اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگار علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی،

فہرستِ مضامین

جلد ۲۰ — نمبر ۱

بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء

تصاویر:- ۱- سیفو - ۲- تصویرِ جذبات

رازِ حیات

انسان پیدا ہوکر، جوان ہوکر، بوڑھے ہوکر، سب کچھ ہوکر یا کچھ نہ ہوکر آخر کار مر ضرور جاتے ہیں۔ قطعی مرجاتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ دنیا ہوگی مگر انسان نہ ہونگے۔ نہ صرف ہم جیسے بے کار انسان نہ ہونگے بلکہ کسی قسم کی کوئی ایسی ہستی جو سوچ سکے، بول سکے، دیکھ سکے، گا سکے، لڑ سکے کہیں بھی نہ ہوگی۔ یہ دنیا ہوگی اور اس کے خوبصورت پتھر، خوبصورت روشنیاں، تاریکیاں اور شاید رنگ۔ جاندار ہستیاں مریں گی تو غالباً پانی بھی مفقود ہوگا کیونکہ جب تک پانی ہے زندگی ضرور رہے گی۔

دنیا اُس وقت ضرور حسین ہوگی مگر حسن پرست کوئی نہ ہوگا۔ دنیا کی نجات ہوجائیگی۔

نجات کتنی مہنگی ہے؟ پانی نہ ہو، دریا نہ ہوں، قطبین پر برف نہ ہو، ہمالیہ پر درخت نہ ہوں، شالامار نہ ہو، پھول نہ ہوں، شملہ میں ساڑھیاں نہ پھڑکیں۔

باوجود اس قدر گراں ہونے کے نجات کس قدر ذلیل چیز ہے! خود دنیا کو پتہ نہ ہوگا کہ اُسے نجات ہوئی کہ نہ ہوئی۔ مگر یہ یقینی ہے کہ نجات دنیا کی قسمت میں لکھی ہے۔ اس سے مفر ناممکن ہے۔

کہیں رازِ حیات یہی نہ ہو کہ جہاں تک ممکن ہوسکے نجات سے بچو! ہم جو آب ساختہ ہیں کیوں اس سیدھی سی بات کو نہیں سمجھتے۔

فلک پیما

جہاں نما

سیام میں آزادیٔ نسواں کا آغاز

اخبار لٹریری ڈائجسٹ نے سیام کے مصلح بادشاہ مہا مانگ کٹ کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

سیام کے بادشاہ رام دوم نے شہزادے مہا مانگ کٹ کو اپنا وارث قرار دے رکھا تھا لیکن بادشاہ کی وفات کے بعد (۱۸۰۹ء میں) اُس کی ایک دوسری بیوی کے بیٹے نے تخت پر قبضہ جما لیا۔ مانگ کٹ نے جس کی عمر اُس وقت اکیس سال کی تھی بھاگ کر ایک مندر میں پناہ لی اور وہاں ایک بدھ پجاری بن کر رہنے لگا۔ اُس نے دوسرے بیراگیوں کی طرح سر منڈا ڈالا، گیروے کپڑے پہن لئے اور ہاتھ میں کشکول لے کر گھر گھر پھرنے لگا۔ یُوں دنیا کو چھوڑ کر بھی اس نے پورا دنیاوی علم حاصل کیا۔ اُس نے معلوم کیا کہ عام لوگ کس طرح رہتے سہتے ہیں اور اُن کو کیا کیا تکلیفیں ہیں۔

حسنِ اتفاق سے دو امریکی مبلّغوں ڈاکٹر ہاؤس اور ریورنڈ کیس ویل سے اس کی شناسائی ہو گئی۔ مانگ کٹ کو ان اجنبیوں کے علم اور خیالات معلوم کر کے ایک عجیب تقویت سی محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اسے انگریزی زبان، حکمت، مغربی اخلاقیات اور مغربی نظریاتِ حکومت کی تعلیم دیں۔ چنانچہ انہوں نے نہایت فراخ دلی سے اُس کی اس آرزو کو پُورا کر دیا۔

۱۸۵۱ء میں بھائی کے انتقال پر مہا مانگ کٹ کو غیر متوقع طور پر اپنا فقیری لُوریا چھوڑ کر تخت قبول کرنا پڑا۔ تخت نشین ہوتے ہی اُس نے اُس علم کو جسے اُس نے اپنی مصیبت کے زمانے میں حاصل کیا تھا عمل میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ اُس نے یہ اعلان کر کے دربار کو متحیر کر دیا کہ وہ ہفتے میں دو دفعہ محل کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی رعایا کی فریاد سنا کرے گا۔ اور اُس کی رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کو بھی بادشاہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ابھی اس قسم کی تقریبوں کی ابتدا تھی اور ابھی درباریوں نے ایسی باتوں کو زیادہ اہمیت دینا نہ سیکھا تھا کہ ایک لڑکی مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور بادشاہ کے قدموں میں گر پڑی۔

بادشاہ نے لڑکی کو بولنے کا حکم دیا۔

لڑکی نے کہا "میرا باپ میری شادی ایک ایسے بوڑھے کھوسٹ سے کرنے کو ہے جس نے اُسے میری معصومیت کے معاوضے میں تیس روپے ادا کئے ہیں"

دربار ایک عورت کی زبان سے ایسے بیباکانہ الفاظ سن کر کانپ گیا۔ایک سپاہی آگے بڑھا تاکہ اسے پکڑ کر باہر نکال دے۔لیکن بادشاہ نے اسے الگ رہنے کا حکم دیا۔اور پھر ایسے نازک وقت میں اُس کی زبان سے یہ معرکۃ الآرا الفاظ نکلے "یہ عورت ہے،گائے نہیں ہے"

سیام کی دس ہزار سال کی تاریخ میں ایسے الفاظ آج تک نہ کہے گئے تھے۔یہ الفاظ انقلاب انگیز تھے۔ لوگوں کے نزدیک یہ الفاظ کفر کا درجہ رکھتے تھے،بے معنی تھے،اُن کے لئے یہ ادنیٰ درجے کا خطرناک مذاق تھا کہ ایک عورت کے دل میں یہ بات ڈالی جائے کہ اُس کی اہمیت ایک گائے سے بڑھ کر ہے!

اس شاہی اعلان کے دن کو،اگر اس کی صحیح تاریخ معلوم ہو سکے تو سیام کی عورتیں "سندِ اعظم" کے دن کے طور پر منا سکتی ہیں۔یہ سچ ہے کہ اس اعلان سے عورتوں کو کامل آزادی نہیں مل گئی تھی،لیکن یہ ایک شاندار آغاز تھا۔

زمین پر انسان کی آمد

زمین پر آنے والوں میں انسان متاخرین میں سے ہے،اور سر جیمز جینز کے قول کے مطابق جیسا کہ انہوں نے رسالہ "ارتقا" میں لکھا ہے ابھی تقریباً اُس کی ساری عمر باقی ہے۔

علم الانسان اور علم الارض کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین پر انسان کا وجود قریب قریب تین لاکھ سال سے پایا جاتا ہے،ہاں اگر ہم اپنے بوزنہ نما اسلاف تک پہنچنا چاہیں تو ہمیں اتنے ہی برس کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔اُن کے اور ہمارے بین اس زمین پر انسان کی تقریباً دس ہزار نسلیں گزر چکی ہیں،جن میں سے اکثروں نے غالباً اپنے وجود کے مقصد اور کائنات کی تخلیق پر کچھ نہ کچھ غور و فکر کیا ہے۔

گمان غالب یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی آیندہ زندگی اس کی گزشتہ زندگی سے بدرجہا دراز ہے۔ایک لاکھ کروڑ سال کے بعد کہ یہیں تک ہماری نظر پہنچ سکتی ہے غالباً سورج اسی آب و تاب سے چمک رہا ہوگا اور زمین اسی طرح اس کے گرد گھوم رہی ہوگی۔سال اب کی بہ نسبت کچھ لمبا ہو گیا ہوگا اور آب و ہوا کچھ سرد۔تیل،کوئلے اور لکڑی کے بے حساب ذخائر کبھی کے ختم ہو چکے ہونگے،لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت ہماری اولاد زمین پر موجود نہ ہو۔شاید زمین اس وقت اتنی بڑی آبادی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جتنا اب اُس نے اٹھا رکھا ہے اور شاید لوگ بھی کم اُس کے سہارے

زندہ رہنے کے خواہشمند ہوں۔ دوسری طرف — اگر ہمارے قنوطی دوستوں کو ناگوار نہ ہو تو ہم کہیں گے کہ نوعِ انسان جس کی عمر آج کی بہ نسبت تیس لاکھ گنا زیادہ ہوگی آج سے تیس لاکھ گنا زیادہ عقل و دانش کی بھی مالک ہوگی۔

اگر اجرامِ فلکی کی عمر کو مدِ نظر رکھ کر کوئی پیمانۂ وقت بنایا جائے اور انسان کی عمر کو اس سے ناپا جائے تو اس کے وجود کا ابھی آغاز معلوم ہوتا ہے۔ اس کے حساب سے وہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے جس نے دنیا کا کچھ نہیں دیکھا؛ اور جس کے آخری لمحات میں بھی اس کا مفاد قطعًا اور کلیتہً اپنے گہوارے اور دودھ کی بوتل کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ وہ ابھی صرف اتنا سمجھ سکا ہے کہ اُس کے اپنے نفس اور گہوارے کے باہر بھی ایک وسیع دنیا ہے۔ وہ ابھی فاصلے کی چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں پر لینا سیکھ رہا ہے؛ اور اُس کے بیدار ہوتے ہوئے دماغ نے ابھی ان اشیا کی ماہیت اور مقصد پر ایک مبہم اور خواب نما انداز میں حیران ہونا شروع ہی کیا ہے۔

اگر مستقبل کا ایک بہت دھندلا سا تصور قائم کیا جائے تو ہم فرض کرتے ہیں کہ نسلِ انسانی کا قیام دو ارب سال تک ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ زمین کی گزشتہ زندگی کے برابر ہے۔ پھر اگر کسی کی عمر ستر برس فرض کی جائے تو انسان اگرچہ جس گھر میں وہ پیدا ہوا وہ ستر برس کا ہے لیکن خود اُس کی عمر صرف تین دن ہوتی ہے۔ اور صرف چند منٹ گزرے اُسے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ دنیا اُس کے گہوارے کے اندر ہی ختم نہیں ہو جاتی؛ اور شاید وقت کے اِس کلاک کے چند ہی کھٹکے گزرے ہیں کہ اُسے بیرونی دنیا کے حجم کا ایک سطحی سا شعور پیدا ہوا ہے۔

ہندوستان میں تعلیم

حکومتِ ہند نے سال مختتمہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے متعلق ایک تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال کے اختتام پر ملک بھر میں ۲۵۸۰۱۶ تعلیمی ادارات اور ۱۲۱۶۵۸۴۹ طالب علم تھے۔ ان میں سے پرائمری سکولوں کی تعداد ۲۰۱۶۸۸ تھی اور اُن کے طالب علموں کی ۹۰۱۳۵۹۱ تعلیم کے کل اخراجات کی میزان بقدر ۱۲۴۵۴۹۲۸ روپے کے بڑھ گئی، گویا ۲۵۸۲۷۷۳۲۵ روپے کی بجائے ۲۷۰۷۳۲۲۵۳ روپے ہوگئی۔ یہ شمار و اعداد دیکھ کر خوشی ہوتی ہے لیکن ہندوستان کو اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے معاملے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ترقی کا انحصار بڑی حد تک مالیات پر ہے۔ موجودہ وقت میں تقریبًا پچاس فی صدی تعلیم کے اخراجات حکومت پورے کرتی ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور بلدیات صرف ۱۴٫۶ فی صدی مہیا کرتی ہیں اور فیسوں سے جو رقم وصول ہوتی ہے وہ اکیس فیصدی سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ عطیات عام چندے اور پرائیویٹ فنڈ کل اخراجات کا بمشکل پندرہ فیصدی ہوتے ہیں۔

تہذیب و شعر

(ذیل کے مضمون کے چند ابتدائی حصے لارڈ مکالے کے مقالہ "ملٹن" سے ماخوذ ہیں)

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ یقینی طور پر شاعری تنزل پذیر ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو ہم تخیل کے اُن عظیم الشان کارناموں کی قدر کرتے ہیں جو ازمنۂ تاریک میں لکھے گئے، پھر بھی اُن کا اُس مخصوص زمانہ کی یادگار ہونا اس بات کی دلیل نہیں سمجھا جاتا کہ اُن کی توصیف اس سے زیادہ کی جائے جس کے وہ اپنی خصوصیات اور خوبیوں کی وجہ سے مستحق ہیں۔ بلکہ اس کے یکسر برعکس، وہ نظمیں کہیں زیادہ دلچسپی اور تعریف کی مستحق ہیں جو مقابلۃً تمدن یافتہ زمانے میں لکھی گئی ہوں۔ پھر اس کے باوجود یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ایسے حضرات جن کا ادبی عقیدہ مجھ سے مشابہ ہے اس کلیہ کی نظیروں کو ایک "فاتحانہ حیرت" کے ساتھ کیوں دیکھتے ہیں۔ گویا وہ محض مستثنیات ہیں۔ میرے نزدیک تو ایک کیفیت کا ہمیشہ یکساں ہونا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اُس کا سبب بھی یکساں طور پر موجود رہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس تجرباتی علوم کی ترقی سے اس درجہ مبہوت ہو جاتے ہیں کہ وہ اُسے فنونِ لطیفہ کے ارتقا سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔ اول الذکر کی ترقی آہستہ اور تدریجی ہوتی ہے۔ صدیوں میں مواد جمع ہوتا ہے اور سالہا سال اُس کی تحلیل و ترکیب میں صرف ہوتے ہیں۔ پھر ایک منظم و منضبط علم بن چکنے کے بعد بھی وہ تشریح و تبدل سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ ہر نسل گذشتہ نسلوں کے جمع کردہ خزانوں سے بہرہ اندوز ہوتی ہے، اور پُر کاوش قیمتی اضافوں کے ساتھ انہیں آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم کے اولین متخیلین بہت خسارے میں رہتے ہیں، اور میرے خیال میں اپنی گوناگوں ناکامیوں کے باوجود تعریف کے مستحق ہیں۔ اُن کے متعلمین جو اکثر قوائے ذہنی کے اعتبار سے اُن کے ہم پلہ نہیں ہوتے علمی حصول میں اُن سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں معاشیات و سیاسی کا ادنیٰ سا طالب علم ماکیاولی اور والپول کو سبق پڑھا سکتا ہے، اور ہر ذہین شخص چند سال کی محنت سے طبعیات پڑھ کر اُس سے زیادہ علم حاصل کر سکتا ہے جو نیوٹن نے نصف صدی کی کوشش اور مطالعہ کے بعد دنیا کے سامنے پیش کیا۔

مصوری، نقاشی اور موسیقی کی یہ کیفیت نہیں۔ ارتقارِ تہذیب ان فنون کے واسطے بہتر موضوعِ امتثال نہیں مہیا کر سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُن اشیا میں کارآمد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہوں جو نقاش مصور اور

معنی استعمال کرتے ہیں۔ مگر زبان جو شاعر کا واحد آلہ ہے، اپنی سادہ ترین شکل میں اُس کے مقصد سے قریب تر ہوتی ہے۔ اقوام بھی افراد کی مانند پہلے محسوس کرتی ہیں اُس کے بعد صفات سے کلیات کا استخراج۔ یہی وجہ ہے کہ متمدن سوسائیٹیوں کا ذخیرہ الفاظ فلسفیانہ ہوتا ہے اور غیر تہذیب یافتہ اقوام کا شاعرانہ۔

دراصل زبان کی یہ تبدیلی ایک حد تک سبب اور ایک حد تک نتیجہ ہے اُس متوازی تبدیلی کا جو متعلق ہے دماغ سے، اور جس سے فلسفے کو فائدہ ہوتا ہے اور شعر کو نقصان۔ کلیات کا استخراج بہت حد تک تخیل کی تعمیر کا ذمہ دار ہے، اور اس لئے ارتقاءِ علم کے واسطے لابدی جس تناسب سے انسان کی معلومات و متفکرات میں اضافہ ہوتا ہے، اسی تناسب سے وہ افراد کو چھوڑ کر اصناف کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے سامنے تخیلی اشکال کی بجائے مبہم فقرے اور انسانوں کی بجائے محض انسانیت کی صفاتِ مشخصہ ہوتی ہیں جب لوگ ارتقا کے اس درجہ کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ نظریے اچھے بناتے ہیں لیکن شعر برے۔ بہت ممکن ہے فطرتِ انسانی کی تشریح بھی وہ اپنے پیش رووں سے زیادہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہوں، مگر تشریح شاعر کا کام نہیں۔ اُس کا مقصد مصوری ہے نہ کہ جراحی۔ وہ اخلاق کے ایک مخصوص معیار کا معتقد ہو سکتا ہے، وہ تمام افعالِ انسانی کا محرک خود غرضی کو ٹھہرا سکتا ہے، اور بالکل ممکن ہے کہ وہ ان اشیا کے متعلق کبھی سوچے ہی نہیں۔ بہر حال ان مضامین کے متعلق اُس کے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ اُس کی شاعری پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اگر شیکسپیر نفسیات پر کوئی مقالہ لکھتا تو یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوتا، مگر اس کے باوجود وہ آتھیلو اور میکبتھ کی وضع کے انسان تخلیق کر سکا۔ اس کے برعکس آج کل بیسیوں ایسے فلسفی زندہ ہیں جو کردار کو اُس کے مختلف اجزا میں تقسیم کر سکتے ہیں، مگر کیا اُن میں سے ایک شخص بھی اتنا ماہر ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے ایک جیتا جاگتا انسان پیدا کر سکے؟

شعر کہنے بلکہ اُس سے کماحقہٗ لطف اندوز ہونے کے لئے بھی ایک مخصوص دماغی مرض کی ضرورت ہے، اگر ایسی نشاط انگیز شے کو مرض سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شعر سے مفہوم ہر منظوم چیز نہیں ہے بلکہ ہر اچھی منظوم چیز کو بھی شعر نہیں کہا جا سکتا۔ شعر وہ منظوم خیال ہے جس میں ایک ایسا سحر ودیعت کر دیا گیا ہو جو متخیلہ پر تھوڑی دیر کے لئے ایک خیرہ کن کیفیت پیدا کر دے۔ اور صحیح معنی میں شاعر کہلانے کا مستحق وہ شخص ہے جو الفاظ کے ذریعہ سے ایسا اثر پیدا کرنے پر قادر ہو جو مصور رنگوں کے ذریعہ کرتا ہے۔ شیکسپیر نے اس خیال کو دو لافانی شعروں میں اس طرح ادا کیا ہے:-

("تخیل نامعلوم اشیا کو مجسم بناتا ہے؛ شاعر کا قلم اُن کی تشکیل کرتا ہے اور غیر محسوس لطیف چیزوں کے واسطے نام اور مقام مہیا کرتا ہے۔")

شعر نتیجہ ہوتا ہے ایک "سوداِ حسین" کا جو محض شاعر کی ملک ہے۔ اور یہ سودا گو حسین ہی کیوں نہ ہو، پھر سودا ہے حقیقت شاعری کا جزوِ خاص ہے، مگر بہ حقیقت ہے، "حقیقتِ دیوانگی"۔ اور اس صورت میں گو طرزِ استدلال بجائے خود صحیح ہے مگر مقدمات اور اُن کی ترتیب یکسر غیر منطقی۔ چند مبادیات کے تسلیم کر لینے کے بعد ہر چیز معقول اور مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن وہ مبادیات ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی سلامت پر یقین رکھنے کے لئے ایک حد تک دماغ کا غیر صحیح ہونا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بچّوں میں تخیل کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اُس اتحادِ دماغی کے مالک ہوتے ہیں جس کے بغیر مکمل انہماک ناممکن ہے۔ ہر تصویر جو اُن کی دماغی آنکھ کے سامنے پیش کی جائے اُن پر واقعیت کا اثر پیدا کرتی ہے۔ آج تک قوی سے قوی محسوسات کا انسان بھی "ہیملٹ" اور "لیر" سے اس درجہ متاثر نہ ہوا ہوگا جتنا ایک چھوٹا بچہ الف لیلہ کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ واقعات صحیح نہیں ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ملک میں اس قسم کے اژدھے اور سانپ موجود نہیں ہیں جو اپنے ادنیٰ سے تنفس کے ساتھ انسان کو جھلس کر راکھ کر دیں یا ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ اُس کو میلوں پرے سے کھینچ کر اپنے شکم میں پہنچا سکیں مگر اس عقیدے کے باوجود وہ قصے کی تمام جزئیات سے اس درجہ "ہم آہنگ" ہو جاتا ہے کہ وہ روتا ہے، لرزتا ہے اور تاریک گلی یا اکیلے کمرے میں جانے کی اسے جرات نہیں ہوتی۔

سوسائٹی کی بے ترتیب صورت میں آدمی بچے ہوتے ہیں: صرف اُن کے خیالات بچوں سے زیادہ متفرق ہوتے ہیں۔ اسی لئے سوسائٹی کی اس حالت میں ہم متوقع ہوتے ہیں کہ اُس کے افراد میں شاعرانہ صلاحیتیں مکمل تر ہوں گی (تہذیب وتمدن کے دور میں ذہانت وعلم، صحیح تقسیم و دقیق تجزیہ کی کثرت ہوتی ہے عقل و فصاحت کی نظموں کی اور عمدہ نظموں کی بھی بہتات ہوتی ہے، مگر شاعری مفقود ہوتی ہے۔ لوگ تقابل و تنقید کرتے ہیں۔ مگر ایجاد نہیں ہوتی۔ وہ پرانے زمانے کے شاعروں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، اور ایک خاص حد تک اُن سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں، مگر یہ لوگ اُس اثر کا صحیح تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو انہوں نے اپنے ہمعصروں کے دماغ پر پیدا کئے) ـــــ وہ نزع، وہ بہجت، وہ اعتقادِ کلی۔

یونانِ قدیم کے مغنی جب ہومر کے اشعار پڑھتے تھے تو اُن کے جسم بے اختیار لرزنے لگتے تھے: اور اُن کے چہرے خوف و دہشت سے بھیانک ہو جایا کرتے تھے۔ آج لوگ انہیں اشعار کو پڑھتے ہیں اور اُسی وضع کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ زمانۂ قدیم میں ویلز اور جرمنی کے شعرا اپنے سامعین کو بالکل مبہوت کر دینے کی قدرت رکھتے تھے۔ اِس دور کے لوگ اُنہیں شاعروں کا کلام پڑھتے ہیں اور اُن اشعار کو نہیں، بلکہ اُس اثر

کو حیرت انگیز اور معجز نما سمجھتے ہیں جو وہ اشعار اُن سامعین پر کرتے تھے (در اصل متمدن اقوام میں سے وہ حسّاسیت معدوم ہو جاتی ہے جو شاعرانہ "یک جہتی" کے لئے ضروری ہے) کسانوں اور نیم تعلیم یافتہ طبقوں میں اس کے اثرات زیادہ عرصہ تک موجود رہتے ہیں، جو مغالطہ انگیز اور خیرہ کن اثر میجک لینٹرن انسان کی جسمانی آنکھ پر کرتی ہے وہی شعر دماغی آنکھ پر کرتا ہے۔ اور جس طرح میجک لینٹرن کا بہترین مظاہرہ تاریک کمرے میں ہوتا ہے بالکل اسی طرح شاعری کے اصلی جوہر تاریک زمانے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جوں جوں علم کی روشنی صورِ ذہنی و خارجی پر پڑتی ہے" وثوق کے نقوش واضح ہوتے جاتے ہیں، "امکانات" کے سائے گہرے پڑنے لگتے ہیں مگر موہوم تصویروں کے رنگ اور خط مدہم پڑ جاتے ہیں۔ در اصل حقیقت اور دھوکے کے ناقابلِ اتحاد فوائد کو ایک جگہ جمع کرنا ناممکن ہے۔

ایک متمدن ادبی جماعت کا فرد اگر شاعر بننے کا شائق ہو تو سب سے پہلے اُسے ایک طفلِ ناداں بننا پڑے گا، اسے اپنے دماغ کا تمام جال پارہ پارہ کرنا پڑے گا، اپنے علم کا وہ حصہ فراموش کرنا پڑے گا جو غالباً اب تک اُس کے "دعوائے عظمت" کا واضح ترین معاون تھا، اُس کی دماغی و ذہنی پختگی ہی اُس کی راہ میں حائل ہونے کو بڑھے گی جس قدر وہ مروجہ علوم کا ماہر ہوگا، اُسی قدر زیادہ اُس کو دقتوں کا سامنا ہوگا، اور اُسی مہارت کے تناسب سے اُس کو اپنی دماغی قوتوں سے کام لینا پڑے گا۔ پھر ان تمام قربانیوں کے بعد بھی اگر وہ بالکل ناکام نہ ہو تو یہ اُس کی خوش قسمتی ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے اپنی تمام عقلی و ذہنی قوتوں کے ساتھ زمانہ کے اثرات کے ساتھ جنگ کی اور اس کے بعد بھی (ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ بالکل نامراد رہے البتہ) اُن کی کامیابی کبھی مکمل نہیں ہوئی۔ اور خواہ وہ خود اپنے کارناموں سے کسی قدر مطمئن کیوں نہ ہوں، دنیا نے اُن کو صلہ و تحسین سے محروم رکھا۔

ایک حد تک اس ناکامی کا سبب یہ بھی ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ زمانے کی فضا میں فلسفہ اور سائنس کے وہ ٹھوس عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں جو بجائے خود تہذیب کا ایک خاص جزو ہیں۔ شعر کا مقصد انسان کے سادہ ترین جذبات میں ہیجان پیدا کرنا ہے، اور یہ اثر پیدا کرنے کے لئے شاعر کا جذبہ بھی سادہ ترین اور خالص ہونا چاہئے۔ ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات میں سے وہ عنصر مفقود ہوتا جاتا ہے جس کو روزمرہ کی زبان میں "معصومیت" اور "سادگی" کہتے ہیں، اور ایسی حالت میں "جو کیفیتِ قلب" تہذیب یافتہ شاعر پر طاری ہوتی ہے اُس میں اس درجہ خلوص اور معصومیت کا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ اُس میں جذبات ہوتے ہیں، مگر ٹھوس بیرونی اثرات کے باعث اُن میں وہ بے اختیاری نہیں ہوتی اور اس لحاظ سے وہ محض جذبات کا سایہ ہوتے ہیں۔ تاریک زمانے کا شاعر شعر صرف اس لئے کہتا ہے کہ وہ شعر کہنے پر مجبور ہے، متمدن دور کا شاعر شعر اس لئے کہتا ہے کہ اُس کا دل شعر کہنے کو چاہتا ہے۔ تاریک زمانہ کا شاعر پہلے محسوس

کرتا ہے پھر شعر کہتا ہے ۔ تہذیب یافتہ شاعر پہلے شعر کہنے کا تہیہ کرتا ہے اور پھر اُن جذبات اور کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم نسبتہً جدید زمانے کے کسی شاعر کو کسی ایسے جذبے کی تفسیر کرتے ہوئے پاتے ہیں جس میں تصنّع کا عنصر مقابلتہً کم ہے تو ہم ایک دم چونک اُٹھتے ہیں ۔ میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر میں کولرج کی سادہ مگر دلکش نظم "محبت" سے متاثر ہوا اس قدر Ancient Mariner سے نہیں ہوا ۔ اب کولرج کی "محبت" کا موازنہ کیجئے بیکن کے شہرۂ آفاق مضمون سے ۔ بیکن خواہ مخواہ اس جذبے کے تجزیہ میں مصروف ہوجاتا ہے ، اور اس کی مختلف شکلوں اور قسموں پر فلسفیانہ طریقے پر بحث کرتا ہے ۔ اس کے بالکل برعکس کولرج کے نزدیک ہر وہ چیز جو انسان کے "فانی جسم کو کپکپا دے محبت ہے" کولرج دُور از کار اور پریشان کُن تعریفیں نہیں مرتب کرتا ؛ نہ وہ اس کے متعلق عالمگیر نظریے گھڑنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور وہ دو تمہیدی شعروں کے بعد ایک سادہ سا واقعہ بیان کردیتا ہے ، کہ کس طرح ایک شام کسی ویران مقام پر اُس نے اپنی محبوبہ کو ایک قصّۂ محبت سنایا اور کس طرح وہ خلوص اور سوز کی کیفیت جو قصّہ سناتے وقت اُس پر طاری تھی اُس کی اپنی محبت کی بہترین تفسیر تھی ۔ اسی صورت سے براؤننگ "اُن کے ساتھ آخری سیر" میں اپنی اکثر نظموں کے مقابلے میں شعر کے صحیح مقصد سے قریب تر ہے ۔

شعر کی سب سے زبردست دشمن منطق ہے ۔ اختصاصِ خیال وصحتِ استدلال وہ حدود ہیں جہاں منطق شروع ہوتی ہے اور شعر ختم ۔ تجرباتی علوم کے واسطے منطق لابدی شے ہے ۔ چنانچہ جُوں جُوں تہذیب ترقی کرتی ہے اور فلسفیانہ علوم زیادہ ہمہ گیر اور پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں منطق کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ جب کوئی علم کم وبیش مکمل ہوجاتا ہے تو اُس کے کلیات اور اصولوں کی تنہا کسوٹی یہی ہوتی ہے کہ اُس کے تمام اصول تسلسل اور تضاد وجملہ منطقی کمزوریوں سے پاک ہوں ۔ اس کے علاوہ اس قسم کے تمام فلسفے مبنی ہیں مشاہدے اور تجربے پر ، اور اس حیثیت سے اُن کی ابتدائی ترقی بجائے خود منطق کے اصولوں کی شرمندۂ احسان ہے ۔ بہرحال جب منطق کسی دور کے طرزِ خیال کا جزوِ لاینفک بن جاتی ہے تو پھر اس کی بالکل متضاد شے یعنی شاعری قدرۃً معدوم ہوجاتی ہے ۔

سیّد معین الحق حقی

Our Last Ride Together

Our Last Ride Together ہے۔

کیفِ جمال

پھر انجمنِ ناز کے پردوں میں ہے جنبش
نظارے کی ہو چشمِ تمنا کو بشارت

پھر ذرّۂ خاموش ہے معمورِ تبسم
پھر غنچۂ شاداب ہے سرشارِ مسرت

سازِ طرب آہنگ ہے اور شامِ تمنا
جامِ مئے گلرنگ ہے اور صبحِ لطافت

پھر عشق ہے قندیلِ رہِ منزلِ اسرار
پھر عقل ہے گرمِ سفرِ وادیٔ حیرت

پھر حُسن نے کی رسمِ کہن دہر میں تازہ
یک جرعۂ صہبا و صد اسرارِ حقیقت

پھر جلوہ سرشار ہے اور منظرِ بینش
پھر نغمۂ بیدار ہے اور درسِ محبت

نقشِ قدمِ حسن ہے اور سجدۂ بیتاب
طوفِ حرمِ ناز ہے اور جوشِ ارادت

پھر دہر میں ہے غلغلۂ قلقلِ مینا
گردوں سے ہے پھر سلسلۂ بارشِ رحمت

ساقی نے دیا بیعتِ آزاد کا پیغام
صہبائے کرم و کیف ہے انعامِ عقیدت

ہاں، صبح نے پھر کھول دیا پرچمِ انوار
ہاں، شام نے پھر ختم کیا دورۂ ظلمت

پھر روح میں بیدار ہے کاہش کی تمنا
پھر قلب میں بیتاب ہے ارمانِ صراحت

پھر دل ہے اور اک روح فزا لذتِ آزار
پھر سر ہے اور اک صبر شکن شوقِ شہادت

پھر میں ہوں اور اک جذبۂ تکمیلِ پرستش
پھر وہ ہے اور اک جلوۂ شایانِ عبادت

اللہ کرے یوں ہی رہے حشر تک اختر
یہ ہوش ربا دورِ مئے ناب بہ صحبت

علی اختر

سیفو

سیفو قدیم یونان کی ایک حسین عورت تھی جس کا شمار دنیا کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ مگر اُس کی شاعری کی نسبت اُس کی ناکام محبت کا افسانہ دنیا کو زیادہ یاد رہ گیا ہے۔ اُس کے بہت کم اشعار مستند ملتے ہیں، زیادہ تر تلف ہو چکے ہیں۔

سیفو کی شاعری کی خصوصیت اُس کی عشق پرستی سمجھی جاتی ہے لیکن بعض محققین نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ایک شریف النسب اور پاکباز خاتون تھی۔ مقابل کی تصویر میں مصور کے مدِنظر یہی دوسرا تصور ہے۔ بہرکیف اس کے وہ آبدار اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں صدیوں کے امتداد کے بعد بھی نایاب موتیوں کی طرح چمکتے ہیں، اور اگرچہ اُنہیں لکھے ہوئے سنِ عیسوی سے بھی پانچ سو سال زیادہ گزر چکے ہیں لیکن اُن کی رفعتِ خیال کو ہمارے موجودہ شعرا بھی مشکل پہنچتے ہیں۔

ہم اس کے کچھ اشعار کا ترجمہ یہاں درج کرتے ہیں:-

(۱)

اے خدا تو ہی تمام نعمتیں عطا کرنے والا ہے۔
تو تھکے ہوئے کو گھر لاتا ہے،
تو بھوکے کو خوش کرتا ہے،
ننھے پرندے کے لئے ماں باپ کے نرم نرم پروں کی آغوش
تو نے ہی بنائی۔
ہمارے گھروں کا سکون
ہمارے دلوں کا اطمینان
تیری ہی نگاہِ عافیت انتما کا مہیا کیا ہوا ہے۔
بچے کو ماں کے سینے سے تو ہی لگاتا ہے۔

(۲)

محبت کا دیوتا، انسان کے اعضا کو گھلا دینے والا بادشاہ
مجھ پر وار کرتا ہے،
اور مجھے کانپتا چھوڑ جاتا ہے۔
پہاڑی درختوں میں سے جس طرح ہوا گزرتی ہے اُس طرح
میرے سینے میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔
جس طرح گڈریے پہاڑ پر چڑھنے میں بے پروائی سے لاکھوں
پھولوں کو پاؤں تلے کچلتے چلے جاتے ہیں،
کاش وہ جسے میں چاہتی ہوں اسی طرح مجنونانہ مجھے زمین پر مسل دے
اے وہ جسے میں چاہتی ہوں
میرے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا دے،
پیشتر اس سے کہ میری آرزوئے عشق میرا خاتمہ کر دے۔

(۳)

چاند نے اپنا منہ روپہلی چادر میں چھپا لیا،
آسمان ستارہ نما آنسوؤں سے تر ہو رہا ہے،
آدھی رات آ گئی ہے، میں اکیلی پڑی ہوں۔
آ اے وہ جسے میں چاہتی ہوں میری آہ سن لے
پیشتر اس سے کہ صبح سنہری پاپوش پہنے ہوئے آئے
اور محبت کے دیوتا کو بھگا دے۔

منصور احمد

آرٹ اور اسلام

یہ کہنا کہ آرٹ جذبات کی تصویر اور شعر تشریح و تفسیر ہے صداقت سے بعید نہیں۔ حقیقت کی ترجمانی آرٹ کے ذریعہ سے کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ جذباتِ قلب کی تشریح موسیقی اور شعر سے۔ شاعری کی طرح آرٹ بھی الہامی فیض پر مبنی ہے کیونکہ جس طرح کسی پیکرِ حسن کی ایک "آن" شاہکارِ شعریت ہوسکتی ہے مناظرِ قدرت یا اطوارِ انسانی کا کوئی مظاہرہ مصورِ حقیقی کا فیض یعنی الہام ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس احساس کا تعلق حقیقت کے ساتھ وابستہ رہے اور دست کاری کے نتیجے کو "نیچرل" کہنے میں پس و پیش نہ ہو۔

لفظ "آرٹ" کے معنی بہت وسیع ہیں۔ سائنس سے حاصل کی ہوئی تحقیق کو علمی ترتیب کے ساتھ مفید ثابت کرنا آرٹ ہے۔ مگر مجازاً اس لفظ کے معنی دستکاری کے بھی لئے جاتے ہیں اور دست کاری میں عموماً نقاشی و مصوری کا مفہوم ظاہر کیا جاتا ہے۔ اردو میں تو خاص طور پر آرٹ کے معنی "مصوری" ہی کے سمجھے جاتے ہیں۔ لفظ مصوّر کے بجائے اب سب لوگ آرٹسٹ ہی بولتے اور لکھتے ہیں، اس لئے آرٹ کے معنی اردو میں صرف مصوری کے ہیں اور اسی مفہوم کے اعتبار سے ہم اِس مضمون میں مشرقی آرٹ اور مشرقی آرٹ میں بھی خصوصاً اسلامی آرٹ پر اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں۔

کوئی تعجب نہیں اگر ناظرین کو الفاظ "اسلامی آرٹ" سے حیرت ہو کیونکہ اسلام نے مصوری کی موافقت تو درکنار اُس کو جائز بھی نہیں رکھا اور منجملہ دیگر معاصی کے اُس کو بھی ایک قسم کی معصیت قرار دیا جیسے کہ مسیح اعظم نے رسمِ ازدواج کی موافقت تو کیا بلکہ اس سے اجتناب کی تعلیم دی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کی تعلیم کا مقصد اصلاحِ اخلاق ہے اور مسیح اعظم کا مقصد حقیقی محبت کو مکمل کرنے کی کوشش۔ ورنہ سچ پوچھئے تو نہ مسلمانوں نے مصوری کو پسِ پشت ڈالا نہ پیروانِ مسیح نے شادی بیاہ سے کنارہ کشی کی۔ جس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہوسکتی ہے کہ فطری جذبات پر خواہ وہ اخلاق کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں بہت مشکل سے قابو حاصل ہوتا ہے۔ اور آرٹ کو فطری جذبے کا اظہار نہ سمجھنا غلطی ہی نہیں بلکہ لاعلمی ہے۔

بقولِ علامہ سر اقبال اسلام کے سوا دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں جس میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، مذہب و سیاست ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہوں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں انسان ایک ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں سمجھا جاتا جسے کسی اور روحانی دنیا کے مقاصد کے لئے ترک کردینا واجب ہو، اور جب دنیا کے ساتھ تعلقات برقرار

رکھے گئے ہوں تو دنیا کے دوسرے لوازم کے ساتھ خواہ مخواہ تعلقات قطع نہیں کئے جا سکتے۔ اگر عبادت مسرتِ روحانی کا ذریعہ ہے تو اکل و شرب عیشِ جسمانی کا اور چونکہ روح و جسم کے درمیان حواسِ خمسہ ایک حقیقی تعلق کی حیثیت سے ہیں اس لئے فرداً فرداً اُن کے لئے بھی عیش و مسرت کے لوازم کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا آرٹ اور موسیقی کو خوشبو وغیرہ کی طرح حواسِ خمسہ کی تفریح کا ذریعہ سمجھنا چاہئے۔

غرض مصوری، موسیقی اور اشعار وغیرہ باطنی نغمہ نوازیوں کی ظاہری صدائے بازگشت ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر یہاں آرٹ سے متعلق باطنی نغمہ نوازی پر ایک تاریخی نظر بھی ڈال لی جائے تو مقابلے سے ظاہر ہو جائے گا کہ آبادیٔ فطرت میں "آرٹ" کو بھی فطرت سے کوئی حقیقی تعلق ہے کہ نہیں۔

جہاں تک تاریخ کو دخل ہے آرٹ سب سے پہلے عمارتوں سے ظاہر ہوا بعد ازاں اُن پر بنے ہوئے نقوش اور پتھر کے ترشے ہوئے بتوں سے۔ قدیم عمارتیں مصر اور جزیرۃ العرب وغیرہ میں زیادہ ہیں۔ نقوش وغیرہ بھی انہیں علاقوں میں ہیں البتہ بت زیادہ تر ہندوستان اور ممالکِ مشرق یعنی چین وغیرہ میں ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں آرٹ کی جو حقیقی خدمت بدھ مذہب اور اسلام نے کی ہے کہیں اور اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یوں تو قدیم یونان، قدیم مصر اور سلطنتِ روما وغیرہ میں بہت یادگاریں ہیں مگر اسلام کی سی عالمگیری کہیں نہیں۔ نہ آرٹ میں کہیں اور ایک پسندِ عام اصطلاحی اہمیت پائی جاتی ہے جو ہر طبقے کے افراد کو مرغوب ہو۔ اس لئے ہم یہاں صرف اسلام سے متعلق آرٹ پر غور کرنا مناسب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ دوسری قوموں نے خصوصاً زمانۂ حال کی مغربی قوموں نے آرٹ کو بہت پست کر دیا۔ وجوہ ظاہر ہیں مثلاً مظاہرِ حسن وغیرہ کی وہ عریاں تصویریں جو مغربی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں شکوہ صرف تصویروں کی عریانی سے نہیں بلکہ اُن جذبات سے ہے جن کا اظہار کیا جاتا ہے خواہ وہ فطرت سے کتنے ہی مطابق کیوں نہ ہوں۔ یوں تو قدیم یونان میں بھی مجسمے عریاں ہوتے تھے اور بدھ کے مجسموں میں بھی لباس سے قدرے بے اعتنائی ہے مگر جذباتِ سفلی نہیں۔ قدیم یونان کے مجسمے پہلوانی اور شجاعت کی مادی تصویریں ہیں۔ ساکیہ منی کے بت تعلیمِ صداقت کی وقیع اور بارعب صورتیں ہیں لیکن مغربی دنیا میں "مظاہرِ حسن" اور "ریڈ ڈانس" وغیرہ سے متعلق جو تصویریں یا مجسمے ہیں ان کو تو دیکھنے والے خود سمجھتے ہیں کہ درحقیقت وہ کیا ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ زمانۂ حال کا مغربی آرٹ ہمیشہ اقوامِ عالم کی خوشنودی کا ذریعہ نہیں ہو سکتا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ مغربی آرٹ میں اخلاق سے کھلی بغاوت ظاہر کی گئی ہے برخلاف اس کے مشرقی آرٹ میں خصوصاً بدھ کے مجسمے آج بھی اپنی اخلاقی شرعیت ظاہر کرنے میں تعلیمِ اخلاق کی بولتی تصویریں ہیں۔ قدیم زمانہ میں ان کی پرستش ہوتی تھی آج ان کو وقعت سے دیکھا جاتا ہے اور آئندہ بھی ان کو توجہ کے ساتھ دیکھا

جائے گا۔ مغربی آرٹ کو جس طرح آج تہذیب یافتہ قوموں کے نزدیک چھپ کر دیکھنا بہ اعتبارِ لازمۂ اخلاق ستر پوشی سمجھا جاتا ہے اسی طرح آئندہ بھی سمجھا جائے گا اور تعجب نہیں کہ سوسائٹی کے اخلاقی عروج پر اُس کو تلف کر دیا جائے۔

اہلِ مغرب اپنے آرٹ کی موافقت میں اکثر یہ کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں کہ ہمارے آرٹ میں محض جذبات کی بہنگم اور بے ترتیب صورتیں نہیں ہیں بلکہ عقل و شعور کے ساتھ ان میں ایک قسم کا فطری توازن بھی ہے۔ ان کا یہ کہنا ٹھیک بھی ہے اور کسی قدر زیادتی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قدیم اہلِ مشرق زیادہ تر اس جذبے کو ظاہر کرنا مقدم سمجھتے تھے جو اُن کے مدِ نظر ہو۔ اہلِ یورپ کی طرح اُن کے نزدیک اور خصوصاً اہلِ اسلام کے نزدیک اظہارِ جذبات خود جذبات نہیں۔ خدا نہ کرے کہ اہلِ مشرق سینما یا تھیٹر یا آرٹ بلاکس وغیرہ کے ذریعہ سے غم و مصیبت کی شکلیں دیکھ کر رونے لگیں۔ غم و مصیبت کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھ کر دل بھر آنا لازمۂ فطرت ہے اور تھیٹر وغیرہ میں ایسا ہونا ایک قسم کی کمزوری۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عہدِ حال سے پیشتر ہر قوم نے آرٹ کے ذریعہ سے یا تو کوئی مذہبی جذبہ پیش کیا ہے یا اخلاقی یا محض روایات وغیرہ سے متعلق جذبات مثلاً یونانیوں کی جسمانی آن بان، بدھ مذہب والوں کی تعلیم صداقت اور مصریوں کی روایات وغیرہ۔ اسلامی آرٹ نے ایک متحدہ شکل اختیار کی ہے۔

سب سے پہلے مسلمانوں نے عمارتوں اور کتبوں کے ذریعہ سے اس فنِ لطیف کی طرف توجہ کی "مسجد" اور "مقبرے" اور اُن پر لکھے ہوئے کتبے آرٹ کا پہلا زینہ ہیں۔ مسجدوں اور مقبروں کو اس اعتبار سے انہوں نے منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ مثال کے لئے قصرِ حمرا اور تاج محل کافی ہیں۔ تاج محل کی تصویریں ہی دیکھنے پر فطرت اور صنعت کے اتحاد کی ایسی مثال بہم پہنچتی ہے کہ دنیا میں کوئی عمارت پیش نہیں کر سکتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا لیلۃ القدر کی روحانی روشنی میں قدرت کی طرف سے ایک خوابی عمارت فضا میں ظاہر ہو گئی۔ جب تصویر میں یہ کیفیت ہے تو شبِ ماہ میں تاج کی کیفیت کا اندازہ دیکھنے والوں ہی کو ہو سکتا ہے۔ ان تمام کیفیتوں میں اسلامی آرٹ کی وہ خاص بات بھی ظاہر ہے جو اس کو تمام دنیا کے آرٹ سے ممتاز کئے ہوئے ہے۔ وہ خاص بات فردوسِ سماوی کا صنعتی مظاہرہ ہے جس میں حسنِ فطرت، حسنِ عقیدت اور حسنِ اخلاق (یعنی وہ نصائح جو کتبوں وغیرہ کے ذریعہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں) سب کم و بیش ظاہر ہیں۔ مساجد کے سر بفلک منارے جو فضائے بسیط کی خاموشی کو اپنے قیام سے گویائی میں تبدیل کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور شام کے وقت ابابیلوں اور کبوتروں کے پرے جو پروانہ وار اُن کے گرد پرواز کرتے نظر آتے ہیں اور علی الصباح لحن سے بھرا ہوا نعرۂ تکبیر جو موذن کے گلے سے بلند ہو کر خوابِ نوشیں میں مست ہونے والوں کو

خدا اور اُس کے ایک برگزیدہ بندے کے پیغام کو سنتا ہوا معلوم ہوتا ہے واقعی کسی قوم کے آرٹ میں ممکن نہیں۔

نقاشی میں مسلمانوں نے خاص کر دو پہلو اختیار کئے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق عربی رسم الخط سے ہے یعنی خطِ نستعلیق میں لکھے ہوئے کتبے۔ یہ خصوصیت کسی زبان کے رسم الخط سے ممکن نہیں۔ ان کتبوں کی مخصوص عبارت "بسم اللہ"، "کلمۂ طیب" اور قرآن شریف کی مشہور آیتیں ہیں۔ ان کا اسٹائل عموماً محرابِ عمارت، یا کنگرہ وغیرہ سے متعلق ہے۔ پھول پتے اور چرند و پرند بھی ان کتبوں سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ کتبے قدیم مصری رسم الخط کا تضاد ہیں۔ خیر یہ تو محض ایک سطحی مثال ہے۔ نقاشی کا دوسرا پہلو علمِ نباتات سے متعلق ہے یعنی بیل بوٹے وغیرہ۔ اگرچہ اس صنف کو ہر قوم نے پسند کیا مگر مسلمانوں نے اس کو خاص طور پر اختیار کیا کیونکہ اُن کے لئے یہی ایک جائز شاہراہ تھی۔ اس کی مثالیں ترکی قالینوں اور ایرانی مصلوں سے بھی بہم پہنچ سکتی ہیں۔ اور آج کل انگلستان میں یہی مثالیں زیادہ اہم خیال کی جاتی ہیں۔

عہدِ عباسیہ میں تحریکِ تصوف نے مصوّری کو عام کر دیا۔ اس سے پیشتر عموماً بادشاہوں کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اس وقت سے آزاد مشرب صوفیوں کی تصویریں بھی بننے لگیں۔ ان تصویروں کی قدر بھی کی جانے لگی لیکن یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ مانی کی روایتی شہرت اور بہزاد کی وقتی جدت نے مصوری کو دنیائے اسلام میں کچھ آگے بھی بڑھا دیا ہو[۵۱]۔ عہدِ مغلیہ کا آرٹ اس کا شاہد ہے۔ اب شاید ہندوستان کو موجودہ اسلامی آرٹ کی تکمیل کا فخر ہو[۵۲]۔

اُن تصویروں کی بابت جو شاہنامہ یا دیگر رزمیہ کتابوں میں بطورِ تشریح بنائی گئی ہیں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے آرٹ کو آرٹ کے اعتبار سے نہیں برتا بلکہ محض ایک سطحی نمائش کے لئے۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے مگر مسلمانوں سے پہلے کیا دنیا کی کوئی ایسی قوم پیش کی جا سکتی ہے جس نے آرٹ کو آرٹ کے اعتبار سے ظاہر کیا ہو؟ ہرگز نہیں کیونکہ ضرور کوئی مذہبی یا اخلاقی یا محض نمائشی خیال اس کے پسِ پشت ہوتا رہا ہے اور یہی ہمیشہ دنیا کا دستور رہا۔ جیسے آج کل عام طور پر جذباتِ نفس کو بیدار کرنے کا خیال مغربی آرٹ کے پسِ پشت ہوتا ہے۔ حقیقی آرٹ کا مظہر تو وہی ہے جو دیکھنے والے کے پست جذبات کو جذب کر کے اس کی روحانی مسرت اور اخلاقی ترقی کا باعث ہو۔ بقول جان ملٹن "حقیقی صنعت وہی ہے جو انسان کے کام کو کارسازِ مطلق کے کام سے ہم آہنگ کر دے۔" اور ایسا ہی آرٹ حقیقی آرٹ ہے گو اس بات کا ہمیں بھی اعتراف ہے کہ وہ چیز جو کسی ایک فرد کو مرغوب ہے، دوسرا اس سے نفرت کر سکتا ہے اور یہ کہ آرٹ کی پسند کا معیار ذاتی احساس و جذبات پر منحصر ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ پسندِ عام پر حقیقی خوبیوں کو قربان کر دیا جائے۔ اگر سطحی نمائش کو دائرۂ اخلاق کے

---

۵۱ ملاحظہ ہو مضمون حسنِ خاموش مطبوعہ ہمایوں دسمبر ۲۹ء

۵۲ غالب پر آرٹ کی پہلی مثال ہے۔

اندر اندر رکھا جائے تو بے جا نہیں۔ چنانچہ اسلامی رزمیہ نظموں کی تصاویر معیارِ اخلاق سے متجاوز نہیں[۱]۔

اسلامی آرٹ پر دوسری قوموں کے اثرات[۲] بھی پڑے۔ مثلاً عماراتِ اندلس میں گاتھک اثرات اور شاہ عباس صفوی کے عہد میں چینی اثرات وغیرہ لیکن یہ اثرات کبھی معرضِ اخلاق نہیں ہوئے اور آج کل بھی نیچرلزم کے دخل کے باوجود فردوسِ سماوی کا صنعتی مظاہرہ مسلم آرٹ نے نظر انداز نہ کیا نہ اپنے عقاید کو پسِ پشت ڈالا۔ مثال کے طور پر اس مضمون سے متعلق تصویر[۳] ملاحظہ ہو جو ساتھ شائع ہوئی ہے۔ یہ تصویر فرضی ہے اور اس سے صرف اظہارِ جذبات مقصود ہے۔

الغرض جس طرح موسیقی سرودِ گویائی ہے آرٹ سرودِ بصارت ہے۔ اگر موسیقی کو روحانی مسرت کا ذریعہ کہہ سکتے ہیں تو آرٹ کو بھی ایسا ہی ذریعہ سمجھنا چاہئے۔ اگر فضائے بسیط میں لحنِ نغمہ کی لہریں پھیل کر سکوتِ فطرت کو ہم آہنگِ سرود کر دیتی ہیں تو آرٹ بھی حسنِ فطرت کو اپنے مصنوعات سے منعکس کر کے افسونِ خیال ثابت کر سکتا ہے۔ اگر کائنات کسی نامعلوم وجود کا آئینہ ہے تو آرٹ مظاہرِ کائنات کا عکس ہے۔ البتہ وہ نقشِ حقیقت ہے اور یہ نقشِ حیرت بقولِ شاعر ؎

وہ جیسے خود میں بنا رہے ہیں، تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں،
وہ ہر تصور سے دور رہ کر بھی ہر تصور میں آ رہے ہیں

سیّد مقبول حسین احمد پوری

---

[۱] عمر خیام پر جو آرٹ بلاکس یورپ میں بنے ہیں اُن کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔

[۲] رام باغ جے پور کے عجائب خانہ میں ایک نوشتہ کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اجنٹا میں مہاتما بدھ کی چند ایسی تصویریں بھی ہیں جو سر سے پیر تک بیضادی حلقوں میں بنائی گئی ہیں اور اس طرح قدیم عیسوی ہنر سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی چند تصویریں عجائب خانہ کی دیواروں پر بھی بنا دی گئی ہیں۔

[۳] شکریہ کے مستحق العزیز میاں مسعود سلمہٗ ہیں جن کی کوششوں سے یہ تصویر دستیاب ہوئی۔ راقم

اگر تم زندہ ہو

اگر تم زندہ ہو اگر تم جیتے جی کچھ جینا چاہتے ہو تو اپنی زندگی کا کوئی مقصد بناؤ۔ کسی بڑی تحریک کے ساتھ کسی بڑے کام کے ساتھ کسی بڑے نام کے ساتھ اپنے تئیں وابستہ کرلو +

اگر تم اپنی زندگی کو صحیح طور پر زندہ و تابندہ بنانا چاہتے ہو تو کسی تاریکی کو اپنی روشنی سے منور کردو۔ تارا چمکتا وہی ہے جو کروڑوں آنکھوں کے اندر چمکے!

اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو تو محض خوش رہنے کی خواہش کو اپنے جی میں جگہ نہ دو۔ بلکہ مفید کاموں میں اپنے جی کو بس جانے دو اور ایسی چیزوں کی آرزو اپنے اندر پیدا کرو جنہیں تم ذرا دقت کے ساتھ پاسکو!

کسی نہ کسی شے میں یقین رکھو۔ اگر تم روحانی ہو تو اپنے مذہب میں یا اپنے پیغمبر میں یا کم از کم اپنے خدا میں۔ اور اگر تم یقین کی طرف مائل نہیں تو پھر کم از کم اپنے اس میلان میں یقین کرلو اور اپنے شک میں بھی کچھ شک پیدا کرو۔ یقین کسی اور شخص یا کسی اور شے میں نہ بھی کرو لیکن کم از کم اپنے آپ میں یقین ضرور رکھو!

ہر شے کو باطل سمجھنے والا خود باطل ہے اُسے چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو بھی باطل سمجھ لے تاکہ پھر ماسوا اُس کے لئے برحق ہوجاتے!

پیچیدگیاں شاندار ہوتی ہیں لیکن روح کے لئے عموماً کھوکھلی اور سادگیاں دلکش ہوتی ہیں اگر کسی کے سینے میں دل ہو اور دل میں کچھ جان باقی۔ ریاست، علمیت، قابلیت، زیادہ تر کیا ہیں؟ بھول بھلیاں! اور دنیا میں ہشت بہشت کون سے ہیں؟ یہی تارے اور سمندر اور پھول اور شبنم اور عورت کی نگاہ اور بچوں کی ہنسی اور کسی دوست کی ہمدردی اور کسی بات میں اک ذرا سی بھی کوشش!

اگر تمہیں ہر کسی کی باتوں سے، ان اوپر کی باتوں سے بھی اختلاف ہے، نفرت ہے، بے پروائی ہے تو تم اپنی سی باتیں ہی کرو اور کہو لیکن کچھ کہو تو اور کم از کم کوئی نہ کوئی بات کرو ضرور یعنی اگر تم زندہ ہو تو جیتے جی مردہ نہ ہو جاؤ بلکہ کچھ جی لو!

ل ب

بانسری بجائے جا

شعلہائے عشق سے شمعِ دل جلائے جا　　نَے کی چشمِ زار سے سیلِ خوں بہائے جا
مستِ نازِ حسن کو خواب سے جگائے جا　　سوزِ دل سنائے جا، غم کا راگ گائے جا

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

دیکھ نکلا آفتاب، رات کی جا چکی برات　　بانسری کی دُھن میں ہے گوش بہ نغمہ کائنات
کیا ہی دلفریب ہے تیری بانسری کی بات　　کرنیں ناچنے لگیں بانسری کے سُر کے سات

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

اپنی بانسری ملا نغمۂ حجاز سے　　ہو حقیقت آشنا صورتِ مجاز سے
کہنا ہو دردِ دل اگر شوخِ مستِ ناز سے　　بھیروں کا راگ چھیڑ سوز اور گداز سے

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

سوزِ صدائے نے نہیں ہے اثرِ سنانِ غم　　آہ، غضب، ہے کس قدر درد بھرا بیانِ غم
درگہِ شاہِ حسن میں پیش کر ارمغانِ غم　　شوق سے سُن رہا ہے وہ تیری داستانِ غم

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

گرچہ چھپا نہیں ہے کچھ حال ترا علیم سے　　اس کی صفت ہے بے نیاز وہ ہے صمد قدیم سے
کھینچ تو آہِ شعلہ زا اپنے دلِ دونیم سے　　مِل ہی رہے گا کچھ نہ کچھ بارگہِ کریم سے

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

امجدِ خستہ تو کہاں پہنچے گا اُس مکان تک　　سینکڑوں بے نشاں ہوئے مل نہ سکا نشان تک
جا نہیں سکتا اُس جگہ گرچہ ترا گمان تک　　پر ترے درد کی صدا پہنچے گی اُسکے کان تک

اے فقیرِ بے نوا! بانسری بجائے جا

سیّد احمد حسین امجد۔

میر محمد حسین المعروف نمود و انمود

مخفی نہیں کہ ہم سیاسیات اور مذہب پر خامہ فرسائی سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں، اور ہماری تحریروں میں شاید ہی کوئی فقرہ ملے جو ان موضوعات کی طرف ایما کرے۔ ان سطور کو سپردِ قلم کرنے میں بات صرف اتنی ہے کہ نمود و انمود کی تاریخی ہستی ہمیں دلچسپ معلوم ہوئی۔ اور ہم اُسے ذرا دل لگی کے لئے شہرِ خموشاں سے دو گھڑی کے لئے کھینچ لائے۔ سرزمینِ ہند فرقہ سازی کے لئے جس قدر بار آور ثابت ہوئی ہے محتاجِ بیان نہیں اس لئے نمود و انمود جیسے بامراد فرقہ ساز کی سوانح حیات کو منظرِ عام پر نہ لانا ہندوستان کے جہانِ ادب کی حق تلفی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اُس کے حالات دیگر فرقہ سازوں سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ تقابل کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ وہ بات ہے جس سے ہم کوسوں بھاگتے ہیں۔ بہرحال یہ کاغذی پیرہن کسی قامت پر درست آجائے تو اس کا علاج ہمارے بس میں نہیں۔ صانع کا شکوہ لازم اور ہم سے گلہ عبث ہے۔

(نور الٰہی و محمد عمر)

میر محمد حسین نام، مشہد کا رہنے والا، ایک نجیب الطرفین سیّد زادہ تھا۔ فارسی کا عالم اور عربی کا فاضلِ اجل تھا۔ حدیث فقہ غرض معقول و منقول میں عبور حاصل تھا۔ زبان شیریں تھی۔ جو بات زبان سے نکلتی تھی، سامعین کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ مجلسِ مناظرہ میں سب کا منہ بند کر دیتا تھا، اور بڑے بڑے منطقی منہ دیکھتے رہ جاتے تھے لیکن قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ کس مپرسی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا اور تنگ دستی ہمیشہ قافیہ تنگ کرتی رہی۔ آخر وطنِ مالوف کو کہ عزیز و اقارب سے تہی دامن تھا خیرباد کہی اور کابل کا رخ کیا جہاں نواب عمدۃ الملک امیر خاں صوبہ دارِ کابل علوم و فنون کی سرپرستی میں مِن برسا رہے تھے۔ محمد حسین کے لئے کابل دوسرا بغداد یا دہلی ثابت ہوا اور یہاں پہنچتے ہی اس کے دن پھر گئے۔ چند دنوں میں اُس کے تبحرِ علمی کی دھوم مچ گئی اور خود صوبہ دار کے صاحبزادے اس کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ محمد حسین کا مسکن علمی دنیا کا مرکز بن گیا اور مذاکرۂ علمیہ میں اُس کی رائے کو قولِ فیصل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ نواب عمدۃ الملک کی بیگم "صاحب جی" کہ نواب علی مردان خاں کی دختر تھی اولاد سے محروم تھی اور اُس نے ایک ولایتی سیدزادی کو گود لیا تھا۔ یہ لڑکی اب جوان ہو گئی تھی اور بیگم کو اس کے لئے ایک ایسے شوہر کی ضرورت تھی جو سیّد ہونے کے علاوہ

دلاتی ہو اور خصائل حمیدہ میں ممتاز ہو۔ جب محمد حسین کی شہرت نواب کے محل کی دیواریں پھاند کر حرم سرا میں پہنچی تو بیگم کے ایما پر نواب نے محمد حسین کو بلا کر آداب، لیاقت، علم و فضل میں یکتا پایا اور اُس لڑکی کی شادی محمد حسین سے ہوگئی۔ اس طرح اُس کا رتبہ دنیاوی لحاظ سے بھی بلند ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد نواب نے اُسے شاہی خوشبو خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔ اور نواب کے فرزندوں نے جو دوسری بیگم کے بطن سے تھے اس سے مراسم دوستانہ بڑھائے۔ اُس نے ان نوجوانوں پر اور خاص کر ہادی علی خاں پر ایسا افسون پھونکا کہ وہ دن رات اس کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اس کے چند ماہ بعد نواب عمدۃ الملک نے سفر آخرت کیا اور اُس کے پس ماندگان دہلی چلے گئے۔ محمد حسین کے پاؤں میں ملازمت کی زنجیر پڑی تھی۔ اُسے کابل ہی میں رہنا پڑا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ داروغۂ خوشبو خانہ کی اسامی آئندہ ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ اس نے بیگمات اور اہل دربار کو تحفہ و تحائف بھیج کر سب کے دل مٹھی میں کرلئے۔ اور نوازشات شاہی کی فراوانی اس حد تک پہنچی کہ اُسے دہلی جاکر آستاں بوسی کی اجازت مل گئی۔ اب محمد حسین کو ایک شاندار مستقبل کے خواب آنے لگے اور وہ دو منزلہ کرتا ہوا لاہور پہنچا یہاں اُسے شہنشاہ عالمگیر کی رحلت کی خبر ملی اور اُس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اُس نے عطر و عبیر کے ۸ ہزار روپے پر اکتفا کرکے اس رقم خطیر کو اپنے توکل کا سرمایہ بنایا اور فقیروں کا بانا پہن کر علائق حیات سے بیگانگی ظاہر کرنے لگا۔ چونکہ حصول عز و جاہ کی خواہش اُس کے دل پر غالب تھی اس نے بوریا سے تخت شاہی کا کام لینے کا تہیہ کیا۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے عام گندم نما جو فروشوں کے پامال طریق کو پسند نہ کیا اور اُس کی جولانی طبع نے عام پیروں کے طریق کار کی پیروی کو پست ہمتی پر محمول کیا۔ اُس نے ایک ایسے مسلک کی طرح ڈالنے کا ارادہ کیا جس کا کسی نے نام تک نہ سنا ہو۔ اس کے ہمراہ ایک طباع منشی زادہ تھا، جسے محمد حسین کے فیضان صحبت نے خاصا عالم بنا دیا تھا۔ محمد حسین نے اُسے اپنا ہمراز بنایا اور دونوں کی سرگوشی کا نتیجہ ایک جدید مذہب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کے تعلق میں محمد حسین کو الہام ہونے لگا، مگر ایسی زبان میں جسے کوئی نہ سمجھ سکے۔ محمد حسین نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کا مرتبہ نبوت اور امامت کے بین بین ہے اس کی شان وہی ہے جو انبیا و اولیا کی ہوتی ہے اور اُسے "بیگوکیت" کہتے ہیں۔ اب یہ دونوں الہامی زبان اور اُس کے قواعد بنانے میں مصروف ہوئے۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو اس جدید زبان میں ایک الہامی کتاب کی تیاری شروع ہوئی۔ اِس کتاب میں انہوں نے عجیب و غریب فقرے اور عبارتیں درج کیں۔ جن کی تفسیر سوا اُن کے اور کسی کو معلوم نہ تھی۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو اُسے "اوزہ مقدسہ" کے نام سے موسوم کیا۔ زبان جو اختراع کی اُس کے الفاظ کا ذخیرہ قدیم فارسی زبان کے غیر مانوس اور غریب الفاظ میں ترمیم و ترخیم کرکے بہم پہنچایا اور اُنہیں عربی کے مشابہ کردیا۔ اس کا بیان تھا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے ۹ بیگوگ ہوتے ہیں۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ کے اول بیگوگ حضرت علی ہیں اور آپ کے بعد آنے والوں میں امام رضا د

امام ضامن ہیں۔ ان کے بعد "بیگوبیت" اس کے نام پر منتقل ہوئی اور وہ "خاتم البیگوکیت" ہے۔ بیگوکیوں کا یہ شمار وہ حضرات اہلِ تشیع کے روبرو کرتا تھا اور اہلِ سنت کے سامنے خلفائے راشدین اور چار خلفائے اموی وعباسی کے نام لے کر نویں نمبر پر اپنی بیگوکیت کا مدعی تھا اس کا قول تھا کہ اسے کسی مذہب سے سروکار نہیں۔ وہ ہر ملت کا چراغ روشن کرنے والا ہے۔ اس کے مرید "فربود" کہلاتے تھے۔ مریدوں کو بتاتا تھا کہ اس پر نزولِ وحی دو طرح ہوتا ہے۔ اول ایک آفتاب جیسا نورانی قرص اُس کی آنکھوں کے سامنے چکر کاٹتا ہوا اُس کے قریب آجاتا ہے اور اُس میں کلمات لکھے ہوتے ہیں جو اُسے یک نظر حفظ ہو جاتے ہیں اس کے بعد وہ قرص اُسکے جسم کا طواف کرتا ہے اور اُس پر غشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس عمل سے اُسے اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس کا برداشت کرنا عام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ دوم ایک خوفناک آواز آتی ہے جس سے کان بولنے لگتے ہیں۔ پھر پیغامِ آلٰہی سننے میں آتا ہے۔ سلام کا طریق بھی نیا ایجاد کیا اور فربودوں کو حکم ہوا کہ بجائے السلام علیکم کے "نمود ہو دال" کہا کریں جس تاریخ کو اُسے اول بار الہام ہوا اس کو مقدس قرار دے کر اسے "روزِ جشن" کہنے لگے۔ اس تیوہار کے روز اس کے مرید ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے پر عطر و عبیر چھڑکتے اور ہر ممکن طریق سے اظہارِ مسرت کرتے تھے۔ بھرے مجمع میں حضرت نمود دوانمود دو علموں کے سائے میں تشریف لاتے تھے۔ جلو میں ہزاروں عقیدتمند ہوتے جو اُس کے راستے کی خاک اٹھا کر اپنے دامنوں میں ڈالتے اور بطور تبرک اپنے گھروں کو لے جاتے تھے۔ ایک پرانی وضع کی ٹوپی زیبِ سر ہوتی تھی جو اماموں کے زمانے میں پہنی جاتی تھی۔ مگر اُس کی دیوار قدیم ٹوپی سے ذرا بلند ہوتی تھی جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ وہ "خاتم بیگوکیت" ہے۔ جب سب مرید جمع ہو جاتے تو نمود دوانمود اس لاؤلشکر کو ساتھ لے کر اُن پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا جہاں دھولی رانی کے محلات کے کھنڈر ہیں اور جنہیں دھولی بھٹیاری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا بیان تھا کہ اسے اول بار الہام اسی جگہ ہوا اور اسے وہی تقدس حاصل ہے جو غارِ حرا کو ہے۔ یہ جشن ہر سال ۶ ذی الحج کو منایا جاتا تھا۔ اور نمود دوانمود غرّہ ماہِ مذکور سے تا یومِ جشن روزہ رکھتا اور ان دنوں میں کسی سے ہم کلام نہ ہوتا۔ اور بالکل خاموش رہتا تھا۔ یہ جشن کامل دو ہفتے تک ہوتا تھا اور نذر و نیاز میں زر و جواہر کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ دوسرا جشن "روزِ سولان" کہلاتا تھا، لیکن اس کی وجہ تسمیہ اور کیفیت معلوم نہیں۔

معمولی نمازِ پنج گانہ پر اُس نے تین نمازیں اور مستزاد کیں جنہیں اس مذہب کی اصطلاح میں "دید" کہتے تھے۔ پہلی "دید" کا وقت طلوعِ آفتاب کے بعد، دوسری کا نصف النہار اور تیسری کا غروبِ آفتاب کے وقت جب سرخیٔ شفق موجود ہو۔ دید کی بجا آوری کا یہ طریقِ عمل تھا کہ نمود دوانمود یا اس کا کوئی خلیفہ بیچ میں کھڑا ہو جاتا اور مرید اُس کے گرد ایک مربع شکل کا حلقہ مثل چار دیواری مکان باندھ لیتے۔ یعنی
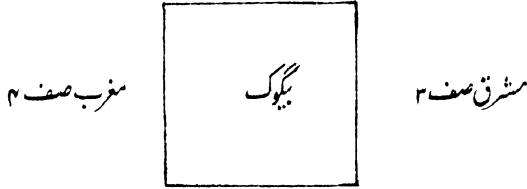
جب اس طرح صف بندی ہو جاتی تو سب ان مقدس کلمات کا ورد کرتے جو نمود وانمود نے اپنی ایجاد کردہ زبان میں وضع کیے تھے اور جن کے سمجھنے سے سب عاری تھے۔ اس عمل کے بعد سب اہل صف سروں کو جھکا دیتے اور اس طرح گھومتے کہ صف ۱ صف ۴ کی جگہ، صف ۴ صف ۲ کی جگہ اور صف ۲ صف ۳ کی جگہ پہنچ جاتی۔ اس نقل مقامی کے بعد سب لوگ اپنی آنکھیں زمین کی طرف جھکا دیتے پھر آسمان کی طرف منہ کرکے فضا میں نظر جماتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر نئی وضع اختیار کرنے پر نئے کلمات پڑھے جاتے تھے جنہیں لوگوں نے طوطے کی طرح رٹا ہوتا تھا۔ اس طرح شش جہت میں اللہ کی عبادت کرنے پر دید ختم ہو جاتی تھی۔

خلفائے اربعہ کے مقابلے میں نمود وانمود نے بھی چار خلیفے مقرر کیے تھے۔ خلیفہ اول اس کا شاگرد رشید اور ہمکار منشی نذادہ تھا جس کا نام "دوجی بار" اپنی زبان میں قرار دیا تھا جس کے معنی اُسی کو معلوم ہونگے۔ دوسرا خلیفہ وانمود کا سالا میر باقر تھا اور دو خلیفہ اَور تھے۔ میر محمد حسین نے اپنا نام "نمود اللہ" اور "نمود وانمود" تجویز کیا تھا جس کے معنی خود اُس کے مریدوں کو بھی معلوم نہ تھے۔ جب کوئی شخص اُس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا تو اُسے نیا نام دیا جاتا، جسے اس کی اصطلاح میں "نشان" کہتے تھے۔ وانمود کے تین بیٹے تھے۔ اول کا نام "نما نمود" دوسرے کا "نفار" اور تیسرے کا "دید" تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جن میں سے بڑی کا نام "نمانہ کلاں" اور چھوٹی کا "نمانہ خورد" تھا۔ بیوی کی طرف سے جو رشتہ دار مرید ہوئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ تھے۔ نمایار، نمویار، نمانہ، اور نموفر جب مذہب کا یہ نیا فتنہ جاگا اُس وقت ملک کی سیاسی حالت یہ تھی کہ بہادر شاہ لاہور میں تھا اور سلطنت میں کھلبلی پھیلی ہوئی تھی۔ میر محمد حسین نے دہلی پہنچ کر خفیہ خفیہ اپنے خیالات کی اشاعت شروع کی اور چائے کی دعوت کے پھیر میں کئی ہم نوا پیدا کر لئے۔ جب بہادر شاہ لاہور سے دہلی آیا اور لائق باپ کے نالائق بیٹوں میں خانہ جنگی کے آثار نمودار ہونے لگے تو محمد حسین نے پردۂ خفا کو چاک کیا اور کھلے بندوں لوگوں کو اپنے مذہب کی تلقین کرنے لگا۔ اول تو کوئی اُس سے بحثنے کا دم نہ بھرتا اور جو کوئی سامنے آ بھی گیا تو میر محمد حسین

دلائل و براہین، اسناد و شواہد سے اس کا ناطقہ بند کر دیتا تھا۔ اس سے اس کا نام اور بھی چمکا اور عوام جوق در جوق بیعت کرنے لگے اور اُس کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ شہرت کا یہ عالم تھا کہ جب شہنشاہ فرخ سیر اورنگِ جہاں بانی پر متمکن ہوا تو سلطنت بھر میں میر محمد حسین سب سے بڑا عالم شمار ہوتا تھا۔ فرخ سیر ایک سادہ لوح نوجوان تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فقط حسین علی خان و عبداللہ خاں کی بساطِ حکمت عملی کا بادشاہ تھا، اور ان "بادشاہ گروں" کو ہر وقت اپنی پڑی رہتی تھی۔ انہیں مذہبی مناقشات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہادی علی خاں جیسے امیرزادے کا سارا رسوخ اُس کا پشت پناہ تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی امرا اُس کے مریدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان تمام حالات سے میر نمود و انمود نے کافی فائدہ اٹھایا اور اپنے مذہب کی بنیادیں محکم دیواروں پر استوار کیں۔ نمود و انمود کے اقتدار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک شب کو فرخ سیر چند خواجہ سراؤں کے ساتھ اس کی قدم بوسی کے لئے اُس کے آستانہ پر چپکے سے حاضر ہوا لیکن شہنشاہ کے پہنچتے ہی نمود و انمود نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات سے صاف انکار کیا۔ آخر فرخ سیر کی خوشامد اور نمود و انمود کے جلیفوں کی لجاجت کے طفیل فرخ سیر کو اس کی درگاہ میں بار ملا۔ بادشاہ نے نہایت ادب سے فرشی سلام کیا۔ وانمود نے ایک مرگ چھال بادشاہ کے آگے پھینک دی۔

فرخ سیر اس کے استغنا پر لوٹ ہو گیا۔ بادشاہ نے اشرفیوں کے بدرے نذر کے طور پر پیش کئے لیکن وانمود نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کر کے فرخ سیر کے دل پر قبضہ کر لیا۔ آخر ہزار منت کے بعد وانمود اس بات پر رضامند ہوا کہ بادشاہ "افوزہ مقدسہ" کی ایک جلد خریدے، جس کی قیمت ۷۵ روپے تھی۔ چنانچہ بادشاہ نے کتاب مذکور خریدی اور اُسے اٹھا کر سر پر رکھا اور باہر جا کر اشرفیاں درگاہ کے فقیروں میں تقسیم کر دیں۔ اب کیا تھا۔ اس خبر کے عام ہوتے ہی مریدوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ ہو گیا۔ اور دہلی میں نمود و انمود کا ڈنکا بجنے لگا۔

جب محمد شاہ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو قلمدانِ وزارت محمد امین خاں نے سنبھالا۔ محمد امین خان کو ایک مدت سے دردِ گردہ کا دورہ ہوتا تھا، اور اطبا کا خیال تھا کہ اُس کی زندگی معرضِ خطر میں ہے۔ اِس لئے وہ مذہب کی طرف زیادہ متوجہ رہتا تھا۔ جب اُسے نمود و انمود کی فتنہ سامانی کا علم ہوا تو اُس نے چند سپاہیوں کو بھیجا کہ نمود و انمود کو باندھ لائیں۔ دوپہر کا وقت تھا جب سپاہی پہنچے۔ ہجوم کم تھا اور وانمود دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ یہ خبر سُن کر اس نے پُورے استقلال سے کام لیا۔ خود کھانا کھاتا رہا اور اپنے بیٹے "دیہ" کو جو حسن و جمال میں ثانی نہ رکھتا تھا کہا کہ جاؤ سپاہیوں کو کھانا کھلاؤ۔ میں کھانا کھا کر باہر آتا ہوں۔ سپاہی اس پیکرِ حسن اور خوش اخلاقی پر مبہوت ہو گئے، اور انہوں نے جبر و تعدی سے کام لینے کے خیال کو دل سے نکال دیا۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اُدھر محمد امین خاں کو دردِ گردہ نے آ دبایا۔ سپاہیوں کو یہ خبر ملی تو ان کے حواس مختل ہو گئے اور وہ بھاگ کر

وزیرِ اعظم کی ڈیوڑھی پر جا پہنچے۔ محمد امین خاں کو ذرا افاقہ ہؤا تو اُس نے پھر سپاہیوں کو حکم دیا کہ صبح کو نمود وا نمود کو ضرور حاضر کیا جائے۔ شب کے وقت محمد امین خاں کی حالت غیر ہوگئی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ نمود وا نمود کو ہادی علی خاں اور دیگر امرا منٹ منٹ کی خبر پہنچا دیتے تھے اور وا نمود بھاگ جانے کا تہیہ کر رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ محمد امین خاں گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ وہ گھر سے نکل کر مسجد میں جا بیٹھا، اور اُس کے معتقدوں نے اُس کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ قمر الدین خاں نے جب باپ کی حالت غیر دیکھی تو بیگمات اور دیگر اعزہ واقارب کے کہنے پر اُسے یقین ہوگیا کہ محمد امین خاں نمود وا نمود کی بد دعا کا شکار ہو رہا ہے اور اُس نے اپنے دیوان کو پانچ ہزار روپیہ دے کر بھیجا کہ اس کی طرف سے نذر گذار کر وا نمود سے خواہانِ عفو ہو اور تعویذ ردِّ بلا طلب کرے۔ جب دیوان پہنچا تو وا نمود مچل گیا اور رد ون کی لینے لگا۔ اور یوں بولا کہ میں نے اس کافر کو ایسا تیر مارا ہے کہ اس کی زندگی محال ہے۔ میں شہادت کے لئے سر بکف بیٹھا ہوں۔ میرے جدِّ اعلیٰ نے بھی مسجد میں جامِ شہادت نوش کیا تو میں اس سعادت سے کیوں محروم ہوں۔ ایک دفعہ مر چکا ہوں اور یہ دوسری زندگی ہے۔

دیوان نے کہ بڑا چرب زبان درباری تھا بہت منت خوشامد کی تو وا نمود نے کہا کہ اگرچہ تیر کمان سے نکل چکا ہے مگر تمہارے کہنے سے تعویذ لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بعد از وقت ہے اور تمہارے پہنچنے سے پہلے روح پرواز کر گئی ہوگی۔ یہ کہہ کر وا نمود نے اپنے خلیفۂ اعظم دوجی بار کو اشارہ کیا اور اُس نے تعویذ پر یہ الفاظ لکھ کر دیئے "وننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمۃ للعالمین ولا یزید الظالمین الا خسارا"

دیوان ابھی راستے ہی میں تھا کہ محمد امین خاں عالمِ جاوداں کو سدھارا۔ اس واقعے نے وانمود کی شہرت اور اقتدار کو چار چاند لگا دیئے۔ دو تین سال بعد تک وانمود شاہانہ جاہ وجلال سے زندگی بسر کر کے موت کی بھینٹ چڑھا اور اُس کا بڑا بیٹا "نما نمود" اپنے باپ کے سجادہ پر بیٹھا۔ وانمود زندگی بھر آمدنی سے دوجی بار اور دیگر محرمانِ راز کو حصّہ دیا کرتا تھا، لیکن نمانمود نے اس حصے کے دینے سے انکار کیا اور کل آمدنی خود لینے لگا۔ ہر چند دوجی بار نے نشیب و فراز سمجھایا لیکن نمانمود نے ایک نہ سنی اور دونوں میں ظاہرا بگاڑ ہوگیا۔ آخر جب معاملے نے طول کھینچا تو دوجی بار چھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آیا اور اُس نے اس مذہب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ چنانچہ جشن کے روز کہ سب فرقہ جمع تھے۔ دوجی بار نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ حضرات بخوبی آگاہ ہیں کہ حضرت وانمود اور اس خاکسار کے تعلقات کس قدر گہرے تھے اور اُن کے سب راز مجھے معلوم ہوتے تھے۔ میں آج ان اسرار سے پردہ اُٹھاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ الہام ووحی کی داستان محض ڈھونگ تھی اور ہمیں نے اور وانمود نے اوزہ مقدسہ مل کر تصنیف کی تھی۔ چنانچہ اصل مسودہ پیش کرتا ہوں، جس کے کاتب میں اور وانمود ہیں اور دونوں کی حک وبرید کے نشانات موجود ہیں۔ جو کتاب الہامی ہو اس میں ترمیم و

تنسیخ کی ضرورت کس طرح لاحق ہوسکتی ہے۔ یہ کہ کر اُس نے اصل مسودہ حاضرین کے سامنے پیش کردیا۔ یہ ایک ایسا بے پناہ وار تھا جس کا جواب نمانمود اور اُس کے رفقا کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ جماعت میں ہلچل پڑگئی اور یہ گھروندا گر پڑا۔ نمانمود نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر رنگ نہ جما اور یہ فرقہ حقیر ہوگیا۔ نمانمود نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ میدان چھوڑ کر عزلت گزیں ہوجائے اور وہ اُس جاگیر پر چلا گیا جو ہادی علی خاں نے اس کے باپ کو دی تھی۔
نمانمود تین سال کی گمنام زندگی کے بعد فوت ہؤا تو اس کا بھائی شاہ نفار سجادہ نشین ہؤا۔ شاہ نفار کو علوم متداولہ میں بہرۂ کافی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ زبان آور مقرر، خوش اخلاق اور خندہ پیشانی تھا۔ اُسے دربار شاہی میں شرفِ باریابی حاصل تھا۔ احمد شاہ کے عہد میں نواب جاوید خاں کی سرکار میں ملازم ہؤا اور "الہاماتِ جاوید" کی تصنیف میں عمر صرف کردی۔ شاہ دید نفار کے سامنے فوت ہؤا اور شاہ نفار بھی احمد شاہ کے عہد میں چل بسا۔ نفار کی زندگی تک اُس کے مذہبِ آبائی کے پیرو اکّے دکّے مل جاتے تھے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد جو بچے کھچے نام لیوا باقی تھے انہوں نے دہلی سے ہجرت کی اور میر جعفر کے ننگِ ہند بیٹے میرن کے پاس مرشد آباد جا پہنچے۔ میرن نے یہ مذہب اختیار کیا۔ قدمِ رسول کی تولیت ان کے سپرد کی اور پانچ صدر روپیہ یومیہ مقرر کردیا۔ اس خاندان کی چند مستورات ۱۱۹۴ء تک مرشد آباد میں جدید بیگوک کی منتظر تھیں جو افسوس کہ نمودار نہ ہؤا اور میرن کے ساتھ اس عظیم الشان فرقے کا خاتمہ ہوگیا +

نور الٰہی
و
محمد عمر

قطعہ

یہ شبِ مہ یہ جوانی پھر کہاں — یہ شرابِ ارغوانی پھر کہاں
بے تامّل دے پیاپے جام دے — ساقیا! یہ زندگانی پھر کہاں

محمد علی کیفی

غزل

بے دیکھے ہر کوئی ترا دیوانہ ہوگیا
افسوں ترے جمال کا افسانہ ہوگیا

کل تھا جو راز آج وہ افسانہ ہوگیا
یہ کیا اشارہ نرگسِ مستانہ ہوگیا

کیا کام تجھ سے نرگسِ مستانہ ہوگیا
ہر گوشہ گوشہ شہر کا میخانہ ہوگیا

دل کی جلن سے آگ جگر میں بھی لگ گئی
پروانہ وقفِ ماتمِ پروانہ ہوگیا

دیدار کی ہوس نے کیا دل کا خاتمہ
آخر ہلاکِ جلوۂ جانانہ ہوگیا

دل محوِ کیفیت ہے تری بزمِ ناز میں
لبریزِ صد نشاط یہ پیمانہ ہوگیا

احسان مجھ پہ ہے تری برقِ نگاہ کا
روشن مری امید کا کاشانہ ہوگیا

آنکھیں جو کھولیں صبح کو اک مستِ خواب نے
وا میرے واسطے درِ میخانہ ہوگیا

ہے اپنے دل کے رنگ میں عالم رنگا ہوا
عشرت کدہ کبھی کبھی غمخانہ ہوگیا

کچھ ہے خبر تو اُس نگہِ آشنا کو ہے
کیوں اک غریب خلق سے بیگانہ ہوگیا

وحشتؔ پری رُخانِ معانی کے حسن سے
دیوان تیرا رشکِ صنمخانہ ہوگیا

رضا علی وحشتؔ

ٹوکیو سکول آف فارن لینگویجز

سترھویں صدی ڈچ قوم کی بحری طاقت اور بحری تجارت کے عروج کا دور تھا۔ بحرِ ہند اور بحر الکاہل میں ان کے تجارتی اقتدار کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہندوستان، ملایا، اور جزائرِ شرق الہند میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے بعد اسی صدی کے اواخر میں یہ قوم جزائرِ جاپان پہنچی اور تجارتی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔

ڈچ ہی پہلی غیر ملکی زبان ہے جو باشندگانِ جاپان نے سیکھی۔ دو برس تک یہ لوگ اپنی تجارتی و صنعتی و بعد ازاں سیاسی ضروریات کو اسی زبان کے ذریعہ سے پُورا کرتے رہے۔

۱۶۸۴ء میں حکومتِ شوگن (قائدِ اعظم) نے ایک محکمۂ ہیئت قائم کیا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں اس محکمہ کے ساتھ ساتھ ایک صیغہ غیر ملکی زبانوں کا ترجمہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک جاپان بیرونی دنیا کے لئے ایک رازِ سربستہ تھا۔ باشندگانِ جاپان بھی بیرونی دنیا سے اُس وقت تک بہت ہی کم آشنا تھے، مگر دنیا کو سمجھنے کی خواہش ضرور پیدا ہو چلی تھی۔ جاپانی تہذیبِ قدیم کے جمود میں نئے خیالات کے انقلاب کی تحریک پیدا کرنے کا سہرا بھی ڈچ قوم ہی کے سر ہے۔ وہ چند مدارس جو ڈچ لوگوں نے جاپان میں قائم کئے تھے اپنے طلبا کی محدود تعداد میں نئی زندگی کی امنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور پھر اُن طلبا کے ذریعہ سے ملک کے دور دراز حصوں پر اثر پذیر ہو رہے تھے۔

۱۸۵۵ء میں امریکہ نے سب سے پہلا سفیر ٹاؤن سینڈ ہیرس جاپان بھیجا۔ اس اہم واقعے نے اُن خیالات کو جن کی ایک عرصے سے آہستہ آہستہ پرورش ہو رہی تھی یکایک بڑے شدومد سے ابھارا، اور جاپانی قوم پرستوں نے سمجھ لیا کہ قومی زندگی اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے بیرونی دنیا کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ اسی سال غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک سرکاری مدرسہ کی بنیاد پڑی۔

۱۸۵۸ء جاپان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی سال امریکہ اور یورپ کی تمام دولِ عظمیٰ نے جاپان کے ساتھ سیاسی معاہدے کئے اور جاپان کی بندرگاہیں تمام دنیا کے ساتھ تجارت کے لئے کھول دی گئیں۔ جاپان کی نئی زندگی اور موجودہ طاقت کے دور کا آغاز اسی واقعۂ عظیم سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد جاپانی طلبا جوق جوق بغرضِ اکتسابِ علوم و

فنون امریکہ اور یورپ جانے لگے اور خود ملک میں غیر زبانوں کے سیکھنے سکھانے کی انتہائی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۷۵ء میں ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز (درسگاہ السنۂ غیر ملکی) قائم کیا گیا۔ مگر خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر ۱۸۸۵ء میں یہ مدرسہ بند کر دیا گیا، اور اس کے طلبا ٹوکیو کمرشل اسکول اور امپیریل یونیورسٹی میں داخل کر دیئے گئے۔

۱۸۸۷ء میں کمرشل ہائی اسکول قائم ہوا، اور ۱۸۹۷ء میں اسی کمرشل اسکول کی ایک شاخ پھر السنۂ غیر ملکی کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی

بالآخر ۱۸۹۹ء میں ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز (درس گاہِ السنۂ غیر ملکی) نے دوسری بار جنم لیا، اور آج تک قائم ہے۔

اپنی گزشتہ سی ویک سالہ زندگی میں یہ درس گاہ نہایت کامیابی کے ساتھ شاندار قومی خدمت انجام دیتی رہی ہے۔ اس وقت چھ ہزار دو سو اسی گریجویٹ اس مدرسے کے مختلف شعبوں سے کامیاب ہو کر نکل چکے ہیں، اور ممالکِ غیر میں تجارت زراعت یا دیگر باعزت اور مفید پیشوں میں مصروف ہیں، اور آٹھ سو دس طلبا اس وقت زیرِ تعلیم ہیں۔ فی الحال مندرجہ ذیل غیر ملکی زبانیں سکھائی جاتی ہیں:۔

انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، ہسپانوی، چینی، روسی، پرتگیزی، منگولی، ملایا اور اُردو۔ ان میں سے اول الذکر چھ زبانوں کے لئے طلبا کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے۔ روسی جماعت میں ۲۷ طالب علم ہیں، اور باقی چار زبانوں کے لئے طلبا کی تعداد ۲۳ اور ۳۳ کے درمیان ہے۔ مڈل سکول کا ہشت سالہ نصاب ختم کرنے کے بعد طلبا اس مدرسہ کے داخلہ کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اس میں کامیابی کے بعد وہ اس مدرسے میں داخل کئے جاتے ہیں۔ مدرسے کا نصاب چہار سالہ ہے اس لئے ہر زبان کی چار چار جماعتیں ہیں۔ ایک غیر ملکی زبان کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے جاپانی علم ادب تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، جاپانی قانون اور بین الاقوامی قانون بھی پڑھنا لازمی ہیں۔

ظاہر ہے کہ تقریباً ایک ہزار طلبا کو اتنی مختلف زبانیں اور دیگر مضامین کی تعلیم دینے کے لئے ایک وسیع عمارت کی ضرورت ہوگی۔ ۱۹۲۳ء تک مدرسے کے پاس ایک عالی شان عمارت تھی مگر زلزلۂ عظیم میں منہدم ہو گئی۔ اس وقت سے اب تک مدرسہ لکڑی کی عارضی عمارت میں ہے۔ عنقریب ایک بیش قیمت سنگین عمارت اس کے لئے تعمیر کی جائے گی۔

تمام عمارت میں سب سے زیادہ دلچسپ مقام وہ ہال ہے جس میں پروفیسر صاحبان خالی وقت میں آرام کرتے ہیں۔ یہاں دنیا کی تقریباً تمام مہذب زبانوں کے علما نظر آتے ہیں۔ یورپ کی تقریباً تمام زبانیں بولی جاتی ہیں، اور مختلف ممالک کے نمائندوں

سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا ہے۔

مدرسے کے پرنسپل جن کو یہاں ڈائرکٹر کہتے ہیں مسٹر جنجی ناگایا ہیں۔ ان کے ماتحت اٹھارہ غیر ملکی پروفیسر ہیں اور تراسی جاپانی پروفیسر یعنی علاوہ ڈائرکٹر صاحب کے (جو تعلیم نہیں دیتے) ٹیچنگ اسٹاف کے ایک سو ایک ممبر ہیں۔ ۲۸ کلرک ایک سکرٹری کے ماتحت ہیں۔ لائبریرین اور اس کا اسٹاف جداگانہ ہے۔ مدرسہ کا سالانہ خرچ تین لاکھ دس ہزار ین یا تقریباً چار لاکھ روپیہ ہے۔ اور اس کا رتبہ یونیورسٹی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے حال ہی میں اسی کی ایک شاخ اُساکا میں بھی کھولی گئی ہے جس میں موجودہ تعدادِ طلبا پانچ سو سے کچھ کم ہے۔

اگرچہ مدرسے کا بورڈنگ ہوس موجود ہے، مگر بیشتر طلبا قیام کے لئے خود اپنا انتظام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

طلبا ایک ماہوار میگزین شائع کرتے ہیں۔ ہر زبان کے لئے علیحدہ علیحدہ ادبی انجمنیں قائم ہیں جن میں طلبا بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ ہر سال نومبر میں ہر زبان کے طلبا اپنی اپنی زبانوں میں علیحدہ علیحدہ ڈراما کھیلتے ہیں۔

طلبا کھیلوں میں بھی بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ کرکٹ اور ہاکی کا تو جاپان میں قطعاً رواج نہیں مگر فٹ بال، والی بال، بیس بال، باسکٹ بال، پنگ پانگ، جاپانی کھیلوں، کشتی رانی اور تیراکی کی باقاعدہ ٹیمیں ہیں، جو ہر سال ٹوکیو کی مختلف یونیورسٹیوں کی ٹیموں سے مقابلہ کرتی ہیں۔ فوجی تعلیم بھی لازمی ہے۔

یہاں اکثر پروفیسر صاحبان مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی غیر ملکی زبانیں سکھانے والے مدارس ہیں اور مجھے شرمندہ ہو کر نفی میں جواب دینا پڑتا ہے۔ اُس وقت دل میں ایک درد اُٹھتا ہے کہ حیف ہمارا ہندوستان ایک ایسی مفید انسٹی ٹیوشن سے اب تک محروم ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ہر صوبے ہر یونیورسٹی میں ایک ایسی درس گاہ کی ضرورت ہے۔ مگر یہ نہ سہی تو کم از کم سارے ملک کے لئے ایک یونیورسٹی ہی ایسی قائم ہو جائے تو بہت کچھ فائدہ ملک و ملت کو پہنچ سکتا ہے۔

محمد بدر الاسلام فضلی

حکومت کا پہلا مقصد تعلیم عامہ ہونا چاہئے۔

یا لوگوں کو بالکل اندھیرے میں رکھو اور یا پھر اگر تم سچائی کے پیرو ہو تو بہتر ہے کہ انہیں پوری روشنی میں لے چلو۔

گلیچیں

درسِ عمل

نگاہِ آدمیت کو عمل کا درس دیتا ہے
یہ اک رقصِ مسلسل ہے جو بجلی کے شراروں میں

تڑپ اُٹھے نہ کیوں خوابیدگیِ احساسِ انساں کی
لہک ہوتی ہے جب پیدا ہوا سے سبزہ زاروں میں

جمودِ رُوح کو دیتی ہے اک پیغامِ بیداری
یہ لرزش تابشوں کی جو نظر آتی ہے تاروں میں

بتاتے ہیں عمل کا نام ہے معراجِ آزادی
کلیلیں کرتے پھرتے ہیں ہرن جو کوہساروں میں

سمیٹا ہے عمل کے موتیوں کو جب سے دامن میں
اُسی دن سے روانی آگئی ہے آبشاروں میں

یہ سب کیا ہے عمل کے بادلوں کی اک نوازش ہے
نظر آتی ہے شادابی جو دنیا کی بہاروں میں

نمودِ ہستیٔ انساں عمل کی ایک صورت ہے
عمل وہ شے ہے جس کی ساری دنیا کو ضرورت ہے

عمل سے ہی فقط جذبات کی تقدیس ہوتی ہے
عمل تدوین کرتا ہے خیالاتِ پریشاں کی

عمل کی بجلیوں میں تابشیں ہستی کی مُضمر ہیں
عمل پر ہے، عمل پر منحصر معراج انساں کی

تمنا کی شفق میں رنگ آمیزی عمل کی ہے
عمل کے دم سے ہیں ساری بہاریں صبحِ ارماں کی

عمل وہ چیز ہے جو یاس کا بطلان کرتی ہے
عمل ہی ہاتھ میں دیتا ہے باگیں رخشِ امکاں کی

عمل سے ہو گیا مغرب کا پلّہ کس قدر بھاری
عمل نے سطح کتنی مرتفع کر دی ہے جاپاں کی

اُٹھ اور ہر سانس سے اک محشرِ خاموش پیدا کر
سکوتِ زندگی کو توڑ غافل فکرِ فردا کر

منظور حسین ماہر القادری

اِنتہا

کونٹ لارمیرین نے ایک اعلیٰ درجے کا لباس زیب تن کیا، ایک چھلکتی ہوئی نگاہ سامنے بڑے سے آئینے پر ڈالی جس کی سطح کا اکثر حصّہ اُس کی مختلف پوشاکوں سے ڈھکا ہوا تھا اور مسکرا دیا۔ اگرچہ اُس کے بال اپنا رنگ قریب قریب بدل چکے تھے لیکن پھر بھی "ایک خوبصورت آدمی" جیسے الفاظ کا اطلاق اس پر ہوسکتا تھا۔ نازک جسم، کشیدہ قامت اور چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں جو اس کے حسین ہونے میں مخل نہ ہوتی تھیں، تمکنت، نمایاں شخصیت گویا قطعِ نظر دولت کے باقی وہ تمام باتیں جو ایک آدمی کو دوسرے پر فوقیت دے سکتی ہیں اسے میسّر تھیں۔

"بوڑھے لارمیرین میں ابھی کچھ زندگی ہے!" اُس نے زیرِ لب کہا اور اپنے دارالمطالعہ کی طرف چل دیا جہاں کچھ خطوط اس کی توجہ کے منتظر تھے۔

اُس کی صاف ستھری میز پر جس کی صفائی میں کوئی شخص غلطی نہیں نکال سکتا تھا اور جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا کم وبیش ایک درجن خطوط اور تین سیاسی اخبارات پڑے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی اک ذراسی جنبش کے ساتھ اُس نے سب چٹھیاں پنکھے کے سامنے یُوں پھیلا دیں جیسے کوئی تاش کا ماہر آپ کے سامنے ایک پتا چننے کے لئے ساری تاش بکھیر دے، اور دستخط کو پڑھنے اور اندازِ تحریر کو پہچاننے کے لئے اپنی اُس تمام قابلیت سے کام لیا جو اُسے ہر روز لفافے چاک کرکے پڑھنے سے پیشتر بروئے کار لانی پڑتی تھی۔ یہ لمحہ اُس کے لئے غیر معمولی تجسس وتفحص کا لمحہ ہوتا جس میں اُسے اپنی لامحدود عقل ودانش کا احساس ہُوا کرتا تھا۔ یہ سربمہر کاغذات اس کے پاس کیا خبر لائے تھے، کیا خوشی، امید یا مایُوسی ان میں پنہاں تھی، ان سب باتوں کا اُس نے ایک سرسری نگاہ سے اندازہ لگا لیا۔ پھر اپنے خیال کے مطابق اندازِ تحریر میں فرق قائم کرکے اُن کو دو یا تین ڈھیریوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ڈھیری میں اُس نے اپنے دوستوں کی چٹھیاں رکھیں دوسری میں صرف شناساؤں کی اور تیسری میں اُن لوگوں کی جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس تیسرے طبقے کے ناآشنا لوگ اسے ہمیشہ دق رکھتے تھے۔ اُن میں کئی قسم کے دستخط ہوتے تھے جو اپنے لکھنے والے کی ذہنیت واخلاق کے عجیب عجیب اثرات اور پرتو اُس کے دماغ پر ڈالتے تھے۔

علی الخصوص اُس دن ایک عجیب خط نے اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ سادہ طرزِ تحریر راقم کے اخلاق کا

قطعاً کوئی مظاہرہ نہ کرتی تھی، لیکن پھر بھی اُس کی بے قرار نگاہیں اس پر سے نہ ہٹتی تھیں۔ اور اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ "یہ کس کی طرف سے ہوسکتا ہے؟" اُس نے اپنے دل میں سوال کیا۔ میری نگاہیں اندازِ تحریر سے یقینی طور پر بخوبی آشنا ہیں۔ لیکن میں اسے کسی ڈھیری میں جگہ نہیں دے سکتا!"

اُس نے لفافہ نہایت احتیاط سے دو انگلیوں میں اٹھا کر شمع کے سامنے کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے کھولنے کا مصمم ارادہ کرلے اُس کی نگاہیں لفافے کو چیر چیر کر اُس کے ملفوف کے مضمون کو پڑھ لینے کی ناکام کوشش کرتی رہیں۔

پھر ناک کو سکوڑتے ہوئے اُس نے دستخط کو اور واضح طور پر پہچاننے کے لئے خوردبین اُٹھائی۔ حیرت و استعجاب کی ایک عجیب کیفیت اس پر طاری تھی۔ "یہ کون ہوسکتا ہے؟ دستخط کو میں خوب جانتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ بلکہ بالعموم یہ دستخط پڑھا ہے لیکن شاید بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ کس شیطان کی طرف سے ہے یہ؟ آخر! کوئی روپیہ مانگتا ہوگا۔ بے شک!!"

اُس نے لفافہ چاک کر دیا اور خط نکال کر پڑھا:-

پیارے دوست

اس میں شک نہیں کہ تم مجھے بالکل بھول چکے ہوگے کیونکہ پچیس سال سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اُن دنوں میں جوان تھی اور اب میں بوڑھی ہوں۔ جب میں نے تم سے وداعی سلام کہا تھا اُس وقت میں اپنے شوہر، اپنے معمر شوہر کی زوجیت میں جانے کے لئے پیرس سے رخصت ہو رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ تم اُسے "سوہانِ روح" کہا کرتے تھے۔ اُسے مرے آج پانچ سال ہونے کو آئے ہیں۔ اب میں اپنی لڑکی کی شادی کرنے کے لئے واپس پیرس آرہی ہوں۔ ہاں! میری ایک بیٹی ہے ——— ایک اٹھارہ سالہ دوشیزہ! جسے تم نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے اُس کی پیدائش کی اطلاع تمہیں دی تھی مگر یہ حقیر سا واقعہ تمہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکا۔

تم ابھی وہی خوبصورت لاربیرین ہو؟ لوگ مجھے تمہارے متعلق یہی سناتے ہیں۔ کیا تمہیں وہ چھوٹی لائیز یاد ہے جسے تم فرطِ محبت سے "لزن" کہا کرتے تھے؟ ——— ہاں اور کیا آج رات کے کھانے میں تم اُس کے ساتھ شریک ہوسکو گے؟ وہ ابھی تک تمہاری اُسی طرح مخلص دوست ہے اگرچہ بیرن ڈی وینس کی بیوی رہ چکی ہے اور اب بیرونس ڈی وینس ہے لیکن اب پھر وہ اپنا مضطرب ہاتھ

جس پر تم کبھی بوسہ دیا کرتے تھے تمہارے سامنے پیش کرتی ہے لیکن اب تم اس کے ساتھ صرف مصافحہ کر سکتے ہو۔

لائیزڈی وینس

لارمیرین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خط کو گھٹنوں پر رکھ کر وہ اپنی آرام کرسی میں بغیر کسی مقصد کے ٹکٹکی باندھے ہوئے بالکل بے حرکت بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ گزرے ہوئے دنوں کی تلخکامیوں میں اتنا کھو گیا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اگر اس نے اپنی زندگی میں کسی سے محبت کی تھی تو وہ صرف حسین لائیز تھی، لائیزڈی وینس جس کے خوشرنگ بالوں اور گہری بھوری آنکھوں کے باعث وہ اسے "لالۂ صحرا" کہا کرتا تھا۔ اس حسین اور نازک لائیز کی شادی اُس بھونڈی شکل والے نقرمی بیرن سے ہوگئی تھی جو اُسے کسی دوسرے صوبے میں اس کے دوستوں سے کہیں دور لے گیا تھا۔

لارمیرین نے اس سے محبت کی تھی اور اُس نے سمجھا تھا کہ وہ بھی اسے ضرور چاہتی ہوگی۔ وہ اسے بے تکلفی اور پیار سے "جیکولیٹ" کہا کرتی تھی اور کتنے پُر نزاکت لہجہ میں وہ یہ کہا کرتی تھی۔

ہزاروں مسرور اور بھولے بسرے لمحات کی یاد اس کی متخیلہ پر چھا گئی اور اُس کا دل اک عجیب پُرملال کیفیت سے بھر آیا۔ ایک شام رقص کے بعد وہ اُس کے گھر تک ساتھ آئی تھی اور وہ دیر تک بالس ڈی بولون میں ٹہلتے رہے تھے لائیز اپنی رقص کی نفیس پوشاک زیبِ تن کئے ہوئے تھی اور لارمیرین اپنے بیش قیمت لباس میں تھا۔ یہ بہار کی ایک دل افزا رات تھی۔ لائیز کے لباس کی ہلکی خوشبو پُرسکون ہوا میں تیر رہی تھی ـــــ اُس کے لباس کی خوشبو اور شاید تھوڑی سے اُس کے جسم کی بھی! کیا ہی رات تھی! لیکن جب وہ جھیل کے کنارے پر پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ چاند کی زریں شعاعیں درختوں کی ٹہنیوں میں سے گذر گذر کر پانی کی سطح پر ارتعاش پیدا کر رہی ہیں تو لائیز ڈر کر سہم گئی تھی اور ایک ہلکی سی چیخ اُس کے ہونٹوں سے نکل گئی تھی۔ لارمیرین نے اس کی وجہ پوچھی تھی تو اُس نے جواب دیا تھا "میں نہیں جانتی یہ پانی اور چاند کا دلفریب نظارہ تھا جس سے میں کسی قدر مرعوب ہوگئی تھی یا کچھ اور مگر جب کبھی میں کوئی غیر معمولی طور پر حسین و پُرکیف نظارہ دیکھتی ہوں میری ضرور چیخ نکل جاتی ہے"۔

لارمیرین نے، اگرچہ خود اس کا اپنا دل بھی کسی نامعلوم کیفیت کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اس پر، یہ خیال کرتے ہوئے کہ عورتیں بعض اوقات کس درجہ بھولی اور پیاری ہوجاتی ہیں، مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ اُسے بالخصوص اِس نظارے میں اس قسم کا اثر پیدا کرنے کی کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے اسے چوم لیا تھا اور کہا تھا۔

"میری پیاری بھولی لائیز! تم بہت حسین ہو"

یہ سب واقعہ کس قدر دلکش مگر مختصر تھا۔ مگر آہ یہ پھول! جب یہ اپنے عین عالمِ شباب میں لہلہا رہا تھا بیرن کی انتہائی بے دردی نے اُسے توڑ لیا اور اُس کی مسحور کُن خوشبو سے دنیا کو قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔

لارمیرن اُسے بھول چکا تھا —— فی الواقع وہ اُسے بھول چکا تھا —— کیونکہ اُس کے جانے کے دو یا تین ہفتوں کے بعد دنیوی مصروفیتوں نے اُسے اس یاد کو تازہ رکھنے کا موقع بہت کم دیا تھا۔ پیرس میں اگر تم نوجوان ہو تو تم دیکھو گے کہ جنسِ لطیف میں ایک سے بڑھ کر ایک کا حسن تمہارے زہد کو توڑ کر رکھ دینے کے لئے ناکافی نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ لارمیرن کے دل میں ابھی تک ایک مقدس گوشہ ایسا تھا جس میں اُس کی "لزن" کی محبت بیتاب رہتی تھی۔ کیونکہ اُس کے جانے کے بعد اُس نے کسی عورت سے کبھی محبت نہیں کی تھی۔

یہ اُس نے مکمل طور پر صرف اس وقت محسوس کیا۔

وہ اُٹھا اور اونچی آواز میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا "ہاں، میں آج رات ضرور جاؤں گا اور اُس کے ساتھ کھانے میں شریک ہونگا" یکایک وہ آئینے کی طرف لپکا اور سر سے لے کر پاؤں تک اپنا جائزہ لینے لگا "وہ مجھ سے زیادہ بُوڑھی ہو چکی ہوگی" اُس نے سوچا، اور اس خیال پر بہت دیر تک مسرور ہو کر سوچتا رہا کہ وہ اسے ابھی تک جوان اور خوبصورت دیکھ کر کس قدر خوش ہوگی اور اِس سے شاید اُس کا دل لرز جائے گا۔ اور اُن دنوں کے افسوس میں اُس کے سینے سے اک آہ نکل جائے گی جنہیں گذرے اب مدت ہو چکی ہے —— اک طویل مدت!

اُس نے باقی ماندہ خطوط اُٹھائے مگر اُن میں کوئی ضروری بات نہ تھی۔

سارا دن وہ اَور کچھ نہ کر سکا بلکہ صرف لائیز کی یاد کو اپنے دل میں ہیرا تا رہا۔ وہ اب کیسی ہوگی؟ پچیس سال کا عرصہ گذرنے کے بعد اُن کی ملاقات کیسی عجیب ہوگی! کیا وہ اُسے پہچان لے گی؟

لباس پہنتے وقت اُس نے ہر گام پر عورتوں کے پسند ناپسند کو خاص اہتمام سے مدِّ نظر رکھا۔ سفید واسکٹ پہنی جو اُس کے باقی لباس کے ساتھ نہایت موزوں اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔ بال بنوانے کے لئے حجام کو بلوا بھیجا —— ابھی تک اُس کے سر کے بال نہایت خوشنما تھے —— اور ملاقات کے اشتیاق میں وہ پیش از وقت گھر سے چلدیا۔

لائیز کے نئے آراستہ دیوانخانے میں سب سے پہلی چیز جس پر اُس کی نگاہ پڑی اُس کی اپنی تصویر تھی —— ایک

پرانی سی بے رنگ عکسی تصویر! جو اس کی جوانی کی حسین فتوحات کی یاد تازہ کر رہی تھی —— یہ سامنے دیوار پر ریشم کی ایک پرانی چوکھٹ میں لٹک رہی تھی۔

وہ چپکے سے بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے پیچھے ایک دروازہ کھلا۔ لارمیرین اچک کر اُٹھ کھڑا ہؤا اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے سفید بالوں والی ایک بڑھیا کھڑی تھی جس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا رکھے تھے۔ لارمیرین نے اُنہیں پکڑ لیا، یکے بعد دیگرے بوسہ دیا اور پیچھے ہٹ کر دیر تک پُرشوق و پُرآرزو نگاہوں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

وہ بے شک ایک بوڑھی عورت تھی۔ ایک ایسی بُوڑھی عورت جسے وہ نہیں جانتا تھا اور جو بظاہر اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

اُس نے بیتاب ہو کر سوال کیا۔ "یہ تم ہو لائیز؟"

"ہاں!" اُس نے جواب دیا۔ "یہ میں ہوں .... تم مجھے پہچان نہیں سکے۔ کیوں؟ آہ! مجھے بے حد تکلیفیں رہی ہیں —— بہت تکلیفیں۔ میری زندگی سوائے دکھ اور مصیبت کے اور کچھ نہیں رہی۔ اور اب میں ایسی ہوں جیسی کہ تمہارے سامنے کھڑی ہوں! ذرا میری طرف دیکھو تو سہی —— نہیں نہیں، میرا مطلب ہے، اب میری طرف کیا دیکھتے ہو، مت دیکھو .... مگر تم ابھی تک کیسے جوان اور خوبصورت ہو۔ اگر میں اتفاق سے تمہیں کہیں بازار میں دیکھ پاتی تو میں فوراً پکار اُٹھتی "جیکولیٹ!" ......"

"اب آؤ بیٹھ جاؤ اور باتیں کریں۔ پھر میں اپنی بچّی کو بلاؤں گی —— اپنی نوجوان بیٹی کو۔ تم دیکھو گے کہ وہ کس قدر میری مانند ہے یا میں کس قدر اُس کی مانند تھی۔ نہیں، یہ بھی قطعی درست نہیں۔ تم دیکھو گے کہ وہ اُس گذرے ہوئے زمانے کی "میں" ہوں۔ مجھے صرف یہ فکر تھا کہ ہم دونوں یہ ملاقات شروع کرتے وقت ذرا تنہائی سی محسوس کریں گے اور مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس کا صدمہ شروع شروع میں کچھ بہت زیادہ ہوگا۔ مگر اب یہ اندیشہ ختم ہو چکا ہے .... بیٹھ جاؤ میرے پیارے دوست!"

وہ اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اُس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مگر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قوتِ گویائی اس میں سے سلب کر لی گئی ہے۔ یہ عورت اُس کے لئے ایک اجنبی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس گھر میں بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ کس موضوع پر وہ کوئی بات کرے؟ کیا گزرے ہوئے زمانے کا موضوع درست نہ تھا؟ اس کے اور لائیز کے درمیان کسی گذرے ہوئے زمانے میں کیا کیا کچھ ہو چکا تھا؟ اُس کے معمر غم زدہ اور

متفکر و متردد چہرے کو دیکھ کر اُسے کوئی بات یاد نہ آتی تھی۔ اس وقت وہ اپنی چشم تصور کے سامنے کسی ایسی کیف آور یا متاثر کر دینے والی یاد کو نہ لا سکتا تھا جو بالعموم اپنی لزن کا دھندلا سا تصور کرتے وقت، اپنے بھولے بھالے "لالۂ صحرا" کا تصور کرتے وقت دماغ سے گذر کر اُس کے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی تھی۔ اُس لائیز کو اب کیا ہو گیا تھا ——— اُس لائیز کو جس سے اُس نے محبت کی تھی، اُس کی دور افتادہ خوابوں کی لائیز کو، بھوری آنکھوں اور سنہری بالوں والی حسین لڑکی کو جو نہایت پیارے اور دلکش انداز میں اُسے "جیکولیٹ" کہا کرتی تھی اب کیا ہو گیا تھا؟

دونوں پہلو بہ پہلو بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کے دلوں کا سکون بے قراری اور ہیجان میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی کبھی مشکل سے کسی کی زبان سے کوئی غیر ضروری اور معمولی سا لفظ نکل کر اُن کے سکوت کو توڑ دیتا تھا۔ اتنے میں لائیز نے اُٹھ کر گھنٹی بجائی۔

"میں رینی کو بلاتی ہوں"، اُس نے کہا۔

دفعتہً دروازہ کھلا، ہوا میں کسی کے لباس کی سرسراہٹ ہوئی اور اک نہایت شیریں اور دلکش نوجوان آواز سنائی دی۔

"میں آگئی ہوں، اماں!"

لارمیرین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا جیسے اُس نے کوئی روح دیکھ پائی ہو۔ لیکن اُس نے لڑکھڑاتے ہوئے لفظوں میں فرانس کی اس دوشیزہ کو شام کا سلام کہنے کی جرات کی اور پھر بے تابی سے اُس کی ماں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔

"یہ تم ہو، لائیز؟"

حقیقت میں یہ گذرے ہوئے زمانے کی لائیز تھی جو اتنی طویل مدت غائب رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسی طرح تازہ و شگفتہ اور حسین و جمیل اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل اُسی طرح ہے جیسے پچیس سال ہوئے اُسے کوئی لے گیا تھا، سوائے اس کے کہ اب اُس کا شباب پہلے سے زیادہ کھلا ہوا تھا اور اس کی تازگی و رعنائی پہلے سے زیادہ مسحور کن تھی۔

لارمیرین کو اک دیوانہ خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اُسے باہیں پھیلا کر اپنی آغوش میں لے لے اور کہے "لزن پیاری تم آگئی ہو" لیکن نوکر نے "محترم خاتون کھانا تیار ہے" کہہ کر اُس کے خیالات کا شیرازہ بکھیر دیا، اور وہ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

کھانے کے دوران میں کیا ہوگا؟ اسے کیا کچھ کہنا ہے؟ وہ اُن کے سوالوں کا جواب کیسے دیگا؟ وہ ان خیالات کے جال میں پھنس گیا جو دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے جب وہ ان عورتوں کی طرف دیکھتا تھا تو ایک سوال رہ رہ کر اُس کی مصروف متخیلہ کو عذاب دیتا تھا، وہ سوال جس نے اس کے دماغی قوی کو سست کر دیا تھا: "اِن دو میں سے اصلی لائیز کونسی ہے؟"

اُس کی ماں مسکرا مسکرا کر برابر پوچھے جا رہی تھی "تمہیں یاد ہے........؟"

لازبرین اس نوجوان حسینہ کی روشن آنکھوں میں اپنے عہد گذشتہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس بوڑھی سفید سر والی خاتون کا دھوکا کھا کر جس کی آنکھیں اک عجیب کمزور و ناتوان انداز سے اس پر گڑی ہوئی تھیں بیسیوں مرتبہ اُس کے ہونٹوں میں یہ کہنے کے لئے حرکت پیدا ہوئی "تم بھول چکی ہو لزان!...... تم بھول چکی ہو!"

بعض اوقات ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے خیالوں میں اس قدر کھو جاتا کہ اُسے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ یہ لائیز بالکل وہ لائیز نہ تھی جس سے وہ اپنے عہدِ شباب میں محبت کیا کرتا تھا۔ بوڑھی لائیز کی آنکھوں میں پھر بھی ایامِ رفتہ کی تھوڑی سی یاد ابھی باقی تھی جو اُس کے چہرے پر بلکہ از سر تا پا پر چھا رہی تھی۔ وہ بے انتہا کوشش کرتا رہا کہ اپنی پرانی محبوبہ کو اپنے پردۂ خیال پر اتارے اور اُن نقوش اور خط و خال میں ایک مرتبہ پھر زندگی اور تازگی بھر دے جو فطرت کی ستم ظریف قلمکاری نے اس سامنے بیٹھی ہوئی دوشیزہ میں نظر انداز کر دیئے تھے۔

بیروسن نے کہا "تم اس وقت بہت ناخوش معلوم ہوتے ہو میرے غریب دوست!"

"ہاں!" اُس نے آہستہ سے جواب دیا "میں چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ ناخوش نہ ہوں"

لیکن اس کے دل کی کسی پوشیدہ تنہائی میں اُس کی سوئی ہوئی محبت پھر بیدار ہو رہی تھی۔ یہ بالکل اُس وحشی درندے کی طرح تھی جو دانت دکھا دکھا کر محسوسات کو زخمی کرتا ہے۔

لڑکی باتیں کرتی رہی اور کبھی کبھی وہی الحان اور موسیقی اُس کی گفتار میں پیدا ہو جاتی اور وہی لفظ اُس کی زبان سے نکلتے جو کسی زمانے میں اُس کی ماں دلبرانہ انداز میں اپنی زبان سے نکالا کرتی تھی اور جواب اُس نے اپنی بیٹی کو استعمال کے لئے دے دیئے تھے۔ اُس کا باتیں کرنے اور سوچنے کا سلیقہ، وہ دماغی اور روحانی مناسبت جو عموماً دو شخصوں کے اکٹھے رہنے سے پیدا ہو جاتی ہے ایک ایسا کامیاب سحر تھا کہ لازبرین کے دل کو پیس پیس جاتا تھا اور اس کے اُبلتے ہوئے اور جوش کھاتے ہوئے جذبات پر تازیانے کا کام کرتا تھا۔

وہ وہاں سے جلد ہی رخصت ہوگیا اور سڑک کا چکر گھوم کر دور نکل گیا۔ مگر اس لڑکی کا تصور اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا

تھا، رہ رہ کر اُس کے دماغ کو تکلیف دیتا اور اُس کے دل کو اذیت پہنچاتا تھا اور اس کا گرم گرم خون جوش میں آ کر اُس کی رگوں میں اچھلتا تھا۔

اب اُس کے تصوّر میں دو کی بجائے صرف ایک عورت تھی۔ اُس کی اپنی نوجوان کھوئی ہوئی قابلِ پرستش لائیز جو اَب واپس آگئی تھی۔ اُس سے اب وہ اُسی طرح محبت کرتا تھا جیسے کسی گذرے ہوئے زمانے میں اُس نے کی تھی۔ اور اسے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا جذبۂ محبت اِن پچیس سالوں کے عرصۂ مفارقت میں بہت زیادہ مستحکم ہو گیا ہے۔

پھر یہ سوچنے کے لئے کہ اس عجیب و غریب اور ہیبت ناک ملاقات کے متعلق کیا کرنا چاہئے وہ گھر کی طرف مڑا۔ جب شمع ہاتھ میں لئے ہوئے، وہ آئینے کے سامنے سے گذرنے لگا جس میں باہر جانے سے پیشتر اُس نے اپنی بے حد تعریف کی تھی تو اسے اس میں دفعتہً ایک متوسط العمر بھورے بالوں والا شخص دکھائی دیا اور اسے عہدِ کہن کا وہ نوجوان اور خوبصورت لارمیرین یاد آگیا جو لائیز سے محبت کرتا تھا اور جس سے لائیز محبت کرتی تھی۔ پھر اُس نے شمع والا ہاتھ سامنے آئینے کی طرف بڑھا کر نہایت غور سے اپنا معائنہ کیا جیسے کوئی کسی نہایت عجیب چیز کو آتشی شیشے کے نیچے رکھ کر دیکھتا ہے۔ اُس نے اُن جھریوں کو گنا، اپنے چہرے کے نقوش کے اُن ویران کھنڈروں کو دیکھا جن پر آج سے پہلے اُس نے کبھی غور نہ کیا تھا۔

آخر کار کسی کھوئی ہوئی چیز سے مغلوب ہو کر وہ اپنے سامنے، اپنے اداس عکس کے سامنے بیٹھ گیا اور زیرِ لب کہا
"بس، اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے، لارمیرین!

ترجمہ **عبدالعزیز**

غزل

پس پردہ تجھے ہر بزم میں شامل سمجھتے ہیں
کوئی محفل ہو ہم اُس کو تری محفل سمجھتے ہیں

بڑے ہشیار ہیں وہ جن کو سب غافل سمجھتے ہیں
نظر پہچانتے ہیں وہ مزاجِ دل سمجھتے ہیں

مسیحائے جہاں ہے جس کو سب قاتل سمجھتے ہیں
مگر اس نکتۂ باریک کو عاقل سمجھتے ہیں

ہم اِس مُردہ دلی کو جانتے ہیں زندگی دل کی
ہم اس بے حاصلی کو عشق کا حاصل سمجھتے ہیں

سمجھتے ہیں ترے ملنے کو ہم بس تیری مرضی پر
نہ ہم آساں سمجھتے ہیں نہ ہم مشکل سمجھتے ہیں

سمجھتا ہے گنہ رندی کو تُو اے زاہدِ خود بیں
اور ایسے زہد کو ہم کفر میں داخل سمجھتے ہیں

ترے کوچے کا ہر جھونکا ہمیں اک روح ہے گویا
ترے کوچے کے ہر ذرّے کو ہم اک دل سمجھتے ہیں

میں وہ گم کردہ منزل ہوں کہ رہروِ راہِ الفت کے
مرے ہر نقشِ پا کو اپنی اک منزل سمجھتے ہیں

سڑی، دیوانہ، سودائی جو چاہے سو کہے دنیا
جو اہلِ دل ہیں وہ مجذوب کو عاقل سمجھتے ہیں

عزیز الحسن مجذوب

کلرک کے دس منٹ

(۱)

"جناب، میں اندر آسکتا ہوں؟" ....

یہ افسر لوگ بھی کتنے کائیاں ہوتے ہیں۔ فوراً تاڑ لیتے ہیں کہ درخواست کنندہ اُن کے عملے کا ہی کوئی آدمی ہے یا کوئی کہنہ مشق تو لب و لہجہ سے یہاں تک بھانپ لیتے ہیں کہ اگر اجنبی ہے تو کس رتبہ کا، اور کس قدر توجہ کا حقدار ہے۔ یہ ایک خطرناک تجربہ ہے، عام طور پہ کیا نہیں جاتا۔ اس لئے ہر اجنبی کی اس درخواست کا اندر سے ایک دم یہ جواب دیا جاتا ہے:

"چلے آئیے"

دو سال کی ملازمت کے عرصے میں موہن بابو اس سلوک کے خوب عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے جواب نہ ملنے سے اب اُن کی دلشکنی نہ ہوتی تھی۔ ایک بار جواب نہ ملتا تو تھوڑی دیر ٹھہر کر ہی صدا لگا لیا کرتے۔

کمبخت بارش کو بھی کلرکوں سے کچھ ایسی عداوت ہے کہ موسم برسات میں چھٹیاں خواہ دس ہوں روز کالی کالی چڑھ کر آتی ہے اور ٹل جاتی ہے۔ لیکن جس دن دفتر کھلنا ہو باوجود ان غریبوں کی پے در پے عاجزانہ دعاؤں کے ایک چھوٹی سی بدلی اُٹھ کر ٹھیک ساڑھے نو بجے اس زور سے برسنے لگتی ہے کہ آن کی آن میں گلیوں اور سڑکوں پر گھٹنے گھٹنے پانی ہو جاتا ہے۔ اور جونہیں ان بیچاروں نے شہر کے دروازے کے نیچے، بند دوکان کے اندر، خالی مکان کے برآمدے میں گھنے درخت کے سائے تلے پناہ لیتے، رکتے نکلتے، ٹھہرتے بھاگتے، بھیگتے بچتے، ہانپتے کانپتے دفتر کے اندر قدم رکھا فوراً ایک ایسے دشمن کی طرح جو انتقام لے چکنے کے بعد میدان میں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھتا ہو، فاتحانہ انداز سے اپنی لے بارش غائب اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

ابھی تک برآمدے کی چھت سے پانی کی بڑی بڑی بوندیں ٹپ ٹپ زمین پر گر رہی تھیں۔ دسمبر کی سنگدل آزار ٹھنڈی ہوا کے جھونکے برآمدے کے آگے لٹکتی ہوئی چکوں میں سے تیزی سے گزر کر موہن بابو کے پچیس سالہ مگر ناتوان جسم میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ اس آڑے وقت میں اس کا واحد محافظ ایک نیلی سرج کا کوٹ تھا جو کسی زمانہ

میں نیا ہوگا، لیکن اب مدت سے زائد المیعاد ہو چکا تھا، اور کثرتِ استعمال سے گھس گھس کر کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ بھی ان تازہ دم جنگجو تند مزاج حملہ آوروں کے مقابلے کی تاب نہ لا کر موہن کو اُس کی تقدیر پر چھوڑ کر ہتھیار ڈال بیٹھا تھا۔ اس نے نیا کوٹ ...... مگر یہ ایک طویل قصہ ہے۔ اور رنجدہ +

غریب کی ایک بیوی بھی تھی، اور ایک ننھا سا دو سال کا بچہ + ایک کلرک کی بیوی اور بچہ ہی سہی۔ آسودگی، افراط، اطمینان اور خوشی اُن کا حصہ نہیں نہ سہی، جینا تو ٹھہرا۔ پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا تو چاہئے۔ قلیل سی تنخواہ میں بیچارہ کیا کیا کرے ؟

ہر مہینے کی پندرہ بیس تاریخ سے یہ منصوبے باندھنا شروع کر دیتا کہ اب کی تنخواہ پر ایک کوٹ اپنا اور ایک جوڑا کملا کا، نہیں، ایک جوڑا کملا کا اور ایک کوٹ اپنا سلا ہی ڈالوں گا۔ مگر تنخواہ کیا آتی، گویا قیامت آتی۔ مہینے بھر کے سوئے سوئے قرضخواہ جاگ اُٹھتے۔ گنے گنائے چالیس ہاتھوں ہاتھ بٹ جاتے، پھر بھی کسی کے دو کسی کے چار کھڑے ہی رہتے تنخواہ سے تین چار دن پہلے اور تین چار دن بعد تک جان سولی پر ٹنگی رہتی۔ اسی فکر میں ہر وقت جان سوکھتی کہ اب کے عزت کیسے بچے گی۔ بیوی کے ننگے ہاتھ کان دیکھتا تو دل ہی دل میں کڑھتا۔ جوانی کے پہننے اوڑھنے کے دن، نئے نئے بیاہ کے لاڈ چاؤ، اور اُن کے حصّہ میں افلاس، تنگدستی، حسرت اور ارمان ...... افسوس!

مگر دل کے یہ جوش وہ ابال تھے جو برتن کے کنارے تک ہی آ کر رہ جائیں۔ یہ وہ آگ تھی جس کا دھواں نہ اٹھتا تھا۔ اس کی سفید پوشی اور تنہائی پسند طبیعت اُس کی ناداری اور تنگ کو عوام کی نکتہ چین نظروں سے چھپائے اور سفلہ طبیعت لوگوں کے ہلاکت کُن مضحکہ سے بچاتے ہوئے تھی۔ برابر کے پڑوسی کو بھی اُس کی مالی مشکلات کا کچھ علم نہ تھا۔ محلے والوں کی نگاہوں میں وہ ایک اچھا خاصہ درمیانہ حیثیت کا آدمی تھا۔ کوٹ خواہ ڈیڑھ درجن جگہوں سے پھٹا ہوا تھا مگر کاریگر کملا کی کارساز انگلیوں نے رفو اس کمال کا کیا تھا کہ دُور سے ایک چاک بھی نظر نہ آتا تھا۔ سوٹ خواہ ایک موسم میں صرف ایک ہی ہوتا لیکن ہر وقت اجلا اور صاف ستھرا۔ پتلون کی استری کسی خوش نصیب کی تقدیر کی طرح ہر وقت سیدھی اور ہموار بوٹ پر ہر وقت نئی پالش۔ غرض ایک بے پروا امیر کی بہ نسبت اس کا لباس بدرجہا بہتر ہوتا تھا + دفتر نہ جانا ہوتا تو باہر کم نکلتا تھا۔ مگر جب نکلتا تھا تو نہایت اچھی حالت میں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ...... مگر یہ اس کا ایک قیمتی اور پوشیدہ راز ہے عالمِ ناداری میں ظاہرداری کا ہنر اُس نے بھاری قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا۔

کسی زمانے میں اُس کی زندگی کی اس تاریک تصویر کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ یا یوں کہئے کہ اُس کی زندگی کی تصویر سنیما کی ایک ایسی فلم کی مانند تھی جس پر تاریکی اور روشنی یکے بعد دیگرے باری باری رونما ہوتی تھیں۔ مصیبتوں کی طوفانی

لہریں اور آفتوں کے قہر آلود ریلے اس کے دل کو ساحلِ سنگیں کی طرح جُوں کا توں چھوڑ جاتے تھے۔ دفتر کی تکلیفیں گویا افریقہ کے صحرائے اعظم کی گرم ریت کی آندھی اور قیامت کی رفتار سے چکر لگاتے ہوئے دیوقد بگولے تھے جو اسے ہڑپ کر لینے کی بے سود کوشش کرتے کرتے آگے نکل جاتے تھے اور فضا صاف ہونے پر وہ پھر صحیح و سالم اُٹھ بیٹھتا تھا۔ تقدیر کا مدوجزر ایک گزرتے ہوئے زلزلے کی طرح اُس کے صبر و سکون کو ایک لمحے سے زیادہ متزلزل نہ کرسکتا تھا۔

بیچارے کی قسمت تو روٹھ ہی گئی تھی، امید بھی دامن چھڑا لیتی تو کہاں ٹھکانا تھا۔ امید نے مسکرا کر کان میں یہ دو چار لفظ پھونک دئیے "اب نہیں تو کیا ہوا کبھی تو ہوگا"۔ بس موہن بابو اتنے میں ہی خوش ہوگئے۔ وہ غیر معروف "کبھی" نزدیک ہے یا دُور، وہ زمانہ جلد آئے گا یا بدیر، اس بات کی پروا نہ تھی۔ کبھی نہ ہونے سے تو بدیر ہونا ہی بہتر تھا۔ صرف یہی اطمینان کافی تھا کہ "کبھی تو ہوگا" اس آس پر ملازمت کے ابتدائی زمانے میں چھٹیوں کے تمام دن آٹھ دستے کاغذوں کی ایک ضخیم کتاب کی شکم پُری کرنے میں صرف ہوا کرتے تھے۔ آپ کہیں گے روزنامچہ؟ نہیں، اس کا اسے شوق نہ تھا۔ اس بھاری کتاب میں متفرق اسبابِ خانہ داری کی متعدد فہرستیں، نئی نئی قسم کے فرنیچر اور آرائشی سامان کے خاکے اور قیمتیں، کملا کی ساڑھیوں، مخمل کمخواب اور زربفت کے جوڑوں کی لاگت کا تخمینہ، نئی نئی وضع کے زیوروں کے نقشے، ایک عالیشان کوٹھی کا خاکا، سیرِ کشمیر کا مکلف پروگرام، بنک میں ایک لاکھ روپے کے پندرہ سال کے سود در سود کا شمار......

مگر یہ ایک دو سال پہلے کی باتیں تھیں۔ اب تو امید کے دریادلی سے کئے ہوئے وعدے ایک ایک کرکے سب جھوٹے ثابت ہوتے جارہے تھے۔ اُس کے دکھائے ہوئے سبز باغ اُس کے نزدیک اب بچوں کو بہلانے کے کھلونوں سے بڑھ کر اہمیت نہ رکھتے تھے۔ امید پر اب اسے مطلق اعتقاد نہ تھا۔ اُس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک تھے۔ ممکن تھا کہ اُس کے دن کبھی نہ پھریں۔ کیا دنیا میں کروڑوں انسان عمر بھر مفلس اور قلاش رہ کر اسی حالت میں نہیں مرجاتے؟ تو پھر اس کے ساتھ امید نے کس بنا پر یہ وعدہ کیا تھا کہ "اب نہیں تو کیا ہوا کبھی تو ہوگا"۔ امید جھوٹی تھی۔ مکار تھی۔ قابلِ نفریں تھی!

دل کو ہر وقت یہی ادھیڑ بن رہے تو کام میں کیا خاک جی لگے۔ دفتر میں سرکاری کام کرتے کرتے خیال آیا کہ فلاں قرضخواہ کے چار روپے تو اس مہینے دئیے ہی نہیں گئے۔ وہ تو بڑا اوچھا ہے۔ ضرور مانگے گا۔ چار روپے۔ اب کہاں سے چار...... چار...... چار...... اب چار کا ہندسہ جو دل میں بسا کتاب میں آٹھ لکھنے تھے چار لکھ گیا۔ اگر خود ہی دیکھ لیا اور وہ غلطی درست کرلی تو خیر، اور جو وہ غلطی کہیں افسر نے پکڑ لی تو بس غضب ہی ہوگیا۔

دفتر میں افسروں کی جھاڑ جھپٹ۔ گھر میں ہزار دکھوں کا دکھ ناداری اور افلاس۔ دفتر کربلا سے بڑھ کر گھر دوزخ کا نمونہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ غرض ایسے غضب میں جان تھی کہ کوئی اَور سا ہوتا تو پاگل ہوجاتا رو رو کے مرجاتا۔

پھر کچھ حیرت نہیں اگر دو ہی سال کے عرصے میں موہن کے دل و دماغ میں عظیم تغیر آگیا تھا۔ قدرتی مناظر کی دلفریبیاں نونہالانِ چمن کا نوخیز جوبن، گلہائے خوش رنگ کا دلکش حسن یہ سب جو کبھی اُس کے دل کو مسحور کرتے اور اُس کے دماغ کو دیوانہ بناتے تھے اب اُسے متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تھے + بلبل کے روح فرسا نالے اور کوئل کی آہ و بکا سے اب اُس کا دل مغموم نہ ہوتا تھا۔ پپیہے کی "پی کہاں" اب اُس کے دل میں ولولہ اور جوش اور اُس کی طبیعت میں وحشت پیدا نہ کرتی تھی۔ "عاشق" اور "معشوق" اُس کے نزدیک مہمل الفاظ تھے۔ عشق جو کبھی اس کا مقصدِ زندگی تھا، ہاں اُسی عشق پر اب اُسے مطلق اعتقاد نہ تھا۔ اس کا دل جو ہر وقت شگفتہ رہتا تھا اب مرجھا چکا تھا۔ دنیا سے اب اُسے کوئی انس باقی نہ تھا۔ زندگی اُس کے لئے اب بالکل دلچسپی سے خالی تھی + وہ شاید اب صرف اس لئے زندہ تھا کہ پچیس سال کے طویل عرصے میں اسے ایک گونہ زندہ رہنے کی عادت سی ہوگئی تھی +

افسردگیٔ دل کا یہ عالم اور حافظے اور دماغ کی یہ کیفیت کہ کم گفتہ بہ ناگفتہ بہتر۔ حافظہ کبھی اس قدر قوی تھا کہ ایک بار کتاب دیکھ لی اور امتحان کے کمرے میں ورق کے ورق حرف بحرف اگل دیئے۔ اس کے دفتر میں داخلے کے لئے مقابلے کا نہایت سخت امتحان ہوا کرتا تھا جس میں ہر سال تین چار سو امیدوار قسمت آزمائی کیا کرتے تھے اور مشکل سے تیس چالیس کامیاب ہوتے تھے مگر ہمارا شیر بڑے بڑے لائق گریجویٹوں کو پچھاڑ کر ساڑھے تین سو امیدواروں میں دوم رہا تھا۔ دلائل اس قدر معقول اور تحریر اس زور کی تھی کہ اُس کے لکھے کو بڑے سے بڑا افسر بھی رد نہ کر سکتا تھا۔ مگر اب حافظے کا تو یہ حال ہے کہ میز کے نام کاغذ اٹھا اٹھا کر دیکھ لئے، دراز تک الٹ مارے اور قلم نہ ملا، پھر ناگاہ ہاتھ کی طرف جو نگاہ کی تو قلم ہاتھ میں موجود ہے۔ دماغ کا یہ حال ہے کہ ذرا سا زور دے کر کام کیا اور سر میں درد شروع ہوگیا۔ ذرا زیادہ نگاہ لگائی تو آنکھوں سے پانی کا دریا بہہ نکلا۔ رنگ زرد، آنکھیں دھنسی ہوئیں، گال پچکے ہوئے، چہرے پر مردنی، بدن سوکھ کر کانٹا۔ صحت اس قدر خراب کہ بدن ہڈیوں کا ڈھانچ۔ وہ بھی ہزاروں بیماریوں کا گھر۔ نزلہ ہے کہ دیرینہ قرضخواہ کی طرح ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ کمبخت موسمی بخار کو موسم بے موسم کچھ سوجھتا ہی نہیں، جب چاہتا ہے آدھمکتا ہے۔

عاجز آکر ایک بار ایک مہینے کی چھٹی کے لئے درخواست دی تھی۔ اس پر افسر نے لال پیلے ہو کر وہ آنکھیں دکھائیں وہ ڈانٹ بتائی کہ طبیعت بحال ہوگئی۔ پھر کبھی چھٹی کا نام نہیں لیا۔ اب مرتے ہیں اور اُف نہیں کرتے۔ صبح دس بجے سے جو کام شروع کیا۔ رات کے آٹھ بج گئے اور قلم نہ تھما۔ کسی کسی دن تو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ دھوپ کب ڈھلی، سورج کب غروب ہوا، اور چپڑاسی نے کس وقت بٹن دبایا اور لیمپ روشن کر دیا۔ اتنی محنت سے بی اے یا ایم اے کی تیاری کرتے تو لعلوں کے لعل بن جاتے۔ صوبہ بھر میں اول رہتے، ساری محنت سپھل جاتی۔ وہ قدر ہوتی کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔ اور یہاں؟ کام

اس قدر جان لیوا، اور اس کا بدلہ؟ تنخواہ! بے شک، مگر وہ تو لائق نالائق، اہل نا اہل سبھی کو ملتی ہے۔ دفتروں میں اس دوسری قسم کے آدمی سو میں ایک کم سو ہوتے ہیں۔ تو پھر ایک فی صدیوں کو ان کی خاص محنت کا صلہ؟ آپ کہیں گے افسروں کی شاباش، حوصلہ افزائی، انعام اکرام، تنخواہ اور عہدے میں ترقی .... تو یقیناً آپ کبھی کلرک نہیں رہے! آپ کسی کلرک سے پوچھیں وہ آپ کو بتائے گا کہ انعام اکرام اور شاباش کے لئے محنت اور لیاقت کی نہیں بلکہ ایک اور "ہنر" کی ضرورت ہے جو بدقسمتی سے موہن بابو نے نہ سیکھا تھا۔ دفتروں میں سب سے زیادہ قدر اُس آدمی کی ہوتی ہے جو سب سے زیادہ مکر کے فن میں طاق ہو۔ جو صبح دس بجے چار مثلیں لے کر بیٹھ جائے، تمام دن ان کے کاغذ الٹتا پلٹتا رہے، جب ہیڈ کلرک یا افسر کمرے میں آئے اپنی نگاہیں کاغذوں میں گاڑ دے اور مصروفیت کا ایسا سوانگ بھرے کہ افسر سر پر آن موجود ہوا اور ظاہر یہ ہو کہ دیکھا ہی نہیں۔ شام تک ایک دو مثلیں کسی اَور ساتھی کے گلے منڈھنے میں کامیاب ہو جائے اور کم از کم ایک موٹی سی مثل گھر جاتے ہوئے اپنے ساتھ اُٹھا کر لے جائے۔ لیکن یہ ہنر کچھ مشق کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اگر ذرا بھی خامی رہ جائے تو پول کھلنے کا بہت اندیشہ ہوتا ہے +

انعام اکرام اُن کے حصے میں آتے ہیں جو افسروں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ کیونکہ چھوٹے بڑے سبھی افسروں کو چند ایسے آدمی درکار ہوتے ہیں جو اُن کی جائز ناجائز، بجا بے جا بات پر "جی جناب" اور "جی حضور" کی رٹ لگاتے رہیں۔ گو اُن کی وقعت نہ ان کے ساتھیوں کے دلوں میں ہوتی ہے نہ افسروں کے نزدیک مگر انعام اکرام ان کو دل کھول کر دئیے جاتے ہیں اور کچھ بے وجہ نہیں۔ ضمیر ایک بیش بہا جنس ہے اور ضمیر فروشی ایک بیش بہا جنس کا بیوپار، تو قیمت بھی اچھی ہی اُٹھنی ٹھہری +

اور ترقی کے لئے ان دونوں میں سے کسی ہنر کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف گھس گھس کر پرانے ہوتے رہنے کی قیمت ہے۔ اور یہ کام حضرتِ وقت سب کے لئے بلا ان کے تردد کئے خود بخود کرتے رہتے ہیں۔

موہن بدقسمتی سے فنِ مکاری سے واقف تھا اور نہ خوشامد سے۔ اُس نے آتے ہی محنت اور دیانتداری سے کام شروع کر دیا۔ پہلے پہل دو چار ہفتے جتنا کام ملتا فوراً ختم کر ڈالتا + سرکار کے گھر میں کاہے کی کمی تھی۔ اگلا کام ختم ہو گیا تو اور بہت۔ ہیڈ کلرک نے بھانپ لیا کہ لڑکا ہے تیز اور چالاک اور ساتھ ہی سادہ لوح اور جہاں نادیدہ۔ بس پھر کیا تھا، حلوائی کی دکان اور داداجی کی فاتحہ + دماغ موہن بابو کا خرچ ہو، صحت اس کی خراب ہو، اور پرانے کلرکوں "مکر بازوں" اور "جی حضوریوں" کے ساتھ لحاظ ہیڈ کلرک صاحب کے چلیں۔ آج ایک کے سالے کے ہاں لڑکا پیدا ہو رہا ہے اور کل دوسرے کی بہن کی سگائی ہے۔ غرض نئے سورج نئے بہانے۔ ہر روز ایک دو غائب۔ مہینے ہی بھر کے اندر

باقی سب ساتھیوں کا تھوڑا تھوڑا کام اُن کے سر تھوپ دیا گیا۔ نیا نیا کام کرنے کا شوق جسم میں جوانی کا چھلکتا ہوا خون، شروع شروع میں تو کچھ معلوم نہ ہوا، مگر تا کجے؟ آخر اُن کی بے اعتدالیاں رنگ لانے لگیں۔ رفتہ رفتہ کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے کچھ بے قدری کے صدمے اور افسروں کی جھاڑ جھپٹ کے دل جلاوے سے صحت خراب ہو گئی۔ جس طرح مکڑی اپنے بنائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس جاتی ہے، وہ بھی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑا گیا۔ پچھلی بار بیمار ہوا تو کہیں ڈاکٹر نے ڈرا دیا کہ اگر کام میں کمی نہ ہوگی تو جلدی پاگل ہو جاؤ گے۔ گڑگڑا کر ہیڈ کلرک سے کہنے لگا کہ "صاحب کام بہت زیادہ ہے۔ کچھ کرم فرمائیے۔ مر رہا ہوں" تو اُس نے بگڑ کر فرمایا۔ کہ "یہاں جیتا کون ہے؟ کیا نام.... کس کے پاس کام نہیں؟ دو سال ہو گئے اور کام زیادہ نہ ہوا۔ اب بہانے بناتے ہو؟ باقی بھی تو کام کرتے ہیں کبھی کسی اور کو بھی شکایت کرتے سنا؟"

بھلے مانس سے کوئی پوچھے کہ باقی لوگ شکایت کیا کریں؟ بیکاری کی؟ یہ کہیں کہ صاحب جب سے موہن بابو آئے ہیں تھوڑا تھوڑا سب کا کام چھین لیا ہے۔ انصاف فرمائیے اور واپس دلا دیجئے؟ اندھے پن کے تو سو دارو، ایسے اندھے کا کوئی کیا کرے جو سوجھنے پر بھی نہ دیکھے؟

یہی نہیں، نیکی برباد گناہ لازم۔ دو تین آدمیوں کا اکیلے کام کریں تو احسان کس پر؟ اور جو اتنا کام کرتے کرتے بھولے سے کوئی غلطی ہو جائے تو بس شامت آ گئی۔ افسر کی لمبی زبان اور بے زبان موہن بابو کے بہرے کان + اب یہ زمانے بھر کے بے پروا بنائے جا رہے ہیں۔ ان سے بڑھ کر دفتر بھر میں نالائق نہیں۔ اور جو یہ صفائی میں زبان ہلایا چاہیں یا سر اٹھائیں تو نالائق تو تھے ہی، گستاخ قرار پائیں۔ اور جو کچھ سوچ کر چپ کھینچ جائیں تو ان کی عاجزانہ خموشی کو مجرمانہ خموشی گردانا جائے اور ان کی غلطی کا خاموش اعتراف سمجھا جائے۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے!

اب یہ اپنا غم کسے سنائیں؟ موہن بابو اس قسم کی زندگی سے تنگ آ گئے تھے۔ مگر بھاگ کر کہاں جاتے۔ اگر نوکری چھوڑ دیں تو کھائیں کیا؟

"صد حیف، جسے ہم نے دارو سمجھا وہی ہمارے حق میں زہر نکلا۔ موت سے بچنے کے لئے کام تلاش کیا اور کام کی زیادتی ہی اب موت کا باعث بن چلی" یہی خیال تھا جو موہن بابو کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ کمزور تھا، نحیف تھا، کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ سردی کی شدت سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اُس کا خون اُس کی رگوں میں جمتا جا رہا ہو۔ وہ زیادہ انتظار کرنے سے معذور تھا۔ سردی سے کانپتے کانپتے ایک بار آہستہ سے اُس نے پھر کہا:

"جناب، میں اندر آ سکتا ہوں؟"

(۲)

"جناب، میں اندر آ سکتا ہوں؟"

موہن کو ان لفظوں سے غلامی کی بُو آتی تھی۔ اس کے نزدیک ایسا پوچھنا گویا اپنی کمتری اور پستی کا ہر بار از سرِ نو دلآزار اعتراف، سخت گیری کے خلاف اپنے ضمیر کی بغاوت کی ایک مرتبہ اور بندش بندی، ادب آداب، قاعدے اور عزت کے ڈھکوسلے میں فرعونیت سے صلح، افسر کے ناجائز حکومت کے حق کو ایک بار پھر تسلیم کرنا، اپنی غلامانہ ذہنیت کو ایک درجہ اور پستی کی جانب دھکیلنا، سرِ تسلیم کی ایک بار پھر توہین کرنا اور "آ بیل مجھے مار" کے مصداق ایک بھلے چنگے نیک آدمی کو "نتھنے پھُولے منہ چڑھا ابرو پہ بل" بنانا تھا۔ اس کے زاویۂ نگاہ سے ایسا پوچھنا سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنے کے برابر تھا "حضور غلام حاضر ہے۔ دل میں آئے تو آنکھیں نکال نکال کر ڈرانے، گرج گرج کر دھمکانے اور رعب اور دبدبے کے مظاہرے کی شوق سے مجھ پر مشق کیجئے" ساتھ ہی دبی زبان میں یہ بھی کہنا "خداوند، گستاخی معاف، اتنا احسان کیجئے کہ یہ سب ذرا تنہائی میں"۔

کوئی پوچھے، آخر افسر کے کمرے میں جانے کے لئے اجازت کی ضرورت؟ کیا اس لئے کہ افسروں کے نازک مزاج کو کلرکوں کی موجودگی گوارا نہیں۔ یا اگر یہ روک تھام اُٹھا لی جائے تو ایرے غیرے سب کے سب کمرے میں جا گھسیں اور وہ شور و غل مچائیں، وہ طُوفانِ بدتمیزی بپا کریں کہ افسر کا ناک میں دم کر دیں۔ یا اس لئے کہ کبھی افسر کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو، اُس کا دماغ پوری طاقت سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، مشکل کا حل سوجھا ہی ہو، انتظام نے صورت دکھائی ہی ہو کہ کوئی کلرک رجسٹر لئے ہوئے جا دھمکے۔ سوجھی سجھائی تدبیر تتر بتر ہو جائے اور وہ ضروری فیصلہ ادھورا ہی رہ جائے اور پھر اگر یہی حادثہ بار بار پیش آتے تو افسر کے لئے کام کرنا ہی ناممکن ہو جائے؟

ان باتوں کے جواب میں موہن بابو سب کو یہی صلاح دیا کرتا کہ وہ صرف ایک مہینے کے لئے کسی دفتر میں شوقیہ کلرکی کریں، یا سرِ دست تجربہ کی خاطر بلا تنخواہ امیدواری ہی کریں۔ سب حقیقت خود بخود کھل جائے گی۔ اجی صاحب، ہجوم کے کیا معنی؟ دفتروں میں ہر شخص اپنے اپنے کام کے بوجھ تلے بے ڈھب دبا ہوا ہے۔ اتنی فرصت کہاں کہ کوئی تفریحاً افسر کے کمرے میں چکر لگانے یا ٹہلنے جائے۔ اور لاکھ فرصت بھی ہو، کیا ایک صحیح دماغ کا تعلیم یافتہ آدمی افسر کے کمرے اور سیرگاہ میں تمیز نہیں کر سکتا؟ اور ضروری فیصلہ کرتے وقت خلل پڑنے کی بھی ایک ہی کہی۔ دفتروں میں ضروری اور غیر ضروری سب کام ماتحت عملہ ہی کرتا ہے۔ افسر کے پاس پہنچنے پر مسّل ہر پہلو سے مکمل ہوتی ہے جس طرح بڑے بڑے سٹیشنوں پر ٹکٹ بیچنے کی مشینیں دھری ہیں کہ سکّہ ڈالا، ہتھی دبائی اور ٹکٹ حاضر۔ ٹھیک اسی طرح کاغذ

افسر کی آنکھوں کے سامنے میز پر رکھا جس جگہ دستخط کرانے مطلوب ہوں وہاں انگلی رکھی ہشین کے پرزوں کی طرح افسر کے ہاتھ کو جنبش ہوئی اور آپ کے انگلی اٹھاتے اٹھاتے دستخط موجود۔ بفرضِ محال مان بھی لیا جائے کہ کوئی فیصلہ افسر کو خود کرنا ہی پڑ گیا تو یکسوئیِ قلب میں خلل پڑنے کے لئے تو خواہ کوئی خود کمرے کے اندر چلا جائے یا باہر سے اپنی آواز اندر پہنچا دے یکساں بات ہے۔ اور اس غرض کے لئے کہ کام میں خلل واقع نہ ہو، باہر سے جانے والوں کی روک تھام کی جتنی افسروں کو ضرورت ہے اتنی ہی کلرکوں کو بھی ہے تو پھر افسر کیوں بلا روک ٹوک جس وقت چاہیں کام کرنے والوں کے سر پر جا موجود ہوں؟ اگر اجازت کی ضرورت اس لئے سمجھی جائے کہ اس سے دفتروں میں افسروں کا رعب اور دبدبہ قائم رہتا ہے تو اس کا وہ یہ جواب دیتا کہ رعب اور دبدبہ ایسے مضر فضولیات ہیں جو کلرکوں کی آزاد ذہنیت اور جذبہ خودداری کو پسپا کرتے اور کچلتے ہیں۔ اور جو شخص اپنے افسروں کے اس ناجائز حق کو روا رکھتے ہیں وہ اخلاقی مجرم ہیں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہر ملازم تنخواہ اس لئے پاتا ہے کہ وہ اس کے عوض کام کرتا ہے۔ کام کے علاوہ تابعداری نہ صرف اہلِ قلم پر لازم نہیں، بلکہ اہلِ قلم کی سراسر توہین ہے۔

موہن کا یہ لیکچر سن کر کچھ لوگ تو آزادانہ اُس کے خیالات کی تعریف کرتے اور کچھ اُس سے متفق نہ ہوتے خیر اس سے واسطہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب بظاہر اتنی چھوٹی سی بات اس کے دل کو اس قدر پریشان کرتی تھی، تو افسروں کی سچ مچ کی ڈانٹ ڈپٹ، جھاڑ پچھاڑ، دھمکیاں جھڑکیاں اُس کے دل پر کیا اثر کرتی ہونگی۔

حقیقت یہ ہے کہ موہن کا دل اس قسم کی زندگی سے اکتا گیا تھا "اس طرح کی زندگی آخر کب تک کاٹنی ہوگی کیا اس بھول بھلیاں سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں؟" یہی تشویش اسے آٹھوں پہر رہتی تھی صبح سے شام تک کام، شام سے صبح تک سونا اور اگلی صبح پھر کام۔ کیا کولھو کے بیل کی طرح اس اڑھائی قطر کے دائرے میں چکر لگاتے لگاتے عمر تمام ہو گی؟ کیا زندگی کا یہی مقصد ہے؟ اُس نے ایک اصول پڑھا تھا "صرف اس لئے نہ جیو کہ کھاؤ پیو، بلکہ صرف اس لئے کھاؤ کہ جیتے رہو" یہ اصول غالباً کسی ایسے زمانے میں یا ایسے لوگوں میں نبھ سکتا ہوگا جب کہ کھانے کے لئے سامان بہم پہنچانے اور کھانے سے وقت بچ رہتا ہوگا، مگر جس آدمی کو صبح سے شام تک صرف اس لئے کام کرنا پڑے کہ صبح اور شام بیٹھ کر کھا سکے اس کے لئے کیا زندگی بھر سوائے کھانے کے کوئی اور کام ممکن ہو سکتا ہے؟ تو کیا مرتے وقت تمام گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ حسرت اور افسوس سے یہ نہ کہے گا

"پیچ پیچ مرا بیل کی نیائیں کھا سویا، اُٹھ کھایا"

وہ ایسی غلیظ اور زہریلی فضا میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اُس کا قصور نہ تھا نہ اُس کے اختیار ہی میں تھا کہ دنیا والوں کے اِس بے ڈول نظام کو تمام تر بدل ڈالے۔ زندگی قائم رکھنے کے لئے اسے کام کرنا ہوگا۔ مگر وہ اس سے نہ گھبراتا تھا، رونا اس بات کا تھا کہ کام کی مقدار مناسب ہو، سلوک عزت کا ہو اور کام کا معاوضہ کام کی مقدار اور علمیت کے مطابق ہو۔

اس کے افسر کو ہی لو۔ اس کی طرح اُس کے بھی دو ہاتھ دو پاؤں، ایک دل اور ایک دماغ سب کچھ برابر ہیں بہت سی باتوں میں اسے اُس پر فوقیت حاصل ہے۔ اُس کی بہ نسبت کام اسی کو زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ دونوں بی اے پاس ہیں تو پھر وہ کیوں پانچ سو روپے ماہوار پائے اور یہ کیوں صرف چالیس پر قناعت کرے؟

اُس کے پاس باغ، باغیچے، کوٹھی، نوکر چاکر، خدمتگار، موٹر، زر و دولت غرض کیا نہیں؟ اور اس کے پاس؟ آہ اس کے پاس ہے ہی کیا؟ اُس کا بچّہ ناز و نعمت میں پرورش پائے، دن رات سیم و زر میں کھیلے اور اس کا؟ اگر کبھی مچل کر نئے کپڑوں یا مٹھائی کے لئے ضد کرے تو خالی باتوں سے بہلا لیا جائے۔

وہ موٹروں اور گاڑیوں میں دندنائے، سیر و تفریح اور زندہ دلی کے سب سامان اُسے میسّر آئیں، اور جب وہ شام کو ٹینس کھیل رہا ہو یا کلب میں دوستوں سے خوش گپیاں کر رہا ہو یا سینما میں دل بہلا رہا ہو یہ لیمپ کی روشنی میں دفتر میں کام میں مشغول ہو۔ وہ دنیا بھر کی سیر کر سکیں اور اپنی معلومات بڑھائیں اور یہ آنکھیں بند کئے کولھو کے بیل کی طرح اپنے گھر سے دفتر تک کے اڑھائی گز کے دائرے میں گھوما کریں، اور عمر بھر اپنے نصیب کو کوسیں۔

اُس کی نہیں اُس کے دشمنوں کی ذرا طبیعت دگرگوں ہو تو مہینہ بھر گھر میں آرام کریں اور زمانے بھر کے حکیموں اور ڈاکٹروں کی آمد و رفت سے اس کے گھر کی چوکھٹ گھس جائے اور یہ جاں بلب بھی ہو اور رخصت کے لئے گڑگڑائے تو موقوف کئے جانے کی دھمکی جواب میں پائے۔

وہ عجز و انکسار کے جواب میں آنکھیں نکال نکال کر گرج گرج کر ڈرائے دھمکائے، اور یہ ایک چابک زدہ کتے کی طرح مار کھا کر بھی دُم ہلائے اور پاؤں چاٹے؟

اس کا غیر مطمئن دل اس ناہموار تقسیم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رہا تھا۔ یہ بے وجہ غیر متناسب مقابلہ اس کی طبیعت میں وحشت پیدا کرتا تھا۔ وہ انتقام کے لئے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ اگر یہ قصور اُس کی قسمت کا تھا تو ..... مگر تقدیر پر اپنی برتری کے لئے بھروسا رکھنا کمزور آدمیوں کا کام ہے۔ وہ بہادر اور توانا تھا۔ وہ اپنے ناموافق حالات کو خود موافق بنائے گا۔

سوہن کو اپنے دل کی تاریکی میں یکبارگی امید کی روشنی نظر آئی۔ اُس کے چہرے پر پھر سے رونق آگئی۔ اس کے

جسم میں خون جلد جلد دورہ کرنے لگا۔ یاس اور رنج کی جگہ امید اور خوشی نے لے لی۔ وہ کھڑا کھڑا تھک گیا تھا، اس لئے برآمدے میں ایک بنچ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے معبود سے دعا کی کہ وہ اسے اس کے ارادے میں کامیاب کرے۔ اُس نے ایک زبردست ارادہ کیا تھا۔ صبر اور اطمینان ترقی اور برتری کے حق میں زہر قاتل ہیں۔ جب تک وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ جائے گا ہرگز صبر سے نہ بیٹھے گا۔ اطمینان کی، پستی کی زندگی سے عروج اور بلندی کی کوشش کرتے کرتے مرجانا بدرجہا بہتر ہے۔ اب وہ ایسا ہی کریگا۔

دوبارہ کالج ..... ایم اے ..... پروفیسر!

ہاں اگر کلرک ہونا ہی گناہ ہے تو وہ پروفیسر بن کر دیکھے گا۔ وہ اپنے ناموافق حالات کو قوتِ بازو سے موافق بنائے گا۔ بدقسمتی کو ٹھوکریں مار کر نکال دے گا۔ اُس نے جیب سے استعفے کی عرضی نکال کر ایک بار پھر پڑھی۔ صبح سے اُس کے دل میں ایک کشمکش جاری تھی، لیکن اب وہ ختم ہو چکی تھی۔ اب اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس ذلت کی زندگی کو ایک لمحہ بھر اَور گوارا نہ کرے گا۔

"جتنی محنت یہاں دفتر میں کر رہا ہوں اس سے آدھی بھی کالج میں کرونگا تو امتحان میں صوبہ بھر میں اول رہونگا اور خرچ اخراجات؟ اونہہ اس کی کیا پرواہ ہے۔ اگر دو گھنٹے روز بھی کسی امیرزادے کو پڑھا دیا کروں گا تو پچیس تیس روپے ماہوار کہیں نہیں گئے۔ وقت گذرتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ آنکھ جھپکنے میں کالج کے دو سال نکل جائیں گے۔ اور اس کے بعد؟"

وقت .....! عزت ....!! دولت ....!!! مگر ....(؟) ...

اُس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ پروفیسری کے زمانے کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے کھنچ رہا تھا۔ اسے صرف تین چیزیں چاہئیں۔ وقت، عزت اور دولت۔ اگر کلرکی اس کے لئے یہ مہیا نہیں کرسکتی تو وہ پروفیسری سے یہ سب کچھ حاصل کریگا۔

وہ یہ سوچتا سوچتا ایک دم چونک پڑا۔ اسے ایک دم ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب شیخ چلی کے ہوائی قلعے ہیں، اور وہ حیران ہوا کہ اس نے شروع ہی میں ایسا کیوں محسوس نہ کیا۔ اس پر پھر وہی پاگل پن کا وہم آسوار ہوا۔ کیا ہو اگر کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کا دماغ پھر چکا ہو، اور وہ دوبارہ تعلیم حاصل کرنے کے بالکل ناقابل ہو؟ یا کیا ہو اگر وہ کالج میں تعلیم پاتا پاتا پاگل ہو جائے؟

کیا ہو اگر کسی روز اسے پاگل خانے میں لے جانے کے لئے سپاہی اُس کے گھر پر آئیں؟ اور کملا؟ .. کملا

کا خیال آتے ہی اس کا دل بھر آیا۔ اور اُس کی آنکھ میں آنسو کا ایک بڑا سا قطرہ ڈبڈبا آیا اور اس میں اُسے کملا کا معصوم چہرہ تیرتا ہوا نظر آیا۔ اس کی امداد طلب نگاہیں گویا عاجزی سے یہ کہہ رہی تھیں "موہن، اب ہمارا کون ہے؟"

موہن نے پچھلے ہفتے ایک کتاب "ایک مجنون کی سرگذشت" پڑھی تھی، جس میں ایک وکیل نے اپنے پاگل ہو جانے اور پھر صحتیاب ہو کر اپنے وطن واپس آنے کے سچے واقعات اور پاگل خانے کے عجیب و غریب حالات قلمبند کئے تھے۔ موہن کو اس کتاب کے سب واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

اس کا کمزور دماغ اس قدر غور و فکر کی زحمت برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنا سر بنچ کی چوبی پشت پر رکھ دیا۔ ذرا سی دیر میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔

دیکھا کہ ریل میں سوار ہے۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوا سے باتیں کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے نزدیک ایک قوی ہیکل جوان خاکی کوٹ پہنے بیٹھا اُس کی طرف گھور رہا ہے اور کہہ رہا ہے:-

"بابو جی، دیکھنا کہیں گھر پہنچ کر کہہ دو کہ جاؤ انعام اکرام کیسا؟ سرکار ہماری خدمت کا بھی حق ہے۔ جن دنوں تم بستر سے اُٹھ اُٹھ کر بھاگا کرتے تھے، اپنے پرائے نفع نقصان میں تمیز نہ تھی، تمہارے سرہانے بیٹھ کر ساری ساری رات آنکھوں میں گذاری ہے۔ ایک رات تو تم نے غضب ہی کیا تھا۔ میں تین راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا نیند کا جھونکا سا آگیا۔ آنکھ جو کھلی تو دیکھتا ہوں کہ بستر خالی ہے اور تم غائب ہو۔ میری روح ہوا ہوگئی۔ تمہیں دیکھنے کے لئے بھاگ کر کمرے سے جو نکلا تو دیکھا کہ تم سامنے کوئیں کی منڈیر پر کھڑے ہنس رہے ہو، اور ہوا سے باتیں کر رہے ہو۔ اب مجھے ایک اَور تشویش ہوئی کہ اگر میں ذرا بھی ٹھہروں تو تم کہیں چھلانگ نہ مار جاؤ۔ اور جو میں تمہیں پکڑنے کا قصد کر کے باہر نکلوں اور تم مجھے دیکھ لو یا پاؤں کی آہٹ سن پاؤ تو کہیں چونک کر گر نہ پڑو۔ وہ تو خیر گذری کہ تمہاری نگاہ مجھ پر نہ پڑی اور میں نے دبے پاؤں پیچھے سے ہو کر تمہیں پکڑ لیا۔ ورنہ بس کُود ہی گئے تھے۔ اور میاں چند دنوں تم دن رات بے ہوش پڑے رہتے تھے۔ ساری ساری دوپہر برف کی ڈلی تمہارے سر اور ماتھے پر پھیرتا رہا ہوں۔ غرض چھ مہینے وہ خدمت کی ہے کہ ماں اپنے بچے کی کیا کرے گی۔ اب تندرست ہونے پر بھی جب تم نے اپنی کہانی مجھے سنائی اور کملا یا بملا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے ہی ڈاکٹر سے عرض معروض کر کے تمہارا نام ہسپتال سے خارج کرایا۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب تو ابھی ایک سال اَور نہ چھوڑتے۔ دیکھو ذرا کنٹوپ نیچا کر لو، ہوا زور کی ہے، گاڑی کی ہوا اچھے بھلے آدمی کو بیمار کر دے۔ ٹھہرو، ہاں اس طرح۔ ذرا کان بھی ڈھانپ لو۔"

خوشامد کے چند الفاظ جو عام طور پر خدمتگذاروں کے نوک زبان ہوتے ہیں۔ اور خیر خواہی کے اس بظاہر معمولی سے مظاہرے سے فراخ دل موہن کے دل میں سخاوت کا دریا اُمڈ آیا۔ "اے کاش میں اس کو اس قدر انعام اکرام دے سکتا کہ اسے آئندہ کمانے کی حاجت نہ رہتی۔ مگر اب؟ ابھی کیا کہوں، گھر پہنچ لوں تو دیکھوں۔ روپیہ نہیں تو کچھ پرانے کپڑے ہی سہی۔ دو چار برتن، کملا کا ایک آدھ زیور۔۔۔ مگر زیور اُس بیچاری کے پاس کہاں؟ اور جو ایک دو تھے بھی وہ اب کہاں رہے ہونگے؟ چھ مہینے کی غیر حاضری۔ چھ مہینے! اُس کا تو میرے بغیر کوئی چھ دن بھی پُرسانِ حال نہ تھا۔ پھر اس بیچاری پر کیا گذری ہوگی؟ بیچاری پردہ نشین، عزت دار گھر کی، کیا گھر میں پڑے کر فاقوں سے مر گئی ہوگی۔ ہائے افسوس کلرکی نے تو کہیں کا نہ رکھا۔ ایک دماغ ہی لے دے کر اپنی پونجی تھی وہ بھی چھین لی"

اُس کی آنکھوں کے آگے وہ امتحان کے کمرے کا نقشہ کھنچ گیا۔ پرچہ بٹتے ہی اُس کا چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل کر بھاگنا، سب لڑکوں اور پروفیسروں کا دوڑ کر اُس کے اردگرد جمع ہو جانا اتنا ہی یاد تھا، پھر اس کے بعد اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا، اور پھر کوئی دس دن پہلے ہسپتال میں ہوش آنا، اور اس خدمتگار کی حفاظت میں ڈاکٹر کا اس کو ہسپتال سے روانہ کرنا، یہ سب واقعات آنِ واحد میں اُس کی آنکھوں کے آگے سے پھر گئے۔

خدمتگار جواب کے انتظار میں موہن کے منہ کی طرف تک رہا تھا۔ موہن کی خاموشی اس کے دل کو اُلجھن میں ڈالتی تھی۔ اسے رہ رہ کر شبہ گذرتا تھا کہ موہن کے دماغ میں شاید ابھی تک خلل باقی ہے ورنہ وہ بات کا جواب تو دیتا۔ کبھی کبھی وہ پچھتانے لگتا کہ اُس نے کیوں خواہ مخواہ ایک نیم پاگل کے وعدوں پر اعتبار کیا۔ کیا ہو اگر سفر ختم ہونے پر اس کا کوئی گھر در ہی نہ نکلے۔ اس کا دل بہت بے چین تھا۔ اس نے گھبرا کر موہن سے کہا:۔

"بابو جی۔ کچھ میری بھی سنی؟ غریب آدمی ہوں، بال بچے دار ہوں، تمہارے جیسے بابو لوگ تندرست ہونے پر کچھ بخشیش دے دیتے ہیں ورنہ تنخواہ کے بیس میں کیسے گذر ہو۔ جاڑا سر پر آگیا ہے، گھر میں رضائی نہیں ہے بچوں کے کپڑے بنوانے ہیں، کچھ انعام اکرام مل جائے تو بابو جی آپ کے سر کو دعائیں دوں گا۔ چھوٹے چھوٹے۔۔۔"

مگر یہاں اس کی سنتا کون تھا۔ موہن کو یہی سفاک خیال مارے ڈالتا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اُس کی بیوی اور بچّی کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

آخر وہ یہ سوچ کر اپنے دل کو ڈھارس دے لیتا کہ پروردگار کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ جو پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے وہ کملا اور ننھی بچّی کو بھی کھانے کو دیتا رہا ہوگا۔ نہیں نہیں چھ مہینے کی غیر حاضری میں وہاں

کچھ بھی تغیر نہ آیا ہوگا۔ اس کی کملا حسبِ معمول کھڑکی میں بیٹھی اُس کی راہ تک رہی ہوگی، اور جب اُسے دور سے آتا دیکھے گی دروازہ کھولنے کے لیئے اتر کر نیچے آئے گی۔ اس کی . . .

سٹیشن آگیا۔ گاڑی تھم گئی۔ موہن بابو نے محافظ سے کہا "چلو اترو"۔ سٹیشن کے احاطے سے باہر نکل کر وہ شہر کی طرف چل پڑے۔

شہر میں کچھ تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ سٹیشن سے دروازے تک وہی سڑک، وہی بڑا بازار، وہی دکانیں، وہی دیکھے پہچانے چہرے، تو جب یہاں پر کوئی تبدیلی نہیں تو اس کے گھر میں کیوں ہوگی؟ اُس کی کملا اُس کے انتظار میں کھڑکی میں بیٹھی ہوگی۔ وفا شعار کملا! (بھولا موہن)

اس کا شوق بے تابی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔

بازار میں ایک حلوائی کی دکان کے آگے بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف لوگ حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ اور بیچ میں . . . یہ کچھ نظر نہ آتا تھا کہ درمیان میں کیا ہے۔ موہن نے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ جب پھر بھی کچھ نظر نہ آیا تو برابر کے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ کیا تماشا ہے اور بیچ میں وہاں کیا ہے تو وہ کہنے لگا کہ ایک بھکارن تھی اور اُس کی لڑکی اِس دکاندار سے بھیک مانگنے آئی تھیں۔ اُس کی لڑکی نے تھال میں سے اٹھا کر کچھ کھا لیا۔ دکاندار نے لڑکی کو گالی دی۔ بھکارن نے نہ جانے کیا کہا کہ اُس نے ایک دو سیر کا باٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اب وہ بیہوش پڑی ہے۔ ہائے ہائے کیسا بے رحمی کا زمانہ آیا ہے"۔

موہن بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھا۔ سامنے کی اگلی قطار میں ایک اُس کا پرانا دوست اور پڑوسی کھڑا تھا۔ بھکارن کو دیکھنا تو بھول گیا۔ سوچا کہ گھر پہنچنے سے پہلے ذرا کملا کا حال اس سے پوچھ لوں ذرا دل کو تسلی ہو تو اطمینان سے بھکارن کو بھی دیکھوں۔ موہن نے زور سے اس دوست کا بازو ہلا کر پوچھا۔ "کیوں صاحب، کملا؟"

اس کے دوست نے چونک کر موہن کی طرف دیکھا، اور زمین پر بے ہوش پڑی سسکتی ہوئی بھکارن کے منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔

موہن کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اُس کے بدن میں سنسنی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ اُس کی بچی، یہ چوری کا الزام! اُس کی بیوی اور بھکارن؟ اُس نے زور سے کہا "کملا۔ ہائیں یہ کیا غضب کرتی ہے۔ اب تک مصیبت کے دن دیکھے۔ اب ذرا آرام کے بھی تو دیکھ۔ کملا نے آنکھیں کھول دیں، موہن کو دیکھا، اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈال کر ایک ہچکی لی اور رخصت ہوگئی!

موہن کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی جو دفتر کے کمروں میں گونجتی ہوئی فضا میں کھوگئی، اور وہ دھڑام سے بنچ کے نیچے فرش پر آرہا۔ ساتھ کے کمروں سے کلرک اور چپڑاسی دوڑ کر آئے۔ ایک نے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ دوسرا بھاگ کر پانی کا گلاس لے آیا۔ کسی نے کہا، ارے پانی پلاکر مارو گے سردی کے موسم میں؟ دودھ منگاؤ دودھ۔ آن کی آن میں دفتر بھر کے آدمی اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔

افسر بھی دروازے کا پردہ سرکا کر خراماں خراماں باہر آیا۔ لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ استعفے کی عرضی بدستور موہن کے ہاتھ میں تھی۔ افسر نے ایک دوڑتی ہوئی نظر عرضی پر ڈالی۔ پھر ایک لمحہ موہن کے ڈراونے چہرے کو، جس پر زندگی اور موت کی کشمکش کے نشان ابھی تک موجود تھے دیکھا۔

دیکھا کرے۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اُس کے جابرانہ چنگل سے دامن چھڑا کر آزاد ہوچکا تھا۔ اب وہ کبھی اس کے دروازے پر آکر یہ نہیں کہے گا:۔

"جناب، میں اندر آسکتا ہوں؟"

برج بہاری لعل

خوشی

سال ——— دوشیزۂ بہار کی آغوش طرب میں کھیل رہا ہے!

دن ——— صبح کی کیف آفرین نکہتوں میں کھویا ہوا ہے!

صبح ——— سورج کی زرنگار کرنوں کو چوم رہی ہے!

کہساروں کے دامن ——— شبنم کے اخضری موتیوں سے بھرے ہوئے ہیں!

چنڈول ——— آکاس کے گرد بہاریں نغمے گا رہا ہے!

جھانجھا ——— پُرخار جھاڑیوں پر ناچ رہا ہے!

اور ان سب کا خالق ——— خدا اپنی جنت میں ان کا نظارہ کر رہا ہے!

تمام کائنات ——— خوشی کے پُرسکون خوابوں کی رنگینیوں میں لپی ہوئی ہے!

ترجمہ

عظیم قریشی لدھیانوی

غزل

گھٹا ساون کی اُٹھی جھوم کر ہر سُو سحاب آیا
اُڑے توبہ کے ٹکڑے دَور میں جامِ شراب آیا

عنادل عارضِ گل چُومتے ہیں وجد میں آ کر
چمن میں کون برساتا ہوا کیفِ شباب آیا

گری برقِ تجلّی خرمنِ چشمِ تماشا پر
یہ کوئی طُور تھا جو انجمن میں بے حجاب آیا

رمیدہ ہے نگاہِ شوق سے اُن کا تصوّر بھی
الٰہی یہ نظامِ عشق میں کیا انقلاب آیا

دلِ ناکام میں امید نے لی اس طرح کروٹ
ابھر کر کوئی سطحِ آب پر گویا حباب آیا

الٹ دی دل کی دنیا جنبشِ برقِ تصوّر نے
خیال اُن کا کبھی آیا تو محشر در رکاب آیا

فضا بے تاب ہے انجم کی کرنیں تھرتھراتی ہیں
عروسِ شب کو شاید کوئی ہیبتناک خواب آیا

ہزاروں تھے ظفرؔ دنیا میں داغِ عشق کے قابل
مرا دل ہی مگر زیرِ نگاہِ انتخاب آیا

سراج الدین ظفرؔ

نیا اور کامیاب طریقِ تعلیم

لندن سے ۶۔اپریل کو رائیٹر نے یہ اطلاع دی ہے کہ ارل رسل (جو مسٹر برٹرینڈ رسل کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) اور کونٹس رسل (یعنی مسز ڈورا رسل) نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے آبائی خطاب نوابی (ارل) کو استعمال نہیں کریں گے۔ مسز ڈورا رسل "ڈیمنز نیشنل ایڈوائیزری کونسل" کی دوبارہ ممبر منتخب ہوتی ہیں۔

مسٹر برٹرینڈ رسل جنہوں نے اپنے آبائی خطاب نوابی کے استعمال نہ کرنے کا تہیہ کیا ہے انگلستان کے مفکرین کے طبقۂ اولیٰ میں ایک نمایاں ہستی ہیں۔ آپ نے بحیثیت طالب علم کے ٹرنٹی کالج، کیمبرج سے ریاضی اور فلسفۂ اخلاق میں درجۂ امتیاز حاصل کیا ہے۔ آپ فلسفے کی مختلف شاخوں اور فلسفۂ تعلیم پر متعدد مشہور کتابوں کے مصنف ہیں۔

آپ کی کتاب "شادی اور اخلاق" نے جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی نہ صرف انگلستان بلکہ تمام یورپ میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ چند روز قبل مسٹر رسل نے پریس کے ایک نمائندے سے کہا تھا کہ انہیں خطاب کے ساتھ کسی قسم کی دولت حاصل نہیں ہوئی۔

مسز ڈورا رسل مسٹر برٹرینڈ مشہور فلسفی اور ماہرِ تعلیم کی بیوی ہیں۔ وہ سر فریڈرک بلیک کی بیٹی ہیں اور حال ہی میں انہوں نے ایک فاضلانہ کتاب "خوش رہنے کا حق" کے نام سے تصنیف کی ہے۔

انگلستان کی دوسری خاتون جس نے دو سال قبل خطاب استعمال نہ کرنے کو ترجیح دی تھی وہ مسز سڈنی ویب، لارڈ پیسفیلڈ وزیر نوآبادیات کی بیوی ہیں۔

مسٹر برٹرینڈ انگلستان کے علاقہ ہمپ شائر میں ایک نہایت قابلِ توجہ سکول چلا رہی ہیں۔ یہ سکول آبادی سے بہت دور واقع ہے۔

اس سکول میں چار برس کی عمر سے گیارہ برس تک کے بیس لڑکے لڑکیاں تعلیم پا رہے ہیں۔ ذیل میں بعض ان طریقوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے مطابق ان بچوں کو تعلیم دی جا رہی ہے:-

۱۔ اس سکول کے بچے جب تک خود پسند نہ کریں، اُن کے لئے درس میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ان بچوں کو کبھی جسمانی سزا نہیں دی جاتی۔

(۳) بچے اکھڑپنا برتنے کے مجاز ہیں۔

(۴) وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔

(۵) ان کے لئے کوئی اور کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہیں ہے۔

(۶) وہ ایک ساتھ ایک جگہ نہاتے اور ایک جگہ سوتے ہیں۔

(۷) وہ گرم ہوا میں ننگے دوڑتے پھرتے ہیں۔

اس آزادی کے باوجود (مسٹر رسل کہتے ہیں کہ) اس سکول نے اپنی چار سالہ زندگی میں بڑی ترقی حاصل کرلی ہے ایک نشیبی زمین کے فرشِ زمردیں پر دھوپ میں متعدد بچے کھیل رہے تھے۔ بعض گھوڑوں پر سوار تھے اور بعض درختوں پر چڑھ رہے تھے۔

مسٹر رسل نے پریس کے ایک نمائندے سے ابھی حال ہی میں کہا کہ میں نے تو بطور تجربہ اس سکول کا کام شروع کیا تھا۔ چونکہ میں نے مسئلہ تعلیم پر ایک کتاب لکھی تھی اور خود میرے بھی قابلِ تعلیم دو بچے ہیں اس لئے میں نے خیال کیا کہ ان بچوں کے ساتھی بھی ہونا چاہئیں، اور اس مقصد کے لئے کسی بڑے سکول کی ضرورت نہ تھی۔

علاوہ ازیں اس سکول کے قائم کرنے سے میرا یہ بھی مقصد تھا کہ میں اس ذریعے سے مسئلہ تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات کو بھی آزماؤں۔ اب نتائج کو دیکھ کر میں خود حیران ہوں کہ میرے نظریات نے واقعی کتنا اچھا کام کیا ہے۔ اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے کہ بچے سبق پڑھنے کے لئے مجبور نہیں مسٹر موصوف نے کہا کہ ہم نے بچوں سے یہی کہا ہے مگر ہم نے دیکھا کہ وہ سب کے سب اس کے باوجود سبق پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ اس میں رمز یہ ہے کہ وہ سبق لینے کے لئے آنے کو ضرور بے تاب ہونگے جب ان کو معلوم ہوگا کہ اُن کو سبق لینے کے لئے جانے کی ضرورت نہیں۔

پھر ہم نے ان کو اکھڑ بننے اور جو کچھ اور جیسا بولنا چاہیں اُس کی اجازت دے رکھی ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ جو بھی خطرناک کام کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں ان پر کوئی بندش نہیں۔

میرے نزدیک یہ طریقہ بہت معقول ہے کہ بچوں کو کہنے دیا جائے جو وہ کہنا چاہیں۔ ورنہ جو باتیں وہ کہہ نہ سکیں گے اُن کے دل میں گھر کر جائیں گی۔

اگر وہ مجھے یا دوسرے اساتذہ کو احمق کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بچہ جو سرِوقت دبایا جاتا ہے جب وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ وہ بولنے میں آزاد ہے اور اسے کوئی روکتا نہیں تو پھر وہ نہ کہنے کی باتوں کا چنداں آرزومند نہیں رہتا۔

ہم بچوں کو نرمی اور حلم کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ سچ ہے کہ بعض قاعدے گڑبڑ کو روکنے کے لئے ضروری ہیں لیکن اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

جب بچوں کو میں نہیں دیکھ رہا ہوتا تو وہ آپس میں خوش ہوتے اور ایک دوسرے سے زیادہ اچھی طرح سلوک کرتے ہیں"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بچوں کو مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی کیونکہ میں ان بچوں کو جہاں تک ممکن ہے بین الملی بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہاں اس سکول میں صحت کے بارے میں بچوں پر ضرور حکومت کی جاتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس لئے کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ ایک علمی مطمحِ نظر اس بارے میں اُن کے پیش کردوں۔

میں ان کو "نوعی حقائق" کا علم حاصل کرنے سے نہیں روکتا۔ جب بھی وہ کرنا چاہیں۔ ہمارے ہاں ایسی باتیں پوچھنے پر کسی قسم کی روکاوٹ عائل نہیں کی جاتی ہے۔ کیونکہ میری رائے ہے کہ کسی بھی علم و واقفیت کے حصول کے راستے میں کوئی دیوار حائل نہیں ہونا چاہئے خواہ بچے کی عمر کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ جو شخص ایک بات جاننا چاہتا ہے اُسے ضرور جاننا چاہئے۔

اس سکول کے بچے اپنے اساتذہ کو کسی معزز و ممتاز خطاب سے مخاطب نہیں کرتے۔ بلکہ ارل رسل نے کہا کہ وہ ہمیں ہمارے "عرف" سے ہی پکارتے ہیں۔

یہ عجوبۂ روزگار اسکول موسم گرما میں بند کر دیا گیا ہے۔ ارل رسل نے کہا کہ انہیں خطاب کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دولت نہیں ملی اور یہ سکول مصارف چاہتا ہے۔ اس لئے اب وہ اپنے بچوں کو کسی اَور سکول میں داخل کریں گے۔ اُن کا قول ہے کہ اُن کے بچے اب کسی بھی سکول میں پڑھ سکیں گے۔

مہر محمد خاں شہاب

مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم بھی ایسی ہونی چاہئے جو انہیں کام کے قابل بنائے ورنہ اُن کی تعلیم پڑھائی ہوگی تعلیم نہ ہوگی۔

کوئی تعلیم تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں جب تک وہ غور و فکر کو جلا نہ دے، جب تک وہ نفس کے پُراسرار روحانی اصول تک پہنچ کر اُس میں تحریک اور نشوونما پیدا نہ کرے۔

گلچیں

(۱)

سورج گوشۂ مشرق سے بلند ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اُس کی سنہری کرنیں اونچے اونچے درختوں پر ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے زعفرانی رنگ گھول کر پتّوں پر ڈال دیا گیا ہو یا سونے کو پگھلا کر بکھیر دیا ہو۔ چڑیاں انار کی ٹہنیوں پر جھولا جھول رہی تھیں اور اُن کے چہچہے کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہو رہے تھے۔

آفتاب کی روشنی جلد جلد فضائے بسیط پر پھیل رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں صبح کا وقت، جب ٹھنڈی ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے ہوں رات بھر کے جاگے ہوئے دماغوں پر وہی اثر کرتا ہے جو صہبائے سرجوش کو کرنا چاہیئے۔ لطیفہ ساری رات بھر کروٹیں بدلتی رہی تھی، صبح ہوتے ہوتے اُس کی آنکھ لگی تھی کہ چڑیوں کے نغمے پیامِ بیداری بن گئے۔ وہ اٹھی تو بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، آنکھوں میں جلن، اور سر میں خفیف سا درد تھا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اُس نے وحشی ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھا اور یہ اطمینان کر کے کہ ابھی اُٹھنے کا وقت نہیں ہے پھر پلنگ پر دراز ہوگئی۔ اُس کے بال پریشان تھے اور رخسار جو کبھی گلاب کے پھول کی طرح رنگین و شاداب رہتے تھے سفید ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے، وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر تنہا پڑی تھی۔

اُسے محسوس ہوا کہ دو نورانی شکل کے آدمی آسمان سے اترے اور اس کے پلنگ کو لے کر اتنے بلند ہو گئے کہ لطیفہ کی نگاہیں دنیا کے ہر حصّے کو بخوبی دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایک بڑا دریا ہے جس کا سفید و شفاف پانی حدِ نظر سے موجیں مارتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ سطحِ آب پر ایک چھوٹی سی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ پانی کی مہیب موجیں اُسے بہا کر کنارے سے دور لے آئی ہیں کشتی میں میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے رشید، لطیفہ کی مملکتِ حسن کا بادشاہ بیٹھا ہے اور دریا سے موتی نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ موتی کے تجسس میں شہر سے دور نکل آیا ہے۔ آخر رحمت کا ابرِ نیساں اس کی کشتی پر برسا اور موتی اسے مل گیا۔ گوہرِ مقصود لے کر رشید نے ساحل کا رخ کیا، لیکن موجوں نے کشتی کو کنارے کی طرف نہ آنے دیا۔ کوشش کرتے کرتے رشید کے ہاتھ تھک گئے۔ آوازیں دیتے دیتے اُس کا گلا بیٹھ گیا۔ کوئی نہ تھا جو ساحل پر اس ڈوبنے

والی کشتی کو دیکھتا اور ہمدردی کے جوش سے بیتاب ہو کر اُس کی مدد کو پہنچتا۔ رشید کے چہرے پر فرطِ مایوسی سے مردنی چھا گئی، اس نے چپو پھینک دیا، اور آنکھیں بند کر کے کشتی کو خدا پر چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ زور سے کشتی کو جھٹکا لگا جس نے اُس کو الٹ دیا۔ رشید کے منہ سے ایک چیخ نکلی جس کو سنتے ہی لطیفہ بے چین ہو کر پانی میں کود پڑی، ——— اور اسی کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔

(۲)

رشید معمولی حیثیت کا مصوّر تھا۔ وہ دن بھر کی عرق ریز محنت سے تصویر بناتا اور شام کو اسے بازار لے جاتا یا کسی بلند پایہ رسالہ کے دفتر میں پیش کرتا تو اُس کی طرف کسی قسم کا التفات نہ کیا جاتا بلکہ بعض اوقات تو اعتراضات کا دل شکن سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کوئی کہتا گردن ضرورت سے زیادہ لمبی ہے، مانا کہ صراحی دار گردن خصوصیاتِ حسن میں داخل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرقع ساز گردن کو بڑھا کر بجلی کا کھمبا بنانے لگیں، ——— اور چہرے میں آنکھوں کے علاوہ کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ کوئی کہتا کمر میں شاعرانہ مبالغہ ختم کر دیا گیا ہے۔ بال سے بھی باریک بنائی گئی ہے۔ بغرض وہ دو سال کے عرصہ میں کوئی تصویر ایسی نہ بنا سکا جس پر کوئی معقول معاوضہ اُسے مل جاتا اور وہ کچھ دنوں کے لئے فکرِ معاش سے آزاد ہو کر کسی نادر تخیل کو نوکِ قلم سے صفحۂ کاغذ پر مرتسم کرتا۔

آخر کار وہ مصوری سے اکتا گیا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس شغل کو قطعاً ترک کر دینا چاہئے ——— یا تو زمانہ پر بد مذاقی کی بلا مسلط ہے یا حقیقتہً میری ہی ذہنیت اس قدر پست ہے کہ میں کوئی کامیاب شبیہ بنانے سے عاجز ہوں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اس پیشے سے دستبردار ہو جانا ضروری ہے۔

لیکن جس فن کو ایک عرصۂ دراز کی کاوش سے اُس نے حاصل کیا تھا جس کے حصول میں اُس نے آنکھوں کا نور، دماغ کا سکون اور انگلیوں کا سارا زور صرف کر دیا تھا، جب وہی فراغ بالی کا ذریعہ نہ بن سکا تو اب دنیا میں کون سا کام ایسا تھا جس کو وہ اختیار کرتا اور اس سے اپنی سقیم الحالی کی تلافی کر سکتا۔

اُس کی شادی کو پورا ایک سال نہ ہوا تھا لیکن قدرت لطیفہ کے لئے امیدوں کا ایک ایسا مرکز تیار کرنے کی ابتدا کر چکی تھی جس کے مکمل ہو جانے پر اُس کے آلامِ حیات میں کافی کمی ہو جانے کی توقع تھی۔

لطیفہ کی طبیعت مضمحل رہنے لگی، اُس کا چہرہ زرد ہو گیا، وہ دن بھر پلنگ پر لیٹی رہتی۔

رشید نے خیال کیا کہ لطیفہ تکالیف کا مقابلہ کرتے کرتے عاجز آ گئی، اُس کا تن نازک اُن شداید کی برداشت سے مجبور ہو گیا جو میرے گھر آنے کے بعد اُس کو برداشت کرنا پڑے۔ اس احساس سے رشید کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ مصوری کو فوراً ترک کر دینا چاہئے۔ تصویر کشی نہایت نفرت انگیز مشغلہ ہے۔

رشید ترکِ مصوری کے عزم کو لطیفہ کی مصیبت اور اُس کی بیچارگی سے متاثر ہو کر تقویت دے رہا تھا کہ اُس کی نگاہ سے ایک اعلان گذرا جو الہ آباد کی نمائش کے سلسلے میں کسی شخص نے شائع کیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "مرکزِ امید" کے عنوان پر بہترین مرقع تیار کرنے والے مصور کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ رشید نے سوچا ممکن ہے انعام حاصل ہو جائے۔ لاؤ ایک آخری کوشش کر دیکھوں اگر اس میں بھی ناکامی ہوئی تو پھر قلم توڑ دوں گا، رنگ کی ڈبیاں پھینک دوں گا اور اونٹ کے بالوں کے یہ لمبے لمبے برش جلا دوں گا۔

اُس نے تین مہینے کی مسلسل کوشش سے ایک تصویر بنائی جس کے مکمل ہو جانے پر اُس کا دل فرطِ مسرت سے اچھلنے لگا۔ آنکھیں کامیابی کے نور سے چمک اُٹھیں۔

رشید نے لطیفہ سے کہا "مرکزِ امید پر میں نے یقیناً سب سے اچھی تصویر بنائی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ نمائش کا انعام میرے سوا اور کسی کو نہیں مل سکتا، مگر میں اس کو ڈاک سے نہیں بھیج سکتا، خود جا کر پیش کروں گا۔"

"زادِ راہ کی کیا سبیل ہوگی؟" لطیفہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

رشید نے سر جھکا لیا۔ وہ دیر تک سوچتا رہا کہ دہلی سے الہ آباد تک کے مصارف کا کس طرح انتظام کرے۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچا تھا کہ جھنکار کی ایک آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

لطیفہ نے اپنے کڑے ہاتھوں سے اتار کر اُس کے سامنے ڈال دیئے، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "شاید یہ آپ کے زادِ راہ کے لئے کافی ہونگے"۔ ——— رشید نے سخت تکلیف اور احساسِ ندامت کے ساتھ کڑے اٹھا کر سر سے پیر تک لطیفہ کے جسم پر نظر ڈالی، اُس کے بدن پر کوئی زیور باقی نہ رہا تھا۔ یہ بالکل آخری چیز تھی جو آج رشید کی اس سخت مشکل میں کام آنے والی تھی۔

رشید چلا گیا، لطیفہ تنہائی کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے رہ گئی۔ رشید کا اس بے سروسامانی کے عالم میں چلا جانا رہ رہ کر اُسے یاد آ رہا تھا اور وہ اس صدمے سے مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی۔ ساری رات اختر شماری کرنے کے بعد صبح سورج نکلتے نکلتے اس کی آنکھ لگی تھی کہ اس ہولناک خواب نے اُسے جگا دیا۔

وہ ایک مستقل مزاج اور صابر عورت تھی۔ اُس نے خواب کو اپنی مصیبت زدہ ذہنیت اور فرقت نصیب تخیل کا نتیجہ قرار دے کر بھول جانے کی کوشش کی، لیکن اس کے پیٹ میں درد کی ایک جانستاں ہوک اٹھی جس کے ساتھ وہ نیم بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

(۳)

رشید دہلی سے روانہ ہو کر الہ آباد پہنچا۔ تصاویر کے لئے جو خیمہ سجایا گیا تھا وہ نگار خانۂ چین بنا ہوا تھا اس میں ہزار ہا

تصویریں رکھی ہوئی تھیں جو اربابِ کمال کی قدرتِ فن کا اپنی خاموش زبان سے اعلان کررہی تھیں۔

رشید نے ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ ابھی تک مسرور تھا، کیونکہ "مرکزِ امید" کے نام سے اُس نے جو تصویر بنائی تھی وہاں تک کسی کا سمندِ خیال نہیں پہنچا تھا۔

کسی نے روپے کو، کسی نے محبوب کو، اور کسی نے ساحل کو مرکزِ امید قرار دے کر اس قسم کا کوئی نہ کوئی نظارہ پیش کیا تھا۔ ملک کے ایک زبردست مصوّر نے اپنی تصویر میں یہ منظر دکھایا تھا کہ دریا میں بہت دور کشتی کا ایک دھندلا سا نشان محسوس ہو رہا تھا، کنارے پر ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے کی کشتی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، کشتی سطحِ آب پر مرغِ آبی کی طرح تیرتی چلی آرہی تھی۔

رشید نے تصویر کو دیکھا، اس کی پیشانی پر ایک بل آیا اور اُس کی آنکھیں زیادہ توجہ کے ساتھ اس مرقعے کو دیکھنے لگیں۔ لیکن اُس نے بے نیازی کے ساتھ کہا "معمولی سا عکس ہے بالکل معمولی سا، تخیل ناکام اور تصور تشنۂ تکمیل ہے"

اگلے دن جس کی شام کو انعام کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ رشید نے اپنی تصویر نمائش میں داخل کردی۔ دو گھنٹے کے بعد نمائش گاہ میں غیر معمولی ہجوم ہوگیا۔ ہر شخص کی زبان پر اُس مرقعے کے متعلق تعریفی الفاظ تھے، جس میں ایک خوبصورت نوزائیدہ بچے کو ماں کی آغوش میں لیٹا ہوا دکھایا گیا تھا۔

یہ تصویر رشید کی تھی جو انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

(۴)

رشید نے لطیفہ کے ذوقِ آرائش کا لحاظ رکھتے ہوئے بیش قیمت زیور اور عمدہ عمدہ تحفے اس کے لئے خرید کئے، اور سب سے پہلی گاڑی سے دہلی روانہ ہوگیا۔

جس وقت رشید اپنے مکان میں داخل ہوا لطیفہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی، اور ایک خوبصورت، نوزائیدہ بچہ اس کی آغوش میں پڑا دودھ پی رہا تھا۔ لطیفہ کی شرمگیں نگاہیں بچے کے چہرے پر جھکی ہوئی تھیں۔ رشید نے دیکھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "لطیفہ، خدا کی قسم تم زبردست مصور ہو، میں نے تین مہینے کی محنت سے جو تصویر بنائی تھی تم نے چار دن میں اُس کے اندر روح پھونک دی"

اُس نے حیا آمیز تبسّم کے ساتھ دوپٹے کا آنچل منہ پر ڈال لیا۔

کوثر چاندپوری

غزلیات

(۱)

کیونکر نہ مزے لُوٹے وہ دردِ تمنا سے
دنیا ہی میں جو رہ کر محروم ہو دنیا سے

اک ہم ہیں کہ گم ہم ہیں شورِ لبِ ساحل میں
اک وہ ہیں کہ لاتے ہیں موتی تہِ دریا سے

کیا موجِ بہار آئی نشتر لئے ہاتھوں میں
کیوں خون ٹپکتا ہے شاخِ گلِ رعنا سے

شید لئے محبت پھر پھولے نہ سمائیں گے
کچھ پھول اگر حسن لیں دامانِ تمنا سے

ٹکرائی کوئی کشتی یا شور ہے ساحل کا
یا کوئی بلاتا ہے مجھ کو لبِ دریا سے

اک اس کے تڑپنے سے عالم تہ و بالا ہے
فطرت نے بنایا تھا دل کون سے اجزا سے

آباد رہے محفل وہ بھی تو ہے محفل میں
زیبا سے کبھی کہئے کچھ، کچھ پوچھئے زیبا سے

علی حسنین زیبا

(۲)

آتی نہیں پسند گل یاسمن کی بو　　مجھ میں بسی ہوئی ہے کسی گلبدن کی بو

یہ سوچتا ہوں حضرتِ زاہد کو کیا کہوں　　حجرے سے آرہی ہے شرابِ کہن کی بو

عمرت دراز بادِ نسیمِ لطیفِ صبح　　پھیلا گئی چمن سے قفس تک چمن کی بو

میں نے ہر ایک گل کی مہک پر کیا ہے غور　　چھو بھی نہیں گئی ہے ترے پیرہن کی بو

اے شاد میرے عیب ہنر ہیں کسے لئے
آتی ہے خوش ہر ایک کو اپنے دہن کی بو

احمد علی خاں شاد

(۳)

خموشی پر مری مہر و وفا کا　　یقیں آتا نہیں اُس بدگماں کو

جہانِ جد و جہدِ زندگی میں　　کہاں ڈھونڈے کوئی آرامِ جاں کو

ترے لطف و کرم کی ہے نشانی　　خدا رکھے دلِ حسرت نشاں کو

مجھے محفل میں رسوا کرنے والے　　کروں میں کیا ترے ربطِ نہاں کو

سمجھتے ہیں جو ہیں رمز آشنا دل　　نوازش ہائے یارِ مہرباں کو

فرشتے بھی ترے جس سے لرزتے　　اُٹھا رکھا ہے اُس بارِ گراں کو

خدا معلوم اُس کا کفر کیا ہو　　کہے ایمان جو عشقِ بتاں کو

مزاجِ یار برہم ہو نہ مضطر
خدارا ختم کر اس داستاں کو

رام رتن مضطر

محفلِ ادب

چیخوف کی عشقیہ نظمیں

عشق کا مضمون نظم میں بہت پرانا ہے اور اس لحاظ سے کہ ہر شاعر اپنے تجربے اور احساسات نرالے سمجھ کر انہیں ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے عشق کا مضمون ہمیشہ نیا بھی ہوتا ہے چیخوف کے لئے عشق کا جذبہ وہی کیفیت رکھتا تھا جو ہر شاعر اور ہر انسان محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے عشق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مناظرِ قدرت کی خوبیوں کو زیادہ روشن اور پرمعنی، اُس اثر کو جو یہ دل پر ڈالتے ہیں زیادہ گہرا اور پُرکیف کر دیتا ہے۔ عشق اُسے انسان اور کائنات کے رازوں سے آشنا کرتا ہے، اور چیخوف عشق کے تصور میں اسی طرح محو ہو جاتا ہے جیسے مناظرِ قدرت کے مشاہدے میں:-

دن ڈھل رہا ہے، رات قریب ہے، پہاڑ کا سایا لمبا ہوتا جاتا ہے۔ آسمان پر بادلوں کی چمک ماند پڑ گئی . . . اندھیرا چھا گیا۔ شام ہو گئی۔ مگر مجھے رات کے اندھیرے کا کوئی خوف نہیں، نہ گئے ہوئے دن کے گزرنے کا افسوس — صرف تُو میری مسحور کن مورت، صرف تُو میرا ساتھ نہ چھوڑنا! . . . مجھے اپنے پروں کے سائے میں لے، میرے دل کی بے تابی دور کر دے، تب میری مسحور روح کے لئے تاریکی بھی فرحت ہو جائے گی۔ تو کون ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ کیسے جانوں کہ تُو زمین کی ہے یا آسمان کی؟ ممکن ہے تُو آسمان کی رہنے والی ہو، مگر تیری روح ایک آرزو بھری عورت کی ہے۔

چیخوف نے کہیں اپنی معشوقہ کا سراپا بیان نہیں کیا۔ صرف ایک نظم میں اُس کی آنکھوں کی تاثیر بتائی ہے۔ مجھے آنکھیں یاد ہیں۔ آہ، وہ آنکھیں! مجھے اُن سے جو محبت تھی وہ خدا ہی جانتا ہے! اُن کی طلسمی آرزو بھری رات میری روح کا قید خانہ بن گئی تھی۔ اُن آنکھوں میں، جن کی کیفیت میری عقل سمجھ نہ سکی جن کی نظر ہستی کے تمام راز روشن کر دیتی تھی، اُن آنکھوں میں کیسا غم موجیں مار رہا تھا، جذبات کی کیا گہرائی تھی! اُن کی نظر پلکوں کے سائے میں بسیرا لئے ہوئے کبھی رنج و الم کی آہیں بھرتی، کبھی لذت سے سیر ہو کر نڈھال ہو جاتی، کبھی بلائے آسمانی بن کر گرتی۔ اُن پرکیف لمحوں میں کبھی مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ اُن آنکھوں کو دیکھوں اور دل بیتاب نہ ہو جائے، ادا شناسی کا حق ادا کروں اور آنسو نہ بہیں۔ معشوقہ کے انتقال کے بعد وہ گزرے ہوئے دن یاد کر کے کہتا ہے:-

میں اُس سے اُن دنوں بھی آشنا تھا، اُس زمانے میں جو ایک پرانی کہانی معلوم ہوتا ہے۔ وہ زمانہ جو یاد سے محو ہو گیا ہے، جیسے صبح کا ستارہ سورج کی کرنوں میں چھپ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اُن دنوں وہ شاداب حسن سے مالا مال تھی۔ اس میں وہ تازگی تھی جو سورج نکلنے سے پہلے فطرت میں ہوتی ہے۔ جب شبنم کی بوند پھول پر ٹپک جاتی ہے، اس طرح کہ کوئی نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ اُس وقت اُس کی زندگی ایسی مکمل تھی، ایسی پاک، دنیا کی عام روش سے اتنی بیگانہ کہ معلوم ہوتا ہے وہ مری نہیں بلکہ غروب ہو گئی، جیسے ستارہ غروب ہوتا ہے۔

اسی عشق کا ایک اور پہلو ہے مشرق کے لوگوں کو وہ بہت انوکھا معلوم ہوگا۔ یہاں عشق اپنے جذبے کی سنگدلی اور بے رحمی کی شکایت کرتا ہے، اس لئے کہ وہ معشوق کے لئے مہلک ثابت ہوا:۔

آہ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے، جب پُرہوس جذبات کے بے لگام جوش میں ہم اندھا دھند اُسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ کیا بہت دن ہوئے جب اپنی فتح پر فخر کرتے ہوئے تُو نے کہا تھا:۔ وہ میری ہے ... ایک برس بھی نہیں بیتا۔ اب خود ہی دیکھ اُس کی کون سی خوبی محفوظ رہی؟ اُس کے گالوں کی گلاب جیسی سرخی کیا ہوئی؟ لبوں کا تبسم، آنکھوں کی چمک اب کہاں ہے؟ جلتے ہوئے آنسو ایسے بہے کہ سب کچھ جلا کر خاک کر گئے! تجھے یاد ہے ملاقات کے وقت، وہ اُس کی جادو بھری نظر اور گفتگو، وہ اُس کی چونچال ہنسی؟ اب کیا رہا؟ یہ سب شوخیاں کدھر گئیں؟ اور تیرا خواب کتنے دن رہا؟ افسوس، شمالی ملکوں کی گرمیوں کی طرح وہ چند لمحوں کا مہمان تھا! تیری محبت اُس کے لئے تقدیر کی ایک ہیبت ناک سزا تھی، ایک رسوائی تھی جس کی وہ سزاوار نہ تھی، جس نے اُس کی ساری زندگی برباد کر دی! عمر بھر اُس نے ہر نعمت سے پرہیز کیا، دل ہی دل میں صدہا تکلیفیں اٹھائیں ... عہدِ شباب کی کچھ یادگاریں باقی تھیں لیکن وہ بھی اُسے دھوکا دے گئیں۔ دنیا کی سربات سے اُسے وحشت ہونے لگی، فریبِ زندگی کا سرور جاتا رہا ... اُس کی روح پھل پھول رہی تھی سو اُسے بھی لوگوں کے حملوں نے پامال کر دیا۔ مصیبتوں کی آگ نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا، اور یہ راکھ جو محفوظ رہی کیا تھی؟ درد، روحانی تلخی کا بے رحم درد، درد، جسے دوا نصیب ہوئی نہ آنسو۔ آہ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے، جب پُرہوس جذبات کے بے لگام جوش میں ہم اندھا دھند اُسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے

چیوچیف اپنی معشوقہ سے پہلی بار ملا تو اُس کی عمر ۲۸ سال کی تھی اپنے جذبے کی اس خصوصیت کو بھی وہ محسوس کرتا ہے:

آہ عمر کے ڈھلتے وقت ہماری محبت میں کیا دلسوزی ہوتی ہے، کیسی وہم پرستی ۔ ۔ ۔ کچھ دیر اور چمک دکھلا، کچھ دیر اور، آخری عشق ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی! آدھے آسمان پر اندھیرا چھا گیا ہے، صرف اُدھر مغرب میں کچھ روشنی باقی ہے ۔ ذرا ٹھہر، ذرا اور ٹھہر، اے روزِ روشن کی یادگار، اے ذوقِ نظر! اپنے جادو کا اثر ذرا اور رہنے دے! رگوں میں خون ٹھنڈا پڑ گیا تو کیا ہوا، دل تو شوق سے گرم ہے ۔ ۔ ۔ اے آخری عشق! تو روحانی لذت بھی ہے اور ناامیدی کا پیغام بھی۔

یہ عمر، یہ جذبہ اور یہ انجام ۔ کیا تعجب اگر شاعر کے دل میں صرف یہ حوصلہ باقی رہ گیا:

جیسے جلتی راکھ پر پڑا ہوا کاغذ دھواں دیتا ہے اور سلگتا ہے، اور چھپی ہوئی آگ چپکے چپکے اُس کے الفاظ اور سطروں کو چاٹ جاتی ہے! یوں ہی میری زندگی برباد ہو رہی ہے، روز تھوڑی تھوڑی دھواں بن کر اڑ جاتی ہے، اور میں ایسی یکسانی سے جو برداشت نہیں ہوتی رفتہ رفتہ جل کر بھسم ہو رہا ہوں ۔ ۔ ۔ اے آسمان! کیسا ہوتا اگر یہ آگ ایک بار دل کھول کر بھڑک اُٹھتی، اور رنج اور سست قدم تکلیفوں سے رہا ہو کر میں ایکبارگی جل اُٹھتا اور جل جاتا!

"اُردو"

خواب

تُو خواب کے مانند گزر جاتا ہے
تو آنکھوں میں نیند کی طرح آتا ہے

تو، پاس آتا ہے، جب میں سو جاتا ہوں
تجھ کو پاتا ہوں جب میں کھو جاتا ہوں

بیخود میں رہوں، تو وہ قریں آتا ہے
اس پردے میں وہ پردہ نشیں آتا ہے

جب، وہ آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں
جب میں رہتا ہوں، وہ نہیں آتا ہے

اے نیند عجیب طرح ڈالی تو نے
میری آنکھوں میں رہ نکالی تو نے

کونین کی فکروں سے فراموشی ہے
خاموشی میں، کیفیتِ سرگوشی ہے

آنکھیں لذت میں ڈوب کر بند ہوئیں
یہ نیند ہے یا نری ہم آغوشی ہے

اِن نور کی پتلیوں نے پایا ہے کسے
اِن بند پپوٹوں نے چھپایا ہے کسے

ہستی میں ہوشیار رہوں واہ رے میں
بند آنکھوں سے دیکھتا ہوں اللہ رے میں

ہے صاحبِ عرش کا مکاں آنکھوں میں
ہے نورِ زمین و آسماں آنکھوں میں

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی
اللہ! بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی

تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو　　رویت ممکن نہیں تو رویا ہی سہی

"صوفی"

ڈراما

لارڈ بائرن کا قول ہے کہ ڈراما کے وجود سے انسان کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا یعنی نیک اور پارسا لوگ ایک برا ڈراما دیکھنے کے بعد بھی نیک اور پارسا ہی رہتے ہیں۔

وکٹر ہیوگو کے قول کے مطابق ڈراما دیکھنے کے شوقین تین گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

پہلا گروہ مستورات کا ہے جنس لطیف کو ڈراما کی خوبیوں یا پلاٹ کی دلآویزی یا نقائص سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ عورتیں اس میں صرف جذبات کو تلاش کرتی ہیں۔ اُنہیں وہی مناظر پسند ہوتے ہیں جو اُن کے جذبات کے لئے تازیانہ بنیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو ڈراما صرف اس نکتہ نگاہ سے دیکھنے جاتے ہیں کہ اس میں انہیں کوئی طرفہ تر کیرکٹر نظر آئے، یہ ایک ایسی شخصیت ہو کہ اس کے قول اور کردار میں کوئی ایک ایسی بات ہو جو عام لوگوں میں عنقا ہو۔ تیسرا گروہ عام تماشائی ہیں۔ ان لوگوں کو نہ جذبات برانگیختہ کرنے والے مناظر کی جستجو ہوتی ہے نہ یہ کوئی خاص شخصیت دیکھنے جاتے ہیں بلکہ ان کا زاویہ نگاہ صرف یہاں تک محدود ہوتا ہے کہ خوبصورت منظر ہو، ایکٹروں میں عورتیں زیادہ ہوں اور تمام کھیل میں زندگی کی ایک مسلسل کشمکش برابر قائم رہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ "کامیڈی" دیکھتے وقت ذرا اپنے دل کی حالت کا بھی اندازہ کرتے جانا چاہئے کہ کس طرح کھیل کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں بھی مختلف جذبات اور احساسات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

روس کا مشہور فلاسفر ٹالسٹائی ڈراما کے متعلق کہتا ہے کہ اگر ڈراما کا پلاٹ مذہب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تو پھر اس سے زیادہ بےکار دنیا میں اور کوئی چیز نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اخلاق کے لئے بھی اس کا اثر بہت بُرا ثابت ہوگا۔ اگر مذہب نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

مشہور فرانسیسی ادیب والٹیر ڈراما پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر مذہب کی تعلیم ناٹک کے ذریعے سے دی جائے تو اس کا اثر اُس تعلیم اور تلقین سے زیادہ اچھا ہوگا جو عام طور پر گرجا میں دی جاتی ہے۔

والٹیر کا یہ عقیدہ ہے کہ حقیقت میں وہی شخص "انسان" کہلانے کا مستحق ہے جس کے دل میں مذہب کا شعلہ موجود ہے وہ کہتا ہے کہ جس زبان میں پادری مذہب کی تعلیم دیتا ہے وہ زبان کانوں کو خوشگوار معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جو زبان ڈراما میں استعمال ہوتی ہے وہ زیادہ سلیس اور زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ ایکٹر کی حرکات کے ساتھ ساتھ اُس کے الفاظ دل پر ایک گہرا اثر پیدا کر دیتے ہیں۔

"ساقی"

"روح جذبات" پر ایک نظر

"روح جذبات" عصر حاضر کی ایک بہترین اور اسم بامسمیٰ منظوم تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت ادب اردو کے حصۂ نظم میں ایک بیش بہا اور دلچسپ اضافہ ہے اس کے مصنف ملک کے مشہور و نامور ادیب ہمارے عزیز دوست حضرت ادیب الملک پروفیسر محمد اکبر خاں صاحب اکبر حیدری ہیں جن کی ادب نواز ہستی دنیائے ادب میں چنداں محتاج تعارف نہیں۔

"روح جذبات" کیا ہے؟ اک جدید رنگ کی روح افزا کیف پرور اور بصیرت افروز نظموں اور دیگر منتخب اور دلدوز اشعار کا نادر و دلکش مجموعہ ہے جس میں قدیم و جدید رنگ اس خوبی خوش اسلوبی اور سلیقے سے سموئے گئے ہیں کہ جس نے اس کو اک بالکل نئی کیف پرور چیز بنا دیا ہے۔ گویا پرانے الفاظ کے کنٹروں میں رنگ برنگ کی نئی شراب ہوش ربا بھر کر پیش کی گئی ہے جس کا ایک ایک ساغر کئی کئی محفلوں کو بے خود و بدمست بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

"روح جذبات" کو جب آپ مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "روح جذبات" اپنے اچھوتے اور بلند پایہ مضامین اور جدید کیف زا انداز بیان کے لحاظ سے اک ایسا بلند اور مخصوص مرتبہ رکھتی ہے جس کی نظیر جدید شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔

"روح جذبات" کی جدید ترکیبیں، چست بندشیں، ترنم بار الفاظ، رنگین اسلوبہائے بیان، اور پھر ان سب سے بڑھ کر اس کی مخصوص جادو نوائی کے انداز قدم قدم پر آپ کے قلب و دماغ کو مسحور کرتے نظر آئیں گے، اور بجز اس کے کہ آپ اک کافی عرصے تک کے لئے اس کی بے پناہ رنگینیوں میں غرق ہو کر رہ جائیں آپ کو کوئی دوسری راہ مفر نظر نہ آئیگی۔

"روح جذبات" کی وہ مخصوص خوبی جو اس کو عام تصانیف سے ممتاز ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ اس نے جدید رنگ شاعری کا اک ایسا مضبوط سنگ بنیاد رکھا ہے جس پر بڑی سے بڑی سر بفلک عمارتیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس نے اک ایسی شاہراہ عمل معین کر دی ہے جس نے حقیقی شاعری کی منزل مقصود کو قریب تر کر دیا ہے۔

"روح جذبات" اس قابل ہے کہ یونیورسٹیاں اس کو اپنے نصاب میں داخل کریں، کتب خانے اس سے اپنی زینت اور اپنا وقار افادت بڑھائیں، ارباب ذوق اس سے لذت اٹھائیں، اصحاب نظر اپنی آنکھوں سے لگائیں تشنگان ادب اپنی پیاس بجھائیں اور دلدادگان شعر جدید اس کے دلچسپ مطالعے سے بہرہ اندوز ہو کر اور اس کی بلند تر شعریتوں سے سبق لے کر شاہراہ مقصود سے ہمکنار ہوں۔ بہر حال "روح جذبات" کے مصنف حضرت اکبر حیدری اس قابل قدر اور مفید تر اشاعت پر ہر طرح لائق مبارکباد ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ان کو خدمت علم و ادب کی مزید توفیق عطا فرمائے اور زندہ و پائندہ و سلامت رکھے تاکہ ملک ان کے افادات سے کافی عرصے تک بہرہ یاب ہوتا رہے۔ آمین!

حکیم آزاد انصاری

فہرست مضامین

جلد ۲۰ بابت ماہِ اگست ۱۹۳۱ء

تصویر:- دیوارِ چین

دعوے

دعوے غلط سہی لیکن اُن کے بغیر گذارہ بھی نہیں +

حال مست شاعر کہتا ہے :

سنا ہے صوفی کا قول یہ ہے کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ کیسے دعوے بہت بڑا ہے پھر ایسا دعوے نہ کیجئے گا

صوفی کہتا ہے دعوے مت کیا کرو شاعر کہتا ہے یہ بات بھی کہ دعوے مت کرو ایک دعوے ہے سو غلط ہے لیکن کوئی اس غریب ناصح سے کہے کہ بھئی یہ بات کہ دعوے کرنا غلط ہے یہ بھی تو ایک دعوے ہے پھر نتیجہ کیا نکلا ؟ یہی کہ بغیر کسی سے کہے سنے کام بھی کئے جاؤ اور باتیں بھی ورنہ یہ فلسفی اور یہ فلسفی شاعر تو چنگے بھلے انسانوں کا منہ اپنی منطق کی خاک سے بھر دیں گے + اور دعووں کے متعلق ہمارا دعوے ہے کہ دعوے غلط سہی مگر اُن کے بغیر گذارہ بھی نہیں +

زندگی میں کون سی شے ہے کہ دعوے نہ ہو۔ خدا ہے، خدا نہیں ہے، ہم نہیں جانتے خدا ہے کہ نہیں۔ دنیا فانی ہے زندگی کو موت ہے، آخرت ہے، نہیں ہے۔ مذہب محض اعتقاد ہے، طبیعیات عقل پر مبنی ہے۔ یہ شخص خود غرض ہے وہ بے غرض۔ خود غرضی بُری شے ہے، ایثار اچھی شے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ایک شے کا بیک وقت ہونا نہ ہونا ممکن نہیں خطِ مستقیم ایک انگریز کی ٹانگ ہے دائرہ ایک ہندو حلوائی کی توند۔ یہ سب دعوے سہی لیکن ہم کہتے ہیں درست ہیں + اور اگر عقل پر چلیں تو فلسفے کے ظالم نقادوں نے تو یہاں تک سمجھا دیا ہے کہ کسی فلسفی کا قول کہ میں ہوں اور اس میں شک وشبہے کی گنجائش نہیں، محض اک بے بنیاد دعوے ہے۔ پہلے ان ستم ظریفوں نے میں کو لیا پھر ہوں کو لیا، اور پھر شاید شک اور شبہے اور گنجائش کی قلعی کھول دی + اب اگر ان عقل کے ماروں کے پیچھے ہولیں تو ہمیں سانس لینے کا حق باقی نہ رہے۔ اُدھر ان سے بچنا اور کامیابی کی امید رکھنا بھی اک امید موہوم ہی ہے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے اولیں دعوے پر قائم رہیں کہ دعوے غلط سہی لیکن ان کے بغیر گذارہ بھی نہیں + باتوں کی خاطر باتیں کم کریں بلکہ کاموں کی خاطر کام بھی کم لیکن یوں جو کچھ بری بھلی سمجھ میں آئیں باتیں بھی کہے جائیں اور جو کچھ بُرا بھلا بن پڑے کام بھی کئے جائیں اور مطمئن رہیں!

ل ب

جہاں نما

اوقاتِ فرصت کا صحیح استعمال

تہذیب و تمدن کے آئندہ دور میں اوقاتِ فرصت کی تقسیم کس اصول پر ہوگی؟ اس موضوع پر مشہور انگریز فلسفی مسٹر سی۔ ای۔ ایم جوڈ نے ایک بلند پایہ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ زمانۂ حال میں فرصت کا وقت جس طریقے پر استعمال کیا جاتا ہے اُس سے نہ مسرت کی افزائش میں مدد ملتی ہے نہ حسن، علم یا بصیرت ہی ہم کو حاصل ہوتی ہے۔ مسٹر جوڈ کے نزدیک صورتِ حالات کی وجہ یہ عام خیال ہے جو آج کل نہایت کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ فرصت کا صحیح اور موزوں مقصد اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ محض مسرت کی تلاش ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسرت کو اگر ہم براہِ راست اپنی تلاش کا مقصد بنا لیں تو نتیجہ برعکس ثابت ہوتا ہے۔ صرف وہ کام ہم کو مسرت دیتے ہیں جن میں جدوجہد کا عنصر شریک ہو۔ جدوجہد سے مراد جسمانی کاوش ہی نہیں بلکہ مسٹر جوڈ اس لفظ کے مفہوم میں زیادہ تر اُن سرگرمیوں کو شامل کرتے ہیں جو ہماری بلند ترین اور نسبتًہ تازہ ارتقا پائی ہوئی قوتوں یعنی ہمارے عقلی اور روحانی قوا کے استعمال کا تقاضا کریں۔ زمانۂ مستقبل میں فرصت کے لمحوں کو عقلی و تخلیقی مشاغل پُر کریں گے اور اُن کے درمیان گاہ گاہ ایسے وقفے آئیں گے جن میں فنونِ لطیفہ موسیقی اور دوستوں کی گفتگو سے تفریح ہوا کرے گی۔

اس موقع پر ایک اور دقت وارد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے محنت و مشقت کی زندگی سے مشروط ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کام کرنے ہی میں حقیقی نجات ہے۔ ساتھ ہی مسٹر جوڈ کا قیاس ہے کہ مستقبل کا کام مشینوں کا کام ہوگا لیکن مصیبت یہ ہے کہ مشینوں کے ساتھ کام کرنا کوئی ایسا فعل نہیں جس میں ہماری خواہشِ تخلیق کی تشفی ہو یا انسان کو اپنی کارگزاری اور محنت سے کوئی فطری مسرت حاصل ہو سکے۔ وہ شخص جو کسی کارخانے میں مشینوں کے ساتھ کام کرتا ہے اُسے لازمًا اپنی مشینوں کے ساتھ مشین بن جانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس طریقے پر طبیعت کی تازگی مردہ، انسان کی حسِ تخلیق بے جان اور روح کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ انسانی افراد مشینیں نہیں ہیں اور اُن کو مشین بنا دینا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی انسانیت کے بہت سے جوہر ضائع نہ ہو جائیں۔ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اسے ایسا کام دیا جائے جو اس کی کوشش و ہمت کے استعمال اور اس کی قابلیت کے ظہور کے مواقع اسے

بہم پہنچائے۔ اس کی عدم موجودگی میں تفریح کی احتیاج خود ایک ظلم عظیم ہے۔

اس مشکل کا حل مسٹر جوڈ کے نزدیک یہ ہے کہ انسان کو اپنی فرصت کے اوقات میں وہ اطمینان حاصل کرنا چاہئے جو اس کی کاروباری زندگی نے اس سے چھین لیا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اُن اشیا کی پیدائش میں جن کی ضرورت سوسائٹی کو اپنی اقتصادی زندگی سے عہدہ برا ہونے کے لئے پیش آتی ہے تین یا چار گھنٹے روزانہ سے زیادہ وقت صرف نہ ہو تو پھر اس حقیقت کا سمجھنا دشوار نہیں کہ اوقاتِ فرصت میں انسان کی اُن روحانی احتیاجات کی تشفی کس قدر ضروری ہے جو اُس کی خواہشِ تخلیق، جذبۂ جدوجہد اور قوتِ برداشت کا عملی اظہار چاہتی ہیں۔ ہمیں اپنے اوقاتِ فرصت میں کام کرنا لازم ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ بہت لمبی بے کاری انسان کی فطرت کو ناگوار ہے بلکہ اس لئے بھی کہ مشینوں نے ہمارا کام غصب کرلیا ہے۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ زبردست کلیں دنیا کے استعمال میں آنے لگیں گی اور انسان کی فرصت کے اوقات میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے گا تاآنکہ اس فرصت کے استعمال کا مسئلہ ایک خاص اہمیت حاصل کرے گا۔ نہ صرف انسان کی فرصت ہی بڑھ جائے گی بلکہ روزانہ کام کی مقدار کے کم ہو جانے سے انسان کی قوت و توانائی بڑی حد تک محفوظ رہے گی۔ اس دوگانہ انقلاب سے اُن چیزوں کو جنہیں آج کل محض "شغل" کہہ دیا جاتا ہے انسان کی زندگی میں ایسا غیر معمولی تفوق حاصل ہو جائے گا کہ ابھی اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ لوگ تین یا چار گھنٹے کی مشقت کے بعد جو سوسائٹی کی مادّی ضروریات کے رفع کرنے کی غرض سے ان پر عائد ہوگی تازہ دم نکلیں گے اور اپنے محبوب مشغلے یا مطالعے میں لگ جائیں گے۔

اگر فرصت کے لمحوں کو موجبِ زحمت نہیں بلکہ مسرت کا باعث بننا ہے تو پھر وہی ہوگا جس کی امید مسٹر جوڈ نے ظاہر کی ہے یعنی سنین ماضیہ کی تفتیش بذریعۂ تاریخ و علم آثارِ قدیمہ، کائناتِ مادی سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش بذریعۂ سائنس، اسرارِ کائنات میں غور و تفحص بذریعہ فلسفہ حسن کی تخلیق بذریعہ فن و ادب، اُس ریاضت و تربیت کا حصول جو طالبانِ حقیقت کے لئے ضروری ہے، یا مختصر طور پر یوں کہئے کہ عملِ تخلیق اور غور و فکر انسان کے اوقاتِ فرصت کا بیشتر حصہ لیں گے۔

ایک نیا تعلیمی تجربہ

۱۹۳۱ء میں امریکہ کی ایک مسیحی جماعت نے ایک امریکن نوجوان فریڈرک جی ولیمز کو ہندوستان بھیجا تاکہ

وہ اسنسول (بنگال) کے قریب اُس مسیحی جماعت کے قائم کئے ہوئے ایک مدرسے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔ اس طرح ایک نئے تعلیمی طریقے کی داغ بیل پڑی جس کی مثال نہ صرف ہندوستان میں بلکہ شاید ہندوستان سے باہر بھی مشکل سے ملے گی۔ اُشناگرام کے مدرسے کی تحریک اور ترقی تجربے کے اُن وسیع امکانات کی وجہ سے ہوئی جو جدید فلسفۂ تعلیم میں پنہاں ہیں۔ اس "نئے دن کے گاؤں" میں (یہ بنگالی نام کا ترجمہ ہے) خاص طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ بچے کے موجود الوقت معاشرتی ماحول کے ساتھ جس سے اسے مستقبلِ قریب میں سابقہ پڑنے والا ہوتا ہے۔ بچّے کی مجموعی اور مکمل شخصیت کا گہرا ربط و تعلق پیدا ہو جائے۔ بچے کو اس کی فضائے گرد و پیش سے خواہ وہ کتنی ہی پست کیوں نہ ہو قطعی طور پر علیحدہ کر لینے کے بجائے یہ کہیں بہتر ہے کہ اس کے دل میں اس فضا کے صحیح واقعات کا احساس پیدا کیا جائے اور ساتھ ہی یہ خواہش برانگیختہ کی جائے کہ جن حالات میں وہ اپنے آپ کو پاتا ہے ان کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ زمانہ گذشتہ میں میلان یہ رہا ہے کہ بچے کو اُس کے "خلل ڈالنے والے" حالات سے الگ کر دیا جائے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بچّے کو اُن مفاسد کی طرف رجوع کرنے سے نفرت ہو جاتی تھی جن کی اصلاح درحقیقت اعلیٰ درجے کی تربیت یافتہ اور واقفِ حال رہنما ہی کر سکتے ہیں۔ بخلاف اس کے اُشناگرام میں بچّے کو مبتدیانہ طور پر اس بات کا موقع ملتا ہے کہ اپنے معاشرتی علائق کو پہچانے اور اُن کی رہنمائی اور ترقی میں مناسب طریق پر حصہ لے سکے۔ اُشناگرام میں تعلیم کے اُس نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کا تقاضا ہے کہ زمانۂ حال و مستقبل کے رہنما اُن لوگوں کے خادم بنیں جن کے درمیان وہ رہتے ہوں۔

نمک اور سوراج

انگلستان کے شہرۂ آفاق سائنس دان پروفیسر جے۔ بی۔ ایس ہالڈین نے ہندوستان میں قانونِ نمک کی تنسیخ اور شراب نوشی کے انسداد کے متعلق مہاتما گاندھی کے مطالبات پر حیاتیات (Biology) کے نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ پروفیسر ہالڈین کہتے ہیں کہ اگر برطانیہ میں قانونِ نمک کی وجہ سے نمک کا استعمال کم ہو جائے تو اس سے بہت کم لوگوں کو نقصان پہنچے گا لیکن ہندوستان میں نمک خوراک کا ایک لاینفک جزو ہے کیونکہ کثرت سے پسینہ آنے کے باعث جسم سے بہت سا نمک ضائع ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں قانونِ نمک حیاتیات کے نقطۂ نگاہ سے اتنا ہی بے محل ہے جتنا بے محل انگلستان میں گندم پر محصولِ منشیات کا عائد کرنا معلوم ہوگا۔ پروفیسر ہالڈین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قانونِ نمک اگرچہ محاصلِ حکومت بڑھانے کا نہایت آسان طریقہ ہے لیکن یہ بداہتہً اہلِ ملک کی صحت

کے لئے ضرر رساں ہے اور اس کا نافذ رہنا از روئے حیاتیات سوراج کے حق میں ایک دلیل ہے +

لا شعاعیں اور جنسیت جنین کی تحقیق

ڈاکٹر ٹامس اور ہینیس ساکن منگین نے "امریکن ایسوسی ایشن برائے ترقی سائنس" کے ایک اجلاس میں چند عکسی تصاویر دکھائی ہیں جو لا شعاعوں (X-rays) کے ذریعے سے لی گئی تھیں۔ ان تصویروں کے ذریعے سے انہوں نے اس بات کا امکان ثابت کیا ہے کہ کسی بچے کی پیدائش سے تین ماہ قبل اس کی جنسیت کی تعیین ہو سکتی ہے۔

برٹش یونائیٹڈ پریس کے بیان کے مطابق ڈاکٹر ہینیس کا طریق عمل یہ ہے کہ نازائیدہ بچے کے ماحول میں سٹرونٹیم آیوڈائیڈ کے مرتکز محلول کی تھوڑی سی مقدار داخل کی جاتی ہے۔ یہ دوا مقابلۃً بے ضرر اور لا شعاعوں کے لئے غیر شفاف ہے۔ اس طرح ایک لا شعاعی تصویر کامیابی کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہینیس کے نزدیک اس سلسلے میں تعیین جنسیت سے کہیں زیادہ اہم ایک اور حقیقت ہے۔ اُن کا طریقہ اس امر کا فیصلہ کرنے میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ بچے کے بخیریت پیدا ہونے کے لئے کسی خاص علاج کی ضرورت تو نہیں ہے +

ہندی کی رفتار ترقی

مئی کے آخری ہفتے میں آل انڈیا ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس کلکتے میں زیر صدارت پنڈت جگن ناتھ رتنا کر بنارسی منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں اُن وجوہ پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے بحث کی گئی جن کی بنا پر ہندی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے۔

بابو راجندر پرشاد نے ہندی ادب پر کانفرنس کے سامنے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ زبان کی وسعت اور سرمائے میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ آپ نے کہا کہ گزشتہ سیاسی تحریک کی وجہ سے ہندی شاعری کا سرمایہ بے حد شاندار ہو گیا ہے۔

کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یونیورسٹیوں اور تعلیمی جماعتوں پر زور دیا گیا کہ ہندی کے مفاد کا خاص خیال رکھیں اور بنگالی والدین سے استدعا کی گئی کہ اپنے بچوں کو ہندی بحیثیت ایک ثانوی زبان کے پڑھائیں۔

ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے بیس ارکان کی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس میں اصحاب ذیل بھی شامل تھے مسٹر درگا پرشاد مسٹر سبھاش بوس مسٹر جے ایم سین گپتا مسٹر ہرشوتم رائے۔ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی (کلکتہ یونیورسٹی)

چین کی دیوارِ عظیم

ماہرینِ علمِ نجوم کہتے ہیں کہ چاند سے کرۂ زمین پر انسانی صنعت کا نمونہ اگر کوئی دیکھا جا سکتا ہے تو یہی چین کی عظیم الشان دیوار ہے۔ اس حیرت افزا عمارت کی ضخامت کا سطحی اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر اس جملہ سامان سے جو اس کی تعمیر میں استعمال کیا گیا خطِ استوا پر کرۂ زمین کی حلقہ بندی کی جائے تو ایک آٹھ فیٹ اونچی اور تین فیٹ موٹی دیوار تیار ہو جائیگی۔ سنہ ۱۷۹۳ء میں لارڈ میکارٹنی کے ایک سفیر نے تخمینہ کیا تھا کہ اس دیوارِ عظیم میں ممالکِ متحدہ (امریکہ) کی مجموعی عمارتوں سے کہیں زیادہ تعداد پتھروں اور اینٹوں کی موجود ہے۔

مورخین اس جلیل القامت فصیل کا دنیا کی سات مشہور عجائبات میں بطور آٹھویں کے اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے استحکام اور قدامت نے اپنے سب ہم جلیسوں کو نیچا دکھا دیا بجز ایک ہرم کوفو کے جو بمقام غیزہ واقع ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ بابل کے معلق باغات کی بس یاد ہی یاد باقی رہ گئی ہے۔ ماسولس کا وہ مقبرہ جو ایک غمگین بیوی کی جیتی جاگتی نشانی تھا دستبردِ زمانہ سے بے نشان ہو گیا۔ افیسس میں ڈائنا کے شاندار مندر کا فقط پتہ دینے کے لئے جو کچھ بچا ہے وہ سینٹ صوفیہ کے بعض راستہ میں چند ستون ہیں اور بس۔ فیڈیاس کے جوپیٹر اولمپس کا نام و نشان مٹ گیا۔ فاروس کا کلاک ٹاور لائٹ ہاؤس وقت سے کامل ڈیڑھ ہزار سال نبرد آزما رہ کر بالآخر شکست کھا گیا۔ رہوڈس کا پیتل والا کلوسس زلزلہ سے پاش پاش ہو گیا، اور اُس کو عربی بدو نوچ کھسوٹ کر رفتہ رفتہ چٹ کر گئے۔

زمانۂ سلف کے دیگر شاہکاروں سے چین کی دیوارِ عظیم میں یہ امتیازی فرق ہے کہ اس کی تعمیر ایک مفید مطلب پیشِ نظر رکھ کر عمل میں آئی۔ لیکن بقیہ اور تمام (بجز فاروس) نمود بے معنی عمارتیں ہیں حد سے متجاوز وسعت اور بڑائی کی یا پھر نظر نواز غیر مستحکم نزاکتوں کی۔ اس دیوار کی اہمیت بہرحال مسلّمہ ہے۔ کیونکہ اس کا وجود اُن وحشی قوموں کے لئے حدِ فاصل بن گیا جن کے دماغوں میں چین کی فتح کا جنون ہر وقت سما رہتا، اور جس کے سبزہ زار اور نخلستان دیکھ دیکھ کر اُن کے منہ میں ہمیشہ پانی بھر آیا کرتا تھا۔ اُس زمانہ میں جب کہ حملہ آوروں کا سامانِ حرب تیر و کمان، برچھی اور

بھالوں پر ہی موقوف تھا یہ تجویز مضحکہ خیز ہرگز نہ تھی ۔ سچ پوچھئے تو اُس وقت اینٹ پتھر ہی اُن فوجوں کے حملہ کی روک میں جن کی ترتیب ایک آوارہ گرد، خانہ بدوش رسالے کی مانند ہوتی بہترین ڈھال کا کام دے سکتے تھے ۔ چین کی تاریخ میں کم و بیش پانچ صدی قبلِ حضرتِ مسیح ایسی دیواروں کا تذکرہ موجود ہے جو یا تو متخاصم جاگیردار سلطنتوں کی تقسیم کے لئے یا ان کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کی جاتی تھیں ۔ اس لئے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ ان قدیمی دیواروں کے وہ حصے جن کے ٹوٹے پھوٹے نشانات اب بھی صوبجات چیلی اور شانٹینگ کے گرد و نواح میں موجود ہیں چین شی ہوانگ ٹی نے اپنی اس طویل فصیل میں شامل کر لئے ہوں جس کی ابتدا ساحلِ بحر پر "شان ہیکوان" سے ہوتی ہے اور اختتام منچاؤ پر ۔ اس خیال سے تاکہ اپنی ذاتِ خاص اور اپنی سلطنت کو اُن وحشی اقوام کی دست درازیوں سے نجات دلا سکے جن پر میدانِ کارزار میں فتح حاصل کرنے کے لئے وہ ایک عرصہ سے ناکام کوششیں کر رہا تھا ۔

اس کی ابتدا حضرتِ مسیح سے دو سو انیس سال قبل ہوئی اور تکمیل ۲۰۴ سال قبل ۔ اس طرح گویا کامل پندرہ سال اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا جن میں سات سال اس جلیل القدر بادشاہ کی وفات کے بعد کا زمانہ ہے ۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس جدّتِ تخیل کا سہرا "تا قیامت اس کے سر رہے گا اور یقیناً ہر ملک اور قوم ایسی نظیر پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گی جس میں اس قدر دولت اور انسانی محنت کام میں لائی گئی ہو ۔ بھلا خیال تو فرمائیے کہ نہ صرف تین لاکھ فوجوں نے اس میں کام کیا بلکہ لڑائی کے تمام قیدی، ملک کے سزا یافتہ بدمعاش اور حکومت کے بے وفا، نمک حرام افسر سب کے سب اس میں جھونک دیئے جاتے تھے ۔ اس سوال کا جواب آج تک صیغۂ راز میں ہے کہ ان جاہل، اکھڑ مزدوروں اور راجوں نے اپنے مختصر دقیانوسی اوزاروں سے کیونکر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ اور بے چاروں نے آخر کون سا انتظام کیا تھا اُن جسمانی تکالیف کے دفعیہ کا جو اُن کے لئے ناہموار پہاڑ کی اونچائیوں اور بے ترتیب گھاٹیوں کی گہرائیوں نے پیش کی ہونگی ۔ علاوہ بریں اس جمِ غفیر کے لئے خوراک رسانی کی دقتوں کے متعلق اس بیان سے اندازہ ہوگا کہ اناج کے ایک سو بیاسی بوروں میں سے صرف ایک بورا جائے مقصود تک پہنچ سکتا تھا بقیہ یا تو راستے میں صرف ہو جاتے یا سڑکوں گذرگاہوں میں بیچ لئے جاتے تھے ۔ افسوس یہ ہے کہ اس کی لاگت کے متعلق کوئی فردِ حساب ڈھونڈے نہیں ملتی ۔

ایک پست ہمت، کمزور طبیعت انسان کے لئے اتنی زبردست اور اہم تجاویز کا وہم بھی بعید از قیاس تھا جو بظاہر حملہ آوروں سے نجات دلانے کے لئے ایک مفید شے مانی جا سکتی تھی مگر جس کی تکمیل میں انسانی تکالیف کی انتہا بھی نمایاں تھی ۔ چین کی تاریخ کیا بلکہ دنیا کی ہر تاریخ چن شی ہوانگ ٹی سی زبردست اولوالعزم اور ایک مخصوص طبیعت

رکھنے والی ہستی پیش کرنے سے قاصر رہے گی جس نے انسانی کوشش، ہمت اور صنعت کی ایک ایسی فقید النظیر مثال چھوڑی جس سے دوسرے ایشیائی بادشاہ واقعی مجبور رہے۔ علاوہ بریں چن شی ہوانگ ٹی ایک ایسا خود سر بادشاہ تھا جس نے چین کی ایک معتدبہ تعداد حریف ریاستوں کے درمیان ۲۴۶ سے ۲۱۰ قبل حضرتِ مسیح بالآخر سلسلۂ اخوت قائم کرا کے چھوڑا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ چین کے اُن مستند تاریخ دانوں نے جن کا رجحانِ طبیعت اپنے ملک کی اولوالعزم ہستیوں کے کارنامے اور عادات و خصائل بیان کرنے میں قطعِ نظر اس کے کہ وہ بری ہوں یا بھلی مگر ساتھ ہی ان کے وجوہ پیش کرنے میں ایک عجیب غفلت اور لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے مائل بہ سنگدلی رہا ہے اس جلیل القدر بانیٔ سلطنت کے نام کو لعنت و ملامت کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ایک مرتبہ اس نے تمام مستند صحائف کو جلا کر خاک کر دیا اور پورے پانچ سو ادبا و علما کو اس خطا پر زندہ دفن کرا دیا کہ مؤخر الذکر اس کو سب سے پہلا بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس کے دعوے پر نکتہ چینی تک کی ہمت کر بیٹھے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت پر اس نے صبر و سکون سے کام لے کر اس وحشیانہ سلوک کی بجائے اگر کوئی دوسرا طریقہ ان کی سرکوبی کا اختیار کیا ہوتا تو اپنا دامن اس ہمیشہ کی بدنامی سے یقینی بچا لیا ہوتا۔ مگر اس کا خیال تو یہ تھا کہ علما و فضلا واقعی حکومت کے نشیب و فراز سے ناواقف ہوتے ہیں ـــــ ایسی فرضی حکومت سے نہیں جس کا دارومدار محض تصورات اور اعتقادات پر قائم ہوتا ہے بلکہ ایسی حقیقی اور اصلی حکومت سے جس میں رعایا کو اپنے حقوق و فرائض کا پابند بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی نالائق سے نالائق بادشاہ نظامِ حکومت کے لئے ایسے متضاد اصول قائم کرنا گوارا نہ کریگا۔ جو اس کے ملک کی قسمت پر ہزار ہا سال کے لئے قابض و دخیل ہو کر ایک طرف تو شاہی اقتدار کے قیام و استحکام کے لئے پابندیاں عائد کریں اور دوسری طرف وزرا اور ارکان کو سر چڑھنے کا موقع دیں۔ اُس نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے جو نقوشِ رہنمائی چھوڑے وہ زیادہ مستحکم اور غیر فانی ثابت ہوئے۔

اپنی سُتواں لمبی ناک، پھٹی پھٹی آنکھیں، کبوتر کا سا سینہ، بھیڑیے کی سی آواز، شیر کا سا دل اور اپنی حریص، شریر اور خوشامد پسند طبع کے ساتھ، جیسا کہ مورخین اس کی تصویر کشی کرتے ہیں، چن شی ہوانگ ٹی چین کی معروف العصر افواج کا مسلمہ سردار تھا۔ گو بذاتِ خود وہ کوئی زبردست سپاہی نہ تھا مگر ہاں اپنے ہم جنسوں کا خون بے دردی سے بہانے میں نہایت مشتاق تھا۔ اس کی قابلیت کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کہ چین میں سب سے پہلے وہ ایک باضابطہ فوج ترتیب دینے میں کامیاب ہوا۔ ایسی فوج جس میں ہزاروں لاکھوں نفوس سامانِ جنگ سے آراستہ و پیراستہ اس کی محبوب ترین دیوارِ عظیم کی محافظت پر مامور تھے۔

چین شی ہوانگ ٹی اور اُس کی دیوارِ عظیم کے متعلق آج تک کچھ عجیب و غریب افسانے اور روایات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ غالباً اس میں سب سے زیادہ لطیف قصّہ اُس کے طلسمی سفید گھوڑے کا ہے جس کو اس فصیل کی داغ بیل ڈالنے کا ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بے لگام گھوڑا چوکڑیاں بھرنے کے لئے آزاد تھا۔ جس طرف جاتا معمار اس کے پیچھے ہو لیتے۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ فلک بوس پہاڑوں پر چڑھتا ہے یا نشیب میں تحت الثریٰ تک جاتا ہے یا اور ایسے دشوار گذار مقامات پر جہاں کسی طلسمی طاقت کے علاوہ دوسری شے کا گذر بعید از قیاس اور ناممکن تھا۔ اتفاقاً ایک موقع ایسا بھی آگیا جہاں یہ لوگ اس گھوڑے کا تعاقب نہ کر سکے۔ چنانچہ کچھ دیر پریشان و سرگردان رہ کر انہوں نے مجبوراً ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا اور چائے وغیرہ کے مشغلے سے دفع الوقتی کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک کالی آندھی کا طوفان نمودار ہوا جس کی تاریکی میں گھوڑا اور اس کے نقشِ قدم سب ہی غائب ہو گئے۔ طوفان کے بعد چائے نوشی سے فراغت پا کر ان لوگوں نے کم و بیش دس میل کی چھان بین کی لیکن گھوڑے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بالآخر ایک گروہ کو پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر تفتیش اور سراغرسانی کے لئے بھیجا۔ انہوں نے ہر طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ جنوب مغربی سمت میں بہت دور فاصلہ پر گھوڑا ایک مخالف سمت کی طرف گامزن ہے۔ چار ناچار معماروں نے اپنا آخری سلسلہ منقطع کر دیا اور پڑاؤ پر واپس آ کر اسی سمت کی سیدھ میں ایک نئی دیوار چالیس لی لمبی بنانی شروع کر دی (چینی لی انگریزی میل کا تقریباً ⅓ حصہ ہوتا ہے) جس کا وجود آج بھی اس افسانہ کی تصدیق کا شاہد ہے۔

دوسری روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ جنت کے کسی رحیم و کریم خدا نے جب اتفاقاً ایک بار نیچے نظر کی اور اُن معماروں کی مصائب و تکالیف کو دیکھا جن میں صدہا تو موت سے ہم آغوش ہو کر اپنے جسمِ خاکی کو پیوندِ دیوار کر چکے تھے اور صدہا محنت دفاقہ کشی کی بدولت لبِ دم ہو رہے تھے تو بے حد متاثر ہوا۔ چنانچہ خدائے مذکور نے ان لوگوں پر ترس کھاتے ہوئے ہر ایک کو ایک طلسمی دھاگا عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ اس کو اپنی اپنی کلائیوں پر باندھ لیں۔ اس عمل نے مصیبت زدگان میں ایک غیر معمولی ہمت و طاقت ودیعت کر دی جس کے بعد وہ بادشاہ کا ہر پہلو سے اطمینانِ کلی کرانے میں کامیاب ہو سکے۔ بادشاہ نے متحیر و ششدر جب یہ دیکھا کہ کس غیر معمولی عجلت و جفاکشی کے ساتھ تعمیر کا کام انجام پا رہا ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے پر اس کو اس طلسمی دھاگے کا سارا قصّہ معلوم ہوا۔ اُس نے ان سب کو طلب کیا اور ان کے روبرو اپنی طلسمی چابک کی ایک ہوائی ضرب لگائی جس کے بعد صدہا معجزات نمودار ہونے لگے بادشاہ کے ایک اشارے پر پہاڑ کی بلندیوں نے سرِ نیاز خم کر دیا۔ دریائے زرد بادشاہ سلامت کی دیوارِ عظیم کو راستہ دینے کے لئے آب بستہ ساکن ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

چن شی ہوانگ ٹی کا یہ تودۂ خاک اور اس کے جملہ مینار اور برجیاں باوجود ان تمام مصائب اور تضیعِ اوقات کے جلد ہی نیست و نابود ہو گئیں۔ حضرت مسیح کے بعد چھٹی صدی میں اس کے بظاہر اسی قدر نشانات باقی رہ گئے تھے کہ خاندانِ وی اور سی نے جو شمالی چین میں ۳۸۶ء سے ۵۷۷ء تک برسرِ حکومت رہے ہمیشہ اس کی تعمیرِ جدید کا ہی ذکر کیا نہ کہ کسی حصہ کی مرمت وغیرہ کا۔ انہوں نے ایک جدید سلسلے کا اضافہ کیا جو پیکن اور کالگن کے درمیان اب بھی موجود ہے۔ ایک اَور سلسلہ بھی جو شانسی ہوتا ہوا جنوب کی طرف دوڑ گیا ہے انہی کی یادگار ہے۔ موخر الذکر سلسلہ جنوبی روس کے میدانوں سے حملہ آوروں کو روکنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ ۱۲۶۵ء سے ۱۳۶۸ء تک جب کہ خاندانِ منگول سلطنتِ چین پر مالک و قابض رہا، اس دیوارِ عظیم کا صفحۂ تاریخ پر کہیں ذکر بھی نہیں آیا۔ اُس زمانہ میں اس کا وجود چنداں مفید تصور نہ کیا جاتا تھا کیونکہ فاتح اپنے خاندان اور کفو کے خلاف محافظت کے ذرائع کے متلاشی نہ ہوتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اس سے ایسی عدم توجہی برتی جاتی تھی اور اس درجہ تعلقات منقطع ہو چکے تھے کہ مارکو پولو جیسے سیاح نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھا۔ مگر منگ خاندان نے جس نے ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک حکومت کی چنگیز خاں کے والی وارثوں کو نکال باہر کیا تو اس دیوارِ عظیم نے پھر اہمیت اختیار کر لی۔ اپنے زمانۂ حکومت کے پورے ۲۷۶ سال تک ان کو اپنی سلطنت شمالی وحشیوں کے متواتر حملوں سے بچانا پڑی جن کو بارہا اپنی حدود سے باہر کر دینے کے بعد بھی یہ کبھی نہ ہو سکا کہ اُن کے وقت بے وقت کے چھاپوں اور حملوں کا سدِّباب ہو جائے۔ اس لئے یہ فصیل اُن کی محافظت کے لئے ایک نہایت ضروری شے بن گئی۔ چنانچہ چین کے معصر مورخین نے اُس کی تمام و کمال مرمت کا نہایت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ کس طرح تمامی سلسلہ از شین ہیکواں تا قلعۂ چایوکوان جو شمالی سرحد پر صوبہ جات کنسوا اور سن کیانگ (مشرقی ترکستان) میں واقع ہے مرمت پذیر رہا۔ اور اس کے استحکام کے لئے ۱۴۷۰ء سے لے کر ۱۵۹۲ء تک برابر جدید سلسلے اضافہ ہوتے رہے۔

اس دور کی تمام تجدید اور اضلاع نہایت مضبوط اور مستحکم تھے بلکہ ایک حد تک شاندار بھی۔ طویل سلسلوں کی پختہ اینٹوں سے حد بندی کی گئی تھی، اور مزید استحکام کے لئے پتھر بھی استعمال کئے گئے تھے۔ مسٹر ولیس ولیمس اپنی معروف کتاب مڈل کنگڈم میں لکھتے ہیں کہ "مشرق کے تمامی سلسلہ میں دیوار کا زیریں حصہ ۲۵ فیٹ اور بالائی حصہ ۱۵ فیٹ چوڑا بنایا گیا تھا۔ اونچائی ۱۵ سے ۳۰ فیٹ قائم کی تھی۔ اوپر کی سطح پر اینٹوں کا کرنجا اور دورویہ منڈیر بنا کر محفوظ کیا گیا تھا۔" حقیقۃً منگوں کے زمانۂ سلطنت ہی میں یہ دیوارِ عظیم اصلی معنوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی

جس میں بیس ہزار مینار تو بطور چھوٹے قلعوں کے کام دیتے تھے اور دس ہزار بطور نشانِ رہنمائی۔

تقریباً ہر ایک حکومت نے محافظت کے جدید سامان تعمیر کرلئے مگر بسا اوقات جیسے بزمانہ چنگ ٹنگ (۱۴۳۵ء لغایت ۱۴۵۰ء) یہ غیر مفید ثابت ہوئے۔ اس کے جانشین جنگ ٹائی کو جس نے ۱۴۵۰ء سے ۱۴۵۷ء تک حکمرانی کی حملہ کی ہزیمتوں سے نجات نہ مل سکی۔

چنگ ہوا (۱۴۶۵ء لغایت ۱۴۸۸ء) کے زمانہ میں ایک تجربہ کار جنرل نے شاہ کی خدمت میں عرضداشت روانہ کرتے ہوئے اطلاع دی کہ دیوار ہذا کے تین سو میل کی نگہبانی کے لئے اس کے ماتحت جو پچیس لشکر گاہیں ہیں اور جن میں ایک سو سے لے کر دو سو تک نفوس شامل ہیں ناکافی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ عملی صورت میں تنہا ایک شخص کا دن رات دو سو گز فاصلے کی نگہبانی کرنا ناممکن سا ثابت ہوچکا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے ایما سے اُس نے سپاہیوں کو عطیۂ زمین کا لالچ دے کر جلد ہی اُن کی ایک معتدبہ تعداد بھرتی کرکے نہایت زبردست فوجی طاقت قائم کرلی۔ یہ ترکیب بعد کو کچھ ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ فوجوں کی فوجیں بلالحاظ دوریٔ وطن یا قواعد کی دیگر ایسی پابندیوں کے جن کی رو سے ان کو آندھی، پانی خواہ کسی حال میں بھی ہوں اُف کرنے کی اجازت نہ ہوسکتی تھی۔ سپاہی جو قلعہ بند لشکر گاہوں میں رہتے تھے باری باری چند ہفتوں کے لئے دیوار پر پہرے کا کام انجام دینے کے لئے جاتے اور چونکہ یہ ایک کاشتکار قوم تھی اس لئے وہاں سے سبکدوش ہونے پر پھر اپنی زمین کی کاشت میں مصروف ہوجاتے تھے۔ بعض کو تو اس زندگی سے ایسا عشق ہوگیا کہ فوجی ملازمت سے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی اسی مقام کو اپنی جائے اقامت قرار دے دیا۔ قطع نظر ان باتوں کے کہ ان کو اپنے ہل اور ہنسئے چھوڑ کر بوقتِ ضرورت برچھی اور بھالے استعمال کرنے کے لئے سینہ سپر اور ہوشیاری کا نشان روشن کرنے پر آمادہ و مستعد رہنا پڑتا تھا، نہایت قلیل تنخواہ دی جاتی تھی۔ اُن کا ذریعۂ معاش زیادہ تر اُن کی محنت اور قوتِ بازو ہی پر تھا۔

چینیوں کو چونکہ بارود کا استعمال عرصۂ دراز سے معلوم تھا اس لئے دیوار کی محافظت میں فوجوں کے ساتھ کچھ بے ڈھنگی توپیں بھی رکھی جاتی تھیں۔ ان قدیمی اسلحہ میں سے چند تپائیوں پر آراستہ کرکے پہاڑ کی واضع اور مناسب چوٹیوں پر چڑھا دی جاتی تھیں۔ مگر باوجود ان کے وان لی کی بادشاہت کے زمانہ میں (۱۵۷۳ء لغایت ۱۶۲۰ء) ایک تاتاری سردار مقام کو فکو سے در آیا اور چیلی پر حملہ کر بیٹھا۔ اس کے بعد عیسائیوں کی آمد پر بادشاہ نے ان کو جدید بہترین توپیں ڈھالنے کی خدمت سپرد کی جس کو انھوں نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور بادشاہ

کی ایسی نظر پڑھیں کہ پادریوں کو گریٹ جنرل کا خطاب عطا ہوا اور فوجی افسران کو ان کی سلامی کے قانونی احکامات صادر کر دیئے گئے۔ منچوؤں کی آمد کے بعد اس دیوارِ عظیم کی ایسی ردی اور غیر حالت ہوگئی کہ عیسائی پادری رگیس نے جو حسب الحکم شاہ کانگ ہی ۱۷۰۸ء سے ۱۷۱۶ء تک سلطنت کا نقشہ تیار کرنے کی غرض سے سفر کرتے رہے لکھا ہے کہ صوبہ چیلی میں اس کی اینٹوں کے اب نشانات ہی باقی رہ گئے ہیں جہاں کسی وقت میں اُس کی اونچائی ۲۰ سے ۲۵ فیٹ تک تھی اور جس میں پانچ معروف دروازے یا قلعہ بند راستے بمقام شین ہیکوان ۔ سیفنگکو ۔ کونکو ۔ ٹونہنکو اور چانگ چو (کالگان) تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "شانسی کے شمالی علاقہ میں ساری دیوار مٹی کی بنی ہوئی ہے اور تقریباً پانچ فیٹ اونچی ہے۔ شانسی کے مغربی جانب اس کی صورت مٹی کی ایک معمولی فصیل کی سی ہوگئی ہے اور بعض جگہ تو محض ریت کا ڈھیر ہی معلوم ہوتی ہے۔ کانسو میں سوچاؤ اور چیوکوان کے درمیان اس کی حالت ہاں کچھ بہتر ہے۔ اس کے آگے تبتی سرحد پر سننگ کی طرف خود پہاڑ فصیل کا کام دیتے ہیں مگر اُن کی چوٹیوں پر بھی دیوار کی داغ بیل موجود ہے۔

اس بیان کی تصدیق فادر گربیلن نے دیوارِ عظیم کی بوسیدگی کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے یُوں کی ہے کہ "ماچوؤں نے بعید علاقوں سے سلسلوں کی مرمت و پرداخت کو تو قطعی نظر انداز کر دیا مگر اپنی توجہ دار السلطنت کے قریبی سلسلوں، شاہی مقبروں اور اُن پھاٹکوں تک قائم رکھی جو شاہراہ عام کے کام آتے تھے۔ اپنے تنزل اور زوال سے ہم آغوش دیوارِ عظیم پھر بھی ایک عظیم الشان کارنامہ اور یادگار رہے جو ایک معمولی سے معمولی دماغ پر بھی اپنا زبردست اثر اور رعب قائم کر دیتی ہے۔

جس نے ایک مرتبہ دیکھ لیا پھر تاحیات بُھول نہیں سکتا۔ تصورات کی دنیا میں تو اس کا خاکا کھینچنا بھی امرِ محال ہے، کیونکہ وین لی چانگ چنگ یا میریاڈلی جیسا کہ چینیوں نے اس کا نام رکھ چھوڑا ہے تقریباً ایک ہزار دو سو پچاس میل لمبی بالکل سیدھی چلی گئی ہے۔ اور اگر اس کے گھماؤ اور پھراؤ بھی شمار کر لئے جائیں تو لمبائی تقریباً دو ہزار میل تک پہنچ جاتی ہے۔ دیوار کا ایک سرا شین ہیکوان کے قریب سمندر کے کنارے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر کے وقت چونکہ چین والوں کو کسی بحری بیڑے کا خوف ہی نہ تھا اس لئے ساحلِ سمندر پر فصیل بندی کرنا غیر ضروری سمجھا گیا۔ عمیق سمندر خود ہی قدرتی طور پر ذریعۂ محافظت بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوارِ عظیم سطحِ آب سے اُٹھ کر مغربی جانب سطحِ زمین پر بڑھتی چلی گئی ہے۔ سمندر کی جانب دیوار کا ابتدائی حصہ نہایت درجہ نظر نواز اور جاذبِ توجہ ہے، جہاں بڑے بڑے پتھروں نے لہروں کی ٹکر اور ہوا کے تھپیڑوں سے کٹ کٹا کر کچھ عجیب ہیبت اور صورت

اختیار کرلی ہے۔ دیوار کے گھماؤ سے آگے چل کر قریب ہی سفید فانوسی منارہ ملتا ہے جس کو دیکھتے ہی مشرق و مغرب کے ارتقا کا فرق پیش نظر ہو جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے سرچ لائٹ کی تیز آنکھیں اُس گنبدِ قدیم کو دیکھ کر حیرت و استعجاب سے بار بار کھلتی اور بند ہو ہو جاتی ہیں جو سمندر سے دو میل دُور اُس مقام پر واقع ہے جہاں چین کی دیوارِ عظیم شن ہیکوان کی شہر پناہ سے واصل ہوئی ہے۔ شن ہیکوان نہ تو مشہور اور نہ کوئی ایسا بڑا شہر ہے مگر ہاں کسی زمانہ میں اس کی اہمیت پر شمالی چین کے علاقہ کا دارومدار تھا۔ یہی جگہ ہے جہاں کامل تیس سال تک مانچو محصور رہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ۲۶ مئی ۱۶۴۴ء کو ڈوسین کیوئی نے بادِ سموم کے جگر سوز طوفان میں کئی گھنٹے کی بے پناہ لڑائی کے بعد لی زو چنگ اور اس کی فوجِ عظیم پر فتح پائی تھی۔ اس اولوالعزم سردار نے جب للکار کر یہ کہا تھا کہ "اگر اب بھی ہر شخص حتی الوسع پوری کوشش اور ہمت کر جائے تو میدان ہمارے ہاتھ ہے" تو اس کی فوج نے ایسا جان توڑ حملہ کیا جو مآلِ کار مملکتِ چین میں مانچو سلطنت قائم ہونے کا سبب بن گیا۔

وہ مقام جہاں پہلے لڑائی کے طبل و چنگ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی آج ریل گاڑی کی سیٹیوں سے گونجا کرتی ہے۔ ریلوے لائن کی ایک شاخ دیوارِ عظیم کو توڑ کر نکالی گئی ہے۔ ریلوے لائن نکالنے کے لئے دیوار میں چھید کرنے کا خیال یقیناً ایک خاص جوش و خروش کے ماتحت ترک کر دینا پڑا ہوتا مگر کاشتکاروں نے یہ سراغ دے کر کہ اس آہنی گھوڑے کے راستے کے لئے دیوار میں ایک روزن موجود ہے ریلوے والوں کی مشکل آسان کر دی اور ساتھ ہی انہوں نے ایک عجیب اور پُر لطف قصہ اس شہزادے کی بابت جس کو چین شی ہوانگ ٹی نے تعمیرِ دیوار پر متعین کیا تھا یوں بیان کیا کہ ایک روز یہ شہزادہ دفعتہً غائب ہو گیا (جیسا کہ اس زمانہ میں اکثر ہوا کرتا تھا) چنانچہ اس کی حسین اور باوفا بیوی دیوارِ عظیم کے آس پاس تلاش یار میں دیوانہ وار پھرا کرتی۔ صدہا قسم کی مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلنے کے بعد بالآخر اس کو معلوم ہوا کہ اس کا جاں باز شوہر لقمۂ اجل ہوا اور اس کی نعش کہیں پیوندِ دیوار کر دی گئی۔ اس خبرِ وحشت اثر سے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گرنے والی ہی تھی کہ فضائے بسیط سے ایک پری نمودار ہوئی جس نے اس کو اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر ہوش میں لانے کی تدبیر کی اور پھر چلتے وقت اس کو ہدایت کی کہ اپنا داہنا ہاتھ کلائی سے کاٹ ڈال۔ زخم سے جس طرف خون کے فوارے نکل کر بہیں ادھر جا اور ڈھونڈ۔ اُس نے حسب ہدایت عملدرآمد کیا۔ قطرہ ہائے خون اس کو اُس جگہ لے گئے جہاں اس کی جانِ آرزو دیوارِ عظیم کے ایک معجز نما روزن میں دراز تھی"۔

یہ روزن اس واقعہ کی یادگار کے لئے قرن ہا قرن تک بند نہ کیا گیا، مگر یہ بدنصیبی ایک معمولی ریل کی سڑک کی قسمت میں تھی جس نے اس نشانِ محبت کو بے نشان کر دیا جہاں محبت کی دیوی حسین مگر نامراد شہزادی نے اپنے شوہر

کو مردہ پایا تھا۔ ان افسانہائے معصوم کی تفتیش تو آسان ہے مگر ان کی بجائے ان واقعات اور نشانات کی دوسری مناسب توضیح یقیناً نہایت دشوار!

شین ہیکوان کے بعد ہی دیوار عظیم کا رخ پہاڑوں کی طرف پھر گیا ہے جہاں سے وہ متواتر تین سو میل اس طرح چڑھتی چلی گئی ہے کہ کسی میدان یا ہموار جگہ پر اس کا قدم نہیں پڑا بلکہ انتہا پر پہنچ کر تو سطح سمندر سے تقریباً ایک میل اونچی ہو گئی ہے کسی چھجے کی طرح باہر نکلے ہوئے حصۂ فصیل پر جو بالکل سینما ہال کے بالائی بکسوں کے مشابہ ہوتا ہے کھڑے ہو کر میدانوں کے نخل و گل زار، پانی کی نقرئی چادریں، یا اوپر کی طرف پہاڑی چوٹیوں کا وہ دلربا نظارہ جس پر کسی مجلسرا کی ممٹی یا کلس کا دھوکا ہوتا ہو واقعی غایت درجہ دلچسپ اور حیرت افزا ہوتا ہے۔ وہ سیاح جو صبر وسکون کے ساتھ اس کی طوالت کا ساتھ دے جاتا ہے اس جگہ متواتر کئی روز شاندار مناظر سے لطف اندوز رہتا ہے۔ ایک انتہائی غیر حساس طبیعت بھی ان سبز و شاداب پہاڑوں کے سلسلوں، اُن کی تاجدار چوٹیوں اور نیچی گہری گھاٹیوں کے روشن اور تاریک حصوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی بلکہ ایسے دلوں پر جو نشان عظمت وجلال اس حصۂ دیوار کا ثبت ہوتا ہے وہ برتر از وہم و گمان ہے۔ الفاظ قاصر ہیں اُس مخصوص ادائے شان و عظمت کے اظہار سے جن کو نمایاں کرتی ہوئی چین کی دیوار عظیم پہاڑ کی چوٹیوں پر اٹھلاتی چلی گئی ہے، جس میں سطوت و جبروت کا ہیبت ناک نظارہ بھی ہے اور ساتھ ہی کامل سکوت اور امن کی تصویر بھی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کی حقیقت ہمارے اعلیٰ ترین تصورات سے بھی برتر ہے جس قدر زیادہ غور اور انہماک سے دیکھا جاتے اسی قدر حیرت و استعجاب بڑھتا ہے۔ اس کے زیر سایہ ایک ہزار میل کا طویل سفر طے کرنے پر بھی آپ کو اس جلیل القدر فصیل کے انداز اور تناسب کا پتہ نہ چلے گا جو بے خوف و خطر اپنا سر اٹھائے سینکڑوں ہزاروں میل ویران اور سنسان مقامات میں چلی گئی ہے۔ دیوار کے بیشتر حصے ایسے ہیں جہاں دور دور نہ تو کوئی آبادی ہے نہ کسی آدم زاد کا پتہ نشان ملتا ہے۔ اور جہاں مستقل طور پر خموشی حکمران ہے۔ ان ویران مقامات کے دشوار گذار چڑھاؤ اتار پر کسی فاتح کا قدم رکھنا قدرتی بات تھی کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا ہوتا۔ اس لئے ایسے مقامات پر جہاں عدم رسائی کے اسباب ہی محافظت کے ضامن تھے تعمیر فصیل بظاہر تضیع اوقات کے مترادف معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں دیواریں دفعتہً سینکڑوں فیٹ نشیب شروع ہو گیا ہے کیونکہ پہاڑی سلسلے نے ہی ایسی صورت اختیار کر لی ہے بعض مقامات تو ایسے مخدوش آجاتے ہیں جن پر بلا رسی وغیرہ کے سہارے اترنا چڑھنا مشکل ہے۔ قرب و جوار بسا اوقات جسیم پتھروں کی آڑ میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ معمولی فاصلے سے یہ امتیاز کرنا کہ دیوار کہاں سے شروع ہے اور پہاڑ

کہاں ختم مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ مگر ایک شوقین سیاح کو ان ہولناک مقامات کی چڑھائیوں کی سخت ترین تکالیف کا نعم البدل ایسے جدید انکشافات میں ملتا ہے جہاں تک پہنچنے یا جن کو معلوم کرنے کا فخر اس سے قبل اگر کسی کو نصیب بھی ہوا ہو تو ایسے انگنے گنے دو ہی چار لوگ نکلیں گے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ایسے ویران مقامات پر چین کی فوج مستقل طور پر قیام پذیر رہتی تھی اور کس طرح ایک سنتری تن تنہا دور دراز فاصلے تک اس عالمِ تنہائی میں محافظت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ خاص کر یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ اُس زمانہ میں خطرے کے وقت فوج کو اطلاع دینے یا اور لوگوں کو آگاہ کرنے کا ذریعہ اگر کوئی تھا تو محض فانوس دار مینار۔

زیریں سطحات پر دیوار کے قرب وجوار میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں، جہاں ایک بھولے بسرے مسافر یا سیاح کو وہاں کے بدھ مندر کے مسافر خانے میں شب گذاری کا موقع مل جاتا ہے۔ مبارک ہے، وہ گاؤں جو کسی دریا یا جھیل کے کنارے آباد ہے اور خوش قسمت ہے وہ مسافر جس کو وہاں کچھ دن ٹھہرنے کا موقع مل جائے۔ یہاں کے اونچے مقامات پر پانی کی عموماً بڑی قلت رہتی ہے۔ کوئیں ہیں مگر چند، اور وہ بھی بہت زیادہ گہرے، اس لئے کسانوں کو اس سے زیادہ پانی دینے میں ہمیشہ تکلف ہوتا ہے جو ہاتھ منہ دھونے یا چائے وغیرہ بنانے کے علاوہ حسبِ دلخواہ غسل کے لئے طلب کیا جائے۔ بعض مقامات کے لئے ضروری ہے کہ لکڑی کی بھری بالٹیاں خچروں اور گدھوں پر لاد کر آب رسانی کی جائے۔ بدقسمتی سے یہاں گھینگے کی بیماری عام ہے جس کا اصلی سبب اُس پانی کا استعمال ہے جو پہاڑی چٹانوں سے گذر کر معدنی اثرات سے مضر ہو جاتا ہے۔

دیوارِ عظیم کے اولیں سو میل کے اطراف وجوانب کے باشندے بہت زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ ان کو پہاڑی زمین سے لوازمِ زندگی پیدا کرنے کی خاطر محنتِ شاقہ کرنی پڑتی ہے۔ ہموار سطح والی زمین کا ایک ایک انچ کاشت کے کام میں لایا جاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات فصلیں دامنِ کوہ تک بو دی جاتی ہیں۔ اکثر جفاکش کسان جو جانوروں کی خرید یا پرورش کی قدرت نہیں رکھتے اپنے دقیانوسی ہلوں میں خود جُت کر کام کرتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی معصوم اور خندہ صورتیں ہر جگہ دیکھ لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ایک اجنبی کو دیکھ کر اظہارِ مسرت میں گلاب اور گیندے کے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں اپنا کھیت نراتے ہوئے خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں "کیا آپ نے بھات کھایا؟" گاؤں کے بڈھے کھڈوں کا یقین ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کا جدِ امجد اب تک تخت نشین ہے۔ سلطنتِ جمہوری کے قیام یا اجرا کی نہ تو اُن کو خبر ہے اور نہ اس کے معلوم کرنے کی کوئی پروا۔ حسین

اتفاق سے جب کبھی ان کی مجلس میں ملکی معاملات کا تذکرہ آ بھی گیا تو ہمیشہ استغنا کے ساتھ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حکومت کے الجھیڑوں میں پڑنا ہمارا کام نہیں ۔ ہم کسان ہیں اور ہمارا سارا وقت اور ساری محنت کاشت ہی کے لیئے وقف ہونا چاہیئے"۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ پہاڑی جفاکش فقط اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور واقعی خوب رکھتے ہیں ۔ وہ اپنی خوش اعتقادی اور صبر کوشی سے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی قسم کے زبردست فلاسفر اور دینی لوگ ہیں۔

راستے میں متعدد مندر اور درگاہیں بھی ملتی ہیں جو مختلف دیوتاؤں کے نام سے موسوم ہیں اور خاص کر خود دیوارِ عظیم کی محافظ ارواح کے نام سے ۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بہت سی درگاہیں اب ویران ہوگئی ہیں۔ اُن کے بوسیدہ دیوتاؤں کے سروں پر ٹوٹی چھتوں سے پانی ٹپکتا ہے، کیونکہ عرصہ گذرا اُن کے پوجنے والے، اُن کے عقیدتمند منتشر ہوگئے لیکن ہاں ایک بعید گذشتہ زمانہ ایسا ضرور گذر گیا جب اُن کی شوکت و عظمت کا ڈنکا بجتا تھا جب کہ صدہا عقیدتمند اُن کی حضوری میں ہردم سربسجود رہتے تھے ۔ یہ حالت اُس وقت تک قائم رہی جب تک کہ یہ اضلاع آباد و گلزار رہے مگر اب تو قحط الرجال اور ویرانی نے ان کے وجود تک کو نابود کر رکھا ہے ۔ ان مندروں میں سے جن سے قطعِ تعلقات کی نوبت نہیں آئی اب شین ہیکوان سے کچھ فاصلے پر ایک عجیب و غریب پہاڑی غار والے مندر کی توسیع کر کے اس کو اٹھارہ جنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ کچھ دُور اور آگے بڑھ کر سیفنگکو کے قریب ایک دوسرے نفیس مندر میں ایک جلیل القامت بت نصب ہے ۔ اس کے چہرے کی چمک کا سبب آج تک حیرت کناں اور صیغۂ راز میں ہے ۔ پہاڑی سلسلہ میں سب سے پہلا اور اہم درہ سیفنگکو ہے ۔ جہاں ایک زبردست پھاٹک لگا ہے اس سے تھوڑی دور پر شاہی قبرستان ہے جو ٹنگ لنگ یا مشرقی قبرستان کے نام سے مشہور ہے ، اور جہاں خاندان مانچو کے پانچ پُر شکوہ تاجدار دفن ہیں ، جن میں مشہور و معروف "چن لنگ" اور "گانگ سی" بھی شامل ہیں ، اور بیوہ ملکہ زوسی بھی جس کا عظیم الشان مجسمہ مشہور ہے کہ پورے تیس سال زیرِ تعمیر رہ کر تکمیل کو پہنچا ۔ ایک سرسبز و شاداب باغ کے مختلف حصوں میں اُن مقبروں کی خوشنما عمارتیں شوخ تاریخی رنگ میں ایک خواب سا نظر آتی ہیں ، جن کے عقب میں شجرہائے صنوبر کا غمگین انداز میں صف بستہ ہونا اور پہاڑی سلسلوں کا پُر سکون نشیب و فراز کچھ عجیب دلدوز منظر پیدا کرتا ہے اور پھر ان سب کے اوپر دیوارِ عظیم اپنی عظمت آفرینیوں کے ساتھ سورج کی طلائی کرنوں میں ایسی چمکتی ہے جیسے سنہری کلغی ۔

یہاں کا جنگل عجیب عجیب نایاب جانوروں کا مسکن ہے جن میں ایک نہایت چھوٹی قسم بندروں کی بھی شامل ہے ۔ مسٹر گیلی جنہوں نے ۱۹۰۸ء میں دیوارِ عظیم کا چپہ چپہ چھان ڈالا ہے فرماتے ہیں کہ ٹنگ لنگ کے محکمۂ جنگلات

میں عجیب و غریب ہرنوں اور دوسرے مختلف جانوروں کے علاوہ تین قسمیں تو جنگلی بلیوں کی ہیں، تین اود بلاؤ کی اور دو اژدھوں کی۔ ایک دوسرے بڑے جنگل میں جو بمقام تنگ دو فو دیوارِ عظیم سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔ متذکرہ بالا جانوروں کے علاوہ چیل، پیکنگ کا بارہ سنگھا، گلدار تیندوا، جنگلی سؤر اور گلہریاں پائی جاتی ہیں۔ مشرقی ترکستان سے کچھ اور آگے بڑھ کر دیوارِ عظیم بمقابلہ اس سلسلہ کے جو شہو کونگ کو وہ کے قریب جوار میں ہے نہایت بوسیدہ حالت میں ہے۔ یہاں دیوار ایک نہایت خوشنما منظر پیش کرتی ہے۔ کبھی تو پہاڑ کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر رینگتی چلی گئی ہے کبھی کسی کرارے پر اس لئے چڑھتی نظر آتی ہے تاکہ نیچی گھاٹی میں پھاند پڑے یا کسی دلکش دریا میں غوطہ زن ہو جائے۔ کو فکو میں سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے مشرق و مغرب دونوں جانب ابر آلود مینار مختلف نشیب و فراز کے ساتھ ایک قطار میں صف بستہ نظر آتے ہیں حتیٰ کہ بعد از منتہائے نظر کی آغوش میں وہ بتدریج چھوٹے چھوٹے تودوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں مگر اپنی مستقل مزاجی اور خاموشی کے ساتھ اپنی اسی جگہ قائم ہیں جہاں آج سے بیس صدیاں پیشتر وہ متعین کئے گئے تھے۔ گویا رفتارِ زمانہ کو اس وقت تک ٹکٹکی باندھ دیکھنے پر مامور ہیں کہ ان کے تعمیر کنندگان دوبارہ واپس آکر ان سے ہمکنار ہو جائیں۔

درہ کونکوٹ، اصلی دیوار اور مختلف شاخیں تقریباً بیس میل لمبائی میں پوری نظر آجاتی ہیں بعض مقامات پر یہ پہاڑ کی ایسی چوٹی پر چڑھ گئی ہیں جس کی اونچائی ۵۲۲۵ فیٹ ہے۔ یہاں کی بہترین حالتِ دیوار اس پختہ کاری کی داد خواہ ہے جو ایک مدت دراز تک سخت سے سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے باوجود آج بھی اپنا رنگ روپ برقرار رکھے ہوئے ہے کو فکو اور دوسرے مشہور درہ شیھکاد کے درمیان درہ کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک بیرونی شاخ تو شیھکو سے گذر کر مغرب کی طرف ڈوبتے سورج کی آنکھوں میں گھستی گھساتی، دلچسپ پہاڑی مناظر عبور کرتی ہوئی کالگان کو چلی جاتی ہے جو زمانہ وسطیٰ کا ایک عجیب و غریب شہر باب منگولیا کے نام سے مشہور ہے۔

اس شاد و آباد شہر سے آگے بڑھ کر دیوار منگولیا کے ہموار میدانوں میں نکل گئی ہے جہاں شمال کی جانب اس ویرانے کے حسین بچے اپنی بھیڑ بکریوں کے گلّے چرایا کرتے ہیں۔ یہاں دیوار کا بیشتر حصہ شکستہ حالت میں ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر تو تودہ سنگ و خشت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چوکور میناروں کا مجموعہ نظر آتا ہے جو مشرقی حصہ کی بہ نسبت نہایت ویران اور غیر دلچسپ ہیں۔ ان میناروں کے اندر جانے کا فقط ایک ہی ذریعہ ہے کہ ان کی کھڑکیوں پر سیڑھی لگا کر چڑھا جائے۔ جانب جنوب وانٹنگو مشہور تجارتی شہر واقع ہے جس میں بسبیلِ تذکرہ بدھ کے اس مجسمہ کا بیان ضروری ہے جو پتھر سے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اس کی جسامت کا یوں اندازہ فرمائیے کہ اس کے ہاتھ کی کھلی ہتھیلی پر چار آدمی بیٹھ کر تاش کھیل سکتے

ہیں۔ اس قرب وجوار میں سنگ تراشی کے دیگر شاہکاروں کا سنِ تاریخ حضرتِ مسیح سے چار صدیاں قبل مانا جاتا ہے
ان کی تیاری خاندانِ شمالی وی کے زمانۂ حکومت میں عمل میں آئی۔ یہ منگول نسل کی ایک وحشی قوم تھی مگر اُس جدید مذہب
کی صدائے تبلیغ کو لبیک کہنے کی نہایت مشتاق جو اس زمانہ میں مشرقی علاقہ میں عروج پذیر تھی۔ یہ عفریت صورت
کارنامے تقریباً اسی زمانہ کے وادیٔ لنگ کے مشہور بدھ سنگتراشوں کے زعم کو بلحاظِ قد و قامت باطل کرتے ہیں۔
حقیقۃً یہ بہترین نمونہ ہیں اُس صنعت و بت تراشی کا جو "گندھارا آرٹ" کے نام سے مشہور ہے۔

دُور مغرب کی طرف دیوارِ عظیم میں شاہو کاؤ کا پھاٹک ہے۔ جو منگولیا کی کوٹی ہاچنگ کی منڈی اور چینِ خاص
کے تجارتی راستے پر ایک مشہور چنگی کی چوکی ہے۔ یہاں سے آگے وہ مقام قریب ہے جہاں دیوار کا اندرونی سلسلہ
بیرونی سلسلے سے وصل ہوا ہے۔ موخرالذکر سے جس کو عام طور پر جنوبی سلسلہ کہتے ہیں۔ بہت سی تاریخی دلچسپیاں
وابستہ ہیں جو اول الذکر سے اگر زیادہ نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہیں۔ اس کی تعمیر گوچن شی ہوانگ ٹی کے ہاتھوں نہ
ہوئی مگر کئی سو برس بعد عمل میں آئی ۱۴۸۷ء میں منگوں نے اس کو از سرِ نو تعمیر کیا۔

سب سے پہلے یہ خاندانِ منگ کے مقبروں کے پاس سے ہو کر گذرتی ہے جن کو دنیا کا عظیم الشان شاہی سنگتراشی
کا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جلیل القدر بادشاہ ینگ لوہ کا مقبرہ ہے جو ۱۴۰۳ء سے ۱۴۲۴ء تک
برسرِ حکومت رہا اور جس نے چین کے دارالسلطنت شہر پیکن کی بنا ڈالی۔ باوجود اپنی خستہ حالی اور پسماندگی کے آج
بھی یہ ایک نادر شے متصور کیا جاتا ہے۔ اُس برجِ عظیم کی قیمت کا اندازہ جہاں وہ فرشِ جواہرات پر اپنے آبدار تابوت میں
آسودۂ خواب ہے خود اس کے زمانہ میں کئی لاکھ ڈالر کیا جاتا تھا۔ اس وادیٔ سکون و راحت میں اس کے اردگرد دوسرے
بادشاہوں کی قبریں ہیں جو ہرچند کہ اس قدر جاذبِ توجہ نہیں مگر پھر بھی قابلِ تعریف ضرور ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ سیاح
جن کو موسمِ بہار میں جب پہاڑی سلسلوں کے پھولدار درختوں سے ساری فضا معطر ہوتی ہے، یا موسمِ خزاں میں جب
درختوں میں روشن قمقموں کی طرح مختلف سنہرے روپہلے پھل لٹکے رہتے ہیں یا اسپرٹ روڈ پر خوبصورت سنگِ مرمر والے محراب
سے گذر کر سرخ ٹیبلٹ ہاؤس، منقوش پلیس آف وکٹری اور پھر پتھر کے جانوروں والے راستہ کو عبور کر کے اس شاہکار
تک پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔ نزدیک ہی دیوارِ عظیم سے ملے ہوئے وہ عیسائی شہدا مصروفِ خواب ہیں جو ۱۹۰۰ء
میں باکسرس سے بھاگ کر ان مینار۔ں میں اس لئے پناہ گزین ہوتے تھے کہ بالآخر اپنی جانیں دے دیں اور دیوار
کے زیرِ سایہ ایک گورِ غریباں قائم کر دیں۔ افلاس اور امارت کا تقابل دیکھئے۔ بھلا اس سے بہتر اور کوئی موقع کیا
مل سکے گا، جیسا کہ ان مفلس اور کس مپرس عیسائیوں کی معمولی قبریں اور بادشاہوں کے عالی شان اور خوبصورت مقبرے۔

پیش کرتے ہیں۔ منگ قبرستان کے بعد دوسرا مشہور مقام درۂ نانکاؤ ہے جس کی لمبائی پوری پندرہ میل تک چلی گئی ہے۔ اس کی ابتدا میدان کے بعد پہلے ہی سلسلۂ کوہ سے ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جب کہ اس کی حفاظت پانچ مزید دیواروں اور پھاٹکوں سے کی جاتی تھی۔ یہ تنگ و تاریک درہ کسی زمانہ میں منگولیا جانے والے کاروانوں کے لئے مخصوص راستہ تھا۔ اس کا یہی استعمال اب بھی ایک حد تک باقی ہے۔ اس کے متعلق روایت مشہور ہے کہ اس کا افتتاح اُن دیوتاؤں نے کیا تھا جو پنج عفریت کے نام سے مشہور ہیں۔ مذکورہ دیوتا توپوں کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک مخصوص توپ کے فیر سے چٹان اڑا کر اس جگہ راستہ پیدا کر دیا تھا۔ فی الحال اس گذرگاہ کے اندر ہو کر ایک ریلوے لائن جاتی ہے جو موجودہ انجنیری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ گاڑی کے اندر کھڑکی میں سے مسافروں کا سڑک پر سے گزرنا، اونٹوں کے قافلے کا رینگنا یا سامنے میدانوں میں منگولیا کے بعد ٹٹوؤں کا قدم قدم چلنا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی مسافر کی نظر تیز ہے تو اس کو چو یونگ کوآن کا مشہور محراب جو ۱۳۴۵ء میں تعمیر ہوا اور جس پر چھ مختلف زبانوں میں کتبے نصب ہیں دکھائی دے جاتا ہے۔ ماہرین فنِ تعمیر اس کی ندرت ساخت اور عجیب و غریب تخیل سے مدتِ دراز تک انگشت بدنداں رہے ہیں۔ پڑوس والا قلعہ دیوار کے آس پاس والے قلعوں میں سب سے زیادہ مستحکم تصوّر کیا جاتا ہے جس کی تصدیق اُس کتبے سے ہوتی ہے جو کسی مانچو بادشاہ نے نصب کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قوی اور مستحکم جائے پناہ نے چینی تاتاریوں کا جو ۱۱۲۵ء سے ۱۲۳۴ء تک برسرِ حکومت رہے منہ پھیر پھیر دیا ہے۔ دو مرتبہ اس کے پناہ گزینوں نے منگول نسل کا پُرزور اور کامیاب مقابلہ کیا ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ ۱۲۱۵ء میں خاص چنگیز خاں کے زیرِ کمان فوج کو ہزیمت دی ہے۔ لیکن یہ اولوالعزم اور جلیل المرتبت جنرل اپنی بات کا دھنی اور اپنے ارادہ کا ہٹی بھلا ناکامی کی کب تاب لا سکتا تھا۔ چنانچہ مزید کمک کے ساتھ نانسی میں باب طاؤس سے جو دیوارِ عظیم کے جنوبی سلسلے پر واقع ہے خفیہ طور پر راتوں رات گذر کر چیلی کے میدانوں میں پہنچ گیا۔ جہاں چو یونگ کوآن کی جرار فوج اپنے مقام پر چاق چوبند ہو کر دوسرے حملے کا انتظار کر رہی تھی۔

نانکاؤ کی وادی تمام و کمال صحرائی ہے۔ اونچی نیچی مگر نہایت خوش منظر جس میں دیوار کے مختلف سلسلے نیچے اترتے چلے گئے ہیں۔ درہ کی چوٹی سے ایک عجیب عالیشان منظر عام پیش نظر ہو جاتا ہے جس میں خطِ استوا پر مینارے ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا سنتری کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ درہ کے اُس مقام پر جس کو اصطلاحِ عام میں پاٹالنگ کہتے ہیں دیوارِ عظیم اور کاروان والی سڑک کا چوراہا ہے مگر اُس چوبی پھاٹک کا جو طلوع و غروب آفتاب کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا تھا اب کچھ پتہ نہیں۔ اگر کسی کو یہاں کے نظر افروز مناظر سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہونا

منظور ہو تو اُس کو اس پھاٹک کے ملحق دیوارِ عظیم کے مشرقی سلسلے کے سب سے اونچے مینار پر بلالحاظ دشواری چڑھ جانا چاہیئے۔ اُس کی نظر کی گردشِ اولیں دیوار کو میلوں طویل اور تیر کی طرح سدھائی میں ایک ساتھ اٹھائیس مینار دیکھ کر متحیر و ششدر رہ جائے گی۔

چونکہ یہ ایک ایسا اہم اور مفید درہ تھا جس میں سے گھوڑے گاڑیاں بآسانی گذر سکتے تھے۔ اس لئے یہاں کے بہت سے میناروں میں معمول سے زائد کمک محافظین کی تعین رہتی تھی جن کے لئے حسبِ بیانِ مورخین سامان خوراک، لکڑی، دوائیں، اور ہتھیار ایسی معقول تعداد میں جمع رکھے جاتے تھے جو کم از کم سات ماہ کے محاصرے کے لئے کافی و وافی ثابت ہوں۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اِن میناروں میں سے قدیم وضع کی توپوں اور چھوٹی بندوقوں کے خزائن برآمد ہوئے تھے۔ یہ بیان بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جب ۵۵۵ء میں اس سلسلۂ دیوار کی تعمیر شروع ہوئی تو فی میل لمبائی پر ۶۹۰۰ آدمی لگائے گئے تھے۔ یا یُوں سمجھ لیجئے کہ جملہ تین سو میل لمبائی پر ایک لاکھ اسّی ہزار آدمی کام کرتے تھے۔

نانکاؤ سے آگے جنوبی سمت جاتے ہوئے اندرونی سلسلہ سیلنگ یا مانچو خاندان کے مغربی قبرستان کے قریب ہو کر گذرتا ہے، جہاں وہ بادشاہ مدفون ہیں جن کو ٹنگ لنگ میں جگہ نہ مل سکی۔ یہاں سے پھر اسی سمت رخ کئے ہوئے یہ سلسلہ پہاڑوں کے قدرتی نشیب و فراز پر چڑھتا اترتا لینچو کی طرف نکل گیا ہے۔ جنوبی سلسلے کی شاخ یہیں سے نکلی ہے، جو چیلی شانسی کے عجیب و غریب علاقے کی سرحد تک چلا گیا ہے۔ نزدیک ہی دوٹائی شان کی متبرک پہاڑی ہے۔ منگول قوم کے اس کعبۂ مقدس کو ایسی دیوار کے حدود کے اندر گھیر لینا جو محض ان کو سرزمینِ چین سے دور رکھنے کے لئے تعمیر کی گئی ہو ایک عجیب بے ضابطگی اور ہٹ دھرمی معلوم ہوتی ہے مگر اس پر بھی دوٹائی جو بدھ چین کی چار مشہور پہاڑیوں میں شامل ہے اور جو ازمنۂ وسطیٰ میں بدھ مت کے ابتدائی مدارج سے بہت کچھ متعلق رہا ہے رفتہ رفتہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ مذہب لاما کا کعبہ بن گیا۔ اس کی متعدد خانقاہیں کیا بلحاظِ حسنِ تعمیر اور کیا بلحاظِ حسنِ عقیدت تبت اور منگولیا کی زریں یادگاریں ہیں۔ اس کے صدہا عقیدتمند روس کے جنوبی میدانوں تک سے آتے تھے۔ اس کے راہبوں کی زیادہ تعداد غیر چینی ہے۔ اس کا صدر الصدور دیوتا عقل کی دیوی بدھ ساتوا منجوشری ہے۔ اور اس کا موجودہ پروہت گوسری جسک لاما جو باوجود ہفتاد سالہ ہونے کے تدبر و فراست کا مجسمہ ہے جیسا کہ اُس کے جلیل القدر چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔ اس کا جائے قیام پوسا تنگ ہے جو کوہستانی سرزمین پر سب سے بڑا اور سب سے زیادہ نفیس مندر ہے۔ اس کے عقیدتمند جبہ سائی اور قدم بوسی

کے لئے یہیں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ کڑکڑاتے جاڑوں اور گرمیوں کی جلتی ہوئی دوپہروں میں بھی بصد ذوق وشوق اس کی لاتعداد سیڑھیوں پر چڑھ کر اُس مقدس مقام کو بوسہ دینا باعثِ نجات تصور کرتے ہیں جو حشر کے روز دنیا کی دائمی بربادی کے بعد بھی اسی طرح صحیح و سالم قائم رہے گا۔ مقدس صحیفوں میں منقول ہے کہ باربرداری کے جانور بھی جو اس مقدس مقام کی گھاس چریں گے اور پانی پئیں گے آئندہ جنم میں اعلیٰ مراتب پائیں گے۔

تواریخ اور آثار الصنادید کا شیدائی دیوارِ عظیم کے جنوبی سلسلے پر کچھ دور سفر کو اس لئے تفضیع اوقات پر محمول نہ کرے گا کہ ٹیوو ان فو کا قدیم اور عجیب شہر دیکھ لے، اور اُس کے سرِ فلک بدھ مندر بھی جو ٹنگ خاندان (۹۶۰ء سے ۱۲۶۰ء) کی یادگار ہیں۔ ٹیوو ان فو سے اس شاہراہ کی ابتدا بھی صاف نظر آتی ہے جو اندرونی سلسلہ دیوار کو بمقام باب طاؤس عبور کرتی ہے جس کے ذریعہ سے چنگیز خاں کی جرار فوج چو یونگ کو آن سے منہ موڑ کر بالآخر حدود چین میں در آئی تھی۔ یہاں سے یہ سڑک سوپنگ شہر کی طرف چلی گئی ہے، اور پھر وہاں سے بیرونی سلسلے میں شامل ہو کر ہوتی ہوئی میدانوں کی طرف مڑ گئی ہے۔ اس شاہراہ کے متعلق بھی بہت سی داستانیں اور افسانے مشہور ہیں۔

سوپنگ سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے زرد کے قریب جو صوبہ اَرڈس کے صحرا کو سیراب کرتا ہے دیوارِ عظیم کے دونوں سلسلے واصل ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ دریا دیوارِ عظیم کو دو سلسلوں میں صاف طور پر منقطع کرتا ہے ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔ مندرجہ بالا تشریح صرف مشرقی سلسلے کی ہے کیونکہ اس فصیل کا یہی جزو ایسا ہے جو حقیقی معنوں میں متعدد بار اپنے مقصدِ اصلی کے کام آیا اور یہی وہ حصہ ہے جو نسبتۃً اچھی حالت میں برقرار ہے۔ محافظت کی صحیح پشت پناہ یہ ہی تھی جس کی تعمیر اس مقصد کے زیرِ اثر کام میں آئی کہ سرزمینِ چین کو غیروں کے غاصبانہ حملوں اور چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ جب تک شمال کی جانب سے خطرہ قائم رہا نہ صرف اس پر محافظوں کی معقول تعداد متعین رکھی گئی بلکہ وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت بیش قیمت ترمیمات بھی جاری رہیں۔

دریائے زرد کے اُس پار مغربی حصہ نہ صرف تعمیری اعتبار سے مختلف ہے بلکہ اُس اصلی مقصد سے بھی جس کے باعث اس کا وجود عمل میں آیا یہ کوئی ایسی فصیل نہیں جو غیر ملک والوں کے حملوں سے بچنے کے لئے بنائی گئی ہو بلکہ برخلاف اس کے یہ چین اور مغربِ بعید کے تجارتی راستہ کی محافظت کے لئے تعمیر کی گئی۔ جدید انکشافات سے پتہ چلتا ہے کہ ہن خاندان کے زمانے میں جنھوں نے ۲۰۶ء قبل حضرت مسیح سے لے کر ۳۲ء تک حکومت کی یہ سلسلہ چیا یو کو آن پر ہی ختم نہ ہوا تھا بلکہ دُور وسطِ ایشیا کے صحراؤں تک چلا گیا تھا بیرونی تعلقات سے بے تعلق رہنے کے لئے اس اہتمامِ عظیم کا تخیل کچھ کم دلچسپ نہیں۔ کیونکہ چینی ہمیشہ سے اپنی تنہائی پسندی

کے لئے مشہور تھے جس کی سچ پوچھئے تو ان میں منگ خاندان نے اصلی بنا ڈالی تھی۔ منگ کا یہ اصول نمایاں طور پر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ دیوارِ عظیم کے مغربی سلسلے سے عدم توجہی برتی مگر مشرقی سلسلے پر اپنے تعمیری فن کا کمال دکھاتے ہوئے اس کے استحکام اور زیبائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جو اُن کے دار السلطنت بیکین کی محافظت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لیچو فو کے قریب تبتی اطراف میں دیگر معاون سلسلوں کی تعمیر بھی برابر کرتے رہے۔

صحرائے ارڈس کے جنوبی کنارے پر پہنچ کر دیوارِ عظیم جس شکل میں باقی ہے وہ چند فیٹ اونچے تودۂ خاک سے زیادہ نہیں۔ اس کے میناروں کا جو اپنے زمانے میں کافی شہرت وعظمت رکھتے ہیں اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو کوڑے کرکٹ کے چند بے ترتیب ڈھیروں سے۔ اس کی عظمت وشان پہلے ہزار میل پر ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مختلف مقامات پر ٹوٹی پھوٹی حالت میں لینچاؤ فو، لیانگچاؤ فو، کنچاؤ اور سوچاؤ ہوتی ہوئی اپنے اختتامی سرے کی جانب موخرالذکر شہر سے آگے بڑھ کر اندرونی چین اور ینگ کیانگ یا مشرقی ترکستان میں گھومتی چلی گئی ہے۔ اس شکستہ حصے کی سیر میں اگر کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے تو نہایت معمولی۔ کیونکہ اس کے تعمیر کنندگان نے محض سامانِ تعمیر کو ایک جا کرنے میں عجلت کام کرنے کے علاوہ اتنا بھی تو نہیں کیا کہ اس کے استحکام کے لئے باہر باہر اینٹ پتھروں سے حلقہ بندی کر دیں۔ یا اوپر پختہ قسم کی منڈیر بنا کر کچھ خوبصورتی پیدا کر دیں۔ ایک سیاح کو یہاں کی مشکلات کا صلہ حقیقتاً کچھ نہیں ملتا۔

اس کی عظمت وشان کے اولیں ایک ہزار میل میں بھی کوئی ایسی شاہی سڑک نہیں ملتی جس سے دیوارِ عظیم کی با آسانی سیر کی جاسکے۔ یہاں انتہائی صبر واستقلال کی ضرورت ہے۔ دیہاتی مسافر خانوں یا سراؤں کی بے سروسامانی اور تکالیف، دن بھر ٹٹو یا خچر کی سخت قسم کی کاٹھی پر بیٹھ کر منزلیں طے کرنا یا دشوار گذار رستوں پر پا پیادہ چلنا ایک عذاب ہے لیکن پھر بھی یہاں کی لاتعداد دلچسپیوں سے ایک سیاح کی بہت کچھ دلجمعی ہو جاتی ہے فلسفی ہو یا ماہرِ علمِ نباتات، آثار الصنادید کا شیدائی ہو یا محض مناظرِ فطرت کا متوالا، مگر یہاں کے نظر فروز مناظر ہر شخص کو کافی محظوظ اور گرویدہ کر لیتے ہیں۔ گرمیوں میں بادلوں کے طوفان فرحت بخش اور حیرت افزا ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صبح کی فضائے نیلی آسمان کی نیلگوں سطح کو بے داغ پیش کرتی ہے۔ دوپہر میں تمازتِ آفتاب پہاڑوں کی چٹانوں سے گرمی کی لرزاں اور مضطرب لہریں اٹھاتی ہے، اور پھر دفعتہً سطحِ آسمان پر بادلوں کی ٹولیاں نمودار ہو جاتی ہیں جن کے بعد ہی بھوری بھوری مٹیالی گھٹائیں آکر برسنے لگتی

ہیں۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ پہاڑ کی چوٹیوں سے ٹکراتی ہے۔ بجلی کا اضطراب پیہم آسمان سے برچھیاں گراتا ہے اور پھر دم زدن میں بارش کا سیلاب آجاتا ہے۔ کچھ لمحوں میں ہر وادی آبشار بن جاتی ہے اور ہر نشیب حبابوں کا مخزن۔ اس طرح ابتدائے موسم خزاں میں دیوارِ عظیم کی سیر کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتی جب کہ پہاڑی درخت اور جھاڑیاں اپنی زرین پوشاکیں زیب تن کرلیتی ہیں۔ وادیوں کی چپہ چپہ زمین پر ایک رنگین حشر بپا ہوتا ہے۔ ہوا بالکل ساکت ہوتی ہے اور فضائے بسیط بالکل خاموش۔ مگر موسم سرما کی ہمہ گیر دلچسپیاں ان سب پر فوقیت رکھتی ہیں، جب کہ پہاڑوں کی ننگی ننگی نوکدار چوٹیاں جن پر دیوارِ عظیم کا سلسلہ قائم ہے برف کی موٹی تہ میں روپوش ہوتی ہیں۔ چٹانوں اور سبزہ زاروں پر برف کی چمکدار نقرئی چادریں جگمگاتی ہیں۔ شمالی چین سے دور دراز والی پہاڑیاں اور وادیاں ایک غیر یقینی صورت میں نزدیک تر معلوم ہونے لگتی ہیں اور کہر دار فضا میں ایسا گمان ہوتا ہے گویا ایک مینار سے دوسرے مینار تک بس ایک ہی قدم کی مسافت طے کرنا ہوگی۔ ہر وقت اور ہر موسم میں دیوارِ عظیم دو دنیاؤں کے درمیان نہ صرف قدرتی بلکہ نسلی حدِ فاصل قائم ہونے کی دعوے دار رہتی ہے۔ گیل کہتا ہے کہ یہ ایک تفریقی خط ہے درمیان دو خطوں اور تمدنوں کے۔ ملکی اعتبار سے اس نے شمالی چرواہوں اور گلہ بانوں کو جنوبی کاشتکاروں سے علیحدہ کردیا۔ فصیل کے جنوبی خطہ میں ایک خاص قسم کا تمدن اثر پذیر ہے مگر شمالی خطہ میں جہالت و ناشائستگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ چین کے اصلی تمدن کی لہریں جنوب کا رخ لے کر بڑھیں اور اپنے راستے والی ہر قوم اور زمین کو سیراب کرتی بالآخر سمندر میں جاملیں اور اس طرح دیوار سے لے کر سمندر تک ساری خدائی چین اور اس کی اولاد کی مرہون تہذیب بن گئی۔

محافظی نکتۂ خیال سے دیوارِ عظیم کا وجود حقیقۃً کبھی سود مند ثابت نہ ہوا کیونکہ باوجود اس کی موجودگی کے تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے نسلی گروہ کی طرف سے چین پر حملے پر حملے ہوتے رہے جنہوں نے کم و بیش دو ہزار سال تک ایشیا کی تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری رکھا اور بلکہ یورپ کو بھی وقتاً فوقتاً کافی دق کیا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معمولی حملوں کے موقعوں پر اس نے اپنا حق ادا کردیا جس کا اخلاقی اثر علاوہ جلیل القدر فاتحوں کے اوردوسروں پر جو کچھ ہوا ہوگا وہ یقیناً نہایت اہم اور ہولناک ہوگا۔ ایک جری دل اور ہاتھ بھر کا کلیجہ رکھنے والے سپہ سالار ہی نے اپنی کثیر التعداد فوج اور سامانِ جنگ کے ساتھ اس فصیل کے اندر قدم رکھنے کی ہمت کی ہوگی جس کی گذرگاہوں کے قرب وجوار میں محافظت کے مینار سو سو گز کے فاصلے پر قائم تھے اور جن کی دوری انتہائی ویران مقامات پر بھی زیادہ سے زیادہ ایک میل تھی۔

آج دیوارِ عظیم کی محافظتی اہمیت قطعی نظرانداز کی جا چکی ہے اور اب اس کی محافظت پر ایک فرد سپاہی یا چوکیدار بھی مامور نہیں ۔ مگر پھر بھی شب کے وقت شاہراہ والے پھاٹک ضرور مقفل کر دیئے جاتے ہیں، اس خیال سے کہ قرب وجوار کے شہر، قریے اور دیہات لٹیروں کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں - خدا کی شان ہے کہ سادہ لوحانِ چین کا آج تک اس یقین پر ایمان ہے کہ چین شی ہوانگ ٹی کی دیوارِ عظیم سارے محاذ پر ایک فوق الفطرت عفریت کی صورت میں پھیلی ہوئی اُن کو مختلف بلاؤں، مصیبتوں اور طوفانوں سے نجات دلانے کا سبب بنی ہوئی ہے -

بتدریج تنزل اور زوال سے ہم کنار، مگر اس حالتِ تباہ اور بوسیدگی میں بھی اپنا قدیم وقار قائم رکھتے ہوئے اور اپنی ہستی کا ایک ایک پتھر وادیوں کی نذر کرتے ہوئے افسوس کہ یہ عفریت پیکر دیوار آج اس قومی جزوِ ایمان سے بھی بے نیاز ہوتی اور اپنی قوت وجبروت کھوتی نظر آتی ہے -

دیوانہ بریلوی

منکرانِ عشق

لیلیٰ اور اُس کی سہیلی زلیلی نے قسم کھائی کہ نوجوانوں سے ہمیشہ نفرت کریں گی، اور اُن کی محبت میں کبھی گرفتار نہ ہوں گی!

محبت کا دیوتا کیوپڈ سویا پڑا تھا، لیکن اُس کے مددگار نے یہ بات اُسے جا سُنائی اور کہا "کیوپڈ سنا تم نے وہ کیا فیصلہ کر بیٹھی ہیں؟ اب جاؤ اور اپنا کام کرو"۔ پس کیوپڈ نے اپنا کام کیا۔ لیلیٰ اور اُس کی سہیلی زلیلی ایک ہی نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسری کو اپنی قسم کی شکست اور اپنے دل کا حال بتانے سے جھجکتی تھیں، اس لئے خاموشی سے وقت گزارتی رہیں -

نوجوان بھی محبت کا بہت حریص تھا، اُس نے دونوں سے شادی کر لی اور ہر لڑکی سے کہہ دیا کہ وہ کسی کو بھی اپنی شادی کا راز نہ بتائے ۔ دونوں نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا ۔ لیکن جو ہونا تھا ہُوا، یعنی دونوں نے ایک دوسری پر اپنا اپنا بھید ظاہر کر ڈالا . . . نوجوان شہر چھوڑ نہ جانے کہاں چلا گیا اور لیلیٰ اور اُس کی سہیلی زلیلی نے قسم کھائی کہ نوجوانوں سے ہمیشہ نفرت کریں گی اور اُن کی محبت میں کبھی گرفتار نہ ہونگی!

(ترجمہ)

عظیم قریشی لدھیانوی

تجلّیات

اب کیا کریں جو دل نہ لگا میں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم

برسوں ہوا نہ فیصلہ فتح و شکست کا
برسوں ستیزہ کار رہے آسماں سے ہم

لے ڈوبے فکرِ راحت لے ڈوبے خوفِ دام!
دیکھا کئے بہارِ چمن آشیاں سے ہم

غیظ و غضب سے نارِ جہنم ہوا ہے شیخ
پہنچے درِ بہشت پہ کوئے بتاں سے ہم

اب کچھ تو فیصلہ ہو حیات و ممات کا
تنگ آ گئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم

سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
بیخود تھے بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم!

کچھ پھول لینے آئے تھے اے باغباں! مگر
کچھ داغ لے چلے ہیں ترے گلستاں سے ہم

سجدے کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں
بیگانہ وار گزرے ہر اک آستاں سے ہم

ہے ایک آرزوئے تماشائے رنگ و بو
لے جائیں گے نہ کچھ بھی ترے گلستاں سے ہم!

وہ جانِ زندگی تو رہا ہم سے سرگراں
اور اپنی زندگی سے رہے سرگراں سے ہم

اثر صہبائی

غزل

سو حسرتیں لئے دلِ پُر اضطراب میں
آباد ہو رہا ہوں جہانِ خراب میں

ہر روز آدمی کو جہانِ خراب میں
انجامِ زندگی نظر آتا ہے خواب میں

ارشاد ہو تو ہم یہ نمایندگی کریں
شرما رہے ہیں آپ کشادِ نقاب میں

ہم اپنی بیقراریٔ دل سے ہیں برقرار
آمیزشِ سکوں ہے اسی اضطراب میں

اب سیرِ گل کہاں، دلِ رنگیں نظر کہاں
اک خواب تھا جو دیکھ لیا تھا شباب میں

بڑھ بڑھ کے چھپ رہے ہیں پسِ پردہ بار بار
کیا کیا تکلفات ہیں ترکِ حجاب میں

دامن جھٹک کے ناز سے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے
کی گفتگو جو ہم نے ذرا دل کے باب میں

دیکھو شعاعِ حسن کی یہ جلوہ ریزیاں
یوں ہیں نقاب میں کہ نہیں آفتاب میں

کھوئے گئے کچھ ایسے اُنہیں دیکھ کر کہ ہم
لے آئے جان دل کی جگہ اضطراب میں

احسن، دل اُن کو دو، مگر اتنا تو پوچھ لو
لیتے ہو تم یہ نقد، رقم کس حساب میں

احسن مارہروی

ایک سوال

یورپ، امریکہ کے بڑے شہروں میں جا بجا ایسی مشینیں رکھی ہیں کہ دن رات جس وقت چاہو دام ڈالو چیز لے لو۔ سگرٹ، چاکولیٹ، ڈاک کے ٹکٹ، دیاسلائیاں، مٹھائیاں، اپنا وزن، ریل کا ٹکٹ وغیرہ وغیرہ۔ کسی قسم کے دھوکے کی گنجائش نہیں، دام کھرے ہوں تو چیز موجود ہے ورنہ نقد واپس۔ بعض منچلے کھوٹے شلنگ سے اچھے سگرٹ لینا چاہتے ہیں مگر مشین بلا تامل کھوٹے شلنگ کو تھوک دیتی ہے۔

انسان کی یہ تدبیر کہ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کوئی نئی بات نہیں۔ تمام تاریخ شاہد ہے کہ مذاہب اس تدبیر کے سب سے بڑے حامی رہے ہیں اور ہیں۔ مذاہب کے نزدیک کائنات (Universe) ایک قسم کی Penny-in-the-slot مشین ہے اور مذاہب کا دعوے ہے کہ ایک طرف کھرا عقیدہ ڈالو دوسری طرف اصلی نجات لے لو۔ یہ امر محض فروعی ہے کہ مختلف مذاہب میں مختلف روحانی سکّے جاری ہیں اور ہر مذہب مُصر ہے کہ اصلی روحانی سکّے کی ٹکسال صرف اُس کے قبضے میں ہے اور دیگر مذاہب کے پیشوا بیش و کم جعلی سکّہ چلاتے ہیں۔ اسی طرح تمام تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے، اُن سے اپنی خدمت کرانے کے لئے کائنات کی مشین سے یوں کام لیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف سے ظلم، جبر، دھوکا، بحری قزاقی، پُر دغا عہد و پیمان ڈالو اور دوسری طرف سے تجارت، سلطنت، شاہنشاہی لے لو۔

مطلب کسی پر اعتراض کرنے کا یا کسی کو بُرا بنانے کا ہرگز نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ یہ خیال کہ کائنات ایک سریع الحرکت، نہ دھوکا کھانے والی اور کھوٹے کھرے کو فوراً پرکھنے والی مشین ہے، عام ہے۔

میری آج کل کی دنیا میں اس خیال کی سب سے بڑی حامی ہستیاں دو ہیں۔ حسنِ اتفاق سے یہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔ ماں جاہل ہے، بیٹی جاہلِ مطلق ہے مگر دونوں اپنے اپنے عقیدے کی پیغمبر ہیں۔ ماں کا اسلام یہ ہے کہ ایک طرف سے خدمت اور صداقت ڈالو اور ڈالتے چلے جاؤ تو دوسری طرف سے ضرور ابدی مسرت حاصل ہوگی گو خدمت اور صداقت کو بار بار اور پیہم مہیا کرنے میں رنج کا سامنا ضرور ہوگا مگر آلِ کار کے خیال سے یہ رنج اور دکھ کچھ

وقعت نہیں رکھتے ۔ بیٹی کا خیال یہ ہے کہ انسان کائنات کی مشین میں ایک طرف سے شاعری کا عطر نچوڑ نچوڑ کر لہو کی بوندوں سے رنگین کر کے ڈالیں تو دوسری طرف ضرور شوقِ آتشیں کا ڈراما نظر آئے گا ۔ ممکن ہے کہ ان دونوں کا خیال سچ ہو، ممکن ہے کہ مذہب اور حکومت والے بھی سچے ہوں مگر راقم سطور کو جو دقت ہمیشہ رہتی ہے اور جس دقت کے باعث وہ کبھی اس مشین کو استعمال نہیں کرتا یہ ہے :-

اگر کسی شخص کو جس قسم کی ابدی مسرت یہ مشین مہیا کرتی ہے پسند نہ ہو تو کیا یہ مشین ازروئے انصاف اُلٹا چلنا شروع کر دے گی اور صداقت اور خدمت واپس کر دے گی یعنی صداقت اور خدمت کے وہی مواقع، وہی جوشِ شباب، وہی ابتدائی خود فریبی کے دلکش اور دلکشا منظر؟ ۔ اگر یہ مشین ایسا کرنے سے عاجز ہے تو انسان اس مشین کے ساتھ کیوں اس قسم کا گہرا جُوا کھیلے ؟ -

جواب دیں دونوں پیغمبر!

فلک پیما

عقاب

کبھی افق میں غروب ہو کر

طلوع ہو کر کبھی فضا میں

سنہرے پھولوں بھری ہوا میں

وہ سامنے اُڑ رہا ہے طائر

کبھی وہ چھپتا ہے بادلوں میں

ہے روشنی میں کبھی شناور

کہ کوئی کشتی جو دُور جا کر

مچل رہی ہے سمندروں میں

احسن الظفر

برسات کی رات

یہ فضائے روح پرور یہ نشاطِ جاں فزا
نرم بوندوں کی نوازش یہ سرور آگیں گھٹا

کالے کالے بادلوں کا منظرِ وجد آفریں
لیلیٰ محمل نشیں نے گویا زلفیں کھول دیں

دیدنی ہے اس شبِ تاریک میں بادل کا رنگ
نرگسی آنکھوں میں جس صورت سے ہو کاجل کا رنگ

یہ اندھیرا یہ گھٹا یہ جنبشِ موجِ ہوا
اس نشاط انگیز عالم میں پپیہے کی صدا

یعنی یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا نغمہ ہے
اصلِ ہستی نغمہ ہے وجہِ تمنا نغمہ ہے

سطحِ عالم پر پریشاں مستیاں یوں ہو گئیں
جس طرح انگور کی بیلوں سے گھر جائے زمیں

بجلیوں کا بادلوں میں یوں عیاں ہوتا ہے نور
غرفۂ جنت سے جیسے جھانکتی ہے کوئی حور

یہ گھٹاؤں کا سماں یہ منظرِ تقویٰ شکن
اک تماشا ہے کہ تاریکی ہے شمعِ انجمن

یہ نشاطِ حسن یہ نازِ مسرت انتساب
قابلِ نظارہ ہے سلمائے گیتی کا شباب

روح کو دیتی ہے پیغامِ طرب تاریک رات
"اٹھ کہ لبریزِ مسرت ہے فضائے کائنات"

کیف کی نشو و نما ہوتی ہے جب برسات میں
حشر برپا کیوں نہ ہو شاعر کے محسوسات میں

منظور حسین ماہر القادری

صحافتِ ایران

ایران کے اعلیٰ طبقوں کی ذہنیتِ عمومی کا مشاہدہ کرنا ہو تو ایرانی اخبارات دیکھئے۔ ہمیں اس امر کو زیادہ تنقیدی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ایران میں تقریر اور تحریر کی کامل آزادی نہیں، اور نہ ایسے انقلابی دور میں اس کی ضرورت ہے۔ بایں ہمہ کسی حد تک اخبارات اپنے اظہارِ رائے کا پیدائشی حق ضرور استعمال کرتے ہیں۔ روزانہ اخباروں میں سب سے بڑھا ہوا "شفقِ سرخ" ہے، اس کے علاوہ اور کئی اخبارات ایسے ہیں جو باشندوں کی ضروریات اور توقعات کی کم و بیش ترجمانی کرتے ہیں، مثلاً "ایران"، "کوشش"، "اطلاعات"، "اقدام" اور "تجددِ ایران" وغیرہ۔

ان پر ایک سیر حاصل نظر ڈالنے سے ایرانیوں کی بیدار شدہ ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ "شفقِ سرخ" (۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء) ایران کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ایران پہلے سے زیادہ بے حس ہے، روحانی طور پر اس کا تعلق ایامِ گذشتہ کی مستبد شخصی حکومتوں سے ابھی تک قائم ہے۔ اس نے اس وقت تک موجودہ زمانہ کے مفہوم میں اخلاقی پختگی کی عمر حاصل نہیں کی۔ اس نے ابھی تک آئینی حکومت کے مقدس اصولوں کو تسلیم نہیں کیا"۔ "اطلاعات" (۱۵ دسمبر) کی اشاعت میں قومی زندگی اور خزانۂ عامہ کی تباہی، توازنِ تجارت کی ضرورت اور آمد و خرچ کے حسابات کی مطابقت پر جو ہماری خاص توجہ کے مستحق ہیں تنقید کرتا ہے۔ "ایران" (۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء) بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ "معیارِ زر کے اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، جب تک تجارتی قرضوں اور اندوختوں میں اس قدر ہولناک تفاوت باقی ہے"۔ "کوشش" کا فاضل مقالہ نگار مسٹر دشتی اپنے ناظرین کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ شکایات کر کے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان کے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے، حالانکہ دوسرے ملکوں کے تجارتی طریقے بالکل تبدیل ہو گئے ہیں لیکن ایران کے کارخانے لیت و لعل میں پڑے ہوئے ہیں اور خود کو تبدیل شدہ حالات کے موافق درست نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایران کی منڈیاں غیر ملکی اشیا سے بھری ہوئی ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کی اخلاقی کوتاہیوں پر اس کی اکثر و بیشتر تنقیدیں اور عورتوں کے تغیر پذیر ماحول کے مطابق ان کی تعلیم اور ان کی حیثیت کے متعلق اس کے نظریات بہت زیادہ ہدایت بخش ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے ایران کے اخبارات ہی سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے یورپ تک تاروں کے سلسلہ کو انگلستان ایران کے حوالہ کر دے گا۔ اس تاریخی واقعہ نے ملک کی خود آگاہی میں اضافہ کر دیا۔ اس سے پیشتر جا بجا یہی یقین کیا جاتا تھا کہ حکومتِ ایران کے سرکاری راز غیر ملکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن آج ایران لاسلکی کے علاوہ تاروں کے اوپر بھی بیرونی دنیا سے رازداری کے وثوق کے ساتھ گفت و شنید کر سکتا ہے۔

اخبارات کیا کہتے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے ایرانی اخبارات کے مقالہ ہائے خصوصی ملک کے اقتصادی زوال پر زور دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں سے بعض مضامین ہمعصر ترکی اخبارات کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقۃً اُن کی حیثیت صرف یہی نہیں ہوتی بلکہ ان مضامین کی اس قدر زیادہ مطابقت کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں ممالک کی اقتصادی سطح بالکل ہموار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکی میں سختی سے حکومت کی جا رہی ہے۔ ترکی قوم خود اس بات کو تسلیم کرتی ہے اور بخوشی معترف ہے کہ یہ سختی غیر ضروری نہیں ہے ترکی کا مشہور روزنامہ "ملیت" (۷ جنوری ۱۹۳۱ء) اپنے ایرانی ہمعصر کی طرح مشرق کے ابدی خوابِ غفلت پر افسوس کرتا ہے اور تاریخ روس کے صفحات میں سے ایک ورق حاصل کرنا چاہتا ہے: "روسی اپنے مدارس اور کارخانوں میں صرف انگریزی اور جرمن زبان کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روسی زبان ترکی کی بہ نسبت بہت زیادہ بلند اور آراستہ ہے، مگر ہم اپنے تعلیمی اداروں میں لاطینی حروف اور طرزِ تحریر کو داخل کر کے ترکی قوتِ عمل کو مضمحل کر رہے ہیں۔ ہم قسطنطنیہ میں کیوں قیام کرنا چاہتے ہیں؟ ——— قسطنطنیہ کا قیام مرادف ہے کسی یونانی قہوہ خانہ کے یا کسی ارمنی ہوٹل کے قیام کے، یا پھر کسی ایسی سڑک پر گذر کرنے کے جو ہماری ملکیت نہیں۔ ہمارے ذہن اس طرف رجوع نہیں ہوتے کہ ملک کے کسی دوسرے گوشے میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اور ایسا ہی ماحول پیدا کر لیں۔ ہمارا جوشِ عمل سرد پڑ چکا ہے اور ہمارے دماغ ماؤف ہو رہے ہیں"۔

ایران اب تک ملک پر فرانس اور جرمنی کے اثرات کی طرف سے غیر جانب داری برت رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت رضا شاہ کی حکومت ہر سال طلبہ کو، سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرانس، جرمنی، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں بھیجتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس ترکی البتہ انگریزی اور جرمن طریقہ ہائے تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہے۔ "ملیت" (۵ جنوری ۱۹۳۱ء) رقمطراز ہے "سیاسی حلقوں کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ نوجوانوں کو بڑے بڑے شہروں سے اور حکومت کے دروازوں سے واپس کر کے ملک کے اندرونی حصص میں بھیج دینے کا ہے۔ ہمارے لئے لازم ہے کہ نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعہ سے ایک نئی فضا پیدا کرنے کے جوش اور مسرت سے روشناس کریں، بجائے

اس کے کہ پیشتر سے تیار شدہ ماحول میں رہنے کی تعلیم دیں - لاطینی تعلیم دینے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ انہیں شمالی اقوام کی تعلیم دیں ——— یعنی امریکہ کے نوجوانوں کی تعلیم -

نوجوان ذہنیت - ترکی اور ایران دونوں ممالک میں نوجوانوں کا دماغ تاریخ یورپ کے صفحات کی طرف نہیں، بلکہ مغربی افسانوں کی سحر آمیز کشش کی طرف رجوع ہوتا ہے - پولیٹیکا (Politica) (۱۸ - نومبر ۱۹۳۰ء) بیان کرتا ہے کہ آرسین لوپن[1] (Arsene Lupin) کی بہت سی کہانیاں ترکی زبان میں لکھی گئی ہیں - تمام الزام صرف مصنفوں کے سر تھوپنا سخت غلطی ہے کیونکہ طلب اور رسد کا قانون معاشیات کے مسلمہ اولین اصول سے ہے - پیداوار بغیر مصرف کے صرف نقصان کے مرادف ہوتی ہے - اگر ہم تھوڑا پڑھتے ہیں اور بہر معمولی چیزیں پڑھتے ہیں تو اس کی وجہ ہماری اقتصادی کمزوری نہیں ہے، بلکہ دراصل لوگوں کے مذاق اور ذہنیت کی عام تبدیلی میں اس کا باعث مضمر ہے"

اس کے بعد مدرسہ جانے والے طلبہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :- "اس سال پرائمری اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد پانچ لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ ہے - شہروں میں تیس اور دیہات میں اسی نئے مدرسے کھولے گئے اور دو سو پچاس نئے کمرے مدرسوں کے لئے بنائے گئے - ان پرائمری اسکولوں میں تیرہ ہزار سات سو استاد ہیں، جن میں سے تقریباً نصف نارمل اسکولوں کے سند یافتہ ہیں - اس وقت ملک میں ایک ہزار چھ سو چوبیس دار المطالعہ ہیں - مقامی حکومتیں ان کے لئے کتابیں اور رسالے خرید کر رہی ہیں - وزارت تعلیم نے حال ہی میں ساٹھ ہزار کتابیں ایک لاکھ پندرہ ہزار لیرا کے صرف سے اُن کے لئے خرید کی ہیں "

لیکن اگر ترکوں کی اکثریت ابھی تک عیش و عشرت اور زندگی کی خاموش نو مسرتوں کی طرف راغب ہے، تو کم از کم ترکی اکا برا ایرانیوں کی طرح ترکی کے گزشتہ غلط افعال کی عزیز یاد دلوں میں تازہ رکھتے ہیں "جمہوریت" (۱۹ - نومبر ۱۹۳۰ء) رقمطراز ہے کہ کسی زمانہ میں ٹرکی کو یورپ کے مرد بیمار کی ملکیت سمجھا جاتا تھا، پھر لکھتا ہے "وہ بیماری کیا تھی جو سلطنت کو موت کے منہ میں گھسیٹے لئے جا رہی تھی؟ یورپ پر ترکوں کے حملہ کو گویا اسلام کے محاصرۂ عیسائیت سے تعبیر کیا جاتا تھا - اور یہ خیال موجودہ زمانے تک قائم رہا - جنگِ بلقان میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ متخاصمین میں سے کسی کو بھی کوئی علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی، خواہ کوئی فریق فتحیاب ہو لیکن جب ترکی کو شکست ہوگئی تو مقدونیہ کا تمام علاقہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا، اور عیسائی دنیا مارے خوشی کے جامہ میں پھولی نہ سمائی ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہلال اور صلیب میں کسی نہ کسی حد تک ایک قسم

---

[1] آرسین لوپن کے اکثر افسانے بہرام کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں - ظفر

کی آویزش ضرور رہی ہے لیکن بیماری کا اصلی سبب یہ نہ تھا بلکہ کوئی اَور وجہ تھی - جنگِ کریمیا کے دوران میں فرانس،
انگلستان، اور سارڈینیا کی عیسائی حکومتوں نے عیسائی روس کے خلاف مسلمان ٹرکی کا ساتھ دینے میں کوئی پس وپیش
نہیں کیا - اور پھر ۱۸۷۷-۷۸ء کی جنگِ روم و روس کے دوران میں بھی جب روسی افواج سین اسطیفانو تک آپہنچیں
تو انگلستان نے روس کو دھمکانے کی غرض سے اپنا جنگی بیڑا بحیرۂ مارمورا کو روانہ کردیا۔"

اس کے برخلاف ایران کا پریس نسبتہً زیادہ آزاد نظر آتا ہے - ورنہ بصورتِ دیگر تجارتی تباہیوں اور اقتصادی
بربادیوں کے خلاف احتجاجی صداؤں کا بیرونی دنیا تک پہنچنا مشکل تھا - اس امر میں "شفقِ سرخ" سب پر بازی لے
گیا ہے - وہ اُس وحشیانہ طریقہ کا انکشاف کردیتا ہے جس کے ذریعہ سے روس اپنے مال کا شمالی ایران میں ماتم کرتا ہے -
بالشویک جنس کا تبادلہ جنس سے کرتے ہیں، لیکن ایران کے اناج روئی، تمباکو اور خشک میوے کے تبادلے میں ایسی
چیزیں نہیں دیتے جنہیں ایرانی خوشی سے منظور کرلیں، بلکہ ایسی اشیا دیتے ہیں جن کے بغیر بالشویک آسانی سے گزارا
کرسکیں ــــ یعنی لوہا اور لکڑی - اس سلسلے میں "شفقِ سرخ" کا مقالہ نگار مسٹر دشتی، خود اپنے ہم وطنوں کو بھی معاف
نہیں کرتا، مگر وہ اس کی نگاہ میں دشمنِ وطن نظر آئیں - اسے ناگوار گزرتا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں کے تاکستان تمام
دنیا میں مشہور ہوں ملک کا اعلیٰ طبقہ فرانسیسی شراب کا دلدادہ ہو - دشتی اپنے ہم وطنوں کو اس امر پر بہت زیادہ زجر و
توبیخ کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی قدیم قومی غیرت اور حمیت سے بے نیاز ہو کر ملکی پیداوار بلا تکلف باہر بھیج دیتے ہیں، اور
اس کے عوض پیرس کا ناپائیدار سامانِ زیبائش اور شمالی یورپ کی مٹھائیوں اور دیگر اشیائے خوردنی کے ڈبے بخوشی
قبول کرلیتے ہیں - اِن حالات کے تحت یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ حال ہی میں اس خبر کے تار موصول ہوئے ہیں
کہ حکومتِ ایران تمام تجارت کے لئے ایک سرکاری اجارہ حاصل کرنے والی ہے - تمباکو کی تجارت نہایت کامیاب
ہے - اسی طرح افیون کی تجارت بھی امید افزا مستقبل لئے ہوئے ہے - حقیقتہً ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہندوستان میں
بیٹھ کر حکومتِ ایران کی تجاویز اور تدابیر پر نکتہ چینی کریں - ہم شاید اتنی دُور ہیں کہ ملک کی مفاجاتی ضروریات کی اندرونی
کیفیت کا اندازہ کبھی نہیں کرسکتے - صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ چند اخبار ان تجاویز کے حامی نہیں ہیں - ایرانی سوداگر
روسیوں کے مستبدانہ طرزِ عمل کا مقابلہ نہیں کرسکتے - مثلاً ایران کی دیا سلائی کی صنعت کو، جو حال ہی میں قائم کی گئی
ہے، تباہ و برباد کرنے کی غرض سے، روس کے سوداگر روسی پٹرول خریدنے والوں کو دیا سلائیاں مفت تقسیم کرتے ہیں

ایرانی ظرافت - کہتے ہیں کہ ایرانی پیدائشی آزاد خیال ہوتے ہیں - اور جس طریقہ سے ایران کے مُلّاؤں
نے جدید سخت ترین قوانین کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا ہے، اس سے اس سرسری رائے کی قطعی تصدیق ہوجاتی ہے کوئی

تعجب نہیں کہ زرتشتی موبد بھی بلاجبر و اکراہ اسی صف میں آ گئے ہیں۔ سوائے اُن لوگوں کے جن کا تمدن اور معاشرت اعلیٰ حضرت رضا شاہ کے ذی علم مشیرانِ کار کی سندِ اجازت حاصل کر چکا ہے، آج ایران میں کوئی روحانی مقتدا اور مصلح نظر نہیں آتا۔ بااین ہمہ اعلیٰ امتحان کا وقت وہ ہوگا جب حکومت ملک کے لاتعداد اوقاف کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی جن میں سے اکثر مقدس خانقاہوں اور مزاروں سے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض اوقاف، مثلاً اصفہان کے، دولت کا ایک خزانہ ہیں جس سے صرف چند ریاکار شخص، جن کا کام درویشوں کے بہروپ بدل بدل کر سادہ لوح باشندوں کو دھوکا دینا ہوتا ہے، متمتع ہوتے رہتے ہیں۔

ظرافت ایرانیوں کی ترکیبِ دماغی کا ایک نمایاں عنصر ہے جو اکثر و بیشتر اخبارات کے صفحات پر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں "شفقِ سرخ" نے ایک طنز یہ مقالہ میں اُن قوانین پر نکتہ چینی کی ہے جو وزیر مالیات تقی زادہ نے ضبط شدہ علم الہجا کے متعلق اپنے ماتحتوں کو ارسال کئے تھے۔ "تجدد ایران" نے تجارت کے متعلق ایسے القابات و خطابات کے استعمال کی ہجو کی ہے جن سے اپنی راست بازی اور فراخ دلی ظاہر ہوتی ہو، درآنحالیکہ ان کے استعمال کرنے والے اکثر ایسے تاجر ہوتے ہیں، جو کئی کئی مرتبہ دیوالیہ ہو چکے ہوں، ناجائز مال کھا کھا کر موٹے ہو رہے ہوں، اور عام طور پر اشیائے درآمد و برآمد میں دست برد کر کے بسر اوقات کر رہے ہوں۔

ایرانی اخباروں کے اشتہارات، باشندگانِ ملک کے بعض غیر متوقع اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ موٹر ڈرائیور تین زبانیں جاننے کے باوجود ملازمت کے لئے اشتہار دیتے ہیں۔ حالانکہ ہوشیار روسی عورتوں کی ملک میں کوئی کمی نہیں۔ وہ کئی زبانیں بول سکتی ہیں، اور ہر قسم کی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمت انجام دینے کے لئے بخوشی تیار ہو جاتی ہیں۔

فارسی زبان کے بہت سے اخبار اور رسالے ایران سے باہر بھی شائع ہوتے ہیں، جنہوں نے مادرِ وطن کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ ہم افغانستان کے اخبارات و رسائل کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ بالشویک اپنے پرچے صرف فارسی ہی میں شائع نہیں کرتے، بلکہ ملک کے ہر طبقہ میں اپنا پروپیگنڈا کرنے کے لئے بعض مقامی زبانوں، مثلاً شمالی ایران کی زبانِ آذری کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ وہ لاطینی حروف استعمال کرتے ہیں۔ مگر روس کا "ایران" رسالہ اس کے طہرانی ہم نام سے جو ایک روزنامہ ہے کوئی تعلق نہیں (عربی حروف استعمال کرتا ہے۔) ایران سے باہر کے دو اخبار ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ قاہرہ کا "چہرہ نما" اور کلکتہ کا "حبل المتین"۔ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ موخر الذکر پرچہ اپنے بانی اور فارسی صحافت کے قائد اعظم سید جلال الدین حسینی کی وفات کے بعد بند ہو گیا۔ ایران کے مفاد کے لئے اس امر کی

صدق دل سے تمنا کی جاتی ہے کہ وہ ذی استطاعت حضرات، جو ایران کے ساتھ اپنے کاروبار یا روحانی ہمدردی کی بنا پر وابستگی رکھتے ہیں، اپنے وسائل و ذرائع کو حرکت میں لائیں گے اور اس بلند حوصلہ اخبار کو ہمارے لئے از سرِ نو زندہ کردیں گے۔ اس پر بحث کرنا اور یہ دکھانا کہ "حبل المتین" نے کس درجہ اہم اور کس قدر ضروری فرض انجام دیا تحصیل حاصل ہے۔ اخبار کی حکمتِ عملی نفرت انگیز خوشامد اور چاپلوسی سے کہیں دور تھی۔ اس موقع پر صرف اُن دو مقالوں کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے، جن میں کرمان کے صحیح حالات و واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جنوب میں ورستان کے خلاف جنگ کا اہتمام کس طرح کیا گیا تھا۔ ان مقالوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق و اقتدارِ شاہی پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی امر نے مؤید کو صحیح واقعات کی تلاش اور چھان بین کرنے کے لئے ان تھک کوششوں پر آمادہ کیا تھا۔ بہت کم آدمی ایسے ہیں جو بیک وقت فارسی اور گجراتی دونوں زبانیں پڑھ سکتے ہوں۔ مستقبل کا جو مورخ ہندوستان کے ہمعصر اخباروں کے فائل سے ایران کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کرے گا اُسے بہت زیادہ پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی۔ بمبئی کے گجراتی پریس کی پالیسی ایرانیوں کے وفادار ترین صحائف سے بھی زیادہ وفادارانہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے حکومت کے طریقوں میں اور سرکاری تجویزوں میں ایسی ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں، جنہیں کبھی ایرانی صحائف بھی معلوم نہیں کرسکے۔ وہ حوصلہ شکن زراعتی ناکامیوں کو (مثلاً خوزستان کی) قطعی نظر انداز کردیتا ہے اور اُس کے لئے ایرانی افسروں میں کوئی مجرم یا نالائق افسر باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس "حبل المتین" نے سب وشتم پر یا ذاتیات پر اترے بغیر اپنی بے لوث تنقید سے بہت سی خرابیوں کی اصلاح کردی، جو بصورت دیگر بے جا اور قابلِ نفرت تحسین و آفرین کی حکمتِ عملی کے سخت ہمیشہ برقرار رہتیں۔ گو اس حکمتِ عملی سے کوئی دھوکا نہ کھاتا، تاہم ایسے مقالہ نگار ملک کے اندر اور باہر روشن خیال ایرانیوں کی نگاہ میں نشانۂ استہزا و مضحکہ بن جاتے۔

چند رسائل۔ فارسی کا ایک مشہور رسالہ جو قاہرہ سے شائع ہوتا ہے "چہرہ نما" ہے۔ "حبل المتین" کے بند ہو جانے کی وجہ سے اس رسالہ نے اپنے مدیر عبدالمحمد خاں ایرانی کی زیرِ نگرانی بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آزادی کے تمام دلدادہ، اُس آزادی کی روح کا بہت گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے، جس کا اظہار رسالہ کے ایڈیٹر نے حال ہی میں کیا ہے۔ مثلاً اُن مضامین سے زیادہ روح پرور اور کیا ہوسکتا ہے، جو ایران کی سیاحت کے بعد "چہرہ نما" کے مدیر نے شائع کئے۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم بالخصوص اُن تنقیدوں کو پیش کرتے ہیں، جو حکومت پر اور اس کے ناکارہ اور نالائق تعلیمی نمائندوں پر کی گئیں، کیونکہ یہ لوگ بعض صوبہ جات میں روشن خیالی کے لئے سدِّ راہ بنے ہوئے تھے۔ "بندرِ پہلوی" میں جو پہلے "انزلی" کے نام سے مشہور تھا پڑھنے کے لئے بہت دل خوش کن

مواد حاصل ہوتا ہے۔ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جسے اتنا لکھنے کی ہمت اور اخلاقی جرأت حاصل ہے کہ ایران میں ایسے دفاتر موجود ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ بولی بولنے والے کے ہاتھ فروخت ہوتے ہیں۔ ایرانی محبانِ وطن ان انکشافات کی بہت قدر کرتے ہیں، بلکہ عموماً ایسے مضامین کے بعد مرکزی حکومت اعتراضات کی تحقیق بھی شروع کر دیتی ہے "چہرہ نما" ایران کی وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو پارسیوں کو، مذہبی قضیات سے بالاتر ہونے کی بنا پر، انجام دینی چاہئے تھی۔ حال ہی میں عربوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ علامۂ رازی کی جس نے مشرق کو جدید یا مغربی نظامِ ادویات سے رُوشناس کرایا، صد سالہ یادگار منائی جائے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے یہ باکمال حکیم ایرانی تھا اور رَے کا باشندہ تھا۔ لیکن اُس نے اپنی بے نظیر تصنیفات عربی میں لکھی تھیں اس لئے بعض لوگ اسے عرب سمجھتے ہیں "چہرہ نما" کے مدیر نے مصر کے اخبارات "مقطم" اور "اہرام" میں مضامین شائع کرا کے دنیا پر ظاہر کر دیا کہ زمانۂ وسطیٰ کے سب سے بڑے ایرانی سائنس دان کی یاد کے ساتھ حقیقی انصاف کیا جا رہا ہے۔

اگر غیر ملکیوں کو جن میں پارسی بھی شامل ہیں، ایران کے ساتھ ایسی محبت ہے جیسی کسی بھائی یا بہن کے ملک سے ہوتی ہے تو اس محبت میں کبھی کبھی ایران کے حالات و واقعات پر ضروری تنقیدات کو بھی دخل ہونا چاہئے۔

بہرحال بحیثیتِ مجموعی ایران کی صحافت اس امر کے لئے بہت کچھ صحیح مواد بہم پہنچاتی ہے کہ حکومت کی کارروائیوں، عوام کے دعاوی، اور ایک ایسے ملک کی اصلاح و ترقی کی بعض ضروری چشم نمائیوں پر، جس کا ماضی انتہائی باعظمت تھا اور جس کا مستقبل بھی کچھ کم شاندار نظر نہیں آتا، معقول اور حدِ اعتدال کے اندر تنقید کی جا سکے۔

(جی کے این) **ظفر واسطی شاہ آبادی**

دوستوں کی قیمت کا ہم صحیح اندازہ نہیں کرتے۔ جب تک وہ زندہ ہیں ہمیں زیادہ اُن کی کمیاں ہی نظر آتی ہیں جب وہ مر جاتے ہیں تو ہمیں صرف اُن کی خوبیاں ہی دکھائی دیتی ہیں +

سچے دوست وہ ہیں جو ہماری خوشحالی کے دنوں میں ہمارے بلائے پر آئیں لیکن مصیبت کی گھڑیوں میں جو بن بلائے چلے آئیں خود بخود +

گلچیں

غزل

تم آپ کر کے بولے کل شب کی گفتگو میں — نرمی سی آچلی ہے کچھ کچھ تمہاری خُو میں

تو کیا ہے اور کہاں ہے کوئی تجھے نہ سمجھا — کیا کیا عزیز جانیں کھوئی ہیں جستجو میں

رونے کا میرے تم کو پیارے یقیں نہ آیا — لو دیکھ لو یہ پلکیں اب تک ہیں تر لہو میں

وابستگی کی تہ میں حاجت چمک رہی ہے — ورنہ کہاں کشش ہے مینائے رنگ و بُو میں

اے جان! اب تو آکر صورت ذرا دکھا جا — بے آرزو ہوا ہوں اِس ایک آرزو میں

آخر کو چارہ گر بھی مجبور ہو کے اُٹھا — یہ چاک ہی نہیں وہ آجائے جو رفو میں

دل ایک ہی نظر میں ہاتھوں اچھل رہا ہے — کیا ہو جو آن بیٹھے پہلوئے گرم خو میں

کن مشکلوں سے سیفی دل کو بچا کے لایا
کیا کیا لگاوٹیں تھیں کل اُس کی گفتگو میں

سیفی (نوگانواں)

حیوانات کا طولانی خواب

قرآن شریف میں اُن سات سونے والوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو روم کے بادشاہ دقیانوس کے خوف سے غار میں روپوش ہو گئے تھے اور جن پر حیرتناک طولانی خواب طاری ہوا تھا اور جو صدیوں کے بعد بیدار ہوئے تھے۔

عقلیت کے پرستاروں نے اس واقعہ کو محض افسانہ قرار دیا، لیکن آج جدید انکشافاتِ علمیہ اس قسم کے طولانی خواب کی تصدیق کرتے ہیں۔

طولانی عملِ تنویم (Libernation) اکثر جانداروں پر طاری ہوتا رہتا ہے، اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

سانپ، مینڈک، بچھو، ریچھ، اور کئی دیگر حیوانات اس طولانی عملِ تنویم سے متاثر ہوتے ہیں اور اکثر اوقات تمام موسم سرما ان کا نیند ہی میں گزر جاتا ہے۔ اکثر حیوانات کا تنفس بند ہو جاتا ہے، اور حبسِ دم کرنے والے جس طرح آنکھیں بند کئے پڑے رہتے ہیں، اسی طرح یہ حیوانات بالکل ساکت، بالکل بے حس، مہینوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں!

علمائے حیاتیات نے اس کے بہت سے اسباب بیان کئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نیند زندگی برقرار رکھنے میں ممد ہوتی ہے۔ برفانی ممالک میں موسم سرما تباہ کاریوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ فصلیں کثرتِ برفباری سے تباہ ہو جاتی ہیں، پھل پھول باقی نہیں رہتے، حشرات الارض مر جاتے ہیں، اس حالت میں قدرت اکثر جانداروں کی غذا کا انتظام کرنے سے قاصر ہوتی ہے؛ اس لئے ان پر ہپنوٹزم (عملِ تنویم) کر کے مادرِ قدرت انہیں سُلا دیتی ہے۔ وہ یہ بھی توجیہ کرتے ہیں کہ اگر یہ حیوانات ایسے قحط و گرسنگی کے عالم میں نہ سوئیں تو فاقہ کشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو جس کا انجام موت کی صورت میں ظہور پذیر ہو۔ اسی لئے وہ پہاڑوں کی درزوں میں، غاروں میں، زیر زمین، درختوں کے خول میں، جا چھپتے ہیں اور پھر ان پر طولانی عملِ تنویم طاری ہو جاتا ہے۔ نیز بعض حیوانات کی نسبت یہ تحقیق کیا گیا ہے کہ باوجود اشیائے خوردنی کی فراوانی کے وہ عملِ تنویم سے متاثر ہوتے ہیں اور سردیوں بھر سوئے رہتے ہیں۔

قطب شمالی کے سفید ریچھ کا بہت حوالہ دیا جاتا ہے۔ وہ دریائی بچھڑے کا شکار کرتا ہے، لیکن موسم سرما میں جب سمندروں کا پانی شدّتِ سرما سے منجمد ہو جاتا ہے اور دریائی بچھڑے بالکل سطح پر آ جاتے ہیں، ان کا شکار بہت آسان ہو

جاتا ہے، تاہم سفید ریچھ انہیں ہاتھ نہیں لگاتا۔ وہ محفوظ مقام تلاش کرتا ہے اور وہاں سو جاتا ہے۔

بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے عملِ تنویم سے حیوانات کی زندگی کا ضرور کوئی تعلق ہے۔ اس قسم کی نیند کے دوران میں حیوانات کا تنفس مسدود ہو جاتا ہے، وہ بول و براز کے حوائج سے بھی بے نیاز رہتے ہیں، اور صرف خون کا ایک خفیف دوران اُن کے نظامِ جسم میں جاری رہتا ہے۔

ایسے طولانی عملِ تنویم کے دوران میں، سانس کی آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ ایک چمگادڑ پر جب یہ عملِ تنویم طاری تھا تجربہ کیا گیا۔ اسے کاربن ڈائی اکسائیڈ میں متواتر چار گھنٹے رکھا گیا لیکن اس کی موت واقع نہیں ہوئی۔ ایک چوہے پر ایسا خواب طاری تھا، اسے شیشے کے ایک مرتبان میں، جس کی ہوا خالی کر لی گئی تھی بند کر دیا گیا۔ مرتبان کو نہایت احتیاط سے سربمہر کیا گیا، لیکن عرصۂ دراز کے بعد بھی چوہے کی حالت میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی پھر جب آغازِ گرما میں مرتبان کھولا گیا تو چوہا زندہ ہو گیا، اس کی آنکھیں کھل گئیں، اور وہ جنبش کرنے لگا۔ آکسیجن گیس میں بھی ایسا تجربہ کیا گیا ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ تمام حیوانات پر عملِ تنویم کا یکساں اثر نہیں ہوتا۔ بعض سردی بھر سوئے رہتے ہیں، بعض پر عملِ تنویم کے میعادی دورے ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاص میعاد کے بعد بیدار ہو جاتے ہیں، اور پھر سو رہتے ہیں۔ ایسے جانور جو درمیان درمیان میں عارضی طور پر جاگ اُٹھتے ہیں وہ اپنے کھانے کا ذخیرہ اپنی جائے پناہ میں چھپا کر رکھ لیتے ہیں۔ اپنے اس توشے میں سے کچھ کھا لیتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ گوشت خوار جانوروں میں بحیرۂ آرکٹک کی لومڑی کی نظیر ملتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا خواب طاری ہونے والا ہے تو وہ خرگوش، لبط، مرغابیاں وغیرہ جانور شکار کرتی ہے اور اپنے بھٹ میں زمین کھود کر دفن کر رکھتی ہے۔ جب موسم ذرا گرم ہوتا ہے تو وہ بیدار ہو کر اپنا خاصہ تناول کرتی ہے، اور پھر سو جاتی ہے! سبزی خوار جانوروں میں انگلستان کی گلہری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سردی کا موسم شروع ہونے کے قبل وہ بادام، کشمش، انگور اور دوسرے انواع و اقسام کے پھل اپنے آشیانے میں جمع کر رکھتی ہے، گویا اپنے عملِ تنویم کے لئے تیاری کر رہی ہو۔ جس دن موسم خنک نہیں ہوتا، مقیاس الحرارت میں پارہ درجۂ زمہریر سے بڑھ جاتا ہے، تو وہ چونک اٹھتی ہے، اپنے پنجوں میں دبا دبا کر اپنے ذخیرے کے پھل کھاتی ہے اور پھر محوِ خواب ہو جاتی ہے۔ سائبیریا کا بھورا ریچھ نیم خفتہ رہتا ہے۔ اس پر سردی کے عملِ تنویم کا اثر ضرور ہوتا ہے لیکن بہت کمزور۔ بدقسمتی سے اگر کوئی اسے اس عمل کے دوران میں چھیڑ دے تو وہ بہت خفا نظر آتا ہے۔ گویا اُسے غصہ آجاتا ہے کہ اُس کے آرام میں کس لئے خلل اندازی کی گئی! ہندوستان کے ریچھ کو اس قسم کی نیند نہیں آتی، البتہ موسم سرما میں وہ بہت سست رہتا ہے، اور اُس کی نقل و حرکت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں چمگادڑیں ہر موسم میں یکساں قلا بازی کھاتی ہوئی نظر نہیں آتیں ۔ باغِ حیوانات میں اُن کی نقل وحرکت اور اُن کے عادات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ مختلف موسموں میں جو مختلف تغیراتِ مزاج رونما ہوتے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل امر نہیں ہے ۔ سردی میں جب کیڑے پتنگے انہیں کھانے کو نہیں ملتے ، تو وہ تہ خانوں میں ، ویران مندروں اور خانقاہوں میں ، مکانات کی تاریکیوں میں ، درختوں کے خول میں چھپ کر سردی کی نیند سو جاتی ہیں ۔ اس ملک میں چمگادڑوں پر پھر بھی اتنا زبردست تنویمی اثر نہیں ہوتا ، کیونکہ قدرت نے اپنی فیاضیوں کا زیادہ حصہ ہندوستان کو عطا کیا ہے ۔ یہاں سردی سخت نہیں ہوتی اس لئے چمگادڑیں نسبتہً کم متاثر ہوتی ہیں ۔ پھل پھول ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں ، کیڑے پتنگے دستیاب ہو ہی جاتے ہیں ۔ چنانچہ جب بستانی مہک انہیں پہنچتی ہے تو وہ دیوانہ وار بیدار ہو کر اسی سمت پرواز کرنے لگتی ہیں ۔ اور باغ سے بہرہ اندوز ہو جاتی ہیں ۔ البتہ یورپ میں چمگادڑیں اسی دن رزق کی تلاش میں نکلتی ہیں جب موسم گرم ہو ورنہ سردی بھر سوتی رہتی ہیں ۔ چمگادڑ کو سردی پہنچائی جائے تو اس کا تنفس بند ہو جاتا ہے ، اور زیادہ سردی پہنچائی جائے تو وہ مر جاتی ہے ۔ ایک سائنس دان نے اپنے معمل میں ایک چمگادڑ پر عجیب وغریب تجربات کئے ہیں ۔ انہوں نے اسے سترہ منٹ تک پانی میں ڈبوئے رکھا ۔ پہلے اس کا تنفس جاری تھا ، لیکن سرد پانی میں ڈبا دینے سے رک گیا ۔ جب نکالا گیا تو پھر تھوڑی دیر میں تنفس جاری ہو گیا ۔ ایک چمگادڑ کو چار گھنٹے مسلسل کاربن ڈائی آکسائڈ گیس میں رکھا گیا لیکن اس کے عملِ تنویم میں فرق نہیں آیا اور نہ اس کی موت واقع ہوئی ۔

ولایت میں ہیج ہاگ نامی ایک عجیب الخلقت جانور ہوتا ہے ، جس کی پشت پر ہمارے ملک کے سیہہ کی طرح خار ہوتے ہیں ، مگر نسبتہً بہت چھوٹے ۔ یہ رات کی اندھیری میں کیڑے پتنگے مار کر کھایا کرتا ہے ۔ دیکھ کر سائنس کے ذریعہ سے کھینچ کر کھا جاتا ہے ۔ سردیوں میں یہ خوب سوتا ہے ۔ جب تنویمی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے تو یہ اپنے جسم کو سمٹا کر گیند کی طرح بنا لیتا ہے اور جہاں جگہ ملے وہیں پر پڑا رہتا ہے ۔ ایسی حالت میں اگر اسے کوئی ستائے تو صرف ایک گہرا سانس یا انگڑائی لیتا ہے ۔ اس سے زیادہ اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی ۔ ایک مرتبہ ایک ہیج ہاگ کو ۲۲ منٹ تک پانی میں ڈبو رکھا گیا لیکن اس کی نیند اچاٹ نہیں ہوئی ۔

ڈارماؤس (Dormouse) بہت دلچسپ جانور ہوتا ہے ۔ اس کا رُواں بہت ملائم ہوتا ہے ، اور دُم گچھے دار ۔ عموماً میدانوں میں تنکوں اور پتّوں سے اپنا گھر بنا کر رہتا ہے ۔ گلہری کی طرح یہ بھی بادام اور خوراک اپنے گھونسلے میں چھپا رکھتا ہے ۔ جب موسم گرم ہو جاتا ہے تو اٹھ کر اپنا ناشتا کھا لیتا ہے اور پھر سو جاتا ہے ۔ وسطِ اپریل سے پہلے اس کا تنویمی اثر ختم نہیں ہوتا ۔

امریکہ میں اسکنک (Skunk) نامی جو جانور ہوتا ہے وہ سرمائی خواب میں بہت زیادہ حصّہ لیتا ہے۔ یہ انسان سے خائف نہیں ہوتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ آدمی کو دیکھ کر یہ ایک زہریلا مادہ خارج کرتا ہے جس کی بو انسان کو سرطان کے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آسٹریلیا کی چیونٹیاں تمام موسم سرما نیند میں گزار دیتی ہیں۔

رینگنے والے کیڑوں سے بڑے جانوروں تک میں سرمائی نوم کی خاصیت ہے۔ سانپ، مینڈک، چھپکلی، مگرمچھ بھی سردی میں سو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جو لاکھوں اموات سانپوں کے زہر سے ہر سال ہوتی رہتی ہیں وہ علی العموم گرمی اور برسات میں ہوتی ہیں، سردی میں نہیں ہوتیں۔ سردی میں سانپ کنڈلی مار کر پوشیدہ جگہوں میں جا چھپتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ اس وقت اگر انہیں چھیڑا جائے، تو وہ ڈسنے کی خواہش نہیں کرتے اور اگر ڈس بھی لیں تو ان کا زہر اثر نہیں کرتا۔ مینڈک بھی سردیوں میں سونے والے جانور ہیں۔ ہمارے ہاں جتنی اقسام کے مینڈک ہوتے ہیں، مثلاً چھوٹی مینڈکی، بھدٹیاں مینڈک، صحرائی مینڈک وہ سب یا تو کیچڑ میں، پرانے مکانات کی درزوں میں، فرش کی اینٹوں تلے، یا اسی قسم کے دیگر مقامات میں آرام کرنے کی غرض سے جا چھپتے ہیں۔ سرد ملکوں میں تو ایک سال کا نصف حصہ نیند ہی نیند میں بسر ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ راقم نے ایک پھولدار درخت کی جڑ میں سے تین مینڈک کھود کر نکالے تھے وہ عمل تنویم سے متاثر تھے۔ ان کا جسم سوکھا ہوا تھا، اور آنکھیں بالکل بند۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ سنیاسی جی غار میں حبس دم کر رہے ہیں! اُنہیں ہوش میں لانے کی مختلف تدابیر عمل میں لائی گئیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی، نہ اُن کے سانس کی آمد و رفت جاری ہوئی۔ خدا خدا کر کے انہیں شروع گرمی میں ہوش آیا تھا۔

یہ امر غور طلب ہے کہ برسات میں مینڈکوں کا اتنا شور و غل مچتا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا جس کا نام ہے وہ انہی مینڈکوں کی بستی ہے! لیکن برسات ختم ہوئی، سردی نے تسلط جمایا، اور مینڈکوں کا وجود بھی نہیں رہا۔

میرے کمرے میں ایک چھپکلی ہمیشہ دیوار گیر گھڑی کے پاس اور تصاویر کے گرد و پیش گھومتی رہتی تھی۔ میں اسے برابر دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن سردی میں مَیں نے اس کی تلاش کی، جو جو سامان دیواروں پر آویزاں تھا سب اتروایا، مگر چھپکلی کا کہیں پتہ نہ لگا۔ وہ برسات میں تھی، سردی بھر غائب رہی، پھر گرمی میں نمودار ہو گئی! اسی طرح مکڑیوں کو سردی میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا۔

ہمارے دیس میں جو گھریلو مکھیاں ہوتی ہیں، وہ بھی سردی بھر کیفیاتِ تنویم سے متاثر رہتی ہیں اور شروعِ گرمی سے اُن کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ خالقِ کائنات کی یہ بھی ایک عجیب قدرت ہے کہ ان مکھیوں کے انڈے سردی میں نہیں پھوٹتے

اور بچے صرف گرمی میں ان انڈوں کے باہر آتے ہیں۔ تتلی اور اسی قبیل کے دوسرے کیڑے جن کی زندگی کا پہلا دور رینگنے والے ننھے ننھے اجسام کی شکل میں نمودار ہوتا ہے (Caterpiller) سردی کا تمام زمانہ انڈوں کے اندر نیند ہی میں گزار دیا کرتے ہیں۔ سرد ممالک میں حشرات الارض بھی سو جاتے ہیں، اور اکثر جب برف باری ہوتی ہے تو وہ بھی یخ کے ساتھ بستہ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب برف پگھلنے لگتی ہے تو تنویمی عمل سے بیدار ہو کر اپنی ننھی زندگی کا ثبوت دینے لگتے ہیں۔ بہت سے حشرات الارض جن کو سخت جان نہیں کہنا چاہیئے برفباری کے ساتھ ہی اپنی زندگی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ سردی میں کھٹملوں کی شرارتیں بھی بہت بڑی حد تک موقوف رہتی ہیں۔ کیچوے اور بچھو بھی سردی بھر سونے والے جانداروں میں شمار ہوتے ہیں۔

آبی جانوروں پر بھی کیفیاتِ تنویم سرمائی طاری ہوا کرتی ہیں۔ آسٹریلیا کی مچھلی جسے وہاں پینکو کہتے ہیں سردی کے آتے ہی کیچڑ میں دبک جاتی ہے، اور اُس وقت تک نہیں نکلتی کہ تمازتِ آفتاب میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو جائے۔ بعض سرد ممالک میں یخ کے ساتھ مچھلیاں بستہ ہو جاتی ہیں، ماہی گیر انہیں برف توڑ کر نکال لیتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسی مچھلیاں جو یخ میں بستہ ہو گئی تھیں اور انہیں سردہ تصور کیا گیا تھا جب مطبخ میں بھیجی گئیں، آتشدان کی حرارت پہنچی تو تڑپنے لگیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ انسان کو بھی تنویم سرمائی کا طویل دورہ ہوتا ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ انسان منطقہ حارہ سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس تنویم کے اثر سے متاثر پایا جاتا ہے۔ جزیرۂ لاپ لینڈ، شمالی سائبیریا، ناروے اور سویڈن میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ ایسے برفانی خطوں میں مکانات کے آگے برف کے تودے جم جاتے ہیں۔ بعض ایسے مقامات بھی ہیں کہ باشندے سردیوں میں اشیائے خوردنی کو خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے۔ چنانچہ قدرت اپنی مشفقانہ عادت کے بموجب انہیں سرمائی خواب کے طولانی دور میں محو کر دیتی ہے اور وہ بدوں تکلیف یہ زمانہ گزار دیتے ہیں۔

علمائے نباتیات نے سرمائی عمل تنویم کی کیفیات کو نباتات میں بھی مشاہدہ کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ایسے پودے گرمی اور برسات میں اپنی غذا آفتاب سے حاصل کر کے سردی میں سوتے رہتے ہیں۔ ان کے پھل پھول اور غنچے، کونپلیں سب پودوں کے اندرونی عضوات میں سکڑے رہتے ہیں اور یہی علامت اُن کے خواب طویل کی بیان کی جاتی ہے۔ ندی اور تالاب میں جو بلیدا رگھاس اگتی ہے، وہ برسات کے بعد ایک دم تہ نشین ہو جاتی ہے، سردی گزار کر پھر سطح پر نمودار ہوتی ہے، اُس وقت اس کی شاخیں دراز ہونے لگتی ہیں، وہ وسعت سے پھیلتی ہے، اور لہلہاتی ہے۔

قدرت نے جن حیوانات کو اس عمل تنویم کا خوگر بنایا ہے، وہ جب بیدار ہوتے ہیں تو اُن کا جسم بہت نحیف ہو...

جاتا ہے، اور وزن میں معتد بہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ریچھ اور سانپوں پر تجربہ کیا گیا ہے کہ ان کا وزن بہ نسبت سابق تیس اور چالیس فیصدی گھٹ گیا۔

اس قسم کی نیند جن جانداروں پر طاری ہوتی ہے ان کے گلے میں جو تھائی مس غدود ہوتے ہیں اُن کی چربی شکر بن کر قلب کو تقویت بخشتی رہتی ہے لیکن یہ صحیح طور پر ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ایسے تمام جانداروں کے تھائی مس غدود ہوتے ہیں یا نہیں جن پر عملِ تنویم سرما طاری ہوا کرتا ہے۔ البتہ یقینی ہے کہ ان کی حرکتِ قلب بہت دھیمی رفتار پر جاری رہتی ہے۔

جدید مشاہدات میں سے اس امرِ واقعہ کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عملِ تنویم کے دوران میں حیوانات کی جسمانی حالت اس درجے پر ہوتی جس درجے پر اُن کے جائے خواب کی حرارت ہو۔ اگر اس میں کچھ فرق ہوا تو سوتا ہوا جانور یا بیدار ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ چمگادڑوں پر عمدگی سے اس قسم کے تجربات کئے جا سکتے ہیں۔

جب تنویمی دور ختم ہو جاتا ہے تو قوانینِ طبعیہ کے موجب سونے والوں کے جسم کی حرارت اُس جگہ کی حرارت سے بڑھنے لگتی ہے جہاں وہ سوئے ہوتے ہیں، اور اس طرح جانور خود بخود بیدار ہو کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

حسن عزیز جاوید

ایمان زندگی کی قوت ہے۔

ایمان عقل کا تسلسل ہے۔

ایمان عقل کا کام نہیں اُس کا آرام ہے۔

ایمان عمل کی جڑ ہے۔ جڑ جس سے کچھ پیدا نہ ہو مردہ ہوتی ہے۔

ایمان کے بغیر انسان بے کار ہے لیکن ایمان علم کو تباہ کر سکتا ہے۔

گلچیں

یادِ وطن

وطن کی پیاری پیاری سرزمیں سے دُور اے ہمدم
مری خاموش اور سنسان راتوں کی فضاؤں میں
بساطِ چرخ پر سجتی ہے جب محفل ستاروں کی
محیطِ آسماں جب بے خودی میں غرق ہوتا ہے
فلک سے تخت جب نیندوں کی پریوں کے اترتے ہیں
سکوں جب حکمراں ہوتا ہے شورش گاہِ ہستی پر
تو کوئی مطربِ نوخیز نغمے چھیڑ دیتا ہے
نوائیں وجد میں لہرا کے اٹھتی ہیں فضاؤں میں
نہیں کچھ بھید کھلتا یہ فسونِ دلربا کیا ہے
یہ کیا شے ہے جو افسردہ امنگوں کو جگاتی ہے
وطن کی پیاری پیاری سرزمیں سے دُور اے ہمدم

وطن کی ارضِ جنت آفریں سے دُور اے ہمدم
مری مدہوش اور بے جان راتوں کی فضاؤں میں
نظر آتی ہیں شکلیں ننھے ننھے دلفگاروں کی
یہ تیرہ خاکداں جب بے خودی میں غرق ہوتا ہے
ہوا کے مست جھونکے دہر کو سرشار کرتے ہیں
خموشی ثبت ہو جاتی ہے ہنگاموں کی بستی پر
جنوں آموز و دلگیر نغمے چھیڑ دیتا ہے
فضائیں مست ہو کر ڈوب جاتی ہیں نواؤں میں
طلسمِ موت سا کچھ چھیڑ جاتا سازِ نو آیا ہے
یہ کیا شے ہے جو دل میں درد بن کر ڈوب جاتی ہے
وطن کی ارضِ جنت آفریں سے دُور اے ہمدم

یہ راتیں ہجر کے احساس کو بیدار رکھتی ہیں
وطن کی یاد میں مجھ کو جگر افگار رکھتی ہیں

مخدوم

آخری تحفہ

ٹھنڈی ٹھنڈی دلکش چاندنی اور خوش رنگ گلاب کے پھول! پیانو کی سریلی دھیمی آواز، وہ متبرک اور مبارک خطبہ اور اُس کے بعد جیک کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اُس کے ہم عصر افسروں کی چمکتی ہوئی تلواروں کی چھاؤں میں میرا مسکراتے ہوئے گزرنا! یہ ہے میری دنیا کے تصور کی بہترین تصویر! کیسا مسرت بخش اور پُرکیف وقت تھا! بھولی بھالی حسین لڑکیاں اور خوبرو نوجوان فوجی وردیاں پہنے چاروں طرف کھڑے مسکرا رہے تھے۔

سرور و انبساط کے دو ناقابلِ فراموش ہفتے اور پھر اپنے بہادر شوہر کو ایک بڑے جنگی جہاز پر میرا الوداع کہنا! جہاز بندرگاہ سے آہستہ آہستہ نکلا اور ہزارہا سپاہیوں کے ساتھ میرے بہادر سپاہی کو بھی سمیٹے ہوئے فرانس کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ منظر بھی میری آنکھوں کے پردوں میں محفوظ ہے۔

میرے لئے تو ایک طرح سے یہ اُس کا آخری دیدار تھا کیونکہ جنگِ عظیم کے بعد جو شکستہ ہستی میری آنکھوں کے سامنے آئی وہ کسی طرح بھی میرے اُس حسین نوجوان سپاہی کے مشابہ نہ تھی جس کو میں نے خدا حافظ کہہ کر جہاز پر روانہ کیا تھا۔

اُس کے محبت آمیز خطوط برابر میرے پاس آتے رہے۔ اخباروں میں اُس کے دلیرانہ کارناموں کا حال پڑھ کر خوشی سے میرا دل اچھلنے لگتا تھا۔ مگر افسوس یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ کچھ عرصے کے بعد خط آنے بالکل بند ہوگئے۔ مدت گزر گئی۔ آخر سرکاری طور پر ایک دن مجھے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ جنگ میں اس کو بہت کاری زخم آئے ہیں، جن کی وجہ سے اُسے واپس بھیجا جا رہا ہے۔

مَیں اس ملاقات کا حال زیادہ بیان نہیں کرسکتی۔ اور نہ الفاظ میں اس کے اظہار کی قدرت ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میرے ساتھ کوئی خطرناک مذاق کھیلا جا رہا ہے۔ پیلا پژمردہ چہرہ، لاغر اور کمزور جسم جو ذراسی آواز پر لرز جاتا تھا۔ اگر اس کی ایک ٹانگ یا ہاتھ ضائع ہوجاتا تو میں ایک بہادر سپاہی کی بیوی کی طرح اُس کو صبر کے ساتھ برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن یہ ـــ یہ حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ اُس کی مخمور آنکھوں میں اب وہ اگلا سا خمار نہ رہا تھا۔ اس کی حالت سے مجھے حقیقتاً ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سینکڑوں مرتبہ مر مر کر جیا ہے۔

بہت عرصے تک ایک شفاخانے سے دوسرے شفاخانے میں ہمارا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر جب ہم سب سے بڑے

فوجی شفاخانے میں پہنچے تو وہاں کے رحمدل اور شریف سرجن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

"مسز ڈیگنز" اُس نے آہستہ سے کہا "میں سخت پریشان ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا" وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پھر کہا "تم جانتی ہو، گو سائنس نے بہت ترقی کی ہے اور کر رہی ہے لیکن انسان کی طاقت اور اس کا علم محدود ہے اور رہے گا۔ جو صدمہ تمہارے شوہر کو پہنچا ہے اُس نے صرف اس کی ہڈیوں ہی کو چُور چُور نہیں کیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ نقصان پہنچایا ہے۔ کاش! میرے ان سخت الفاظ سے تمہیں رنج نہ پہنچے، مگر میں مجبور ہوں اب صرف ایک طریقہ ہے کہ تم اُس کے قلب کو آرام اور قوت پہنچانے کی کوشش کرو۔ شہر سے باہر کہیں گاؤں میں لے جاؤ، جہاں تازہ ہوا خوب مل سکے۔ راحت و آرام پہنچے محنت کم کرنی پڑے۔ اب تو یہی ایک علاج ہے۔ اسی پر امید ہے۔ قدرت کو بھی اپنا کرشمہ دکھانے کا ایک موقع دو۔

"اور اُس کا نتیجہ" اُس نے اپنا ہاتھ ایک معنی خیز انداز میں ہلا کر کہا "صرف وقت ہی بتا سکتا ہے"۔

اُسی وقت مجھے کلنٹ اسکواٹل کا خیال آیا۔ کلنٹ میرا بہت پرانا دوست تھا صحت خراب ہونے کی وجہ سے وہ جنگ میں شریک نہ ہو سکا تھا جس کا اسے بڑا افسوس تھا۔ سیاچوسٹ میں اُس نے جوتوں کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں اسے فوج کے جوتوں کا ٹھیکہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت مالدار ہو گیا تھا۔

میں اس کے پاس جانا اچھا نہیں سمجھتی تھی، لیکن مجبور تھی۔ ایک مفید مشورے کی محتاج تھی۔ کلنٹ نے معاملے کو فوراً سمجھ لیا اور اس طرح حل کر دیا گویا یہ کوئی معمولی سی بات تھی۔

"کیٹ" اُس نے کہا، "مجھے تمہارے آنے سے بیحد مسرت ہوئی۔ میں خود ایک ایسے آدمی کی تلاش میں تھا۔ آج کل مجھے ایک خاص انتظام درپیش ہے۔ میں نے حال ہی میں ماٹنٹا میں ایک سونے کی کان خریدی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم جیک کو وہاں بھیج دیں۔ دفتر کا معمولی کام ہوگا۔ وہاں کی آب و ہوا بھی اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ جب تم دوبارہ اس سے ملو گی ......

"دوبارہ ملوگی" میں نے جواب دیا۔ "کلنٹ تم کس خیال میں ہو۔ میں اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اس کے ساتھ ہی جاؤں گی"۔

کلنٹ نے کچھ غصے میں منہ بنا کر جواب دیا "لیکن کیٹ وہ جگہ عورتوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کان کھودنے والوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے، جہاں صرف ایک عورت رہتی ہے، مسز پراکٹر، وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کی بیوی"۔

"اگر مسز پراکٹر وہاں رہ سکتی ہے تو یقیناً میں بھی اچھی طرح رہ سکوں گی"۔

کلنٹ نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن جس قدر وہ اصرار کرتا تھا اُسی قدر میرا ارادہ پختہ ہوتا جاتا تھا۔ آخر وہ اندر ہی اندر کچھ بڑبڑا کر خاموش ہوگیا، اور ہماری روانگی کے لئے ضروری انتظامات کرنے لگا۔

میں یہ ضرور کہوں گی کہ جب میں نے مانٹنا کا صندوق نما سرخ اسٹیشن دیکھا جو گویا ریل کے ایک ڈبے کے پہیے نکال کر بنایا گیا تھا، اور سامنے مجھے پہاڑی کی چوٹی تک ایک وسیع اور گھنا جنگل نظر آیا تو میری طبیعت گھبرانے لگی۔ غالباً ایک شہری ہی میرے اِن جذبات کو اچھی طرح محسوس کرسکے گا۔ لیکن جیک کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی چمک نظر آئی زخمی ہونے کے بعد آج یہ پہلا موقع تھا کہ اُسے کسی چیز میں کچھ دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ میرے دل میں امید اور خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں خاموش کھڑی تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔ گرد کا ایک پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس پردے سے ایک پرانی موٹر نکلی اور اسٹیشن کے قریب آکر رک گئی۔ گندمی رنگ کا ایک آدمی اس میں سے کود کر باہر نکلا۔ وہ تمباکو چبا رہا تھا۔ لیکن میری صورت دیکھتے ہی سب بھول گیا اور گھبرا کر جلدی سے سارا تمباکو نگل گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی جیک کو دیکھتا اور کبھی میری طرف تکنے لگتا۔ اسٹیشن پر دیکھنے کو بھی کوئی اور مسافر نہ تھا۔ آخر میں نے اس سے دریافت کیا "کیا تم کسی کو تلاش کر رہے ہو؟"

اُس نے اپنی گنوار وزبان میں جواب دیا "ہاں! لونا نزا کی سونے کی کان پر ایک آدمی انتظام کے لئے آنے والا تھا"

"وہ ہم ہی ہیں"۔ میں نے جیک کو سہارا دے کر موٹر میں سوار کرا دیا۔

موٹر کا سفر خود ایک طویل داستان ہے جس کے اختتام پر ہم دونوں تھکے ماندے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھے تھے، جو گھاٹی کی سطح سے بہت بلند تھا۔ جنگل کا خوشنما منظر ہمارے پیش نظر تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ایک طرف سامنے چھوٹی سی آبادی نظر آتی تھی۔ وسط میں لکڑی کی ایک بڑی عمارت تھی جہاں سب لوگ بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک اور عمارت تھی جس میں دفتر تھا۔ اسی کے اندر گودام بھی تھا۔ چند چھوٹے چھوٹے مکانات اور بھی تھے۔ سب آباد نظر آتے تھے۔ کان یہاں سے تقریباً دو یا تین فرلانگ پہاڑی کی جانب تھی۔ ہمارا مکان حال ہی میں تیار ہوا تھا، اور خلافِ امید بہت صاف کشادہ اور آرام دہ تھا۔

رات کو مجھے ایسی نیند آئی کہ اپنی یاد میں کبھی میں ایسی گہری نیند نہیں سوئی۔ صبح کو جب بیدار ہوئی تو دل میں یہی خیال تھا "یہاں کی آب و ہوا کیا اثر کرتی ہے۔ کچھ مفید ثابت ہوگی یا نہیں"

موسم بہت خوشگوار اور ٹھنڈا تھا۔ گھڑوں میں پانی پر برف کی ایک پتلی سی تہ جم گئی تھی۔ لیکن سورج کی تیز شعاعو

نے بہت جلد خنکی دور کر دی۔ بھنے ہوئے گوشت اور انڈوں کی خوشبو پاکر جیک اپنے بستر سے اٹھا۔ مہینوں کے بعد آج پہلی مرتبہ اُسے حقیقی بھوک محسوس ہوئی تھی۔ چہرے پر بھی کچھ رونق معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایک دم یہ خیال آیا کہ یہاں کی آب و ہوا میں اس کے صحت یاب ہونے کا کس قدر امکان ہے۔ اس کے تصور ہی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دفتر گئے اور مسٹر پراکٹر سے ملے۔ وہ جیک کو اپنے ہمراہ کان پر لے گیا۔ اس کو تمام کام سمجھایا۔ مسز پراکٹر بہت رحمدل، ہمدرد اور خوش مزاج تھی۔ میرے آنے سے اسے بہت خوشی ہوئی کیونکہ اب تک وہ یہاں بالکل تنہا رہتی تھی۔

کچھ دن تک تمام کاروبار بہت اطمینان اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ جیک کو اس کام میں ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس کی صحت اور دماغی حالت میں نمایاں فرق معلوم ہوتا تھا۔ لیکن معاملات نے پھر ایک دم پلٹا کھایا۔ اعصاب کی کمزوری سے جیک پھر بہت چڑچڑا ہو گیا۔ ذرا سی آواز سے وہ پریشان ہو جاتا تھا اور گھبرا کر بہت خوفزدہ آنکھوں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اپنے دل میں ایک درد سا محسوس ہونے لگتا۔ کوئی بات ضرور تھی جس نے اُسے اس قدر متوحش کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اس سے دریافت کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی، کیونکہ میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی طبیعت کے اس انقلاب کو محسوس کر چکی ہوں۔

اتوار کے دن کام بند رہتا تھا۔ یہاں آنے کے تقریباً تین ہفتے بعد ایک دن اتوار کو میں گودام سے کچھ سامان لینے جا رہی تھی۔ جیک نے بھی میرے ساتھ جانے کی خواہش کی تاکہ سامان لانے میں مدد دے سکے۔ میں نے سامان خریدا، اور اسے کاغذ میں باندھنے کے لئے کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے مسز پراکٹر کے مکان پر گئی۔

پراکٹر انجن کے کچھ پرزے لینے کے لئے بٹ گیا ہوا تھا۔ اسی لئے میں مسز پراکٹر کو شام کے کھانے پر مدعو کرنے گئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے میں نے اتفاقاً کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گودام کے آگے کان کھودنے والوں کا کچھ مجمع نظر آیا۔ بیچ میں ایک بلند قامت جوان کھڑا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی ایسا قوی جوان نہیں دیکھا۔ خوبصورت ورزشی جسم میں ایک مقناطیسی قوت محسوس ہوتی تھی۔ اس کی پوشش عام کان کھودنے والوں کی سی تھی۔ کھلے ہوئے کالر کی فلالین کی قمیص، موٹی پتلون کے پائنچے اونچے اونچے جوتوں کے اندر گھسے ہوئے تھے، لیکن صحت نے اُس میں ایک عجیب کشش پیدا کر دی تھی، جس کی وجہ سے وہ دوسروں میں ممتاز نظر آتا تھا۔ بال گھونگروالے اور سیاہ تھے۔ گردن ایک مغرورانہ انداز سے خم تھی چھوٹی چھوٹی خوبصورت مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ غرض اُس کی حرکات و سکنات میں غرور اور بے پروائی کا ایک عجیب انداز تھا۔

میں نے مسز پراکٹر سے دریافت کیا "یہ خوبصورت جوان کون ہے؟"

اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا "یہ جین جیراکس ہے۔ بدمعاش! میں نے اکثر پراکٹر سے اسے برخاست کر دینے کو کہا ہے لیکن مردوں کے خیالات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پراکٹر کہتا ہے کہ یہ بہترین آدمی ہے اور جب تک یہ اپنا کام ٹھیک کر رہا ہے یہیں رہے گا۔ خدا جانے اس وقت کس علت میں یہاں کھڑا ہے۔

اُسی وقت گودام کا دروازہ کھلا اور جیک اپنے دونوں ہاتھوں میں سامان لئے ہوئے باہر نکلا۔ جین جیراکس کو دیکھتے ہی وہ گھبرا گیا اور پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا وہ بچ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ اسی آدمی کی وجہ سے جیک کی بیماری پھر عود کر آئی ہے۔ جیراکس نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے اور جھومتا ہوا آگے بڑھا۔

"بدمعاش!" اُس نے چلا کر کہا اور بہت سخت نگاہوں سے گھورتا ہوا آہستہ آہستہ جیک کی طرف چلا۔ غریب جیک ڈر کر پیچھے ہٹا۔ گھبراہٹ میں اُس کے ہاتھ سے ایک بنڈل بھی گر گیا۔ جیراکس نے اپنا سر ہلایا اور پھر اکڑ کر کہا۔ "شیطان ہاتھوں میں اتنا بھی دم نہیں۔ یہ سامان کیوں گرایا۔ تجھے ضرور اس کی سزا ملنی چاہئے۔" اُس نے آگے بڑھ کر جیک کو پکڑ لیا اور زور سے دھکا دیا۔ جیک نے خوف سے ایک چیخ ماری۔

شرم اور غصے سے پاگل بنی ہوئی میں جھپٹ کر دروازے سے نکلی اور اُن لوگوں کے بیچ میں آگئی۔ میرا جی چاہتا تھا میں اُس کو قتل کر دوں۔ جب میرا ہاتھ اُس کے منہ پر پڑا تو ایک پٹاخے کی سی آواز ہوئی، اور جیراکس گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اُس کی آنکھوں سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔

ایک لمحے تک ہیبت ناک خاموشی رہی۔ بہت ہی عجیب نظارہ ہوگا۔ چاروں طرف آدمی کھڑے تھے کچھ پریشان اور کچھ متعجب۔ بیچ میں وہ قوی فرانسیسی میرے مقابل تھا۔ منہ پر گرد جمی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے گھبراہٹ اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور اُس پر پانچوں انگلیوں کے سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ لیکن میں غصے سے اندھی ہو رہی تھی۔

"بزدل کمینے" میں نے حقارت سے کہا "کمزور بیمار پر حملہ کرتا ہے اور اپنے آپ کو دلیر اور بہادر سمجھتا ہے کسی بہادر سے مقابلہ کر جو ترکی بہ ترکی جواب دے لیکن تجھ میں اتنی ہمت کہاں ہے، ذلیل!" میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور پھر کہا "تم سب نامرد ہو!" "آؤ جیک" میں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

اُن میں سے ایک آدمی نے قہقہہ لگایا۔ جیراکس کے چہرے کا رنگ ایک دم تبدیل ہوگیا اور اُس نے دانت پیس کر بہت سخت نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ "اچھا۔ میرا مذاق اڑاتے ہو! جین جیراکس پر کون ہنستا تھا؟" اس کی آواز ہلکی تھی لیکن لب و لہجہ سے سختی ٹپک رہی تھی۔ وہ تن کر سیدھا کھڑا ہوگیا، اور پھر نصیحت آمیز پیرائے میں کہنے لگا "دوستو

تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ خاموش رہو۔ میرا مذاق بنانا اچھا نہیں۔" اُس نے بڑی شان سے اکڑ کر اپنا ہاتھ گھماتے ہوئے کہا "تم سب چلے جاؤ۔"

گو وہ بہت متکبر اور مغرور تھا لیکن مجھے یہ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس شکست میں بھی اُسی کی فتح تھی۔ شام تک میرے دماغ میں خوف و ہراس میں ڈوبے ہوئے پریشان خیالات چکر لگاتے رہے۔

میں نے مسز پراکٹر سے آج تک جیک کے متعلق کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن ممکن ہے کہ کلبنٹ نے پراکٹر کو جیک کے حالات سے آگاہ کر دیا ہو۔ مگر اس وقت تک کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوا ہو کہ وہ لوگ جیک کی گزشتہ زندگی سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ جیک جیسے کمزور اعصاب کے آدمی کو ایسے جاہلوں کے تکلیف دہ مذاق سے بچانا ضروری تھا۔ آخر ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی۔ ہمارے ساتھ ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ میں نے جا کر اُس کی سب چیزیں الٹ پلٹ کر ڈالیں، اور آخر وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبا۔ میں اسے اپنے ہاتھ میں لئے سیدھی اُن سب کے کھانا کھانے کے کمرے کی طرف گئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے اور میز کے چاروں طرف بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے اور کچھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

ایک فوری اور کامل سکوت سے میرا خیر مقدم کیا گیا۔ گفتگو بند ہو گئی۔ میں نے ان کی نگاہوں سے محسوس کیا کہ میرا آنا کس قدر ناگوار گزرا ہے۔

آخر میں نے کہنا شروع کیا "مجھے تمہاری اس آزاد صحبت میں اس طرح خلل انداز ہونے کا سخت افسوس ہے لیکن میرے یہاں آنے کی ایک خاص وجہ ہے جس کو میں بہت جلد آپ صاحبان کی اجازت سے چند مختصر الفاظ میں بیان کر دوں گی۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ اپنے چاروں طرف دیکھا حیرت زدہ اور متعجب چہرے نظر آتے۔

"اس میں شک نہیں کہ تم میرے شوہر کو بزدل اور ڈرپوک خیال کرتے ہو، اور بعض کو اس وجہ سے غالباً میرے حال پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو لو . . . دیکھو!" میں نے وہ ڈبا کھولا اور چمکتے ہوئے پانچ تمغے میز پر پھینک دیئے۔ پھر ان میں سے ایک تمغہ تجویز کر کے میں نے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا تاکہ سب اُس کو دیکھ سکیں۔

"کراڈی گارڈ!" یہ تمغہ بزدلوں کو نہیں دیا جاتا۔ میں نے فخر سے اپنا سر اٹھایا۔" یہ سب میرے شوہر نے حاصل کئے ہیں اور وہ انہیں اپنے سینے پر لگانے کا مستحق ہے۔" میں نے پھر میز کے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔

"جنگِ عظیم کا کبھی نام سنا ہے؟ شاید تم میں سے بعض اس میں شریک بھی ہوئے ہوں۔"

اُن کے جمعدار نے جو میز کے دوسری طرف بیٹھا تھا آہستہ سے اپنے دانتوں سے پائپ نکالا اور کہا۔ "ہاں ایں

شریک تھا"

جیراکس تیزی سے کرسی سرکا کر کھڑا ہو گیا۔ "میں بھی لڑائی پر گیا تھا" چند لوگوں نے اس کی تائید میں اپنے سروں کو جنبش دی۔

"اچھا" میں نے کہا "یہ بھی بہت ممکن ہے کہ تم میں سے بعض کپتان جان ڈیگنز سے واقف ہوں جو کبھی جیک کوہنکن کے نام سے پکارا جاتا تھا"

میں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ تمام مجمع پر ایک موت کا سا سکوت چھا گیا۔

جیراکس نے اپنے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "وہ نہیں ... نہیں ... مگر کیا ... یہ وہی ہے"

میں نے اپنا سر ہلایا۔ اُس نے پھر کہا "لیکن میری آنکھوں کے سامنے اُس کے گولی لگی تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا"

لوگوں میں کچھ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ میں برابر جیراکس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ آہستہ آہستہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اُس نے نہایت متانت سے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ سب خاموش ہو گئے۔ جیراکس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ لیکن صبح کی حرکت کا خیال کر کے میرا دل ہنوز اس کی طرف سے پتھر بنا ہوا تھا۔

"محترم خاتون" اُس نے آہستہ سے کہا "میں اس قدر شرمندہ ہوں کہ آپ سے معافی تک کی امید نہیں کر سکتا لیکن آج سے ہم سب اُس کی شایانِ شان عزت کریں گے۔ ہمارے لئے آج سے وہ پھر ایک کپتان ہے"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے تمغے اُٹھائے اور سب کو رات کا رخصتی سلام کر کے تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی، اپنے مکان پر پہنچی اور اپنا قیمتی ڈبّا پھر چھپا کر رکھ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ ہرگز جیک سے اس بات کا تذکرہ نہ کریں گے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میرا جادو چل گیا، اور آئندہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں کس حد تک کامیاب ہوتی۔

دوسرے دن صبح کھانے سے فارغ ہو کر میں جیک کو کپڑے پہننے میں مدد دے رہی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ یہ مسز براکٹر تھی۔ اندر آکر کہنے لگی "میری پیاری بچی، کل تم نے بڑی دلیری سے کام لیا۔ واقعی بڑی ہمت کی۔ یہ لوگ بہت بے رحم اور شوریدہ پشت معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل بہادر اور شریف ہیں۔ نیک دل ہیں ... براکٹر بھی آج ہی صبح کی گاڑی سے واپس آگیا ہے۔ اُسے یہ سُن کر بہت غصہ آیا اور کہنے لگا کہ آج شب کو وہ ضرور

جیرآکس کو برخاست کر دے گا۔ اس کا یہی علاج ہے۔ وہ بدمعاش اسی قابل ہے "
لیکن میں نے کہا کہ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مسز پراکٹر تم اُسے اس ارادے سے باز رکھو جو کچھ بھی اُس نے کیا بے سوچے سمجھے کیا۔ اب مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ کبھی ایسا نہ کرے گا۔ میرے لئے مہربانی پراکٹر کو روکئے کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ غرض ایک طویل مباحثے کے بعد وہ اس بات پر تیار ہوگئی کہ دوپہر کے کھانے پر اپنے شوہر سے اس کا تذکرہ کردے گی۔

دوسرے دن یہ معلوم کرکے کہ جیرآکس اپنے کام پر موجود ہے مجھے اطمینان ہوگیا۔ اب میرے لئے ایک خوشگوار زمانے کا آغاز ہوچکا تھا۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ عیش و مسرت میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ میرا جیک اب بالکل ایک نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پچکے ہوئے رخسار ایک مرتبہ پھر بھر آئے تھے۔ اب میری متجسس نگاہیں بھی اس کے خولصورت چہرے پر پریشانی اور وحشت کے آثار نہ ڈھونڈ سکتی تھیں۔ البتہ بعض اوقات جب وہ بہت زیادہ تھکا ہوا ہوتا تھا اُس کے مزاج میں کچھ چڑچڑاپن ضرور آجاتا تھا۔ لیکن اس کی حالت روز بروز بدلتی جارہی تھی۔ آخر وہ پھر میرا وہی پرانا پیارا جیک معلوم ہونے لگا۔ ایک روز اُس نے مجھ سے خود کہا کہ وہ لوگ اس پر بہت مہربان ہوگئے ہیں۔ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اخلاق و محبت سے پیش آتے ہیں۔

لیکن جیک نے کبھی اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کی۔ مجھے اکثر یہ خیال بھی گزرتا تھا کہ شاید وہ اس سے واقف ہوگیا ہے۔ لیکن میں خود اپنی طرف سے کوئی سوال کرکے اس ناخوشگوار واقعے کی یاد تازہ کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ جو کچھ گزر گیا گزر گیا، اس کے لئے خدا کا شکر ادا کرتی تھی اور آئندہ کے لئے بہتری کی دعا کرتی تھی اور امید رکھتی تھی۔

اسی دوران میں مجھے کچھ گمنام تحائف پہنچتے رہے۔ کبھی نہایت خولصورت خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ برآمدے کی میز پر رکھا ہوا ملتا۔ کبھی مکان کی پشت پر دیوار کے نیچے جلانے کی لکڑیاں صفائی سے چنی ہوئی دکھائی دیتیں۔ ایک دن صبح کو خلافِ معمول میں سویرے اُٹھ بیٹھی دروازے پر کچھ کھٹکا معلوم ہوا۔ فوراً جاکر دیکھا۔ دروازے کے اوپر ایک کیل میں تازہ شکار کئے ہوئے چند خرگوش لٹک رہے تھے جنگل میں جو ہمارے مکان کو تینوں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ میں نے بلند قامت حبشی جیرآکس کو تیزی سے غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ غائبانہ تحائف پہنچانے والا یہی تھا میرے دل میں ابھی تک اس کی طرف سے نفرت بھری ہوئی تھی۔ ابھی تک میں اس خیال کو فراموش نہ کرسکی تھی کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ چنانچہ ایک روز جب وہ مجھے راستے میں ملا تو میں نے اسے روکا اور بہت متانت سے کہا۔ "جیرآکس۔ تمہارے جذبات بہت قابل تعریف ہیں، میں ان کی قدر کرتی ہوں، لیکن افسوس کہ میں تمہاری ان

عنایات کی خواہاں نہیں ہوں۔ اُس دن صبح کو میں نے تمہیں وہ خرگوش لٹکا کر واپس جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"
دیو قامت جیک اُس خاموش کھڑا انگلیوں میں اپنا ٹوپ نچا رہا تھا۔ آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی حالت بالکل اسکول کے اُس چھوٹے لڑکے کی سی تھی جو کوئی برا کام کرنے کے دوران میں دیکھ لیا گیا ہو۔
"لیکن۔ محترمہ . . . " اُس نے کہا۔
"نہیں جیک مجھے افسوس ہے۔ آئندہ میں تمہارے کسی تحفے کو ہاتھ نہ لگاؤں گی۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ آج سے کوئی تحفہ نہ بھیجنا۔"
اتنا کہہ کر میں تیزی سے روانہ ہوگئی۔ اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں نے جس دلی صدمے کا اظہار کیا اُس کا اثر میں جلد اپنے دل سے نہ مٹا سکی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسا بھی ایک دن آنے والا ہے جب میں اپنی اس حماقت پر کفِ افسوس ملوں گی۔ دل میں اس سے شرمندہ ہونگی۔ کاش! میں اُس کے قصور کو بھول سکتی اور اسے معاف کر دیتی۔
چھ مہینے ہنسی خوشی گزر گئے۔ سردی کا زمانہ قریب آپہنچا۔ ایک دن رات کو میں اور جیک کھانا کھا چکے تھے کہ پراکٹر کمرے میں آیا، اور آتشدان کے قریب کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سینکتے ہوئے کہنے لگا "جیک مجھے ابھی ڈاک ملی ہے۔ کلنٹ کا بھی ایک خط آیا ہے۔ گذشتہ ماہ میں جو سڑک تیار ہوئی ہے اس کے اخراجات کا حساب فوراً مانگا ہے۔ میں رات کے وقت ہرگز تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ تمہیں کان پر جا کر حساب کے کاغذات لانے ہونگے۔ تکلیف تو بہت ہوگی۔"
جیک مسکراتا ہؤا فوراً کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں بخوشی جانے کو تیار ہوں۔ ذرا کیٹ کے ساتھ برتن صاف کرالوں۔ ابھی جاتا ہوں۔" پراکٹر بہت خوش ہؤا اور کہنے لگا "ایسی ہی ہمت اور مستعدی ہونی چاہیے شاباش کاغذات لے کر دفتر میں آجاؤ۔ حساب تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مسز ڈیگنر معاف کرنا انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"
جب ہم برتن صاف کر چکے تو میں نے جیک کو گرم کوٹ پہنایا، اور اُس کا برقی لیمپ بھی ڈھونڈ کر دے دیا پھر کچھ متردد ہو کر میں نے کہا "جیک رات کا وقت ہے۔ نزدیک کے نئے راستے سے مت جانا۔"
جیک نے مسکرا کر جواب دیا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ابھی تک اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا؟"
"نہیں۔ نہیں، جیک لیکن احتیاط ضروری ہے۔"
"اوہ، تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ تم کچھ فکر مت کرو"
جیک سڑک پر چلا جارہا تھا۔ میں کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر اُس

کی روشنی کی مدد سے چٹانوں اور گڑھوں سے بچتا ہوا جا رہا تھا، اور میرے دل میں اس کی محبت کا دریا موجیں لے رہا تھا۔

کان پر جانے کے دو راستے تھے۔ ایک بہت لمبا اور پیچیدار تھا جو پہاڑی پر چکر کھا گر گیا تھا۔ دوسرا مختصر تھا جو سیدھا پہاڑی کے نیچے چلا گیا تھا اور پھر وہاں سے معمولی لکڑی کی سیڑھیوں کے ایک زینے سے اوپر کان پر پہنچتا تھا۔ عام طور سے لوگ اسی راستے سے جاتے تھے، کیونکہ یہ بہت قریب کا راستہ تھا۔ زینے تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹی سی کھائی پر سے گزرنا پڑتا تھا جس کے اندر دلدل کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اُس کو عبور کرنے کے لئے لکڑی کا ایک تختہ ڈال دیا تھا۔ دن میں اس تختے پر سے گزرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن رات کے وقت ایک قدم کی لغزش کے معنی موت تھے۔

میرے دل میں ایک فوری خیال پیدا ہوا، اور کچھ یقین سا ہو گیا کہ جیک ضرور اسی راستے سے جائے گا۔ خدا معلوم کیوں میرا دم سا گھٹنے لگا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا۔ برقی لیمپ ہاتھ میں لیا اور جیک کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ شاید وہ گھبرا گیا کیونکہ جب میں ایک کونے سے مڑی اور اس کا نام لے کر زور سے پکارا تو وہ اس تختے پر سے گزر رہا تھا۔ ایک دم جھجکا، لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی مگر گر پڑا۔ آہ، میں نے کیا کیا۔ میں اندھی ہو گئی۔ ایک ناقابلِ بیان خوف اور دہشت مجھ پر طاری ہو گئی اور میں چلا چلا کر رونے لگی۔

ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے پیچھے کسی کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک لمبا چوڑا آدمی دکھائی دیا ــــ جین جیراکس ــــ اُس نے ذرا تامل نہ کیا۔ ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا گویا مجھے الوداع کہہ رہا تھا، اور فوراً کھائی میں کود گیا۔ برقی لیمپ کی روشنی میں میں نے اس کے مضبوط شانے دیکھے۔ اس نے غیر معمولی قوت صرف کر کے میرے شوہر کو بے رحم دلدل کے ظالم خونخوار پنجے سے چھڑا کر دونوں ہاتھوں میں اپنے سر سے اونچا اٹھا لیا تھا۔

اُس نے چلا کر کہا "محترم خاتون، ادھر دیکھو۔" اس کی آواز انتہائی غم میں ڈوبی ہوئی تھی "گو میرے تحفوں سے تم انکار کر چکی ہو لیکن یہ ایک تحفہ اور پیش کرتا ہوں۔ غالباً تم اسے ضرور قبول کر لو گی جین جیراکس کا آخری تحفہ۔"

اس کے شانوں کے عضلات سمٹے، اُن میں حرکت ہوئی، میرے شوہر کا جسم ہوا میں اُٹھتا ہوا اوپر آیا اور میرے قریب آ گرا۔ مٹی میں لت پت، بے حس و حرکت اور خاموش۔ وہ اب محفوظ تھا۔ مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا، کچھ دیر یوں ہی پڑا رہ سکتا تھا۔ میرا دل اور دماغ جیراکس کے خیال میں لگا ہوا تھا جس نے میرے شوہر کو موت کے پنجے سے نجات دلائی تھی۔

"جین!" میں دیوانوں کی طرح چلائی "میں تمہارے لئے مدد لاتی ہوں۔"

اُس نے مسکرا کر اپنا سر ہلایا "محترمہ اب اس کا وقت نہیں ہے"

میں نے دیکھا کہ اس کا خیال صحیح تھا۔ میرے شوہر کو اوپر پھینکنے کی کوشش کا یہ اثر ہؤا کہ وہ خود بہت تیزی سے اندر دھنس گیا۔ دلدل اُس کے شانوں تک آچکی تھی۔

"محترمہ، ادھر دیکھو، ابھی اتنا وقت ہے کہ میں آپ کو اپنا آخری سلام کہہ سکوں"!

"جین"! میری زبان سے بے اختیارانہ نکلا، اور میں بے ہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو دلدل کی سطح ہموار ہو چکی تھی، اور جین کا آخری تحفہ میرے قریب زمین پر پڑا تھا۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ اب اُس خونی گھاٹی کے اوپر ایک مضبوط آہنی پُل نظر آتا ہے، جس کے ایک جانب سپید پتھر کا ایک کھمبا گڑا ہؤا ہے اور اس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"جین جیراکس ـــــ فرانس کا جانباز اور مایۂ ناز سپاہی"

(ماخوذ) **ناظم میرٹھی**

سودائے عشق

ہر کس کہ بتیر ناب شیدا بادا
سودا زدہ و خراب و رسوا بادا
ہر کس کہ ز دست نیز اسیر آمد
از ترس بہ ہر جا بادا بادا
ما بادہ بجوئیم بادا

مردہ بلبل سنان نشاط

اے چہرۂ تو آیت سیمائی ما چیست
سلطان حقیقت تنہائی ما چیست
تا ہمہ تن تیغ تن آگہی آمد
اے مردہ بدوش من الٰہی ما چیست

سید احمد حسین امجد

فکرِ رسا

دل ہمارا بے نیازِ ماسوا ہونے کو ہے
یعنی ترکِ مدعا اب مدعا ہونے کو ہے

وہ ستم ایجاد اب صبر آزما ہونے کو ہے
امتحانِ ضبط اے اہلِ وفا ہونے کو ہے

نازنیں قاتل ہے اور بسمل ہے سرتاپا نیاز
دیکھئے اس کشمکش میں آج کیا ہونے کو ہے

کارفرما ہیں جو حسن و عشق کے ناز و نیاز
دیکھئے کس کی ادا کس کی قضا ہونے کو ہے

اے تصور جا رہا ہے ہاتھ سے دامانِ یار
ہائے کوئی آشنا نا آشنا ہونے کو ہے

سایہ افگن ہو رہی ہے کب سے اک برقِ بلا
میرا بختِ نارسا شاید رسا ہونے کو ہے

اُٹھ رہا ہے سینۂ محزوں میں اک طوفانِ غم
شاید افشا آج دل کا ماجرا ہونے کو ہے

طے ہوئی جاتی ہیں راہِ یار کی سب منزلیں
خود ہمارا جذبِ دل اب رہنما ہونے کو ہے

دل کی چنگاری رسا اب شعلہ زن ہونے لگی
یعنی جس کی ابتدا تھی انتہا ہونے کو ہے

احمد الیاس دہلوی رسا

ہابیتا کے دل میں ابھی شباب کی دل خوش کن اُمیدیں بس رہی تھیں۔ اور پیری کے تفکرات نے ابھی اُن کی جگہ نہ لی تھی۔ اس کے خیالات پاکیزہ اور مسرت انگیز تھے، اور اس کی روح شہرت کی آرزو سے ناآشنا تھی۔ وہ ہر روز طلوعِ آفتاب کے وقت اُٹھ کر گڈریوں کے دیوتا حسطور کی عبادت گاہ میں جایا کرتا تھا۔ دیوتا اُس کی دعائیں سُن کر خوش ہوتا تھا، اور ہابیتا شاداں و فرحاں گھر لوٹ کر باڑے کا دروازہ کھولتا تھا اور بھیڑوں کو چراگاہ میں لے جاتا تھا۔ وہ جو کی روٹی اور پنیر پر گذر کرتا تھا، اور کبھی کبھی اپنی سادہ غذا کے ساتھ بیر بھی شامل کر لیا کرتا تھا۔ یا ندی کا پانی پیتا تھا جو پہاڑوں سے اُتر کر آتی تھی اور خدا جانے کہاں جاتی تھی۔

گرمی کے دنوں میں جب اس کی بھیڑیں گھاس کھا رہی ہوتیں یا بیٹھ کر جگالی کر رہی ہوتیں تو وہ اپنی بانسری سے ایسے رسیلے سُر نکالتا کہ صحرا کی پریاں سننے کو اُس کے پاس جمع ہو جاتیں۔ وہ کنکھیوں سے اُنہیں دیکھ سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا نظر گاڑ کر اُنہیں دیکھتا تو وہ غائب ہو جاتیں۔ اس سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ خوشی کو نہ ڈھونڈا جائے تو وہ آتی ہے لیکن اگر اُس کی تلاش کی جائے تو وہ کبھی نظر نہیں آتی۔

اُس کی زندگی اس طرح گذر رہی تھی۔ اور تمام دن اُس کے لئے ایک جیسے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب طوفان کسی غضب آلود دیوتا کے غصّے کی ترجمانی کرتے تھے تو وہ اپنے غار میں اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ اس کے گناہوں کی سزا صرف اُس کو دی جائے اور باقی دنیا کو تباہی سے بچا لیا جائے۔ جب بہت مینہ برستا اور ندی میں طغیانی آجاتی اور وہ اپنے گلے کو بچانے کے لئے کسی اونچی جگہ پر لے جاتا تو وہ بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کے لئے دعائیں کرتا، کیونکہ اُس نے سنا تھا کہ وہ میدانوں میں نیلی پہاڑیوں سے دور غیر محفوظ جگہ میں رہتے ہیں۔

وہ کہتا تھا "حسطور دیوتا، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اور میری بھیڑوں کو سیلاب سے بچانے کے لئے اتنی نزدیک پہاڑیاں بنائی ہیں، لیکن مجھے باقی دنیا کو کسی طریقے سے، جو میں نہیں جانتا بچانا چاہیئے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیری عبادت نہ کروں گا۔"

حسطور یہ جانتے ہوئے کہ ہایتا اپنے عہد پر قائم رہنے والا ہے، شہروں کو چلا لیتا تھا اور پانی کا رُخ سمندر کی طرف پھیر دیتا تھا۔

ہایتا اسی طرح رہا کرتا تھا۔ اُسے کسی اور قسم کی زندگی کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔ مقدس راہب نے جو وادی کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا، اور جس سے اُس نے بڑے شہروں کی باتیں سُنی تھیں، اُن شہروں کی جہاں غریب باشندوں کے پاس بھیڑیں نہ تھیں، اُسے اُس گذرے ہوئے زمانے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا جب وہ اپنی بھیڑوں کی طرح خود بھی مدد کا محتاج ہوگا۔

پھر اُن رازہائے سربستہ، اُن عجائبات اور اُس خوفناک انقلاب کے خیال سے جو اُسے کسی دن خاموش اور تباہ کرنے والا تھا جس نے اکثر اس کی بہت بہت سی بھیڑوں کا خاتمہ کر دیا تھا ——— اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کی ہستی الم انگیز ہے۔

اُس نے سوچا۔ "میرے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ میں کہاں سے اور کس طرح آیا، کیونکہ آدمی اپنے فرائض ہی نہیں جان سکتا اگر اُسے یہ معلوم نہ ہو۔ مجھے اطمینان ہی کیونکر ہو سکتا ہے جب مجھے یہ معلوم نہیں کہ کسی دن کے بعد یہ لمحہ رخصت ہو جائے گا یا نہیں۔ ممکن ہے کہ مجھے کل ہی کسی خوفناک انقلاب سے دوچار ہونا پڑے۔ پھر میری بھیڑیں کہاں جائیں گی۔ مجھے خبر نہیں کہ کل ہی مجھے کس آفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

اِس خیال نے ہایتا کو غم کے سمندر میں غوطہ دیدیا۔ اُس نے اپنی بھیڑوں سے مسرت ناک باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ اب وہ حسطور کے معبد کو بھی پہلی سی مستعدی کے ساتھ نہ جاتا تھا۔ ہوا کا ہر جھونکا اُسے منحوس عفاریت کی سرگوشی کی خبر دیتا تھا۔ بادل اُسے قہر و غضب کا پیغام دیتے تھے اور تاریکی خوفناک دیووں سے پُر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی بانسری سے صرف ایک غمناک لَے سنائی دیتی تھی۔ صحرائی پریوں کا جھرمٹ اب اُس کے آس پاس نہ ہوتا تھا۔ اور اُسے پتوں کی سرسراہٹ اور پھولوں کے چٹکنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس کی آواز سے بھاگ رہے ہیں۔ اب اُس نے بھیڑوں کی نگہبانی بھی پوری توجہ سے کرنا چھوڑ دی۔ ان میں سے بہت سی بھٹک کر گم ہو گئیں، اور باقی گھاس کی کمی کی وجہ سے دبلی ہو گئیں۔ کیونکہ وہ اب انہیں اچھی چراگاہوں سے جانے کے بجائے روزانہ ایک ہی جگہ لے جاتا تھا۔ اسے صرف حیات و موت کا فکر دامنگیر تھا ——— حیاتِ ابدی کے متعلق وہ کچھ نہ جانتا تھا۔

ایک دن سوچتے سوچتے وہ اچانک اُس چٹان سے جس پر وہ بیٹھا تھا اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے دائیں ہاتھ کو جنبش دے کر کہنے لگا: "میں اب اُس بات کی تلاش نہیں کروں گا جو دیوتاؤں نے مجھ سے چھپا رکھی ہے۔

ان کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچائیں اور میرا فرض یہ کہ حسب مقدور اپنا کام کروں۔ اگر اس سعی میں کوئی غلطی مجھ سے سرزد ہو تو اس کے ذمہ دار دیوتا ہیں"۔

اچانک ایک روشنی نمودار ہوئی۔ جس کی چمک چوندھ نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے سورج پردۂ ابر سے نکلا ہے۔ لیکن بادلوں کا تمام ونشان تک نہ تھا تقریباً ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ پھول شرم کے مارے سمٹ گئے اور تعظیم کے لئے جھک گئے۔ اس کی صورت اتنی دلفریب تھی کہ گانے والے پرندے اُس کی آنکھوں کو آسمان سمجھے اور ان کے پاس آگئے۔ شہد کی مکھیاں بھی اُس کے شیریں لبوں کے قریب آگئیں اور اُس کے رُخ زیبا کی طلعت سے سائے بھاگنے لگے۔

ہاریتا مسحور ہو گیا۔ اُٹھا اور اُس پیکرِ نور کے آگے جھک گیا۔ نازنین نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور ایسی آواز میں جو چاندی کی گھنٹی کی صدا سے بھی لطیف تر تھی اس سے کہنے لگی:-

"اُٹھو! اُٹھو، میں دیوی نہیں کہ تم میری پرستش کرو، لیکن اگر تم فرض شناس اور باوفا ہو تو میں تمہارے ساتھ رہوں گی"۔

ہاریتا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اٹھا اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مسکرانے لگے۔ وہ احترام اور مسرت کی ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈال کر کہنے لگا: "پیاری نازنین مجھے بتا کہ تیرا نام کیا ہے، تو کہاں سے آئی ہے اور کیوں آئی ہے"؟

یہ سن کر نازنین نے انتباہ کے لئے اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی اور اُس سے دور سرکنے لگی۔ اس کے حسن میں ایک تغیر نمودار ہوا جسے دیکھ کر وہ کانپنے لگا۔ اُسے اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی کیونکہ وہ اب بھی خوبصورت تھی۔ لیکن فضا ایک سائے سے تاریک ہو گئی جو ایک گدھ کی سی سرعت سے وادی پر منڈلانے لگا۔ تیرگی میں نازنین کی شکل مدغم ہو گئی اور اس کی آواز دور سے آتی معلوم ہوئی۔ جب اُس نے گڈریے کو جھڑک کر کہا، او گستاخ اور بے وفا لڑکے کیا اب مجھے اتنی جلدی تجھ سے رخصت ہونا پڑے گا؟ کیا عہد ازل توڑے، سوا تجھے چین نہیں آتا؟"

ہاریتا کے غم کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر التجائیں کرنے لگا۔ پھر اٹھا اور اسے تاریکی میں ڈھونڈھنے لگا، اس کی تلاش میں دوڑنے لگا اور اُس کا نام لے لے کر چلّانے لگا۔ مگر وہ اب نظر نہ آتی تھی صرف اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "تو کبھی ڈھونڈھنے سے مجھے نہیں پا سکے گا۔ اپنا کام کر ورنہ ہم کبھی نہیں ملیں گے"۔

اب رات ہوگئی تھی، بھیڑیوں کی عوعو سے کان پھٹے پڑتے تھے اور سہمی ہوئی بھیڑیں اس کے پاؤں کے گرد آبیٹھی تھیں۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اپنا غم بھول گیا۔ پھر بھیڑوں کو باڑے میں لے گیا۔ اس کے بعد اس نے حسطور کے مندر میں جاکر بھیڑوں کی سلامتی کے لئے شکر ادا کیا اور پھر اپنے غار میں واپس آکر سو گیا۔

جب ہاپتا جاگا تو سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اور اس کے غار کو روشن کر رہا تھا۔ خوبصورت نازنین اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے لبوں پہ ایک تبسم کھیل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہاپتا کی بانسری کے نغمے نے نازنین کی مسکراہٹ کی مادی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب اُس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ پہلے کی طرح اب بھی خفا ہو جائے گی۔

وہ کہنے لگی "تو نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور بھیڑیوں سے گلے کو بچانے کے لئے حسطور کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولا۔ اس لئے میں تیرے پاس آگئی ہوں کیا تو مجھے اپنی رفیقہ بنائے گا؟

ہاپتا نے جواب دیا "کون تیرے ساتھ تمام عمر رہنا پسند نہیں کرے گا؟ اب مجھ سے اُس وقت تک جدا نہ ہونا جب تک مجھے وہ خوفناک انقلاب خاموش اور ساکت نہ کردے"۔

ہاپتا موت کا نام نہ جانتا تھا!

وہ پھر کہنے لگا میری خواہش یہ ہے کہ تو میری جنس کی ہوتی، تاکہ میں تجھ سے کُشتی لڑتا، دوڑیں دوڑتا اور تیرے ساتھ رہنے سے کبھی نہ اُکتاتا!"

یہ الفاظ سنتے ہی نازنین اُٹھی اور غار سے باہر چلی گئی۔ ہاپتا جب اسے ٹھہرانے کے لئے اُٹھا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مینہ برس رہا تھا اور ندی نے اپنے کنارے توڑ دیئے تھے۔ بھیڑیں خوف کے مارے ممیانے لگی تھیں کیونکہ پانی کی بہتی ہوئی موج باڑے کو بہا لے جانے کو آمادہ تھی۔ اور میدانوں میں جو شہر تھے وہ اب خطرے سے محفوظ نہ تھے۔

ہاپتا کو بہت دنوں تک وہ دوشیزہ نظر نہ آئی۔ ایک روز وہ وادی کے کنارے سے واپس آرہا تھا جہاں وہ بھیڑوں کا دودھ اور جو کی روٹی اور پیر راہب کے لئے لے گیا تھا کیونکہ غریب بڈھے میں اب چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی کہ اُس نے خیال کیا۔ بوڑھے میں اب سکت باقی نہیں رہی۔ میں کل اُسے اُٹھا کر اپنے غار میں لے جاؤنگا اور اُس کی خدمت کرونگا۔ یقیناً حسطور نے مجھے اسی لئے اتنے سال پالا پوسا اور صحت و طاقت بخشی ہے۔

یہ خیال آیا ہی تھا کہ وہی دوشیزہ نورانی لباس پہنے اسے راہ میں ملی اور ایک تبسم سے جس نے ہاپتا کو بیخود کر دیا کہنے لگی: "میں پھر تیرے پاس آگئی ہوں کیونکہ کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے خیال ہے کہ اس اثنا میں تجھے تجربہ نے دانا بنا دیا ہوگا اور تو میری حقیقت جانے بغیر میرے ساتھ رہنا منظور کرے گا۔

ہاینا اُس کے قدموں پہ گر کر کہنے لگا "حضور کی خدمت کے بعد میرے دل و جان تیرے لئے ہیں ۔ اگر تو قبول کرے ۔ لیکن تیرے مزاج میں تلون ہے، اور تو ہرجائی ہے ۔ پیشتر اس کے کہ آفتاب نکلے تو غائب ہو جائے گی مجھ سے عہد کر کہ اگر میں لاعلمی سے کوئی گستاخی کر بیٹھوں تو تو معاف کر دے گی اور ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی"

ابھی یہ تمام الفاظ اُس کے منہ سے نہ نکلے تھے کہ بھیڑیے بڑی تعداد میں پہاڑیوں سے نکلے اور اُسے کھانے کو دوڑے ۔ اُن کے منہ خون سے آلودہ تھے اور اُن کی آنکھیں آگ کی طرح چمک رہی تھیں ۔ نازنین غائب ہوگئی ۔ اور ہاینا جان بچانے کو بھاگا ۔ آخر راہب کے جھونپڑے میں پہنچ کر اُس نے دم لیا ۔ جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور رونے لگا ۔

راہب کہنے لگا "بیٹا! تم تو بھیڑیوں کے ڈر سے کبھی نہ رویا کرتے تھے ۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا غم ہے ۔ میں اپنے نوجوان دوست کے زخموں کو اپنے بڑھاپے کی دانائی سے اچھا کروں گا"

ہاینا نے سب روداد اُس سے بیان کی اور بتایا کہ کس طرح وہ اُس دشمنِ ہوش نازنین سے تین بار ملا اور کس طرح اُس نے تینوں دفعہ اُسے تڑپتا چھوڑ دیا ۔ اُس نے صرف بحرت اپنی داستان غم سنائی اور کوئی تفصیل حذف نہ کی ۔

جب اُس نے اپنی روداد ختم کی تو راہب ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہنے لگا "میں نے تیری داستان توجہ سے سنی ہے اور میں اس نازنین کو جانتا ہوں ۔ میں نے سینکڑوں دوسرے آدمیوں کی طرح اسے دیکھا ہے ۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ اس کا نام جو وہ تجھے بتانا نہیں چاہتی تھی "خوشی" ہے تو نے اُسے سچ کہا تھا کہ وہ بیوفا اور متلون مزاج ہے ۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے ایسی شرائط پیش کرتی ہے جو وہ پوری نہیں کر سکتے اور جب وہ دیکھتی ہے کہ وہ اُن کی تکمیل سے عاجز آگئے ہیں تو انہیں تنہا چھوڑ دیتی ہے ۔ وہ صرف اُس وقت آتی ہے جب اُس کی تلاش نہ کی جائے اور سوالات سے چڑ جاتی ہے ۔ اس کی حقیقت پہچاننے کی خواہش یا اُس کی وفا پر شک کیا جائے تو وہ رخصت ہو جاتی ہے .... وہ تجھے چھوڑنے سے پہلے کتنی مدت تیرے پاس رہی ؟"

نوجوان نے شرماتے ہوئے کہا "صرف ایک لمحہ"

مقدس راہب نے کہا "تو بدقسمت ہے اگر تو دانائی سے کام لیتا تو وہ تیرے پاس دو لمحوں تک رہتی!"

عطاءاللہ کلیم

(ایمبروز بیرس)

جو کوئی ڈھب ڈبے کا نکل آئے۔ جوں جوں ریل کے آنے کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے اندر مسافر بھرے چلے آتے تھے۔ ڈاک گاڑی کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہونگے، جو اسٹیشن کا سارا چبوترا آدمیوں سے بھر گیا گھنٹی بجی اور ریل اس قہر کے ساتھ دندناتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی کہ در و دیوار لرز گئے میں سمجھی یہ لوہے کا سائبان جس میں ہم سب بیٹھے ہیں دہل سے ٹوٹ کر اور اڑا کر کے سر پر آ رہے گا۔ پھر جو مسافر بھاگے ہیں اور آپا دھاپی مچی ہے تو حشر برپا ہو گیا، تو مجھ پر اور ہیں تجھ پر۔ سب سے آگے تو چار قلی اُن کے سروں پر ہمارے ٹرنک بکس بچھونے اُن کے پیچھے وہ اُن کے پیچھے میں۔

ابھی ریل کا درجہ کوئی پانچ قدم پر ہو گا جو آگے سے ریلا آیا تو آپ کے بہنوئی لٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ اُن کا ہٹنا کہ میں پیچھے سرکی۔ اگر لکلے آدمی اور ذرا دھکیلیں تو میں پس ہی گئی ہوتی۔ مگر خدا نے بال بال بچا لیا۔ بارے ہزار مشکل اور مصیبت کے ساتھ ریل کے اندر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ہم سے پہلے اس درجہ میں دس آدمی اور ٹھسے بیٹھے ہیں۔ بیٹھنے کیا کھڑے رہنے کا بھی ٹھکانا نہیں۔ وہ الگ بغلیں جھانک رہے ہیں۔ میں صداحق حیران کھڑی ہوں۔ اس میں اُنہیں کچھ خیال آیا اور ساتھ ہی ایک بھلے مانس نے کہا "حضرت ان کو اوپر والے پلنگ پر چڑھا دیجئے"۔ کیا بیان کروں کس مصیبت سے اُوپر پہنچی۔ وہ پلنگ دو موٹی موٹی لوہے کی زنجیروں میں پڑا جھول رہا تھا۔ میری سلیم شاہی جوتی کی نوک جو ایک زنجیر میں اٹکی تو جوتی پنجے سے نکل نیچے جو ایک بوڑھے آدمی بیٹھے تھے اُن کی سفید ڈاڑھی پر جا گری۔ وہ بیچارے جھیپ کر یہ کہنے لگے "ریل کے سفر میں پردہ نشین عورتوں کے لئے انگریزی جوتی اچھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک تو اس سے چلا اچھا جاتا ہے۔ دوسرے بھاگ دوڑ میں پاؤں سے نکلنے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا"۔

ابھی میں سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی۔ جو ایک اور آفت کا سامنا ہوا۔ آگے آگے ایک بابو اس کے پیچھے ایک فرنگن بھبو کا رنگ سادہ پن میں لاکھ لاکھ بناؤ چھلا جیسی کمر اور وہ بھی چمڑے کی پیٹی سے کسی ہوئی۔ گلے میں ڈھیلا سا ایک کوٹ جس کی سنجاف سمور کی تھی۔ سیاہ سایہ گھیردار سر پر ٹوپی اور ٹوپی میں دو تین گلاب کے پھول اوڑھے ہوئے۔ مگر گلاب کے لال لال پھول اُس کے چہرے کی بہار کے سامنے پھیکے دکھائی دیتے تھے، ہاتھ میں ننھا سا کالے چمڑے کا ایک بیگ، ان کے پیچھے ان کے صاحب۔ بابو نے ٹکٹ کاٹنے کی قینچی گاڑی کے کواڑ میں زور سے مار کر کہا "تم ہندوستانی دیکھتا ہے نہ بھالتا ہے گاڑی میں یونہی گھس جاتا ہے انرو اس میں سے یہ صاحب لوگوں کے بیٹھنے کا گاڑی ہے"۔ اس صدا کو سُن کر میرا تو جی چھوٹ گیا۔ نیچے جو لوگ بیٹھے تھے پہلے وہ اپنا اپنا اسباب سنبھالتے ہوئے نکل کر بھاگے، آپ کہیں گی کہ جو کمرہ صاحب لوگوں کے بیٹھنے کا ہوتا ہے اس پر لکھا ہوا ہوتا ہے اور تمہارے میاں تو انگریزی پڑھے

ہیں وہ تمہیں انجانوں کی طرح اس کمرے میں سے کرکس طرح دھنس گئے،؟ آپا جان مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی رات کا وقت ہول جول میں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ بندریا کی طرح پھر اس پلنگ پر سے نیچے اتری۔ یہ بھلا ہوا تھا کہ قلیوں کو ابھی چکایا نہیں تھا اور وہ ریل سے لگے کھڑے تھے نہیں تو اسباب کا اتارنا دوبھر ہو جاتا اور ریل ہنک جاتی۔ نکلتے نکلتے بابو نے ہمارے پیچھے دھیری لگا دی "یہ ڈاک گاڑی جاتا ہے جلدی اترو"

اب کی دفعہ مجھے ایک زنانہ کمرہ مل گیا جس میں میرے سوائے عورت کیا کوئی چڑیا بھی نہ تھی۔ پاس ہی مردانہ کمرہ تھا وہ اس میں بیٹھ گئے ڈاک گاڑی جلدی چلتی ریل میں ہمارا اسباب دھر دیا اور ایک قلی ریل کے پڑے پر کھڑا ہو گیا اور اپنی مزدوری لے کر جھپ سے کود گیا۔ اب کیا تھا بلی کے بختوں چھینکا ٹوٹا۔ بے منتا اکیلا کمرہ مل گیا۔ کھانا بھی کھایا پان بھی کھائے۔ اگلے اسٹیشن پر انہوں نے آکر بستر بند میں سے میرا بچھونا کھول کر بچھا دیا۔ اور پھر جو میں پاؤں پھیلا کر سوتی ہوں تو دلی تک مجھے ہوش نہ ہوا جب ریل اسٹیشن میں ٹھہر گئی تو انہوں نے آکر جگایا کہ اٹھو گھر آ گیا۔ اتنے میں میاں ناصر بھی آن پہنچے، اور کھڑکی میں منہ ڈال کر کہنے لگے "باجی جان آداب میں ڈولی لے آیا ہوں" میں نے کہا "شکر ہے"

"ساقی"

معذرت

ہنسا میں اور زمانے کی خوشی کا چڑھ گیا پارا
مگر کھینچی جب آہ سرد قلبِ ناشکیبا نے
کہا میں نے کہ اے وہ زلف جو برہم نہیں ہوتی

مگر دنیا نے میرے قہقہے پر قہقہہ مارا
تو غمخواری کی جا مڑ کر نہ دیکھا مجھ کو دنیا نے
شریکِ عیش ہوتی ہے شریکِ غم نہیں ہوتی

یہ سنتے ہی کہا دنیا نے یہ نیچی نگاہوں سے
کہ مجھ کمبخت کو فرصت نہیں خود اپنی آہوں سے

"ملکہ"

ریگ زار کے نقوش

میں سمندر کے کنارے تنہا جا رہی تھی۔ یک بیک میں نے جھک کر ریگ زار پر اپنا نام اور تاریخ لکھ دی۔

اور آگے بڑھ گئی۔ جب میں نے پیچھے ہٹ کر اُن نقوش پر نظر ڈالی۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ سمندر کی ایک بلند اور سبک لہر آئی اور ان خطوط کو مٹاتی ہوئی گذر گئی۔

میں نے سوچا کہ وہ دن قریب ہے کہ زمانے کے ریتلے ساحل کے کنارے میں نے جتنے نقوشِ قدم چھوڑے ہیں انہیں فنا کے تاریک سمندر کی لہر مٹا دے اور میرا کوئی نشان باقی نہ رہے۔

لیکن وہ! جس کا علم ریت کے ذروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، وہ! جس کے قبضۂ قدرت میں سمندر کی موجیں ہیں اُس کے پاس میرے تمام افعال کا حساب موجود ہے۔ اُس فردِ حساب میں میرے نام کے بالمقابل میرے فانی جسم کے اعمال اور میری روح کی آرزوؤں اور نیکی اور بدی کے لمحوں کی کیفیت تحریر ہے۔

"تہذیب نسواں"

ایک معمہ

اِن اچھلتی ہوئی لہروں میں کیا ہے؟
بادلوں کی اُمڈی ہوئی گھٹاؤں میں،
آسمان پر جلوہ گر ہو کر ہر ایک کی نگاہوں کو اپنی جانب
کشش کرنے والی قوسِ قزح میں،
سردی کی راتوں کے پورے چاند کی بکھری ہوئی
کرنوں میں،
پھولوں کی پنکھڑیوں میں، کلیوں میں، پتوں میں،
اور چراغ کی لَو کے نیچے، اے میرے دل کے دیوتا!
مجھے تو تیرے کرم کے سوائے اور کوئی شے
نظر نہیں آتی۔
دنیا میں رنج بھی ہے، راحت بھی ہے
لیکن اُن کے اندر سے
تیرے لمس کی خوبصورتی کی ہلکی شعاع
پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے
یہی وہ چیز ہے جس سے زندگی حاصل کر کے
چاند مسکراتا ہے
اور تارے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں
اور چھوٹی چھوٹی کلیاں کھل اٹھتی ہیں۔

"چندن"

تبصرہ

شریر بیوی مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی، بی اے، ایل ایل بی۔ یہ نو مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے جنہیں آزادیٔ نسواں کے بلند مقصد کو مدِنظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں ہندوستان کی مسلمان عورتوں کے رسمی پردے کے نقصان بیان کئے ہیں اور شرعی پردے کے احیا کی ترغیب دلائی ہے۔ مرزا صاحب کا خیال ہے اور کتنا صحیح خیال ہے کہ "اس دنیا کی جد و جہد میں کمزور اور بے بس ہونا کوئی قابلِ تعریف صفت نہیں۔ ہر مذہب اور معاشرت نے شرم و حیا اور پردے کا کوئی نہ کوئی درجہ مقرر کر دیا ہے اور اس میں مبالغہ کرنا ممکن ہے کہ کسی طرح مفید ہو مگر خطرناک ضرور ہے۔ ایسی بے بس عورتیں درحقیقت نہ تو شوہر کی کوئی خدمت کر سکتی ہیں اور نہ مذہب اور قوم کی" حقیقت بھی یہ ہے کہ جس قوم کی نصف آبادی ناروا پردے کی قید میں پڑ کر ایک عضوِ معطل ہو چکی ہو وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی دوسری قوموں کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ ہمیں اس وقت ایسے ادب کی بے حد ضرورت ہے جو ایک لطیف پیرایہ میں ہمیں ہماری کوتاہیوں سے آگاہ کرے، جو ہمیں ناگوار ہونے کی بجائے ہماری تفریح کا سامان ہو اور ساتھ ہی ساتھ ہماری اصلاح بھی کر دے۔ عظیم بیگ صاحب کی کتاب "شریر بیوی" ایک اسی قسم کی دلچسپ تصنیف ہے جس کے پڑھنے کی سفارش ہم پردے کے حامیوں اور آزادی کے حامیوں دونوں طبقوں سے کرتے ہیں۔ اکثر افسانوں میں طرزِ بیان اتنا دلکش ہے کہ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ مصنف کے مدِنظر کوئی خاص مقصد بھی ہے۔ ایک سرسری نظر سے پڑھنے والے کو بعض مقامات پر شکایت پیدا ہونے لگتی ہے کہ مصنف حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا۔ لیکن خود مصنف کے دل میں اس تجاوز کا احساس ظاہر کرتا ہے کہ حد سے تجاوز کرنا اُس کا مذہب نہیں ہے بلکہ وہ صرف رسمی جکڑ بندیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ہاں ایک شکایت ہمیں مرزا صاحب سے ضرور ہے اور وہ یہ کہ "آل کوئیٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ" کی طرح کبھی کبھی انسان اپنے آپ کو بیت الخلا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ حجم ۱۸۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مینیجر نیرنگِ خیال بک ڈپو لاہور سے طلب فرمایئے۔

مخزنِ ادب منتخبہ و مؤلفہ جناب حافظ ڈاکٹر مولوی عبدالشہید صاحب ایس ایس، ایم اے، ایل آئی جی۔ یہ کتاب اردو نصابِ تعلیم کے طور پر لکھی گئی ہے اور سچ یہ ہے کہ اسے بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔ درسی حصے کے کل سات باب ہیں (۱) خطوط نویسی (۲) قواعد و نمونۂ شکست (۳) رقوم و دیگر مروجہ علامتیں (۴) مکتوباتِ مشاہیر اہلِ ادب (۵) حصۂ نثر (۶) حصۂ نظم (۷) سوانحِ حیات۔ نثر نظم اور مکتوبات کا انتخاب بہت اچھا کیا ہے۔ زیادہ تر مضامین مسلم الثبوت اہلِ قلم کے ہیں، اور اُن کے انتخاب میں جدید ضروریات اور معلومات کو مدِنظر رکھا ہے۔ لیکن پہلے تین ابواب کو ہماری رائے شاملِ کتاب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ ان ابواب کے مضامین سے بھی طلبہ کا واقف ہونا ضروری ہے۔ لیکن ایک ادبی مجموعے میں ان کی شمولیت بے محل سی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب نہایت مفید اور کارآمد ہے حجم ۲۰۰ صفحات۔ پتہ:- ایجوکیشنل بک ہوس، سول لائنز، علی گڑھ

"ایوان" یہ ماہوار رسالہ چھ ماہ سے حضرتِ مجنوںؔ گورکھپوری کی ادارت میں ایوان اشاعت گورکھپور سے شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک جتنے پرچے نکل چکے ہیں اُن کو دیکھ کر ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "ایوان" ہندوستان کے اُن چند متین اور سنجیدہ رسائل میں سے ہے جو اس وقت صحیح معنوں میں ادبِ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ مضامین اور شکل و صورت کی پاکیزگی کے لحاظ سے اُسے امتیازی درجہ حاصل ہے۔ چندہ سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے آٹھ آنے۔

فہرست مضامین

جلد ۲۰ — بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء — نمبر ۳

تصویر:- آتشِ عشق

اقوال

۱

انسان کا یہاں آنا بُرا، آ کر یہاں سے جانا اور بھی بُرا، اور اس آنے جانے کے بہانے تو بہت ہی بُرے۔

۲

بعض کہتے ہیں کہ روح غیر فانی ہے۔ کائنات نہ ہوئی دھوبی کا گھاٹ ہوئی جہاں کثیف روحیں دھلتی ہیں۔

۳

کاش دُنیا اس دھوبی نظریہ کو رخصت کر چکے! کاش کہ دھوبی کا بیل تمام روحوں کو کچّا چبا جائے۔ پھر تو نہ روح ہو نہ دھوبی کے بیل کی فکر!

۴

عدم سے آنے والے عدم کو جانا پسند نہیں کرتے۔ عربی کی ایک ضرب المثل ہے کہ تمام چیزیں اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ انسان، باغی انسان، عدم زائیدہ انسان عدم سے بھاگ کر ابد میں گھسنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی اصل سے نفرت ہے، اور اسی حد تک یہ گمراہ ہے۔ صرف ان کی آنکھیں کھلی ہیں جن کا غالب کے ساتھ ایمان ہو

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یعنی ہم اب بھی عدم ہی ہیں اور ہمارا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ شعر اس مشہور شعر سے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جس کی تشریح پیش کرنے کا موقع مجھے سیالکوٹ میں آج سے سولہ سال پہلے غالب کی برسی کی تقریب پر ایک جلسے میں ملا تھا، بہت بالاتر ہے۔ "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" والے شعر میں پیر و مرشد خود فریبِ ہستی کھا گئے اور لگے ڈوبنے۔

۵

کسی زمانے میں عدم بیاک طریقے سے کثیرالاولاد تھا۔ لاکھوں کروڑوں دیوتا دیویاں پیدا کرتا چلا جاتا تھا۔ رحم عدم کا وہ حصہ جہاں سے دیویاں دیوتا پیدا ہوتے تھے اب قریبًا بانجھ ہو چلا ہے۔ بلکہ ایک فلسفہ کے رُو سے تو خود عدم ہی مفقود ہے مگر یہ فلسفہ ضرور غلط ہے۔ عدم ہی وہ عمرو عیار کی زنبیل ہے جس میں غلط فلسفے چھپ سکتے ہیں۔

۶

پیغمبر، فلاسفر، صوفی، مقنن آتے جاتے رہتے ہیں سمجھاتے بھی ہیں، نمونہ بن کر بھی دکھلاتے ہیں، ڈراتے بھی ہیں، بہشتوں کی رشوت بھی پیش کرتے ہیں مگر انسان وہی کرتے ہیں جو غلط ہو۔ عدم میں غلطی بھی صحت ہے۔

فلک پیما

سچی عظمت کبھی بے نیاز اور متکبر نہیں ہوتی۔

دُنیا میں دوست کم ہوتے ہیں بادشاہ زیادہ +

ہاتھی کے جوڑ ہوتے ہیں لیکن ادب آداب کے لئے نہیں۔ اُس کی ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن ضرورت کے لئے نہ کہ لچک کے لئے +

خوف کی باتوں کو جہنم رسید کردو

گلچیں

جہاں نما

مقروض ممالک کی اعانت

گزشتہ مہینے کی بہترین خبر شاید یہ ہے کہ دنیا کی قرض خواہ اقوام نے مقروض اقوام کو ایک سال کے لیئے ادائے قرض کی فکر سے سبکدوش کر دیا ہے۔ اقتصادی مشکلات کی لہر جو اس وقت تمام دنیا پر چھا رہی ہے اس سے وہ ممالک سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں جو یورپ کی جنگِ عظیم میں شکست کھا کر فاتح اقوام کو بہت بھاری قرضہ جات جنگ ادا کرنے کے پابند ہو گئے لیکن جرمنی اس معاملے میں سب سے زیادہ بدقسمت ثابت ہوا ہے۔

دنیا کی کوئی قوم محنت اور جفاکشی کے لحاظ سے جرمن قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس قوم نے گزشتہ ایک سو سال سے اب تک جس طرح جاں کاہی اور تن دہی سے کام کیا ہے اس طرح دنیا کی کسی اور قوم نے نہیں کیا۔ اس کے باوجود جنگ یورپ کے عظیم حادثے کے بعد جب جرمنی کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہی تو اس باہمت قوم کے عزم میں فرق نہ آیا اور دشمن اقوام بھی اُس بے پناہ استقلال کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں جس کے ساتھ پوری جرمن قوم اپنے عظیم الشان قومی حوادث کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑی ہو گئی لیکن تقدیر کی نامساعدت اگر کوئی چیز ہے تو اس کی سچّی تصویر جرمنی کو اپنی موجودہ حالت میں نظر آسکتی ہے۔ اس وقت جرمنی میں چالیس لاکھ افراد بے کار ہیں اور یہ عدد آئندہ موسم سرما میں غالباً ستّر یا اسّی لاکھ تک پہنچ جائے گا۔ اگر افراد کے بجائے اُن کنبوں کا شمار کیا جائے جن پر اس بے کاری کا اثر پڑے گا تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جرمنی کی تقریباً نصف آبادی ذرائع معاش سے محروم ہو جائے گی۔

یہ خوفناک حالات تھے جنھوں نے جرمنی کے سب سے بڑے قرض خواہ امریکا کو ادائے قرضہ جات کے التوا کی تجویز پیش کرنے پر آمادہ کیا کیونکہ جرمنی کی اقتصادی تباہی خود امریکا بلکہ تمام دنیا کو چند در چند اقتصادی مشکلات میں مبتلا کر دیتی۔ جب مسٹر ہُوور (صدر ریاست ہائے متحدہ امریکا) نے مقروض اقوام کو ایک سال کی تعطیل دینے کے متعلق اپنے فیصلے کا اعلان کیا تو باقی قرض خواہ ممالک نے بھی جن میں زیادہ نمایاں برطانیہ اور فرانس ہیں اسی فیاضانہ روش کی تقلید کی۔ آج کل سرمایہ دار اور مقروض سب ممالک اپنی اپنی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ اس کے باوجود برطانیہ نے ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ، فرانس نے دو کروڑ پونڈ اور امریکا نے ایک اس سے بھی بڑی خطیر رقم سے ایک سال کے لئے دست کش ہو کر جس فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اس سے بین الاقوامی تعلقات پر بہت خوشگوار اثر پڑنے کی توقع ہے۔

ترک عورتیں

کسی مشرقی قوم کی نسوانی دُنیا میں اس قدر زبردست انقلاب اتنی تیزی کے ساتھ نہیں آیا جتنی سرعت کے ساتھ ترک عورتوں نے اپنی پرانی معاشرت کا مقاطعہ کیا ہے۔ آج سے ایک ربع صدی قبل کی ترک عورت اور اس کی دور جدید کی بہن میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ سلطان عبدالحمید خاں کو پرانے طریقوں سے بہت ربط تھا اور اُن کے زمانے میں ترک عورتوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ کبھی اکیلی گھروں سے باہر نہ نکلتی تھیں اور اگر نکلتی تھیں تو دو دو چار چار کی ٹولیاں بنا کر۔ عورتیں مردوں کے ساتھ نہ چل پھر سکتی تھیں۔ بلکہ اگر کوئی مرد ساتھ ہوتا بھی تو وہ ذرا فاصلہ چھوڑ کر آگے آگے چلتا۔ سلطان عبدالحمید خاں کو مغربی تعلیم پر بھی اعتراض تھا اس لئے ترک لڑکیاں یورپین سکولوں میں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔

انقلاب ترکی کے بعد جب سلطان عبدالحمید خاں معزول ہو گئے تو عورتوں کو نسبتہً بہت کچھ آزادی مل گئی۔ وہ اب بے کھٹکے جا بجا سفر کر سکتی تھیں۔ ترکی مدبر اپنی بیویوں کو مغربی ممالک میں اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ تعلیم کے متعلق بھی پابندیاں اُٹھ گئیں۔

لیکن اصلی انقلاب اُس وقت آیا جب مصطفےٰ کمال پاشا کا دور شروع ہوا۔ بیک جنبش قلم نقاب ہمیشہ کے لئے ملک سے رخصت ہو گیا۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے گئے۔ ترک عورتیں سوسائٹی کا لاینفک جزو بن گئیں اور انہیں رقص کے جلسوں اور دوسری معاشرتی تفریحوں میں شامل ہونے کا موقع دیا گیا جہاں شروع شروع میں مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے ہاتھ سے بعض پابندِ وضع عورتوں کے نقاب اُتار پھینکے۔ لڑکیاں اپنے رفیق زندگی کا "انتخاب" اب خود کرتی ہیں نہ یہ کہ دوسرے لوگ اُن کی "شادی کریں"۔ طلاق صرف سوئس قانون کی حدود کے اندر ہو سکتی ہے جو سختی کے ساتھ ترکی میں نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس اہم معاملے کا فیصلہ مرد کے مطلق العنان ارادے کے بجائے اب عدالت کرتی ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے میں پوری آزادی ہے اور لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے ادارے تک قائم ہو چکے ہیں۔

ہٹلر کی تحریک

جرمنی میں "قوم پرست اشتراکی تحریک" کی کامیابی نے فرانس کے سیاسی حلقوں کو مضطرب کر کے قدرتہً دنیا بھر کی توجہ اس تحریک کے آغاز اور نشو و نما کی طرف منعطف کر دی ہے۔ مختصر الفاظ میں ہٹلر کی تحریک کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ تریاق ہے اُس زہر کا جو جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد ملک بھر میں پھیلنے لگا تھا۔ جرمنی کو فاتح

اقوام کے ساتھ اپنے تعلقات میں جس تلخ کامی کا منہ دیکھنا پڑا اس سے فساد اور بے ہمتی کی روح جرمنی میں جا بجا ظاہر ہونے لگی اور یہ روح اور بھی خوفناک طور پر بڑھ گئی جب ملک کی اقتصادی و معاشرتی زندگی میں انتشار رونما ہوا۔

اڈولف ہٹلر جس کی عمر اس وقت اکتالیس سال کی ہے آسٹریا میں ایک کم رتبہ سرکاری ملازم کے گھر میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں اسے مصور بننے کی آرزو تھی لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور وہ آخر وائنا کے ایک ماہر تعمیرات کے دفتر میں بحیثیت نقشہ نویس کے ملازم ہو گیا۔ یہاں اسے حزب العمّال کے ساتھ میل جول کا موقع ملا لیکن چونکہ وہ خود دستکار نہ تھا اس لئے اُسے کام حاصل کرنے میں دقت ہوئی اور اُس نے چند سال نہایت عسرت کے عالم میں گزارے جنگ عظیم کے موقع پر ہٹلر جرمن فوج میں لڑا اور کئی دفعہ زخمی ہوا۔ جنگ کے بعد وہ میونش میں سیاسی پراپیگنڈا کا افسر مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں ایک انجنیر گاٹ فرائیڈ فیڈر سے اس کی ملاقات ہوئی جو اب اس کی جماعت میں سب سے بڑا ماہر اقتصادیات ہے۔ فیڈر کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر ہٹلر ایک سیاسی جماعت میں شامل ہو گیا جس کے ارکان کی تعداد اُس وقت تک صرف چھ تھی۔ جلد ہی وہ اس جماعت کا رئیس بن گیا اور جماعت کے ارکان کی تعداد بھی سرعت سے بڑھ گئی۔ اب ہٹلر نے اس جماعت کو "قوم پرست اشتراکی جماعت" کا نام دیا۔

ہٹلر اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ جرمنی کی نوجوان نسل موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہے۔ اسی لئے وہ نوجوانوں کے ساتھ اپنی جماعت کے تعلقات کو خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس چیز کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جنگِ عظیم کے بعد جرمن رائے دہندوں میں سے ۲۵ فی صدی حال ہی میں سنِّ رائے دہندگی کو پہنچے ہیں +

ایک محبِّ وطن کا خط

یورپ کے بعض اخبارات نے مشہور المانوی مدبّر والٹر راتھیناؤ کے کچھ خطوط شائع کئے ہیں۔ یہ خطوط راتھیناؤ نے ایک لیڈی کے نام لکھے ہیں جس کو اُس سے محبت تھی۔ ان کے ایک ایک فقرے سے اس نیک نفس محبِّ وطن کی روح کی بلندی اور پاکیزگی جھلک رہی ہے اور لکھنے والے کی سچّی عظمت دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ایک کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

عزیزہ فرالائین لور ــــ

تمہارے خطوط نے میرے دل کو رنج و غم سے بھر دیا ہے۔ بالخصوص اُس یاس آمیز خط نے جو تم نے اپنے بھائی کے نام لکھا ہے کیا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟ مجھے بتاؤ میں کس طرح تمہاری کوئی خدمت بجا لاؤں۔ یہ تم مجھے اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہو، میرا

سہارا چاہتی ہو، چاہتی ہو کہ میری ہستی کا ایک جزو تمہارے لئے وقف ہو جائے۔ میں کس خوشی سے تمہاری یہ آرزو پوری کرتا! لیکن اب میں اپنی ذات کا مالک خود نہیں رہا ہوں۔ میں نے اپنی روح ہبہ کر دی ہے۔ میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ آرام کے لئے ایک گھنٹہ، تھوڑی سی نیند، یہ بھی اب میرے اختیار میں نہیں۔ میں محض ایک اجنبی ہوں جو اپنے آپکو قربان کرنے کے لئے آیا۔ اور جب میں اپنا سب کچھ صرف کر چکوں گا تو میری زندگی بھی ختم ہو جائیگی۔ میں اپنے وقت کے اتنے بڑے حصے کی قربانی خانگی زندگی میں کبھی گوارا نہ کرتا، کبھی بغض اور عداوت کے اس بارِ عظیم کو برداشت نہ کرتا جو میرے کندھوں پر پڑ گیا ہے لیکن میں ان سب باتوں پر صبر کئے جاتا ہوں اس لئے کہ میرا اپنا کوئی نفس، کوئی گھربار، کوئی خانگی زندگی نہیں۔ میں ایک ایسے شخص کے مانند ہوں جو ایک مسلح مورچے میں اپنے افسر کے واضح حکم کے ماتحت ایک توپ چلانے پر متعین ہوا ہو۔

تم میرے لئے زندہ رہنا چاہتی ہو۔ اس سے میرے دل پر شکرگذاری کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں چاہا کہ اُس کی زندگی محض میری خاطر ہو۔ تمہیں وہ پہلی ہستی ہو جس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی ہے۔ تمہارے سوا ہر شخص نے یہ چاہا کہ میری زندگی اُس کے لئے وقف رہے اور یہ بالکل قدرتی بات تھی اس لئے کہ جہاں تک میری استعداد میں داخل ہے میں نے اپنی زندگی ہمیشہ دوسروں کے لئے وقف رکھی، اگرچہ اُس مفہوم میں نہیں جس میں لوگ بالعموم چاہتے ہیں کیونکہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ خود میری ذات نہیں بلکہ وہ چیزیں ہیں جو مجھ سے وابستہ تو ہیں لیکن پھر بھی مجھ سے الگ ہیں یعنی تحریک و تقویت، تسکین و اعانت گفت و شنید اور نئے نئے خیالات۔ خود میری ذات اُن کے لئے باعثِ کشش نہیں ہے۔ اس کے قبول کرنے سے اُنہیں انکار ہے۔ اگر الفاظ کا عام مفہوم لیا جائے تو تمہاری زندگی میری راہ میں بسر نہیں ہو سکتی۔ مجھ جیسی کل کو کسی ایسے تیل کی ضرورت نہیں جو دنیا کے کسی انسان کا ہاتھ اسے بہم پہنچا سکتا ہو۔ جب تک وہ ایندھن جو اس کل کو چلا رہا ہے ختم نہیں ہو جاتا اُس وقت تک یہ چلتی رہے گی۔ اگر تم میری خاطر زندہ رہنا چاہتی ہو تو تم صرف یہ کر سکتی ہو کہ خود اپنی خاطر زندہ رہو، اُس مفہوم میں نہیں جو ان الفاظ سے عام طور پر لیا جاتا ہے بلکہ اُن قوتوں کے نشو و نما کی خاطر جو تم میں ودیعت کی گئی ہیں۔ کیا تم اس بات کو سمجھتی ہو کہ میرے ذہن میں اُن کتابوں کا خیال ہے جو تم لکھنی ہیں اور جو ایک دن شائع ہوں گی؟ شاید تمہاری زندگی میری ہی راہ میں بسر ہو رہی ہے اس لحاظ کہ تم کلاؤس کی مدد کر رہی ہو یا کسی اور ایسے شخص کو جو تمہاری مدد کا محتاج ہے تمہاری وجہ سے ۔

میرا جی چاہتا ہے کہ انہیں دنوں موسم سرما کی کسی شام کی طویل ساعتیں تم میرے ہاں گذارو۔ میں ۔ ا خیال سے ناقابلِ بیان تکلیف ہوتی ہے کہ تمہیں سخت سردی میں واپس گھر جانا پڑے گا اور میں ۲۱ ، قابل ــ ہوں کہ تمہارے لئے یہیں رات بھر کی اقامت کا انتظام کر سکوں کیا تم اتوار کی سہ پہر کو ذرا سویرے آسکو گی اگر میں یہ وعدہ کروں کہ شام کے بعد میں تم کو ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہراؤں گا؟ مجھے اب کلاؤس کے متعلق اتنی تشویش نہیں رہی جب تم آؤ تو مجھے اُس کا پتا بتا دینا تاکہ میں اپنا تازہ لکھا ہوا مضمون اُسے بھیج سکوں۔ اچھا شب بخیر۔ اطمینان سے رہو اور غم بالکل نہ کرو۔

آتشِ عشق

فرانسیسی مصور ارنسٹ ژاں اوبیر جس کی تصویر اس رسالے میں دی جا رہی ہے پیرس کا رہنے والا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں وہ مدرسۂ فنون لطیفہ میں داخل ہوا۔ پھر مشہور مصور دلاروش کا شاگرد بنا اور اس کے بعد پانچ سال تک اطالوی مصوری کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی اکثر تصویریں رومی اور یونانی موضوعات پر ہیں لیکن وہ ان میں ایک ایسی شوخی اور نزاکت پیدا کر دیتا ہے کہ دوسری تصویروں کے درمیان اُن کی ایک نرالی شان نظر آتی ہے۔

اس تصویر میں اوبیر نے اپنا کمال نہایت خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں جن کا خیال ہے کہ ننھے کیوپڈ کو حقیقت میں سردی نہیں لگ رہی بلکہ اُس نے مکر بنایا ہے اور حسین لڑکی کے قریب پہنچنے کے لئے ایک حیلہ تراشا ہے۔ پھر یہ کہ اُس نے لڑکی کا خوف دور کرنے کے لئے اپنے تیر اور کمان کہیں چھپا دیئے ہیں اور اُن کے بغیر ہی اسے شکار کرنا چاہتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عشق جھوٹ موٹ نہیں بلکہ حقیقت میں ٹھٹھر رہا ہے، کیونکہ تصویر میں ایک برفانی دن اور برفانی منظر دکھایا گیا ہے۔ شاید الفاظ کی ایک تیز و تند ہوا نے نوجوان حسینہ کی محبّت کو سرد کر دیا تھا اور اب مہربانی اور شفقت کی باتیں اُسے پھر گرما رہی ہیں۔

اور دو محبت کرنے والے دلوں کا ملاپ ہمیشہ یوں ہی ہو جایا کرتا ہے۔ محبت کا دیوتا نفرت اور مفارقت کی سرد ہوا کی تاب نہیں لا سکتا کیونکہ وہ اب بھی بہشت کے اُسی قدیم لباس میں ملبوس ہوتا ہے جو دنیا کی سرد فضا کے لئے نہیں۔ وہ محبت کے قدیم دہکتے ہوئے آتش دان کے پاس آ بیٹھا ہے تاکہ اپنی ننھی ننھی یخ بستہ انگلیوں کو گرم [illegible] پیاری پیاری حرکتوں سے اس غمزدہ حسینہ کا دل خوش کرے جو اپنی گول گول خوبصورت باہیں آتشدان [illegible] دے ہے۔ تصویر سے ظاہر ہے کہ وہ اس ننھے مکار ہرجائی کو پہچانتی ہے اور اسی لئے اس کی طرف الفت آمیز [illegible] سے دیکھ رہی ہے۔ وہ کیوپڈ کی نوازش کا جواب اسی خلوص اور بے ریائی سے دے رہی ہے جو ہر محبت پرست اور وفادار خاتون کا خاصہ ہے۔ کاش دنیا خالص اور بے ریا محبت کرنے لگے اور کیوپڈ کو لبادے اوڑھنے اور آگ تاپنے کی ضرورت نہ پڑے!

منصور احمد

دماغی اختلافات اور دنیا کا مستقبل

اٹھارہویں صدی کے مغربی مصلحین کا خیال تھا۔ کہ تعلیم تمام معاشرتی اختلافات کا خاتمہ کردے گی۔ زمانہ بھی مدارس اور علم کو مقبولِ عام بنانے کا تقاضا کرتا تھا ممکن ہے اس صدی کے بزرگ جانتے ہوں کہ تمام انسانوں کی سمجھنے کی طاقت یکساں نہیں ہوتی مگر وہ اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہ ڈالتے تھے۔ مشاہدہ سے انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ بعض آدمی احمق ہوتے ہیں۔ اور بعض غیر معمولی قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر ذہانت کا اندازہ ان سے نہ ہوسکتا تھا ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک۔ اچھے نظامِ تعلیم کے رائج ہوتے ہی امرا کا اقتدار رخصت ہوجائیگا۔

انہیں یقین تھا کہ تعلیم کے بغیر عوام حکومتِ خود اختیاری کے قابل نہیں ہوسکتے لیکن انہیں کبھی یہ نکتہ نہ سوجھا تھا کہ تعلیم کے باوجود اکثر لوگ حکومتِ خود اختیاری کے ناقابل ہونگے۔ صرف موجودہ عہد میں دنیا ذہانت کے اختلاف کا اندازہ کرسکی ہے۔ اور اس حقیقت کے حوصلہ شکن نتائج سے دوچار ہوئی ہے جمہوری نظام کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں اُن سے ہمیں ذہنی تجربات کی اہمیّت کا احساس ہوا ہے۔

تجرباتِ ذہانت کے معتبر نتائج کثرت سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ہماری دماغی قوت میں کتنا عظیم فرق ہے:-

تعداد	کیفیّت	درجہ ذہانت
۲۵۰۰۰۰	غیر معمولی ذہانت والے آدمی	۱۴۰ یا زیادہ
۶۷۵۰۰۰۰	بہت اعلیٰ دماغ " "	۱۲۰ سے ۱۴۰
۱۳۰۰۰۰۰۰	اعلےٰ دماغ " "	۱۱۰ سے ۱۲۰
۳۰۰۰۰۰۰۰	متوسط اچھے دماغ " "	۱۰۰ سے ۱۱۰
۳۰۰۰۰۰۰۰	متوسط پست ذہنیت " "	۹۰ سے ۱۰۰
۱۳۰۰۰۰۰۰	کُند ذہن	۸۰ سے ۹۰
۶۰۰۰۰۰۰	ناقص العقل	۷۰ سے ۸۰

۷۵۰۰۰۰	خفقانی یا ہذیانی	۵۰	سے	۷۰
۲۵۰۰۰۰	پاگل	۵۰	سے	کم
۱۰۰۰۰۰۰۰۰				

اس جدول کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ناقابلِ تکمیل نصب العین کے خواب دیکھتے رہے ہیں - لیکن اب حقیقت کے احساس نے ہمارے حوصلے پست کر دیئے ہیں - اور ہمیں اپنے نظریوں کی اصلاح پر مجبور کیا ہے +

جونہی ہمیں ذہنی فرق کا اندازہ ہوتا ہے - ہمارے خیالات میں انقلاب واقع ہوتا ہے - انسانیت کے کمال اور مساوات کے خواب باطل ہو جاتے ہیں - جب ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آدھی دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکی جا سکتی ہے + لوگوں کی ذہانت کا امتحان لیجئے اور آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں احمق بڑی تعداد میں رہتے ہیں - بناوٹی حکیم اور جھوٹے پیر عوام کو لوٹتے پھرتے ہیں - آپ کو سینکڑوں لوگ ایسے نظر آئیں گے جو اپنی چالاکی کے باعث بیوقوں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں - اِن حقائق کے علاوہ یہ بھی مدِ نظر رکھئے کہ کئی اشخاص خیالات کی کاواکی الفاظ کی خوبصورتی سے چھپاتے ہیں - اور احمق اِن کی تقریر پر فریفتہ ہو جاتے ہیں - گناہ کو دلفریب رنگوں میں پیش کیا جاتا ہے - بیوقوف مرد اور عورتیں رواج اور فیشن کی بھول بھلیاں میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں - شور و شر عیش و عشرت اور جنگ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں +

ہر مرد اور عورت کو جن کا درجۂ ذہانت ۱۰۰ سے کم ہے ایسے مرد اور عورت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا درجہ ذہانت ۱۰۰ سے زیادہ ہے۔ تعلیم ناقص العقل لوگوں کو کسی قدر روشن خیال بنا دیتی ہے لیکن ساتھ ہی ذہین لوگوں کی قابلیت میں حیرت انگیز اضافہ کرتا ہے - سائنس پست طبقہ کے لئے ایک اچھی چیز ہے - لیکن یہ خوش قسمت آدمیوں کو حقوق کا اجارہ دار بنا دیتی ہے - گویا علم کی ترقی کم مختلف درجوں والے اشخاص کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے - دورِ جدید کی سیاسی اور تجارتی پیچیدگیاں لوگوں کے فہم سے بالاتر ہیں - عالمگیر تجارت کی وجہ سے کم درجہ کی ذہانت والے بیچارگی اور کس مپرسی کی حالت میں ہیں - اعلیٰ صنعتی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ناقص العقل اشخاص کی راہ میں ایک اور دیوارِ سنگین کھڑی کی گئی ہے +

تعلیمی اداروں کے بانی اس بات سے بے خبر تھے - کہ تعلیم دماغ کے فطری اختلاف مٹا نہیں سکتی تعلیم اور دوسرے شعبوں میں اس انکشاف کی وجہ سے ردوبدل واقع ہونا یقینی ہے -

لیکن ہمیں انتہائی دلچسپی صرف اِن معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے ہے ۔ جو ذہنی اختلافات کا لابدی نتیجہ ہیں ۔ ان سے عملی سیاسیات کی دنیا میں ایک عظیم خلا کے واقع ہونے کا احتمال ہے ۔ کیا مسولینی ایسا آدمی نہیں ہے جس نے دماغی فرق سے متاثر ہو کر تمام حقوق اپنے آہنی پنجہ میں سمیٹ لئے ہیں ؟ کیا روسیوں کے سیاسی تجربہ سے ہمیں ذہانت کے فطری اختلافات کا خیال نہیں ہو سکتا ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ مستقبل کے سیاسی فلسفہ کی بنیاد اس احساس پر ہو کہ عوام کا درجۂ ذہانت نسبتاً کم ہے جیسے جمہوریت کی بنیاد اِن کی مفروضہ مساوی ذہانت پر تھی ۔

ہمارا سوال یہ ہے :۔ کیا تیس کروڑ اشخاص جن کا درجۂ ذہانت سو سے کم ہے ۔ ان تیس کروڑ اشخاص کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے ہیں جن کا درجۂ ذہانت سو سے زیادہ ہے ؟ تیرہ کروڑ احمق کس طرح تیرہ کروڑ داناؤں سے جنگ آزما ہونگے ؟ چھ کروڑ پچھتر لاکھ ناقص العقل اور خفقانی مردوں کا خیال کیجئے جنہیں مساوی تعداد کے انتہائی ذہین مردوں سے زور آزمائی کرنا پڑے گی ۔ پھر دو لاکھ پچاس ہزار فاتر العقل اشخاص کا اُن اڑھائی لاکھ لوگوں سے مقابلہ ہے جن کے دماغ بہترین ہیں ۔

اس عقدے کا حل رفتارِ زمانہ کے مشاہدہ ہی سے ہو سکے گا ۔ بوڑھوں کے لئے وظائف کے اجرا کی تحریک زوروں پر ہے ۔ امریکا کی جمہوریت کے صدر ہوور نے امرا کے طبقہ کو غریب لوگوں کی بیکاری کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ۔ زندگی کا بیمہ اکثر کرایا جاتا ہے ۔ کاشتکار تباہ ہو گئے ہیں چھوٹی تجارتی کمپنیاں نیست و نابود ہو رہی ہیں اِن تمام حالات سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی اختلافات کا فرق عالمگیر معاشرتی اثرات کا باعث ہے ۔

آئندہ یہ ہوا کرے گا کہ کم ذہنی قوت والے آدمیوں کو تباہی اور ذلت سے بچانے کے لئے سرمایہ داروں کا ہمدردانہ جذبہ بروئے کار آئیگا ۔ لیکن اس جذبہ کے ساتھ یہ ڈر بھی شامل ہو گا کہ مزدور فاقہ مستی سے تنگ آ کر سرمایہ داروں کی تباہی پر کمربستہ ہو جائیں گے ۔ یہ ممکن ہے کہ عام آدمیوں کے لئے ضروریاتِ زندگی م[illegible] جائیں ۔ لیکن اِس کا باعث پدرانہ جذبہ ہو گا ——— وہی جذبہ جو غلامی کے فروغ کے زمانہ میں تنگ کانوں میں کام کرنے والے بدقسمت غلاموں کو خورد و نوش کا سامان پہنچانے کا باعث تھا ۔ لیکن یہ پدرانہ جذبہ جس کا ذکر ہم نے کیا ہے ایک حد تک بہتر اور بلند تر ہو گا ۔

سیاسیات کے تھیٹر میں ملک کے ناقابل ترین شہریوں کا پارٹ صرف "ہاں" اور "ضرور" کہنا یا صدائے احتجاج بلند کرنا ، قرار دادیں منظور کرنا ، جلسے کرنا تکلیفیں اٹھانا اور ظاہری طاقت حاصل کرنا ہو گا ۔ حقیقی حکومت خود اختیاری سے بہرہ ور ہونا اُن کی قسمت میں نہ ہو گا حکومت کرنے والے حقیقت میں وہی

ہونگے - جو قانون، سیاسیات، تعمیر، نظم و نسقِ مملکت اور نشر و اشاعت کے فنون میں ماہر ہونگے - غلط خبروں کی تشہیر اور اسی قسم کی دوسری چالوں سے کم عقل ووٹ دینے والوں کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ انہیں کی خواہشات پر عمل کیا جارہا ہے -

ایچ - جی ویلز کے ایک افسانہ میں مذکور ہے کہ ناقص العقل لوگوں یا سوسائٹی کے پست طبقوں کو رہنے کے لیئے زمین کا نچلا حصہ ملے گا - یہ بات حقیقت سے بعید نظر آتی ہے مگر یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ ایسے لوگوں کے لیئے علیحدہ سرکاری جھونپڑیاں بنائی جائیں گی - اگر دانائی اور سونے چاندی کی تھیلیوں کا واقعی کوئی تعلق ہے تو آئندہ زمانہ میں غریبوں کو اپنی بیچارگی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائیگا - اور حکومت کا جذبۂ پدری اُن کی زندگی کا واحد ذریعہ قرار پائے گا -

(ترجمہ) **عطاالله کلیم**

بروگ بنسی

کیسا مذہب کیسی ملت کیا عقلی تشویش
اک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

عشق و محبت کے مشرب میں کون نہس دلریش
مانا ہم نے حضرت ناصح آپ ہیں خیر اندیش
اِک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

سارے دھرم کو نشٹ یہ کر دے تن من ڈالے پیس
رِیت پریم کی ہے کچھ ایسی چلے نہ پانچ پچیس
اک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

کیسی عادت کیسی خصلت اور کیا رسم و رواج
ہم تو محبت کے راجہ ہیں عشق ہے اپنا راج
اِک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

آنسوؤں مالا نینیاں جپیں شیام سِی لاگی پریت

تن من سب بیاکل ہوا ہوئی پریم کی جیت
اِک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

رووت روت بھور بھئی اور چین گیا سب کھوئے
نیند نیناں سے سر کھئی ، برہ کا دکھڑا روئے
اِک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

ہوش میں اپنے ہم نہ رہے جب یاد کبھی وُہ آئے
ہے یہ تمنّا یاد میں اُن کی جان بھی اپنی جائے
اِک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

کیسی سُدھ اور کیسی پاتی اور کیسا سندیس
ہردے ہُوک اُٹھے رہ رہ ، گھنشام گئے پردیس
اک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

کیسی سمرن کیسا مالا ، دل میں ہے اک ٹیس
اک من تھا سنگ گیا شیام کے
کون بھجے جگدیش

سید مقبول حسین احمد پوری

میر کی غزل گوئی

شعر کا مطالعہ جس قدر دلچسپ ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ شعر کا مطالعہ ممکن نہیں صرف اس سے حظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آرٹ حیات کے مانند وسیع ہے اور شاعری آرٹ کے ذریعے سے ترجمہ شدہ حیات کا نام ہے۔ پھر اس کا مطالعہ اور تجزیہ کس طرح ممکن ہے ؟ لیکن ہمیں "سرودِ حیات" کی سریلی آواز کو نہ بھولنا چاہیئے "آؤ ہمت کریں اور کام میں لگ جائیں" یہی جذبہ ہے جس نے راقم کو اس مشکل کام پر آمادہ کیا۔ تشریح و تحلیل اس مضمون کا مقصد نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون محض چند اشارات کا حامل ہے۔ اور میرا مقصود یہ ہے کہ میر صاحب کے ایک حقیر عقیدتمند کی حیثیت سے اُن کی غزل گوئی کی خصوصیات پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔

مغربی ادبیات میں جس صنفِ شعر کو مزماری شاعری (Musical Poetry) کہا جاتا ہے اسے مشرق کی غزل گوئی سے بہت قریب کی مناسبت ہے۔ اس لئے اگر یہاں مغربی نقادانِ فن کے خیالات سے کچھ اقتباس کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ ہیگل (Hegel) نے جو جرمنی کا مشہور فلسفی اور نقاد تھا۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب "جمالیات" میں رزمیہ اور مزماری شاعری کے مسئلہ پر اچھی طرح بحث کی ہے - اس کا خیال ہے کہ اگر شاعری معروضی ہو تو رزمیہ ہوتی ہے اور اگر ذہنی ہو تو مزماری ہے۔ رزمیہ شاعری میں مصنف اپنے سے باہر مضامین کی تلاش کرتا ہے اور اپنا موضوعِ سخن بیرونی اشیا و واقعات کو قرار دیتا ہے۔ مزماری شاعری میں وہ آپ اپنا موضوع ہوتا ہے یعنی اپنے جذبات اور حسیات پر قلم آرائی کرتا ہے۔ کوئی نظم جزئً رزمیہ اور جزئً مزماری ہو سکتی ہے۔ ہیگل نے مزماری نظم کی اس طرح تعریف کی ہے:۔

"وہ ایک واحد جذبہ ہے جو مزاج کی مناسبت سے شاعرانہ الفاظ میں ادا کیا گیا ہو" مزماری نظم بدرجۂ اتم جذباتی اور تخیلی ہوتی ہے۔

اب ہم مزماری نظم کی فنی (ٹکنیکل) خصوصیات پر غور کریں گے۔ اس میں وحدت اور اختصار پائے جاتے ہیں۔ مزماری نظم عموماً کسی "واحد خیال۔ احساس یا موقع" سے متعلق ہوتی ہے اس لئے اس میں وحدتِ خیال

ل۔ امریکن شاعر لانگ فیلو کی ایک مشہور نظم کا نام ہے۔

نہایت ضروری ہے۔ یہ بالعموم مختصر ہوتی ہے کیونکہ یہ مصنف کی ایک خاص قلبی کیفیت کی تصویر ہوتی ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ علاوہ ازیں اس کی آخری اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لفظی موسیقی۔ سادگی زبان اور لطافت بیان سے مملو ہوتی ہے اور یہ تمام خوبیاں اسے اک "پارۂ حسن" بناتی ہیں۔

میر صاحب کی عظمت بالخصوص غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہے انہوں نے اس صنفِ شعر کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا آلہ بنایا جیسا کہ عمر خیام نے رباعی کو اور پیٹرارک نے سانٹ کو اختیار کیا تھا۔ پس ہم پر لازم ہے کہ اِس صنف شعر کی وسعت اور استعداد کو دیکھیں۔

غزل کی ابتدا ایران میں ہوئی اور سعدی و حافظ جیسے شعرا کے ہاتھوں میں اس کو بڑا کمال حاصل ہوا۔ ایسے عہد میں جب کہ ایرانی مذاق اور اطوار ہندوستان پر حکمران تھے۔ لازم تھا کہ غزل یہاں کے ادیبوں میں بہت مقبول ہو، چنانچہ انہوں نے اِس کو نوزائیدہ اردو میں بھی داخل کیا۔ ابتداً غزل کے مخصوص مضامین عشق ومحبت تھے لیکن بعد میں دیگر جذبات وخیالات کا بھی اس میں اظہار ہونے لگا۔

اُردو کے اصنافِ شاعری میں غزل ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مزاری نظم کی دو فنی خصوصیات یعنی اختصار و لطافتِ بیان بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ لیکن غزل پر بڑا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ شخصی جذبات کی مظہر نہیں ہوتی۔ ہمارے اکثر شعرا نے ایک ہی مضمون کو بار بار نظم کیا اور دوسروں کے جذبات وحسیات کا اپنے آپ پر غلط اطلاق کیا۔ اس طرح غزل بہت تصنع آمیز ہوگئی لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ استادانِ سخن اور باوقار شعرا نے اپنے گہرے نقوش ہمارے ادب پر چھوڑے ہیں۔ ہم میرؔ، سوداؔ، غالبؔ و ذوقؔ کی اصلی شخصیتوں کو اُن کی عاشقانہ نظموں میں محسوس کر سکتے اور جان سکتے ہیں۔ غزل ہمیشہ لطیف پیرایۂ اظہار رکھتی ہے یا بقول کسے "لفظی میناکاری" سے ممتاز ہوتی ہے۔ لیکن غزل کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں وحدت وتسلسل نہیں ہوتا جو تمام اعلیٰ آرٹ کی خصوصیت ہے۔ یہ ایک بے قاعدہ نظم ہے جو مختلف بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک دوسری سے بالکل آزاد ہوتی ہے۔ نیز ہر بیت اتنی مختصر ہوتی ہے کہ اس میں بمشکل کسی واحد جذبہ یا خیال کا اظہار ہوسکتا ہے یہ بہت بڑا نقص ہے جس سے غزل کا اصلی شخصی رنگ مدہم نظر آتا ہے۔

عہد میر۔ گوئٹے کے ارشاد کے مطابق ہر شخص اپنے ملک کے ساتھ اپنے عہد کا بھی باشندہ ہے۔ کلام میر کے مطالعہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے عہد کے عام حالات سے واقفیت ہو۔ میر صاحب اٹھارھویں صدی کے رہنے والے تھے جو تمام دنیا میں سیاسی کشمکش اور اجتماعی بےچینی کا عہد تھا۔ ہندوستان اس سے مستثنیٰ نہیں تھا

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم باب کا خاتمہ ہے۔ اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا شخص زبردست نہیں تھا جو تمام ملک کی حکومت کی باگ سنبھال سکتا۔ سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور بادشاہتوں میں بٹتی گئی۔ نئی نئی حکومتیں بنیں اور بگڑیں ایک دوسرے سے انہوں نے جنگ آزمائی کی اور ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر کے اپنی طاقتوں اور قوتوں کو منتشر و عاری کر دیا۔ اور اس طرح اُس عظیم المناک حادثے کے لئے راستہ صاف کر دیا جو اگلی صدی میں واقع ہونے والا تھا۔ سیاسی تنزل کے ساتھ ہندوستانیوں کی اخلاقی اور روحانی قوتیں بھی انحطاط میں آنے لگیں۔ متمولین کی عیاشی اور نفس پرستی انتہا کو پہنچ گئی۔ ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا ظلم روز بروز بڑھتا گیا جس سے غربا کی حالت اور پریشان و خستہ ہوگئی۔ غالباً اپنے عہد کی اسی شورش انگیزی کی طرف میر صاحب نے نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے   دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

اٹھارہویں صدی میں ادب کی حالت کیا تھی؟ کارلائل نے اِس عہد کے یورپی ادب کا اس طرح حال لکھا ہے۔ "نثر کا زمانہ! دشنام و دروغ گوئی کا قرن! فریبی دیوالیہ صدی! شیطان کی حکومت! تصنع کا مخصوص عہد!" ہندوستان میں بھی یہی زبوں حالت تھی[ا]۔ فارسی ادب کے زریں دور اور شاندار کارنامے ختم ہو چکے تھے۔ اگر اس وقت نثر و دشنام کا دور نہیں تو کم از کم قافیہ پیمائی تصنع کی حکومت تھی۔ اُردو زبان نے اسی زمانہ میں ادبی روپ اختیار کیا۔ اِس ماحول سے اس کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اس کے ادب[ب] پر خالص فارسی رنگ چڑھا ہوا تھا کیونکہ اکثر شعرائے اردو نے خیالات و اسلوب میں فارسی اساتذہ کی تقلید کی اور کسی نمایاں جدتِ خیال و بلند نظری سے کام نہیں لیا۔

اُردو ادب کی یہ حالت مولانا حالی کے عہد تک باقی رہی۔ انہی ناموافق حالات میں میر صاحب کی پیدائش

[ا] ملاحظہ ہو۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی۔ نواب صدر یار جنگ کا خطبۂ صدارت (شعبۂ اردو۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور) "عہدِ عالمگیری کے ختم ہوتے ہی یہ بھی باقی نہ رہا محض قافیہ پیمائی رہ گئی۔ ایک شاعری پر کیا منحصر ہے۔ سارے فنونِ لطیفہ پر پانی پھر گیا۔ بہر حال شاعری رہی ' ورلئے شاعری چیزے دگر' رخصت ہوگئی۔ اس بد مذاقی کی حد جعفر زٹلی کے کلام سے جا ملی جو بین ثبوت اس امر کا ہے کہ متین کلام میں گرمیٔ سخن باقی نہ رہی تھی اور وہ ضیافتِ طبع بہم پہنچانے سے عاجز ہو چکا تھا۔" وفاتِ عالمگیر کے بعد حالت بد سے بدتر ہوگئی۔

[ب] اس عہد میں اردو ادب کی حالت کی تفصیل کے لئے ڈاکٹر سید عبداللطیف (پروفیسر انگریزی کلیہ جامعہ عثمانیہ) کی انگریزی کتاب "اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر" حصہ اوّل ملاحظہ ہو۔

ہوئی۔ ہم آگے بتائیں گے کہ اس مصیبت رساں ماحول نے ان کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا۔

حیات[1] وسیرۃ۔ میر تقی میر ۱۷۲۲ء (۱۱۳۷ھ) میں آگرہ میں پیدا ہوئے اُن کے والد میر محمد متقی ایک مذہبی اور خدا ترس انسان تھے جن کا انتقال شاعر کے گیارہ برس کی عمر پانے سے پہلے ہوگیا۔ باپ کی وفات پر اُن کے ایک رشتہ دار خان آرزو خاندان کے سرپرست ہوئے۔ لیکن خان آرزو کا سلوک میر صاحب کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا جیسا کہ خود اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"اگر ان کی دشمنی کی تفصیل کروں تو ایک دفتر ہو جائے!" (ذکر میر)

پندرہ برس کی عمر میں وہ دہلی چلے گئے جہاں اُن کی زندگی کا بہترین اور سب سے بڑا حصہ گزرا۔ انہوں نے دہلی کو ہمیشہ اپنا وطن سمجھا اور اس سے اُن کو محبت تھی:۔

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔۔ ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے!

لیکن دہلی میں اُن کی زندگی راحت و آرام سے نہیں گذری اُن کو ہمیشہ مالی دقتوں اور خانگی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے تمام محسن ـــــ ریاست خاں۔ نواب بہادر۔ راجہ ناگر مل وغیرہ ـــــ یکے بعد دیگرے رفتار زمانہ کا شکار ہوگئے۔ بالآخر ۱۷۸۲ء میں اُن کو مجبوراً لکھنؤ جانا پڑا۔ لیکن اس تبدیلی سے کچھ فائدہ نہ ہوا ؎

خرابہ دہلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا ۔۔۔ وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں!

کچھ دنوں تک نواب آصف الدولہ و دیگر امرا نے اُن پر نوازشات کیں۔ لیکن میر صاحب کو طفیلی و خوشامدی بننے سے نفرت تھا۔ انہوں نے اخیر عمر کا بڑا حصہ ریاضت و فاقہ کشی میں گزار دیا۔ بالآخر موت کی اٹل گھڑی (۱۸۱۰ء) سر پر آگئی اُن کی روح نے جسدِ خاکی سے آزادی حاصل کی جس کے بعد وہ "ناقابلِ اظہار رنگینوں" کے ساتھ "پرکیف رسالوں اور جماعتوں" میں پہنچ گئی۔ لیکن دنیاوی شاعر نے نوحہ بلند کیا: واویلا مرد شہ شاعراں!

ناسخ نے الم کا یہ نعرہ کیوں لگایا؟ آیا اس وجہ سے کہ میر صاحب ایک بڑے شاعر تھے یا اس لئے کہ "اس کی زندگی شریفانہ تھی۔ اس میں عناصر اس خوبی سے ترکیب پائے ہوئے تھے کہ فطرت تمام عالم سے مخاطب ہوکر کہہ سکتی تھی کہ یہ ایک انسان ہے!"

میر صاحب فی الواقع شیکسپیر کے اس اعلیٰ تصور کے حامل تھے۔ بیشک وہ ایک انسان تھے!

ملئے اس شخص سے جو آدم ہوئے ۔۔۔ ناز اس کو کمال پر کم ہوئے

---

[1] حیات وسیرت کے تفصیلی مطالعہ کے لئے تذکرۂ آبحیات دیکھنا چاہئے۔

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا　　خدائی صدقے کی انسان پر سے!

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں　　بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش　　ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے!

بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل وجگر میں کہ نصف شب کو

لگا جو رونے تو جائے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا　　ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا　　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا!

میر صاحب کے سوانح زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانی اور مذہبی دل ودماغ کے آدمی تھے۔ اُن کو یہ چیز اپنے والد سے وراثتہً ملی تھی۔ اُن کی حیات کے واقعات سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھا: "بیٹا زمانہ سیال ہے یعنی بہت کم فرصت ہے۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو"۔ والد کے انتقال کے بعد اُن کے استاد سید امان اللہ نے بھی جو ایک درویش صفت اور مقدس آدمی تھے یہی سبق دیا۔ خود میر صاحب کی طبیعت میں جوشِ عمل موجزن نہیں تھا۔ اُن کو عملی زندگی سے ہمیشہ گریز رہا اور گوشہ نشینی و عزلت کے دلدادہ تھے:۔

دامن عزت کا اب لیا ہے میں نے　　دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے!

تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک　　پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے!

یہی خصوصیت ہم کو میر کی فطرت کے ایک روشن پہلو کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ میر صاحب بہت کم دنیوی تھے امرا کی شان وشوکت سے بالکل غیر متاثر رہتے تھے اور مشہور مقولہ "خوشامد سے طاقت جھکتی ہے" سے نفرت رکھتے تھے:۔

ہو کوئی بادشاہ یا کوئی وزیر ہو　　اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

مطلق العنانی کی روح کسی اور جگہ اس خوبی سے ادا نہیں کی گئی!

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا　　حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے!

میر صاحب میں اخلاقی دلیری ودیعت کی گئی تھی جس کا لازمی نتیجہ فقر واستغنا ہے تھے وہ بالکل بے خوف وخطر تھے۔ انھوں نے بہت کم کسی کی ستائش ومدح سرائی کی۔ اور اسی کے متعلق اشارا کرتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں   میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں

میر کی اعلیٰ فطرت عام انسانوں کی تنگ خیالی سے بالکل بالاتر تھی اور اِسی وجہ سے اُن کے طرزِ عمل کے صحیح مطالعہ میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے غالباً انہوں نے اِسی وجہ سے فرمایا :-

تری چال ٹیڑھی تری بات رُکھی   تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے !

اُس عہد کے عام حالات کے لحاظ سے تعجب نہیں کہ اُن کے معاصرین نے میر صاحب کے متعلق مختلف چہ میگوئیاں کی ہوں - چنانچہ فرماتے ہیں :-

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ   ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ !

لیکن مولانا آزاد جیسے روشن خیال مصنف نے بھی میر صاحب پر "بے دماغی" "خود پسندی" کا الزام لگایا ہے جو نہ صرف افسوسناک بلکہ حیرت انگیز ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک ان کی سیرت کو صحیح روشنی میں نہیں دیکھا گیا -

میر صاحب اپنے متعلق کہتے ہیں :-

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں   اِک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردہ سے باہر   میں ورنہ وہی خلوتئ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر   صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

دیکھا ہے مجھے جس نے سو دیوانہ ہے میرا   میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے   اس باغِ خزاں دیدہ میں مَیں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بس کہ پریشاں   در پے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیٔ موہوم   اِس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

ذہنیتِ میر - میر صاحب کی سیرت سے کم و بیش آگاہ ہونے کے بعد ہم اُن کی ذہنیت سے واقفیت کی کوشش کریں گے - یہیں سے اصلی ادبی مطالعہ شروع ہوتا ہے - اہلِ تنقید کے پاس کوئی ایسی خوردبین نہیں جس سے کسی شاعر کے دل و دماغ کو ایک نقطۂ ماسکہ پر لا کر مطالعہ کیا جا سکے - وہ میکانی آلات کے بجائے دماغی و روحانی ذرائع سے کام لیتے ہیں - صنعت کو دیکھ کر صانع کی طرف خیال کا منتقل ہونا ایک فطری امر ہے - اور ایک نقاد بھی اسی پر کاربند ہوتا ہے - وہ ایک ادبی پارہ کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ یہ چیز کس قسم کے دل و دماغ کی ضیا کاری ہو سکتی ہے -

کسی شاعر یا آرٹسٹ کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا

خیال اپنے آرٹ کے متعلق کیا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا مخصوص شخصی رنگ کیا تھا اور بالآخر حیات کے متعلق اس کے زاویہ نگاہ سے واقفیت کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب ہم کو نفسِ مضمون کی طرف آنا چاہئے۔

میر صاحب پُر خلوص اور شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے۔ اُن کی قابلِ ستائش سیرت مختلف طریقوں سے اُن کی حیات اور شاعری میں ظاہر ہوتی ہے۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے اپنے معاصرین کی عادت کے برخلاف امرا و اکابر کی فرمائش پر نظمیں نہیں لکھیں اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قصیدہ گوئی کی طرف کم میلان تھا۔ نواب آصف الدولہ نے ایک دن اُن سے ایک غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ دوسرے دن جب وہ دربار کو گئے تو نواب نے پوچھا کہ غزل کہاں ہے۔ میر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا: "جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔"

اس لطیفہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ میر صاحب کا یہ سچا عقیدہ تھا کہ شاعر کو آزاد ہونا چاہئے اور کسی رکاوٹ اور جبر کے ماتحت کام نہ کرنا چاہئے بلکہ وجدانی کیفیتوں میں اپنے جوہر دکھانے چاہئیں۔ ہم آبحیات سے ایک دوسرا لطیفہ درج کرتے ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین شاگردی کے لئے گئے تو فرمایا: "آپ خود امیر ہیں امیر زادے ہیں شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں ... آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب اِس مشہور عالم مقولہ پر یقین رکھتے تھے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ نیز اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ "ورائے شاعری چیزے دگر است" ان کے نزدیک "احساس" و "جذبہ" ہی شاعری کی جان ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دل کے الجھاؤ کا کیا تجھ سے کہوں اے اہد — تو کسی زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں!
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا!

شخصی شاعری کی طرف اس قدر زیادہ میلان کے باعث ان کے اشعار پر عموماً "رزمیاری" رنگ چڑھا ہوا ہے جو ارادۃً یا بلا ارادہ خود اُن کی اپنی زندگی کے واقعات سے پیدا ہوا:۔

ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی — تب درد ہے ہمارے اے میر ہر سخن میں

"کتابِ انسان" کا مطالعہ یعنی کسی شخص کا اُس کی تحریرات کی روشنی میں مطالعہ بہت دلچسپ اور نہایت اہم ہے۔ لیکن یہاں کارلائل کی ہدایت پر عمل کرنا لازم ہے اور "اصلی آواز" اور "صدائے بازگشت" میں تفریق کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ہم کو یہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ ہر شاعر کے کلام کی طرح کلامِ میر بھی دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ پہلا وہ حصہ جو

بیشتر تقلیدی اور مشقی ہے۔ دوسرا وہ حصہ جو پختہ اور طبع زاد ہے۔ آخرالذکر کے امتحان سے ہم میر کے اصلی منر راز کو سن سکتے ہیں جو اُن کے دل کی آواز معلوم ہوتا اور اُن کی شاعری میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ کلام میر کی کوئی زمانی ترتیب موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہم اُن کی ذہنیت اور آرٹ کے ارتقاء کو واضح نہیں کر سکتے۔ تاہم اُن کے مصنفات کلیاتِ میر۔ ذکرِ میر و نکات الشعرا ـــــ کی مدد سے اُن کی شاعری کی عام خصوصیات کو واضح کیا جا سکتا ہے۔

میر کی شاعری میں سب سے نمایاں راگ شیریں حرماں و آرام دہ یاس کا ہے۔ یہاں ہم کو حسب ذیل واقعات پیش نظر رکھنا چاہئیں:

(ا) میر صاحب کو ہوسِ دنیا سے نفرت اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی اُن کی تعلیم سید امان اللہ جیسے ولی صفت انسان کے ہاتھوں میں ہوئی جنہوں نے ان کو وہی سبق دیا۔

(ب) صغر سنی میں اُن کے والد کی وفات اور خان آرزو کی بدسلوکی اُن کے لئے بڑے صدمے تھے

(ج) خود اُن کی زندگی مصائب کا ایک سلسلہ اور ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھری ہوئی تھی۔

(د) اپنے عہد کی عام بے چینی۔ دہلی کی سیاسی بربادی اور کئی خاندانوں کی تباہی بھی شاعر کے دل کے لئے کچھ کم اہم واقعات نہ تھے۔

ان تمام اسباب نے شاعر کی حساس طبیعت پر بڑا اثر کیا اور اس کو قنوطیت کی طرف مائل کر دیا۔ مصنّف آبحیات نے ان کی شاعری کی اصلی روح کو ایک خوبصورت جملہ میں ادا کیا ہے: "وہ اُن کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا ہی نہیں بلکہ حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا"

اس پر الم راگ کو اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی یہی یاس تھی جس نے انہیں کلفت زدہ بنایا!

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ——— دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اسی وجہ سے وہ موت کو غالباً ایک قسم کی نیند سمجھتے تھے جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ شور و غل سے اچاٹ ہو جائے گی۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ——— ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لئے دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے زندگی کے روشن پہلو کو دیکھتے اور اس سے لطف اندوز ہو کر فطرت کی مسرت و خوشی میں اس کا ساتھ دیتے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

گو شگفتہ چمن چمن تھے گل — غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک بہم غم دل کہا کریں گے — طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کرینگے

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے — ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ!

مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ — رہنے دو نشاں غریب کا تو

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کارلائل نے جو کچھ کالرج کے متعلق لکھا اس کا میرؔ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے :- "اُن کا حزن و ملال " کڑواہٹ - بدمزاجانہ شکایت اور بائرن کی مایوسی سے پاک ہے " فرماتے ہیں

برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا — ابر تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں

تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں — دل آزردہ گر سلامت ہے

خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

مری اس باغ میں گزری سدا خوش — رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں

اپنے مضمون کے شروع میں ہم بتا چکے ہیں کہ آرٹ کے ذریعہ سے حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہے - اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہمارے شاعر نے اپنے کلام میں زندگی کی مختلف ہیئتوں کی کس طرح تصویر کھینچی ہے -

ہمارے شعرا میں اکثر یہ دستور رہا ہے کہ دنیا کو گزشتنی اور مصائب و آلام سے پُر قرار دیتے ہیں - اکثر شعرا نے عوام کو دنیا سے باز رہنے اور خدائے تعالیٰ کی طرف محو ہو جانے کی نصیحت کی - اسی قسم کے تصنع آمیز مضامین اُن کے کلام میں بھی موجود ہیں تاہم اُن میں کسی قدر اچھوتا پن پایا جاتا ہے جو اپنی حیات کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے متعلق کہتے ہیں :-

بودِ آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے ہم اس شعر کے شخصی رنگ کو نہیں تسلیم کر سکتے کیونکہ ہم نے اس قسم کی صدائیں دہلی کے تمام شعرائے اردو سے سنی ہیں لیکن چونکہ میر صاحب کی زندگی بحیثیت مجموعی پُر آلام تھی اس لئے اس کو ہم ایک شخصی تجربہ قرار دے سکتے ہیں -

میر صاحب مجسم ذکاوت ہیں اُن کے لئے ضروری ہے کہ عام اور معمولی چیزوں میں بھی اپنے وقار و عظمت کا اظہار

کریں اور یہی بات اُن کے نظریۂ حیات سے معلوم ہوتی ہے
دُنیا کی بے ثباتی کو دیکھ کر وہ اس طرح نصیحت کرتے ہیں :-

ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل ۔۔۔ بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ!

یہی آواز پھر اس طرح گونجتی ہے

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل ہے بنی آن کے صاحب نظروں کو

اُن کے لئے انسان ایک معمّہ ہے جس کا حل اُن کو خود اپنی ہستی کے مطالعہ سے بھی نہیں مل سکتا!

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا ۔۔۔ ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو ۔۔۔ دیر سے انتظار ہے اپنا
مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم ۔۔۔ القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

وہ اپنی حیات کو قدرت کا ایک زبردست عطیہ سمجھتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ۔۔۔ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وہ دل کو زندگی کی بیش قرار نعمت سمجھتے ہیں اور اکثر اس کی سب سے زیادہ قدر کرنے پر زور دیتے ہیں۔

دل ہیں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک ۔۔۔ ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
کعبہ جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق میر ۔۔۔ چال وہ بتلا کہ ہیں دل میں کسی کے جا کروں

اُن کے نزدیک دنیا اک آئینہ خانہ ہے جس میں اور ہزاروں دنیائیں منعکس ہوتی ہیں

سرسری تم جہان سے گزرے ۔۔۔ ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا!

وہ خالقِ حیات کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

حق ڈھونڈنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ ۔۔۔ عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

وہ موت کو "بقائے دوام کا پل" سمجھتے ہیں۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔۔۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا ۔۔۔ کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا!

میر صاحب کا آرٹ ۔ میر صاحب کی ذہنیت سے کم و بیش واقف ہو جانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ

اُن کے آرٹ کی طرف رجوع کریں۔

اگر شیلی کا قول درست ہو کہ "ہمارے لطیف ترین نغمے وہ ہیں جو غم و اندوہ کا راگ گاتے ہیں" تو کلام میر ایک اعلیٰ شاعرانہ معیار پر پُورا اُترے گا۔ اُن کی شاعری میں محاسن تغزل بخوبی پائے جاتے ہیں۔ جذبات کی گہرائی اور احساسات کے خلوص میں غالباً کوئی اُردو شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم صرف چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا!

ضبط کروں میں کب تک آہ — چل مرے خامے بسم اللہ

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے!

تڑپ کے خرمن گل پر کہیں گرا اے بجلی — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

غیرت سے نام اُس کا آیا نہیں زباں پر — آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے ہیں

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

دل ہی مرغِ چمن کا ٹوٹ گیا — پھول گلچیں نے ہائے کیوں توڑا

مختلف جذبات میں عشق و محبت۔ غم۔ امید و بیم کی تصویریں اُن کے کلام میں ملتی ہیں لیکن حُبِ وطن، حریت پسندی جیسے اعلیٰ جذبات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ مولانا حالی سے پہلے تمام شعرا کا یہی حال رہا۔ اور اپنے معاصرین کی طرح میر صاحب نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول نہ کی۔

عموماً غزل اور تصوف میں گہرا رشتہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم کو یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ نظریہ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن میر صاحب کی حیات کے مطالعہ کے بعد ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اُن کی طبیعت اور تصوف میں خاص تعلق ہونا چاہئے :۔

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں — کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں

یہ بالکل صحیح ہے۔ اُن کے نزدیک تصوف ایک پیشہ ورانہ مسلک نہیں تھا بلکہ خود اپنی حیات کے مانند ایک گہرا اور حقیقت آمیز جذبہ۔ چنانچہ اُن کے کلام کا ایک حصہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں :۔

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے — نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ اِدھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

جو سوچا ٹک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میر — خراب پھرتے تھے جس کی طلب میں مدت سے
ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں — نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے!

اِس کے بعد ہم اُن کے آرٹ کے دوسرے حصّے طرزِ بیان کا مطالعہ کریں گے جو اُن کے کلام کا ایک اہم جزء ہے۔ اُن کی وفات کے بعد ہی ناسخ نے معاصرین کے سامنے ایک مسلک پیش کیا:۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب نے اُن کی بزرگی کا اس طرح اعتراف کیا:۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا!

ذوق اُن کے متعلق یُوں کہتے ہیں:۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر کا طرزِ بیان یا بقولِ ذوق اُن کا "انداز" متغزلانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اُن کا کلام ظاہری و معنوی خوبیوں سے مملو ہے۔ اس میں خوبصورت تشبیہات دل خوش کن محاورات اور سادہ جملوں کی بہتات ہے۔ یہ اُن کے جذبات کے خلوص اور حسیات کی گہرائی کے بالکل مطابق تھا۔ اپنے معشوق کے ساتھ اُن کو کتنی گہری محبت ہے لیکن اُن کا بیان کتنا سادہ ہے!

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ — ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

اِن اشعار کی تہ میں جو گہرے جذبات کام کر رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے!

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — ہر سخن تا بلب نہیں آتا

ذیل کے اشعار میں شاعر کے خلوص اور بیان کی سادگی و بے ساختگی دیکھئے۔

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
نکلیں کیا کیا کہاں ہیں جن پہ فلک
یہ وہی آسمان ہے پیارے
ترک تبسم کے کرنے سے تیرے
کنجِ لب پر گمان ہے پیارے
میرِ عمداً بھی کوئی مرتا ہے؟
جان ہے تو جہان ہے پیارے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

غالب نے اُن کی موسیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :- جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں!
موسیقیِ الفاظ اور سلاست و روانی کے لحاظ سے اردو شعرا میں ان کا بہت بڑا مرتبہ ہے - ان کے اندازِ بیان کو بجا طور پر "سہل الممتنع" کہا گیا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بِن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا؟

اِن تمام خوبیوں کے ساتھ اُن کے کلام کی بڑی خصوصیت تاثیر اور دلپذیری ہے اور یہی اُن کو شعرائے اُردو میں ایک باوقار جگہ دیتی ہے -

ہم سے خوش زمزمہ کہاں؟ یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں!

ورڈس ورتھ نے خوب کہا ہے :- " شاعری دل سے نکلتی ہے اور دل میں پہنچتی ہے "
کلامِ میرؔ کے قارئین و سامعین پر اس جملہ کی صداقت واضح ہو جاتی ہے -

جادو کی پُڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

ہم تھوڑی دیر اور توقف کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ دنیائے شاعری میں میرؔ صاحب کا کیا مرتبہ ہے تھیوڈور واٹس ڈنٹن

نے شعرا کو دو قبیل میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جماعت کی خصوصیت اچھوتا پن اور جوش ہے جو پگھلے ہوئے لاوا کی طرح غیر مزاحم طور پر خارج ہوتی رہتی ہے۔" اس سے ہمارے نقاد کی مراد صرف یہ ہے کہ اِن شعرا کا تخیل نہایت اعلیٰ پایہ کا ہوتا ہے جو وجدان اور الہام کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس قبیل میں دنیا کے اکثر عظیم شعرا داخل ہیں۔ مثلاً ہومر شیکسپیئر۔ ڈانٹے۔ گوئٹے۔ کالیداس مولانا روم وغیرہ۔ دوسری جماعت کے شعرا کو واٹس ڈنٹن "آرٹ کے شعرا" سے موسوم کرتا ہے۔ اُن کا کلام کم جوشیلا اور زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ یعنی اُن کے کلام میں تخیل کی پرواز اور اچھوتا پن، بیان کی ندرت اور دلکشی کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔ ان شعرا کے کلام میں کوئی مستقل و مربوط تعلیم نہیں ہوتی۔ اکثر شعرائے عالم اسی جماعت میں داخل ہیں۔ میر صاحب کا بھی غالباً اسی قبیل سے تعلق ہے۔ ان میں اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی کا وہ شور نہیں جو پہلی جماعت کے شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کے کلام سے کسی قسم کی تعلیم کی توقع بے جا ہے البتہ اُن کو دنیائے شاعری میں صاحبِ طرز کی حیثیت سے ایک ممتاز جگہ حاصل ہے۔ لیکن اِس سے ہمارے دلوں میں اُن کی وقعت ہرگز کم نہیں ہوسکتی۔ میر صاحب کو یہ بڑا فخر حاصل ہے کہ ایک شورہ پشت اور رو بہ انحطاط دور میں انہوں نے صحیح ادبی خدمات انجام دیں اور "ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا" کے بغیر شاعری کی چپ چاپ خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے سپنسر کے الفاظ میں اپنا یہ مطمح نظر قرار دیا تھا:۔

"میرا ہرگز یہ خیال نہیں کہ میں پارنیسس[1] پہاڑ پر پہنچ گیا ہوں
بلکہ ایک چھوٹی گھاٹی میں آہستہ گاتا رہتا ہوں۔
میرے راگ خود اپنے خوش کرنے کے لئے ہوتے ہیں خواہ وہ دوسروں کو بھلے معلوم ہوں یا نہ ہوں"

"تاہم اس سادہ نصب العین کے علاوہ میر صاحب کو ایک اور مقصد بھی پیش نظر تھا۔ جو بجائے خود قابلِ ستائش ہے اور جس کے پورا کرنے میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ——— یہ مقصد ریختے کو رفعت اور وسعت دینا تھا ———

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

پس ہمیں شاعر کی درد بھری التجا پر عمل کرنا چاہئے

تربتِ میر پہ ہیں اہلِ سخن — ہر طرف حرفِ حکایت ہے،
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل — بخدا واجب الزیارت ہے

سید شاہ محمد

---

[1] پارنیسس یونان میں ایک پہاڑی کا نام ہے جو قدیم دیومالا کی رو سے شاعری کے دیوتا اپالو کا مسکن تھی

ستارے

(سانیٹ)

نکل کر جوئے نغمہ خلد زارِ ماہ و انجم سے
فضا کی وسعتوں میں ہے رواں آہستہ آہستہ
بسوئے نوحہ آبادِ جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آ رہی ہے اُس گلستانِ ترنّم سے،
ستارے اپنے میٹھے، مدھ بھرے، ہلکے تبسّم سے
کئے جاتے ہیں فطرت کو جواں آہستہ آہستہ،
سناتے ہیں اُسے اک داستاں آہستہ آہستہ،
دیارِ زندگی مدہوش ہے اُن کے تکلّم سے؛

یہی عادت ہے روزِ اوّلیں سے اِن ستاروں کی،
چمکتے ہیں کہ دُنیا میں مسرت کی حکومت ہو،
چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بھُلا ڈالے!
لئے ہے یہ تمنّا ہر کرن اِن نور پاروں کی،
کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو،
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے!

راشد وحیدی

یورپ اور امریکہ کے مشہور کتب خانے

برطانیہ

عام خیال کے مطابق آج تمام دُنیا کے عظیم الشان کتب خانوں میں انگلستان کا مشہور قومی کتب خانہ برٹش میوزیم سب سے بڑا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ برٹش میوزیم کی کتابوں سے بڑا کتابوں کا ذخیرہ اور کہیں موجود نہیں۔ پیرس کے مشہور کتب خانہ ببلیوتھک نیشنل میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے قابلِ قدر نسخے بے شک یہاں سے زائد ہیں، مگر انتظامی معاملات اور کتب بینوں کے لئے آسانی پیدا کرنے میں لندن کا کتب خانہ یقیناً دنیا کے تمام کتب خانوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اِس میں تیئیس لاکھ پچاس ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں نو ہزار قدیم مطبوعات ہیں، اس کے علاوہ ستر ہزار قلمی نسخے، چوراسی ہزار فرامین اور متعدد نقشہ جات و دستخطی رقعات موجود ہیں۔ اس کی مطبوعاتِ جدیدہ کی فہرست ساٹھ جلدوں میں اور مطبوعاتِ قدیمہ کی چھ جلدوں میں مرتب ہوئی ہے۔ گذشتہ سال خزانۂ عامرہ سے صرف شعبۂ الطبقات کے سلسلہ میں دو لاکھ پندرہ ہزار چار سو پونڈ کی رقم منظور ہوئی تھی۔ حالانکہ اسی سال واشنگٹن کے کتب خانہ کے جملہ اخراجات کے لئے صرف ۴۷۳۲۸۴ پونڈ کی منظوری ہوئی تھی۔

۱۷۵۳ء میں جب سرہنس سلون کا ذخیرۂ کتب حاصل کیا گیا تو برٹش میوزیم کی بنیاد پڑی۔ اول اول یہ کتب خانہ مانٹیگو ہاؤس میں تھا جس کی رسمِ افتتاح ۱۷۵۹ء میں ہوئی۔ موجودہ عمارت ۱۸۵۷ء میں تیار ہوئی۔ مگر آج یہ عمارت کتب خانہ کی متعدد ضرورتوں کے لئے ناکافی ہے حالانکہ وقتاً فوقتاً اس میں زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے ترمیم ہوتی رہی۔ ۱۷۵۹ء سے برٹش میوزیم کو باڈلین کے کتب خانہ کی طرح ہر اس کتاب کی ایک نقل ملنے کا قانوناً حق ہو گیا ہے جس کا اندراج اسٹیشنرس ہال میں ہو۔

انگلستان کے کتب خانوں میں برٹش میوزیم کے بعد آکسفورڈ کے مشہور کتب خانہ باڈلین کا شمار ہوتا ہے، جس کی بنا پیرس کے مشہور نگار خانہ اور کتب خانہ لوور (LOUVRE) کی وجہ سے پڑی۔ باڈلین کا وہ حصہ

جو ڈیوک ہمفری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ابتدا ہمفری ڈیوک آف گلوسٹر کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ شخص جنگ صد سالہ میں انگلستان کی طرف سے فرانس میں انگریزی فوجوں کا جرنیل تھا۔ ادب میں اسے کافی دستگاہ تھی اور مصوری سے بھی اسے شوق تھا۔ پیرس کی لوٹ میں اپنے حصے کے لئے اس نے لوور کی کتابوں کو منتخب کیا۔ منجملہ لوور کی کتابوں کے اس نے مختلف مقامات سے اور بہت سی کتابیں حاصل کیں اور واپسی پر یہ تمام ذخیرہ آکسفورڈ یونیورسٹی کو بطور عطیہ دے دیا۔ ان کتابوں کو رکھنے کے لئے جو عمارت بنائی گئی وہ ڈیوک ہمفری کے کتب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۴۳۹ء میں اول بار ڈیوک کی بھیجی ہوئی چھ سو کتابیں آئیں لیکن جس مکان میں وہ رکھی گئیں وہ ڈیوک کی موت کے ۳۳ برس بعد تیار ہوا۔ یہ مکان اب تک باقی ہے۔ ایڈورڈ ششم کے زمانہ میں جب یہ جنون عام ہو گیا تھا کہ جس چیز کا ذرا سا بھی تعلق پاپائے روما سے ہو وہ تباہ کر دی جائے، اس کتب خانے کے بہت سے نسخے برباد کر دیئے گئے۔ ملکہ میری کے عہد میں یہ ستم اور ہوا کہ تمام الماریاں اور تپائیاں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچ ڈالی گئیں ۱۵۹۸ء میں جب ملکہ ایلزبتھ کا عہد تھا سر ٹامس باڈلے نے از سر نو اس کتب خانے کی تعمیر شروع کی تو در و دیوار، فرش و سقف کے سوا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ اسی زمانہ سے اس کا نام سر ٹامس باڈلے کے نام پر کتب خانہ باڈلین پڑا جو ہر طرح موزوں اور مناسب ہے۔ دو برس کی لگاتار محنت کے بعد یہ کتب خانہ کسی حد تک اپنی اصلی شکل میں آ گیا اور ۱۶۰۲ء میں باقاعدہ اس کا افتتاح ہوا۔ اس وقت سے اب تک اس میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ مطالعہ کے لئے دونوں طرف دو بہت وسیع کمرے بنا دیئے گئے ہیں۔ موجودہ حالت میں اس ساری عمارت کی شکل H کے مانند ہے۔ جو حصہ ان دونوں بڑے خطوں کو ملاتا ہے وہ ڈیوک ہمفری کی قدیم عمارت ہے۔

کتب خانہ میں اس وقت تیرہ لاکھ اٹھتر ہزار پانچ سو مطبوعات کا ذخیرہ بھی کافی وسیع ہے۔ ساتھ ہی چالیس ہزار قلمی نسخہ جات ہیں تمام شعبوں کو ملا کر اس میں پچیس لاکھ کتابیں ہیں لیکن اس عدد میں فرامین وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ مطالعہ خانے اور خود کتب مطالعہ کے متعلق موجودہ زمانہ کی ضروریات بہت بڑھ گئی ہیں۔ امریکہ کے مشہور ہمدرد علم و ہنر مسٹر راک فلر نے جو وقف اس غرض کے لئے قائم کیا تھا اس میں سے اس کتب خانہ کو بھی ایک کثیر رقم توسیع اور اضافہ کے لئے ملنے والی ہے۔

اسی راک فلر کے وقف سے کیمبرج کی مشہور یونیورسٹی کے کتب خانہ کو بھی ایک کثیر رقم تعمیر و اضافہ کے لئے ملنے والی ہے۔ اس کتب خانے کی بنیاد پندرھویں صدی میں رکھی گئی۔ مگر اس کا سب سے بڑا مربی اور ہمدرد سر ٹامس

اسکاٹ تھا جو یارک کا اسقف اعظم تھا۔ اُس نے ۱۴۷۵ء میں کتب خانہ کی عمارت تیار کرائی اور اسی عمارت میں یہ کتب خانہ ۱۷۵۵ء تک رہا۔ بعد ازاں بڑے بڑے امرا اور بادشاہوں نے اس کی امداد کی۔ شاہ جارج اول نے ۱۷۱۵ء میں بشپ مور کا کتب خانہ جس میں تیس ہزار سے اُوپر جلدیں تھیں، کیمبرج یونیورسٹی کو دے دیا۔ آج اس کتب خانہ میں دس لاکھ سے زیادہ مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں قدیم مطبوعات کا بھی کافی ذخیرہ ہے۔ دس ہزار کے قریب قلمی نسخے ہیں جن میں کوڈکس بیزا کا وہ مشہور قلمی نسخہ بھی ہے جس کو خود بیزا نے ۱۵۹۱ء میں پیش کیا تھا۔ یہ "عہد جدید" کی یونانی اور لاطینی زبان میں ایک نقل ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں تیار ہوئی اس میں خاص بات یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں میں انجیل کا سب سے قدیم نسخہ معلوم یہی ہے۔

اسکاٹ لینڈ کا نیشنل کتب خانہ نسبتہً نہایت جدید ہے یعنی ۱۹۲۵ء میں جب وکلا نے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کو منتقل کیا تو اس کی داغ بیل پڑی۔ لیکن اس سے قبل وکلا کا کتب خانہ بمنزلہ قومی کتب خانہ کے شمار ہوتا تھا۔ اس میں سات لاکھ مطبوعہ اور قلمی نسخے اور سرکاری کاغذات ہیں۔ سر الیگزنڈر گرانٹ نے اس کو ایک لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا ہے لیکن ابھی تک اس کی کوئی مستقل عمارت نہیں بنی۔ نقشہ زیر غور ہے عنقریب یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔

ویلز کا قومی کتب خانہ بھی نیا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں پڑی اور ۱۹۱۵ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ اس وقت اس میں پانچ لاکھ کتابیں ہیں۔ ویلز کی ملکی زبان میں بہت سے قابل قدر نسخے اس میں موجود ہیں۔ آئرلینڈ میں ٹرینیٹی کالج ڈبلن کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں اور بعض مشہور قلمی نسخے ہیں جن میں کلز کا مشہور قلمی نسخہ بھی ہے۔

فرانس

فرانس کا مشہور کتب خانہ ببلیوتھک نیشنل واقع پیرس پہلے ببلیوتھک رائل کے نام سے موسوم تھا۔ اس کی بنیاد پڑے سینکڑوں برس گذر گئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہنشاہ شارلمین کا جمع کردہ ذخیرہ بھی اس میں موجود ہے۔ شاہ چارلس پنجم کا ذخیرہ اس کے مختلف ذخیروں میں بہت مشہور ہے۔ پندرھویں صدی سے قبل اس کے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کی تاریخ میں اس کا حال اس وقت سے معلوم ہوتا ہے جب جے۔ اے وی تو کو ہنری چہارم نے ۱۵۹۳ء میں اس کتب خانہ کا منتظم مقرر کیا۔ ۱۶۱۷ء میں اس کتب خانے کو قانوناً یہ حق

دیا گیا کہ ملک کی تمام مطبوعات کی دو دو نقلیں اس کو ملا کریں - اور سترھویں صدی کے آخر میں یہ کتب خانہ رفاہ عام کے لئے کھول دیا گیا - انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اس کتب خانہ میں صرف ڈھائی لاکھ مطبوعہ کتابیں اور اناسی ہزار قلمی نسخہ جات تھے - انقلاب فرانس سے اس کو بہت فائدہ ہؤا - امرا اور دوسرے بڑے بڑے لوگوں اور مذہبی انجمنوں کی ضبط شدہ کتابیں اس میں داخل کی گئیں - نپولین نے کتب کی خریداری کے لیئے سرکاری امداد میں بھی کافی اضافہ کیا - آج اس میں چالیس لاکھ مطبوعہ کتابیں ، ایک لاکھ پچیس ہزار قلمی نسخے ، پانچ لاکھ اخبارات اور تیس لاکھ منقش اور مطبوعہ قطعات ہیں - موجودہ عمارت میں یہ کتب خانہ ۱۸۵۴ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان منتقل ہوا - ان تمام باتوں کے باوجود آج کل سرکاری امداد اس قدر کم ہو گئی ہے کہ انتظامی معاملات کے بعد نئی کتابوں کی خریداری کے لئے مشکل سے کافی ہوتی ہے -

روس

روس کے بڑے اور دلچسپ کتب خانوں میں شہر لینن گراڈ کا مشہور قومی کتب خانہ ہے - جو پہلے امپیریل لائبریری کے نام سے موسوم تھا - اس کی ابتدا پولینڈ کے دو مخیر اور ہمدرد علم امیروں کے ہاتھوں ہوئی جو زالسکی برادران کے نام سے مشہور ہیں - اول اول یہ کتب خانہ شہر وارسا میں تھا - جب ۱۷۹۴ء میں پولینڈ فتح ہؤا تو یہ کتب خانہ سینٹ پیٹرسبرگ میں منتقل کر دیا گیا - انیسویں صدی میں اس کو کافی ترقی دی گئی اور بہت سے بیش بہا قلمی نسخے اس کے لئے حاصل کئے گئے - ملکہ کیتھرائن دوئم نے والٹیر اور ڈیڈرو (فرانس کے دو بہت مشہور اہل قلم) کی کتابوں اور قلمی نسخوں کو خرید کر جو ذخیرہ کتب خانہ ہرمیٹیج کے نام سے قائم کیا تھا وہ بھی اسی میں ملا دیا گیا - حال میں جتنی ترقی اس کتب خانہ نے کی ہے اتنی ترقی شاید ہی کسی کتب خانہ کو نصیب ہوئی ہو - جنگ سے تھوڑے دنوں قبل جب کتابوں وغیرہ کا شمار ہؤا تو معلوم ہؤا کہ اس میں تمام چھوٹی بڑی مطبوعات کو ملا کر اڑتالیس لاکھ تنیس ہزار جلدیں ہیں اور تین لاکھ اکتیس ہزار قلمی نسخے ہیں - موجودہ سوویٹ حکومت کے دور میں اس کو ایک بڑی رقم سرکاری امداد کے طور پر ملتی ہے اور روس میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں - اُن کی ایک نقل اس کے پاس قانوناً پہنچتی ہے - ساتھ ہی اس کی کتابوں کی آمد و رفت پر ڈاک کا محصول بالکل معاف ہے - کتب خانہ کا انتظام ایک مجلس کے ذمہ ہے جس میں سرکاری اور غیر سرکاری جماعتوں کے نمائندے شامل ہیں لیکن اس کے اندرونی انتظام میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا - جو انتظام زار کی حکومت میں تھا وہی اب بھی ہے - فہرست ترتیب

کرنے اور بعض نادر قلمی نسخوں کی نقل لینے کا کام بڑی دلسوزی اور جانفشانی سے ہوتا ہے۔

امریکہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ کو امرا اور سلاطین اور مذہبی انجمنوں کے کتب خانوں سے کتابیں جمع کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا جیسا کہ یورپ کے لوگوں کو ملا۔ انیسویں صدی کے وسط تک یونیورسٹیوں کی چہار دیواریوں کے باہر لوگ عام طور پر کتب خانوں سے کم دلچسپی لیتے تھے لیکن اس کے بعد کتب خانوں کی ترقی میں امریکہ نے اس سرعت کے ساتھ قدم بڑھایا کہ ہر شخص آج انگشت بدنداں ہے۔ خیال تو کیجیئے کہ جہاں ساٹھ ستر سال قبل کہیں کتبخانوں کا چرچا نہ تھا آج وہاں متعدد کتب خانے ہیں جن میں دس دس لاکھ سے زائد جلدیں موجود ہیں۔ واشنگٹن میں کانگرس کا جو کتب خانہ ہے اس میں بشمول ذخیرہ المتفوتین اکتالیس لاکھ کتابیں دس لاکھ سے زائد نقشہ جات، اور دس لاکھ سے قریب قلمی نسخے موجود ہیں۔ عمارت ایسی شاندار ہے کہ دوسرے ملکوں کے عمدہ سے عمدہ کتب خانے اس پر رشک کریں۔ قانون تحفظِ کتب کی رو سے ہر مطبوعہ کتاب کے دو نسخوں کا اس کتب خانہ میں جانا ضروری ہے۔ کانگرس ہر سال ایک کثیر رقم اس کی امداد کے لئے منظور کرتی ہے۔ عام طور سے کانگرس سالانہ چار لاکھ ستر ہزار کی رقم منظور کرتی ہے۔ مگر ۳۱-۱۹۳۰ء میں چونکہ ضروریات وافر تھیں اس لئے ساڑھے سات لاکھ پونڈ کے قریب منظوری ہوئی

واشنگٹن کا دوسرا مشہور کتب خانہ کتب خانۂ سرجن جنرل کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً یہ کتب خانہ دنیا کے تمام طبی کتب خانوں سے بڑا ہے۔ علمِ طب پر اس میں ساڑھے سات لاکھ کتابیں ہیں۔

جرمنی

جرمنی کا مشہور کتب خانہ پرشین اسٹیٹ لائبریری ہے جو برلن میں واقع ہے۔ فریڈرک ولیم نے اس کو ۱۶۵۹ء میں قائم کیا اور ۱۶۶۱ء میں اس کو رفاہِ عام کے لئے کھول دیا۔ ۱۶۹۹ء میں اس کو ملک کی تمام مطبوعات کی ایک ایک نقل حاصل کرنے کا حق مل گیا۔ آج کل اس میں تیس لاکھ مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں مطبوعات قدیمہ کا ایک کافی ذخیرہ ہے ساتھ ہی ہزار کے قریب قلمی نسخہ جات ہیں۔ اس کتب خانہ نے اپنے ذمہ سب سے اہم کام جو لیا ہے وہ تمام قدیم مطبوعات معلومہ کی فہرست کا مرتب کرنا ہے۔ اب تک صرف چار جلدیں شائع ہوئی ہیں مگر حروفِ تہجی کے دو ہی حرف تمام ہوئے ہیں۔ بہ لحاظِ شہرت و اہمیت جرمنی کے اور کتب خانوں میں بویریا کا مشہور کتب خانہ ممتاز ہے۔ یہ شہر میونخ میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد البرکیٹ پنجم ڈیوک آف بویریا نے سولہویں صدی میں ڈالی۔ اس میں قدیم مطبوعات

کا ذخیرہ زیادہ ہے جن کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچتی ہے مطبوعہ کتابیں سولہ لاکھ ستر ہزار اور قلمی نسخے پچاس ہزار ہیں۔

اطالیہ

اطالیہ خاص طور پر قدیم کتب خانوں کے لئے مشہور ہے مثلاً فلارنس کے کتب خانہ لارنشین کو بہت شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتب خانہ کوسیمو۔ پائٹرو دی میڈیسی اور لورینزو کے مجموعہ جات سے بنا ہے۔ شہر وینس میں سینٹ مارک کا کتب خانہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ پیٹرارک نے ۱۳۶۲ء میں اپنے کل قلمی نسخے اس کے حوالہ کر دیئے اور ۱۴۶۸ء میں بشاریں نے اس کو رفاہ عام کے لئے کھولا۔ شہر میلانو میں کتب خانہ امبروزین ہے جس کی بنیاد بورومیو نے ڈالی۔ اس کے علاوہ یہ کتب خانے خاص طور پر اہم ہیں: شہر نیپلز کا قومی کتب خانہ جو ۱۷۳۴ء میں قائم ہوا۔ فلارنس کا مرکزی قومی کتب خانہ جو روما کے کتب خانے وکٹر امینوئل کے بعد سب سے بڑا ہے اور آخر میں کتب خانہ وکٹر امینوئل واقع روما جو موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اطالیہ میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتب خانہ ہے۔ لیکن اطالیہ کے تمام کتب خانے پوپ (وٹیکن) کے کتب خانہ کے سامنے ہیچ ہیں۔ یہ کتب خانہ یورپ میں سب سے زیادہ قدیم ہے اور پوپ کی ذاتی ملکیت ہے۔ پوپ نکولس نے اس کو ۱۴۴۷ء میں قائم کیا اور اپنی زندگی میں نو ہزار قلمی نسخوں کا اضافہ کیا۔ پوپ لیو دھم۔ پائیس چہارم۔ پائیس پنجم وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ کرتے رہے سکٹس پنجم نے ۱۵۸۸ء میں موجودہ عمارت تعمیر کی اور ۱۶۵۸ء میں اربینو کا مشہور کتب خانہ اس کے لئے حاصل کیا گیا۔ سویڈن کی ملکہ کرسچینا نے قلمی نسخوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ اس کی نذر کیا ۱۷۴۶ء میں آٹوبونی کا مشہور ذخیرہ اس میں شامل کیا گیا جس میں ۳۸۶۲ کتابیں جرمن اور لاطینی زبان میں تھیں۔ اگر صرف جلدوں کا شمار کیا جائے تو یہ کتب خانہ بہتیرے کتب خانوں سے بازی لے جائیگا۔

اس میں چار لاکھ مطبوعہ کتابیں مع سات ہزار قدیم مطبوعات کے ہیں اور ساتھ ہی ترپن ہزار قلمی نسخے بھی ہیں جو نہایت بیش قیمت اور بے مثل ہیں۔ صرف کوڈکس وٹیکینس جو یونانی زبان میں انجیل کا قدیم ترین نسخہ ہے اور جس کی تاریخ چوتھی صدی مسیحی ہے۔ اس کتب خانہ کی شہرت کو چار چاند لگانے کے لئے بہت کافی ہے۔

اس کتب خانہ کی اب تک کوئی مکمل فہرست مرتب نہیں ہوئی لیکن ۱۹۲۷ء سے چار اطالوی اور چار امریکی منتظمین کتب خانجات نے اس کی تدوین اور ترتیب کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اس کے علاوہ امریکہ کے مشہور "وقف کارنیگی" میں سے اس کی مالی اعانت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(ماخوذ) "قرہ خاں"

شباب

قدر و قیمت فصلِ تیّارِ شباب — حسن و صحت نقدِ دستارِ شباب
عزم و ہمّت خادمِ کارِ شباب — تاب و طاقت کفش بردارِ شباب

جرأتِ بے خوف و عزمِ استوار — بندۂ بے دامِ سرکارِ شباب
تابِ سعی و تابِ کوشش تابِ کار — خادمِ خدّامِ دربارِ شباب

زہد و تقوے کو جواں کیا منہ لگائیں — زہد و تقوے باعثِ عارِ شباب
رندی و مستی سے کیوں دامن بچائیں — رندی و مستی سزاوارِ شباب

پرسشِ اعمال بے جا ناروا — عفو کے قابل گنہگارِ شباب
باوجودِ علم اقدامِ خطا — داد کے لائق خطا کارِ شباب

عالمِ حسنِ حسینانِ جہاں — پرتوِ دنیائے انوارِ شباب
جلوۂ روئے مہ جبینِ مہوشاں — عکسِ روئے مہر آثارِ شباب

جلوہ ہائے مہر سے بھی دل پذیر — جلوہ ہائے ماہِ رخسارِ شباب
پیچ ہائے بخت سے بھی سخت گیر — پیچ ہائے زلفِ خمدارِ شباب

ہر سخن نغماتِ ساماں کیوں نہ ہو — نغمہ زا گفتارِ شباب
ہر قدم محشر بداماں کیوں نہ ہو — فتنہ زا رفتارِ شباب

کامگارِ سیرِ باغِ خلد ہے — کامگارِ سیرِ گلزارِ شباب
میگسارِ صد ایاغِ خلد ہے — میگسارِ کیف دیدارِ شباب

واقعی گل پر بھی جوبن ہے، مگر — گل سے جوبن ہیں سوا عارِ شباب
در حقیقت دن بھی روشن ہے۔ مگر — دن سے بھی روشن شبِ تارِ شباب

بادشہ ہو یا گدا ہو۔ کوئی ہو۔ — جس کو دیکھو وہ طلبگارِ شباب
رند ہو یا پارسا ہو۔ کوئی ہو — جس کو پوچھو وہ پرستارِ شباب

مستِ صہبائے تمنّا کر دیا — اے جزاک اللہ! سرشارِ شباب
زندگی میں کیف پیدا کر دیا — اے رحماک اللہ! میخوارِ شباب

حضرتِ آزاد! اک دن ہم بھی تھے — فائزِ خدماتِ سرکارِ شباب
لیکن اب کیا کیا ہیں۔ کوئی کیا کہے
راندہ و مقہورِ دربارِ شباب

حکیم آزاد انصاری

تعمیر گناہ

"آہ تم کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری روح گناہ کے بوجھ سے دب رہی ہے!"

"مجھے اپنی داستان سناؤ بیٹا"

"میں تمہیں کیا سناؤں اماں؟"

"تم تین سال سے بیمار پڑے ہو، تین بہاریں ایک ختم نہ ہونے والے کارواں کی طرح گزر گئی ہیں، لوگ تمہارے مکان کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہیں اور تمہیں دیکھتے ہیں، تین مرتبہ شاہ دانے پک کر تیار ہوئے لیکن تم نے انہیں توڑنے اور کھانے کو اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا، کیا خدا کی دنیا تمہیں اب پیاری نہیں لگتی؟ کیا تمہارے دل میں یہ شوق نہیں ہے کہ تم سورج کی روشنی میں باہر نکلو، اور درختوں، گیہوں کے کھیتوں اور عظیم الشان پل کو دیکھو؟ کیا تمہارے دل میں یہ تمنا نہیں کہ تم نوعمر لڑکیوں سے ملو؟ تین بہاریں گزر گئیں ——— پھر بھی تم اپنے بستر سے نہیں اٹھے!"

"میں نے دنیا کو چھوڑ نہیں دیا، لیکن اب میرے دل میں اس کی کوئی آرزو بھی نہیں"

"تم مرد ہو، تمہارے دل میں ایک مرد کی امنگیں ہونی چاہئیں، تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

شمع نے بیمار آدمی کے چہرے کو روشن کر دیا، اس کی بوڑھی ماں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس سے کیونکر اس کا حال پوچھے، ایک آنسو مریض کے رخسار پر آگرا، باہر چاندنی رات میں سڑکوں پر پڑی ہوئی برف چمک رہی تھی، سڑک کی دونوں طرف درخت سرگوشیوں میں محو دعا تھے، مکان کی چمنی گھنی شاخوں میں سے باہر نکل کر ادھر ادھر جھانک رہی تھی، گویا وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ واقعی ساری دنیا خواب گراں میں محو ہے یا نہیں۔

بلی کا سفید بچہ ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف دیکھنے لگا

"کیا تمہیں یاد ہے اماں؟"

"کیا؟"

"وہ دن جب لوگوں نے دریائے روزیٹا پر پل بنانا شروع کیا، اُس دن ملکا نے میرے لئے سرخ حاشیہ والی سفید قمیص سی تھی"

"یہ تو ابھی کل کی بات ہے اُس موسم بہار میں تم بائیس سال کے ہوئے تھے،

"سب لوگ یہ کہہ کر مجھ پر ہنستے تھے کہ میں دریائے روزیٹا پر پتھر کا پل بنانے میں ہرگز کامیاب نہ ہوںگا لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا کرسکتا ہوں، میں اور ابا جان سات سال تک ملک کے مختلف حصوں میں عمارتیں تعمیر کرتے رہے تھے، اور میں فن تعمیر میں پختہ کار ہوگیا تھا، ابا جان مجھ پر از حد خوش تھے، ایک دن ہم دریا پر چنار کا ایک درخت کاٹنے گئے ۔ تمہیں یاد ہوگا اماں! ۔۔۔ اور ہم کنارے پر بیٹھ گئے، روزیٹا ہمارے پاس سے گنگناتا ہوا گذر رہا تھا، بید مجنوں کے درختوں نے اپنی شاخوں کو سر دیا نی پر جھکا رکھا تھا، ابا نے مجھ سے کہا، مینوکل سنو، میں یہ کام نہیں کرسکا لیکن تم ضرور کرنا یہی وہ جگہ ہے جہاں پل تعمیر ہوگا، اور اس طرح دو ملک ایک دوسرے سے ملحق ہوجائیں گے، دریا کے اُس پار لوگ گیہوں بوتے ہیں، تم انہیں ایک پل بنادو تاکہ وہ فصل کاٹ کر روپیہ کما سکیں۔

"چنار پر ایک پرندہ گا رہا تھا، میں نے ابا کی باتیں سُن کر کہا: کیا میں ہی وہ آدمی ہوں جو روزیٹا پر پل بنائے گا!"

"ہاں تم ہی ہو، اور یاد رکھو کہ یہی وہ مقام ہے جہاں چار محرابوں والا پل تعمیر ہونا چاہئے نھرلیس سے سنگتراش منگوالو، کسانوں سے مدد لو اور ایک عظیم الشان پل تعمیر کرو، لوگ قیامت تک تمہارا نام عزت سے لیں گے۔

"اس پرندے کے پر جو چنار پر بیٹھا گا رہا تھا، چاندی کے تھے، جن سے شبنم کے قطرے گر رہے تھے اگر ابا نہ بھی کہتے تب بھی میں پل ضرور بناتا، میں نے اس کا تصور کیا، اور میں نے دیکھا کہ دریا بل کھاتا، لہریں لیتا، وحشیانہ اور آزادانہ انداز سے نیلگوں پہاڑوں کی طرف جا رہا ہے، اس پر پل کھڑا ہے۔ اناج سے لدے ہوئے چھکڑے اس پر سے گزر رہے ہیں اور دیہات کی بھینسیں اپنے سروں کو اِدھر اُدھر جھٹکتی ہوئی چلی جارہی ہیں۔

"ابا جان نے کہا: پل کی تعمیر شروع کرتے وقت اُس کی بنیاد میں وہ چیز دفن کر دینا جو دنیا میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے؟"

"کون سی چیز ہے جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے؟"

"یہ تم خود جانتے ہو"

بیمار لڑکا چپ ہوگیا، چاندکی زرد شعاعیں کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی تھیں، رات ایک سکینہ لحاف میں

لیٹی ہوئی خواب راحت میں محو تھی۔ شاہ دانہ کے درختوں کے سائے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

لڑکے نے بستر سے ذرا اُٹھ کر کہا: "ابا انتقال کر گئے اور مجھے پل بنانے کے لئے پیچھے چھوڑ گئے۔ میں پل بنانا جانتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ کس کی قربانی کروں اور وہ کون سی عزیز شے ہے جسے میں پل کی بنیاد میں دفن کروں۔"

"موسم بہار آگیا، سارسوں نے اس کی آمد کا اعلان کر دیا۔ شہر سے سنگتراش بھی آگئے۔ انہوں نے پتھر کاٹنے اور تراشنے شروع کر دیئے۔ میں از حد خوفزدہ تھا تاہم مسرور تھا۔

"اماں کسی کی جان لینا کوئی آسان سی بات نہیں۔ میں کس طرح اس کی جرأت کر سکتا تھا؟ میں دیوانہ وار پھرتا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں حواس باختہ نہ ہو جاؤں ——— ایک رات میں ابا کی قبر پر گیا اور اس پر گر کر کہنے لگا: "خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ میں کسے قربان کروں؟"

"قبر خاموش تھی، کیا کبھی قبریں بھی بولتی ہیں؟

"میں گھر آیا اور سو گیا۔ میں نے خواب میں ابا کو دیکھا، گویا وہ زندہ ہیں۔ انہوں نے اونی لبادہ اور سرخ پیٹی پہن رکھی تھی، اُن کے ہاتھ میں ایک سفید باز تھا، وہ دریا کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے: "باز کو نیچے اترتے ہوئے دیکھتے رہو، یہ تمہیں بتا دے گا کہ تمہیں پل کے لئے کس کو قربان کرنا چاہیئے۔"

"باز نے اپنے پر پھیلا دیئے، اور آسمان کی طرف اڑنے لگا، اُس نے گاؤں کے گرد تین چکر کاٹے اور نیچے اترا، لیکن مجھے بالکل معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں اترا ہے، ابا جان نے میری طرف دیکھا، اپنا سر ہلایا، اور کنارے سے ہٹ آئے، معاً میرا پل میری آنکھوں کے سامنے آگیا، ابا جان نے اُسے عبور کیا اور پار جا کر ٹھہر گئے۔ پل کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا اور اپنا ہاتھ ہلا کر کہا: "الوداع!"

"میں جاگ پڑا، اور دیکھا کہ تم میرے بستر کے قریب کھڑی ہو اماں، تم نے مجھ سے کہا: "اٹھو مینول صبح ہو گئی ہے۔ بڑی دیر سے چھکڑے گزر رہے ہیں، اور سنگتراشوں نے کام شروع کر دیا ہے اُٹھو۔"

"میں پل کی طرف جانے کے بجائے گاؤں کی طرف چل دیا، مجھے ملکا سے ملنے، باتیں کرنے اور دلی اطمینان حاصل کرنے کی امید تھی جب میں اس کے مکان پر پہنچا تو مجھے از حد صدمہ ہوا، کیونکہ وہاں اخروٹ کے درخت پر ایک سفید باز بیٹھا تھا، یہ وہی باز تھا جو ابا نے چھوڑا تھا، میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی، میرے کان خون کی تیز حرکت کے باعث بہرے ہو گئے۔ میں ابا کی قبر کی طرف دوڑا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے ملکا جیسی حسین لڑکی

سے کیونکر محروم رکھ سکتے ہیں، وہ جو میرے والدین؟ میں چل دیا گو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مُردوں سے سوال نہیں کیا کرتے،

"پل پر معمار کام کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ گاتے جاتے تھے، دریا اُن کی آواز کو دُور تک پہنچاتا تھا، انہیں کسی قسم کا غم نہ تھا، وہ اس قابل تھے کہ کام کرتے وقت گاتے جائیں، وہ اپنے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں سے پتھر لگا رہے تھے اور اپنے گیتوں کو بھی پتھروں کے ساتھ ساتھ پل کی عمارت میں چنتے جاتے تھے، وہ خوش قسمت انسان تھے!

"کس کو پل کی بنیاد میں دفن کروں؟"

"میں ابّا کی قبر پر بیٹھ گیا، اور ملکا کے مکان میں اخروٹ کا جو درخت تھا اُس کی طرف نگاہ ڈالی، آسمان پر ایک سفید بادل حرکت کرنے لگا، یہ کسی فرشتہ کی روح تھی جو صبح کے نور میں غسل کر رہی تھی، اُس شام میں ملکا سے ملا لیکن میری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔

"میں قبر پر جھک گیا، کانپتا ہوا ـــــ روتا ہوا ـــــ

"سڑک پر میں نے گرد و غبار کا ایک بادل اٹھتا دیکھا، پھر گھنٹیوں کی آواز اور بلند چیخیں سنیں، اناج سے بھرے ہوئے چھکڑے ایک قطار میں گزر رہے تھے، ایک چھکڑے پر وہی پرندہ بیٹھا تھا، جسے میں نے چنار کے درخت پر گاتے سنا تھا، لوگ دریا پر پہنچ کر رک گئے اور انتظار کرنے لگے، وہ کس بات کا انتظار کر رہے تھے؟ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا، مجھے کوئی شخص نظر نہ آیا، معمار اپنے کام میں مشغول تھے اور بدستور گا رہے تھے۔

"میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ یہ ضرور ہو کر رہے گا۔

"شام کو میری پیاری ملکا کنوئیں پر پانی بھرنے آئی، جب وہ جھکی ـــــ آہ صرف چاند نے مجھے ایسا کرتے دیکھا۔"

اتنا کہہ کر بیمار آدمی رک گیا، باہر شاخوں میں ایک پرندہ پھڑ پھڑایا، بلی کا بچہ ایک جست میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا، بیمار آدمی پرندے کی آواز سن رہا تھا، یہ وہی پرندہ تھا جس نے اپنا گیت چنار کے درخت پر گایا تھا، یہ کئی راتوں سے گانے آتا تھا، آج پھر آیا تھا، وہ شاہ دانے کے درخت کے پتوں میں محفوظ بیٹھا تھا، بلی کا بچہ کھڑکی کے ساتھ لگا منتظر تھا، مینول کی ماں بستر کے قریب بیٹھی تھی، اور شش و پنج میں تھی کہ کہ آیا اُس کا بیٹا واقعی سچ کہہ رہا ہے۔

وہ کہنے لگی: "لعنت ہو اس پل پر! کاش پانی اُسے بہالے جائے"!
"اس پر لعنت کیوں بھیجتی ہو اماں، میں نے ہی فیصلہ کیا، پل بنایا اور میں نے ہی ملکا کو اس پر قربان کر دیا،
لعنت مجھ پر بھیجو"!
بینول کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ کہنے لگا: "اماں کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جس دن پل کی تعمیر ختم ہوئی؟
آہ کس قدر پُر جوش اجتماع تھا! نو دیہات کے باشندے پل کے افتتاح پر جمع تھے، کئی نوجوان اس دن کو عمر بھر یاد
رکھیں گے۔ کیا تمہیں ان دو پہاڑی گڈریوں کی بین یاد ہے؟ اُن میں سے ایک ہمارے ہاں اکثر آیا کرتا تھا اس
نے بہن کوتا سے شادی کی درخواست کی تھی، لیکن تم نے منظور نہ کی، کیونکہ تم ایک اجنبی سے کوتا کی شادی مناسب
نہ سمجھتی تھیں، معمر لوگ پل پر جمع ہوئے، انہوں نے اس پر اپنی لاٹھیاں ماریں، اس کے مربع پتھروں کو چھوا، اور
کہا: "خدا نے مینول کو پل بنانے کی طاقت دی"! لیکن یہ طاقت مجھے کس طرح نصیب ہوئی آہ یہ میں ہی جانتا تھا اماں،
"سب لوگوں نے خوشی منائی، انہوں نے شوخ رنگ صراحیوں میں ایک دوسرے کا جام صحت پیا،
لیکن میں خاموش تھا، مغموم تھا اور کسی کا جام صحت نہ پی سکتا تھا، جب بین کے سُر فضا میں بلند ہوئے، تو
ہر چھوٹا بڑا اٹھ کھڑا ہو گیا، اور ایک، دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے لگا، کسی شخص نے کہا: بینول کہاں ہے!
وہ کیوں ہمارے ساتھ رقص میں شریک نہیں ہوتا"؟
"معاً موسیقی بند ہو گئی، لوگ خاموش ہو گئے، اور چلے گئے، اور میں پلٹا۔ اماں۔ او خدا۔ میں نے ایک
نعش دیکھی، تمہیں معلوم ہے انہوں نے کس کی نعش اٹھائی؟
"میں اُن کے پیچھے قبرستان کو گیا۔ اُس کی قبر پر مٹی ڈالی، اور دعا مانگی۔ کہ خدا اس کی روح کو تسکین دے!
"جب میں لوٹا تو رقص پھر شروع ہو گیا تھا، میں نے شراب کی ایک صراحی لی اور پوری چڑھا گیا، یہاں
تک کہ میں مدہوش ہو گیا، ہم نصف شب تک رقص کرتے رہے، ایک طرف میدان میں دعوت کے لئے نو
بھیڑیں ابالی جا رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان پہلے سے وسیع ہو گیا ہے، ابابیلیں گیہوں کے کھیتوں پر
کلیلیں کر رہی تھیں۔ زمین اُن لوگوں کی آرزومند تھی۔ جو گاتے ہوئے آئیں اور ہل چلانے لگیں۔
"آگ روشن کی گئی۔ دوشیزہ لڑکیوں کی آنکھیں شعلوں کی مانند دہکنے لگیں۔ لیکن آہ میرا دل شکستہ تھا،
میں نے خیال کیا، کہ ملکا کو بھلا دوں، اس کا خیال دل سے نکال دوں، دنیا میں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ آہ میں
مدہوش تھا، خدا مجھے معاف کرے!

"نصف شب کے بعد جب مرغ نے اذان دی - تو تمام لوگ لڑکھڑاتے ہوئے گھروں کو سدھارے میں ان کے ساتھ جانے کی بجائے ایک پتھر پر بیٹھ گیا - میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا - ناگہاں میں نے ایک آواز سُنی -

"مے ــــ نو ــــ ل ــــ

"میں اس آواز کی سمت میں چلا، چاند کی زرد روشنی کھیتوں کو نور کے دریا میں نہلا رہی تھی، میں چلتا گیا - یہاں تک کہ میں گیہوں کے کھیتوں کے درمیان چھوٹی سی پہاڑی کے قریب ٹھیر گیا، ایک عریاں عورت میرے سامنے کھڑی تھی، اُس کے بال زمین کو چھوتے تھے -

" وہ بائیں طرف سے آئی تھی، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کہاں سے آئی تھی، کھیتوں میں سے گرگٹ کی آواز آرہی تھی، شائد میں ابھی تک مدہوش تھا، میں کچھ نہیں کہہ سکتا،

"میں اُس عورت پر سے آنکھیں نہ ہٹا سکا، جس نے مجھے بلایا تھا - اور جو میری منتظر تھی -

"مے ــــ نو ــــ ل ــــ

"گاؤں میں کتے چاند کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگے، میں بے اختیار کانپتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوگیا، گیہوں کا کھیت بھی میرے ساتھ کانپا، یہ عورت کون تھی؟ میں نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟ کیسی روح میں اُتر جانیوالی سیاہ آنکھیں تھیں! آہ اماں اُن دلکش آنکھوں سے میں آشنا تھا!

"اُن آنکھوں نے مجھے مسحور کر لیا - اس سفید اور حسین جسم نے میری طرف حرکت کی - میں نے آجتک کسی عُریاں عورت کو نہ دیکھا تھا، اس کے بال نسیم صبح کے مست جھونکوں سے لہرانے لگے، اُس کی آنکھوں نے میرے سینہ میں آگ لگا دی، ایکاایکی کھیت سیاہ ہوگئے، اور اُس نے اپنے عُریاں بازو میری طرف بڑھا دیئے اور کہا: "میں مدت سے تمہاری منتظر ہوں"

"جب اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، میں نے فوراً پہچان لیا، کہ یہ ملکا ہے - مجھ پر خوف طاری ہوگیا، اور میں کھیتوں میں بھاگ نکلا،

"یکایک آواز آئی: "تم مجھ سے کیوں ڈرتے ہو میتول؟ آج رات ہماری منگنی ہوئی ہے! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمام دیہات کے لوگ ہمیں مبارکباد دینے آئے تھے؟

"میں نے اس کے سیاہ ملائم بالوں کے لمس کو محسوس کیا، انہوں نے مجھے اپنی ریشمیں شکنوں میں لپیٹ

لیا، اور میرا گلا دبا دیا۔"

کمرے کی شمع ٹمٹمائی اور بجھ گئی، چاند شاہ دانے کے درخت کے پیچھے چھپ گیا، بڑھیا نے اپنا ہاتھ بیمار بیٹے کی پیشانی پر رکھ دیا اور رونے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا، "اماں ہفتے کو جب تم قبرستان جاؤ تو اس کی قبر پر ضرور ٹھیرنا ——— جب سب چلے جائیں ——— اور اُسے بتانا کہ تین سال سے دریا میرے پل کے پتھروں کو لگاتار دھو رہا ہے، اُس سے پوچھنا، کہ ابھی تک اُس نے میرے گناہ دھوئے ہیں یا نہیں؟ اماں اس سے ضرور پوچھنا ——— وہ تمہیں ضرور بتا دے گی، کہ اُس نے میرے گناہوں کو ابھی تک فراموش کیا ہے یا نہیں۔"

سراج الدین احمد نظامی

درسِ زندگی

میری پیاری لڑکی مت رو، میں جانتا ہوں کہ تیری سہیلیوں نے تیری ننھی سی گڑیا توڑ ڈالی ہے، اور تیرا نیلے رنگ کا خوشنما مٹی کا شہزادہ اور تیری گڑیا کا گھر بھی توڑ پھوڑ دیا ہے یہ تمام چیزیں گذرے ہوئے ایام سعادت کی یادگاریں ہیں لیکن بچپن کے غم بہت جلد مٹ جائیں گے۔

اس لئے، اے میری پیاری بچّی، مت رو!

اے پیاری لڑکی! مت رو، مجھے معلوم ہے کہ تیری ہمجولیوں نے تیری ننھی منی سی سلیٹ توڑ ڈالی ہے، ——— اور تیرے مکتب کے دنوں کی یہ چند خوشیاں ایک بھولے بسرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں، ——— لیکن ذرا صبر کر، جلد ہی ایک حیاتِ تازہ تیری اِن معصومانہ رنجشوں کو مٹا دے گی،

اس لئے، اے میری پیاری بچّی مت رو!!

اے میری پیاری لڑکی! مت رو، آہ، یہ میں جانتا ہوں کہ تیری ہم عمر لڑکیوں نے تیرا ننھا سا دل توڑ ڈالا ہے ——— لیکن غم نہ کر، تیری یہ تمام کھوئی ہوئی چیزیں خدا کے خزانہ میں محفوظ ہیں!!!

اس لئے، اے میری بچی، مت رو!

(ترجمہ)

عظیم قریشی

دو دن

جہاں میں زیست کو اے دل قرار ہے دو دن
یہ پھول وہ ہے کہ جس کی بہار ہے دو دن

چہک رہے گی نہ طائر کی پھر نہ گل کی مہک
رواں چمن کا ترے آبشار ہے دو دن

چمک لے ایک ستارے کی طرح رات کی رات
اس انجمن میں ترا بھی شمار ہے دو دن

اتار دے گی یہ نشہ بھی موت کی ترشی
خودی کا اپنی بشر کو خمار ہے دو دن

یہ زیست جبر سہی صبر کر مگر اور شکر
کہ جبر میں بھی تجھے اختیار ہے دو دن

وفا نہیں ہے خوشی میں نہ ہو غنیمت ہے
کہ زندگی سے خوشی ہمکنار ہے دو دن

یہ امتیاز کہاں تک یہ لطف و غم کب تک
پیادہ پا کوئی کوئی سوار ہے دو دن

خوشی کا غم کا بھی حصہ ہے زندگانی میں
مگر اسے بھی اسے بھی قرار ہے دو دن

سمجھ کے زیست کو دو دن کی شے نہ ہو غمگیں
سمجھ کہ رحمت پروردگار ہے دو دن

بہار حسن کو دنیا میں دم کے دم ہے قرار
وہ چاندنی ہے یہ جس کا نکھار ہے دو دن

دوام عشق جو چاہے تو لو لگا حق سے
جو ہے بشر کو بشر سے وہ پیار ہے دو دن

یہ بیش و کم کی ہوس یہ زر و گہر کی خوشی
یہ اونچ نیچ سب اے میرے زار ہے دو دن

ب ل

تعزیت

ریاض کے والدِ بزرگوار نے انتقال فرماکر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاءاللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا۔ کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تُل جائے، تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے۔ لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانہ میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے۔ ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور رہتا ہے، کہ خداوند کریم اور دیگا، لیکن سوال تو یہ ہے، کہ ریاض بیچارے اپنے لئے والد کا انتظام کس طرح کرتے، اُن کو تو یہی غم تھا، کہ قیامت تک بھی اگر زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا، ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے، اس لئے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں اس دنیا سے کوچ کر چکی تھیں، اور ان کو اُن ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بنکر پالا تھا، لہٰذا اُن کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی، جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن سے جدا کر دیا تھا،

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود اُن کے لئے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا، لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے، اس لئے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لئے جانا تھا۔ اُن سے اظہار ہمدردی کرنا تھا، جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ، لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا، زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی، اور وقت اتنا تھا نہیں، کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہمکو اتنا اطمینان تو تھا ہی، کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لئے آ چکے تھے۔ اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی، تو صرف اس لئے کہ خود ہم نے بنفسِ نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جانا اور تعزیت

کرنا تقریبًا ناگزیر تھا - لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لیکر اپنے ارادہ کو پختہ کرلیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے - ذہن پر زور دیکر یکجا کرنا شروع کردیئے :-

مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ——— صبر کیجئے ——— جس کی چیز تھی اس نے لے لی ——— دنیا کا یہی دستور ہے ——— مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے ——— کیا علیل ہوئے تھے؟ ——— ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے ——— آج وہ کل ہماری باری ہے ——— خدا بخشے عجیب انسان تھے ——— دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے ——— کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے؟ ——— ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد ——— مگر صبر کیجئے اب رونے سے کیا ہوتا ہے ——— ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے ——— دنیا سرائے فانی ہے ——— کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش ——— کبھی نماز قضا نہیں کی ——— خدا نعم البدل دیگا ——— اپنے دل کو سنبھالیئے ——— صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ——— حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ——— بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ——— ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن ——— الٰہی عاقبت محمود گردان ——— چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں،

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کرنہ لے اس کے لئے مشکل بنا رہتا ہے - بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا - لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کرلیا - اور ان کی مشق کرنے کے بعد جب ہم "اکسپرٹ" ہوگئے، تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لئے جا رہے ہیں - تمام راستہ تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہوگئی :-

مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی - واللہ دل کو یقین نہیں آتا، عجیب سانحہ ہے عجیب حادثہ ہے، خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجئے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا، حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے، جس کی چیز تھی اُس نے لے لی، ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، روحیں آزاد نہ ہوں جسم جو برباد نہ ہوں، ابھی تو نہ تھے اُن کے مرنے کے دن، مریں گے تو سانچہ میں ڈھل جائیں گے، وہ تو جنت کا ایک پھول تھے، حوروں کی گود میں ہوں گے،

نمازی، پرہیز گار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے، لائق، پڑھے لکھے، فخرِ خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے، خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے، مجھ کو اطلاع ہوتی تو شائد کچھ کام آتا، مٹی دینے میں شرکت کرتا، نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا، مگر افسوس کہ، آج وہ کل ہماری باری ہے، چلیئے اب دونوں وقت ملتے ہیں، السّلام علیکم،

ریاض کے دروازہ پر پہونچ کر ارادہ ہوا کہ "خدا لے جائیے" کی آوازدیں لیکن یاد آ گیا کہ موقع غم کا ہے، فوراً اپنا چہرہ اُداس بنالیا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا، "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا، اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا، جہاں ایک کمرہ میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا السّلام علیکم، انہوں نے اس کے جواب میں" والے ـ کم ـ اُس ـ سا ـ لام" کہکر زار و قطار رونا شروع کر دیا، ہمارا بھی دل بھر آیا، لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا، ہم تعزیت کے لئے آئے تھے، للہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی، ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دُہرانا شروع کی، لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا، کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے، لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی، اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگ جاتے تھے، جب اسی میں بڑی دیر ہوگئی، تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے، کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں، مجبوراً ہم نے طے کیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیئے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا، لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں؟ کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، للہٰذا یہی سوچ رہے تھے، کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا، للہٰذا اس پر غور کرنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوا، اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کُل پر آ کر آدھ گھنٹہ کے قریب ہوتا تھا ہم نے کہا، لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم تعزیت کے لئے آئے ہیں اور آدھ گھنٹہ سے بُت بنے بیٹھے ہیں، للہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سر نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"آپ کے والد"------------ پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آ گیا تو عرض کیا:۔

"آپ کے والد"------------ ہم کو خود یاد نہیں رہا، کہ ہمکو کیا یاد آیا تھا، مگر ٹھیک ہے، وہ بات یہ تھی کہ:۔

"آپ کے والد" آپ کے والد ـــــــ آپ کے والد ـــــــ "خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے دماغ میں جیسے کمبخت گوبر بھرا تھا آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا:-

"آپ کے والد ـــــــ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا" ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہوگیا لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیئے لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا:-

"آپ کے والد کا انتقال ہوگیا، آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز قضا نہیں ہوئی، زندگی بھر روزے رکھتے رہے، آپ کے والد مرحوم مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے تھے، صبر کیجیئے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ـــــــ آپ کے والد ـــــــ آپ کے والد تھے ـــــــ جس پہ گذری ہو یہ وہی جانے۔ مگر اب نہ روئیے ـــــــ جانے بھی دیجئے ـــــــ ہٹائیے بھی اس قصہ کو ـــــــ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ـــــــ"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی وہ روتے روتے خاموش ہوگیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہے، بہت سے بیچارے اس ارمان ہی میں مرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے ـــــــ"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرہ پر جمادیں میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا:-

"اب وہ واپس تو آ نہیں سکتے، مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے، ہمکو بھی ایک دن اسی طرح تصویر رکھنا ـــــــ یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے، خدا بخشے عجب انسان تھے، دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے، مجھ کو تو کل خبر ہوئی، آج وہ کل ہماری باری ہے، ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرضِ محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہوجاتی، نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی،

ریاض نے مُنحنی آواز میں جواب دیا "جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی"

میں "خیر یہ بھی اچھا ہؤا اور خدا اب آپ کو ضرور صبر دیگا۔ اور قبر کا کیا انتظام کیا؟"

ریاض "عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب سی جگہ لے لی تھی۔"

میں "ہاں واقعی اور تم بیچارے کیا کرتے تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے، دنیا سرائے فانی ہے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، اور بیماری کیا تھی"

ریاض "ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔"

میں "ہاں صاحب بڑی مہلک بیماری ہے خدا سب کو محفوظ رکھے ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہؤا کمبخت اب تو عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی؟"

ریاض "ایک تو میں ہی ہوں ——"

میں (جلدی سے)، "تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شائد اور بھی ہوں ارے ہاں کیا تعجب ہے"

ریاض "جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔"

میں "وہی مطلب ہے میرا، اور اُن کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟"

ریاض "جی ہاں میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔"

میں "اُن کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہؤا مگر مشیتِ ایزدی میں کیا چارۂ صبر کیجئے اور آپ کے والد کی ماشاءاللہ کیا عمر تھی؟"

ریاض "سو سے کوئی پانچ چھ سال اُوپر تھے۔"

میں "افسوس صد افسوس۔ ع حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا گویا میں دُنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے۔ مگر میں نے مؤثر انداز میں کہا:۔

"خدا گواہ ہے۔ کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔"

ریاض "جی ہاں اُن کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔"

میں :۔ ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے، ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی۔ ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن، خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟"

ریاض۔ "جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے"۔

میں ۔" گھبرائیے نہیں جس خدا نے ان کو اُٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا، دنیا سرائے فانی ہے، عجیب ذات شریف تھے مرحوم، کبھی نماز قضا نہیں خود اُن ہی کی قضا آگئی۔ ع۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ دنیا کا یہی دستور ہے دنیا سرائے فانی ہے ایک آتا ہے ایک جاتا! اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟"

ریاض ۔" جی ابھی تو نہیں ہوئی"۔

میں۔ (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اِس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ"۔

ریاض :۔ اس کا یہ کونسا موقع ہے بھلا؟"

میں ۔" تو اب اور کونسا موقع آئے گا؟"

ریاض ۔" اب خوش ہونے والا کون ہے جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی"۔

میں :۔ ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیئے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ جس کی چیز تھی اُس نے لے لی مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ ع۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ۔ ع۔ سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔ اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بیچارے آخر کیا بیمار تھے ہی نا کہ بس قضا آگئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ وہ مر جائیں گے؟ مگر خدا کی مصلحت، اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے اب تم کو کون اس طرح چاہیگا۔ تمہارا محبت کرنے والا اُٹھ گیا تم یتیم ہو گئے تم پر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ ع۔ دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں تمام الفاظ ختم ہو چکے، کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں؟ لیکن اگر انہوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا؟ آخر کار

دل نے کہا بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر پھر دل نے دوسری بات بھی کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو لہٰذا ہم نے کہا:-

"بھائی رونے کے لئے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہوگے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیئے"۔

ریاض کی ہچکیاں، سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہوگئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی "اچھا بھائی اب اجازت دو" ریاض نے کہا "جائیے گا" ہم نے کہا "ہاں السلام علیکم"

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیئے تعزیت کے لئے روز چلا جایا کروں۔

شوکت تھانوی

(۱)

کیا سمجھتے ہیں راز بادہ پیمائی ہیں
لذت ہے خرابات کی ہوائی ہیں
سمجھیں ہوں تو ساغر میں خدا کو دیکھیں
زاہد نہ چھپے گوشۂ تنہائی ہیں

(۲)

ہم کیا کہیں نشے میں ہے لذت کتنی
لذت نہیں اس قدر ہے مستی جتنی
اے قطرۂ مے ابر کے بتا دے سر کی
ہے عالم ہستی کی حقیقت اتنی

شارق دہلوی

—— کے سرِ راہ مزاج پوچھنے پر

تجھے فکر کس لئے ہو مری جانِ ناتواں کی؟ — تجھے کیا خبر کسی کی تب و تابِ جاوداں کی؟

ترے واسطے کسی کا ہے فسانۂ الم کیا؟ — ترے بھولے بھالے دل کیلئے جور کیا ستم کیا؟

تجھے کیا خبر کہ کیا ہیں کسی دل جلے کی آہیں؟ — تجھے کیا خبر کہ کیا ہیں مری منتظر نگاہیں؟

تجھے اے بہارِ ہستی! ہے مسرتوں سے مطلب — تجھے حسرتوں سے مطلب؟ تجھے کلفتوں سے مطلب؟

ترے واسطے بنی ہے یہ ہری بھری جوانی — ترے واسطے ہے تاروں کا شباب غیر فانی

ہے بچھا زمیں پہ سبزہ ترے پاؤں چومنے کو — ہے ملی ہوا کو تیزی ترے گرد گھومنے کو

تری چشمِ نرگسیں میں کوئی سحر ہے فسوں ہے — کہ تری نگہ کی مستی مرے واسطے جنوں ہے

اگر آہ! دل نوازی بھی ترا شعار ہوتا — دلِ بے قرار اتنا تو نہ بے قرار ہوتا

یہ نہیں تو حال میرا سرِ راہ پوچھنا کیا! — میں سناؤں تجھ کو آخر غمِ دل کا ماجرا کیا!

"بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری؟

شب و تابِ ما شناسی؟ دلِ بے قرار داری؟"

ممتاز حسن

قفس سے رہائی

ژلینڈ کی طبیعت آج کچھ علیل سی تھی۔ لباس پہنتے ہوئے نقاہت اور اعضا شکنی کا احساس اُسے تکلیف دے رہا تھا۔ جس کا سبب شاید گرمی کی شدت تھی۔ کھانے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو انتہائی کمزوری اور بے دلی کے ساتھ مطالعہ خانے میں ایک کرسی پر گرا دیا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے باہر جانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی گیارہ بجے کے قریب عدالت کی کاوشوں کو گھر کی تنہائی اور بے کاری پر ترجیح دیتے ہوئے وہ اپنے ہم پیشہ مجسٹریٹوں میں مل بیٹھنے کے لئے گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

اس کی عمر پینتالیس برس کے قریب تھی اور سرسری نظر میں وہ ایک نہایت تندرست اور صحت ور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے کی چند پژمردہ لکیریں اُس کے اُن مغموم تفکرات کا اظہار کرتی تھیں۔ جو اب اس کی طبیعت کا جزو ہو چکے تھے۔ اور اس کی آواز سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی تھی۔ شہر کے لوگ اُس کی دولت، مختلف مجلسوں میں اُس کی شخصی دل کشی اور اس کی پُر امن خانگی زندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے نہایت قابلِ رشک ہستی سمجھتے تھے۔ لیکن ژلینڈ اپنے آپ کو اس سے بالکل مختلف روشنی میں دیکھا کرتا تھا۔ بالخصوص آج تو اُن آلام اور مایوسیوں کی وجہ سے جو گذشتہ کئی سال سے اُس کے دماغ پر بوجھ ڈال رہی تھیں۔ اُس کی روح غیر معمولی طور پر دبی جا رہی تھی۔

اپنی فراغ بالی اور مالی اطمینان کی بنا پر اس نے تئیس سال کی عمر میں شادی کر لی تھی اور آج تک اس کے ہاں چھ بچے پیدا ہوتے تھے۔ سب لڑکیاں تھیں۔ مگر اُن میں سے صرف تین بقیدِ حیات تھیں۔ سب سے چھوٹی کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس کی بیوی نہایت تنگ نظر اور مستقل ارادے کی عورت تھی اور اپنی غیر مآل اندیشانہ فطرت اور صنفِ نازک کی کسی نہایت خوش آیند ادا سے اپنے شوہر کی زندگی کے ہر شعبے میں دخل انداز ہوا کرتی تھی۔ اُسے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ اس کا شوہر اس اطاعت اور حلقہ بگوشی سے دل ہی دل میں سخت بیزار رہے اور اس نے اُس جھگڑے اور تنازعہ کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ جس کے پیدا ہونے کا اِن دونوں کے اختلافِ رائے کی وجہ سے ہر وقت امکان تھا۔ ژلینڈ کی بیوی علاقے کے ایک اعلیٰ خاندان

کی عورت تھی اور باقی تمام چیزوں کی بہ نسبت اپنے مقامی وقار اور عزت و احتشام کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ اس کے لندن جانے کی علت غائی اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتی تھی کہ اپنی اُن چند دیہاتی سہیلیوں میں شامل ہو۔ جنہیں تہذیب حاضرہ دیہات سے اٹھاکر شہر میں لے آئی تھی۔ اگر وہ تعطیل منانے کے لئے کہیں باہر جاتی تو محض اس مقصد سے کہ لوگ اس کی عدم موجودگی تاسف کے ساتھ محسوس کریں اور اس کی واپسی پر پہلے سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں۔ وہ ہر چیز کو نہایت تنگ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی تھی۔ اس کی لڑکیوں کی پرورش نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی تھی یعنی ان کی پرورش و تربیت میں یہ خیال ہر وقت پیش نظر رکھا جاتا تھا کہ اُنہیں علاقے کی بہترین خاتونیں بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اُن کا باپ روزمرہ کے خانگی امور کی طرح ان کی تعلیم و تربیت میں بھی اپنی رائے کو صائب قرار دینے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ رٹلینڈ کی بیوی کو اپنے شوہر سے صرف یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے مقامی حلقوں میں اپنے نام کی عزت کو محفوظ اور برقرار رکھنے میں کوشاں رہا کرے۔ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے وہ دو مرتبہ پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھی کھڑا ہوا۔ مگر دونوں دفعہ ناکام رہا۔ دو مرتبہ وہ اس شہر کا حاکم اعلےٰ رہ چکا تھا جس میں اُس کی بہت سی جائداد تھی اور جس کے قریب ہی اس کی سکونت تھی۔ بیوی کے کہنے پر وہ کئی مقامی جلسوں میں نہایت سرگرم حصہ لیتا، پھولوں کی نمائشوں کا افتتاح کرتا، کئی جلسوں میں کرسی صدارت قبول کرتا، شہر کے کاروباری لوگوں کی ترقی کی تحریک کو تقویت پہنچاتا اور کئی اور ایسے کام کرتا جو اُسے سخت ناپسند تھے۔ خانگی تنازعات کو وہ کہیں زیادہ ناپسند کرتا تھا اگرچہ اُسے یہ بھی معلوم تھا اس کی اِس امن پسندانہ روش کی قربانی اسے کئی ناپسندیدہ فرائض اور پابندیوں سے آزادی دلا سکتی ہے۔

اس کے تمام دوست اور آشنا اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اس کے ایک یا دو پرانے دوست ایسے بھی تھے جو رٹلینڈ میں اس قوت کے نہ ہونے پر سخت متاسف تھے۔ جس کی کمی اس کی بہت سی فطری قابلیتوں کو چھپائے ہوئے تھی اور نہایت حیران ہوتے تھے کہ ایسا بلند خیال اور تعلیم یافتہ آدمی جو گفتگو کے مختلف موضوعات میں بے حد دلچسپی لے سکتا ہے۔ کیوں ایسی عامیانہ زندگی بسر کرنے پر مطمئن ہے لیکن اُس کی شائستگی، ہر دلعزیزی اور خوش اخلاقی کے متعلق لوگوں کی رائے میں کبھی اختلاف نہ ہوا تھا۔ رٹلینڈ مجسٹریٹ ہونے کی حیثیت میں اپنی نرم دلی کی شہرت کو محسوس کر کے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ شہر کے بدمعاش جنہیں وہ حکم سُنا کر قید خانے میں بھیج دیا کرتا تھا۔ رہائی پانے کے بعد بھی اُس کے الطاف و اکرام پر بہت سا انحصار رکھتے تھے۔

اس روز جب وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا ضرب شدید کا ایک مقدمہ سنا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ نہایت حقیر

تھی۔ مجرم اگرچہ اس شہر میں نووارد تھا مگر اُسے یہاں ایک مکان کی نقاشی کا کام مل گیا تھا۔ اور کام کے دوران میں اپنے ایک سست اور کاہل کاریگر سے جس نے خواہ مخواہ اس کے فن کی توہین کی تھی جھگڑ پڑا تھا۔ اور اپنی اس تحقیر اور بے آبروئی پر سیخ پا ہو اس نے بے صبری کے ساتھ اسے مار کر نیچے گرا دیا تھا اور ساتھ ہی پولیس کی حراست میں دے دیا گیا تھا۔ رٹلینڈ نے مجرم کو دیکھا اور اُسے مجرم سے ایک خاص دلچسپی ہوگئی۔ مجرم کا چہرہ اور وضع قطع دیکھ کر رٹلینڈ کے دل میں بہت سے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اُس کی شخصیت صاف بتا رہی تھی۔ کہ اُس کے انداز و اطوار مجرموں کے سے نہیں ہیں۔ اور اگرچہ موجودہ واقعات میں وہ ناخوش دکھائی دیتا تھا مگر نہ تو وہ شہر مسار تھا اور نہ اخلاق و تہذیب کو اس نے ہاتھ سے جانے دیا تھا۔ صاف ملیح چہرہ، روشن فہمیدہ اور ہوشیار آنکھیں، کشیدہ قامت، یہ اس کا حلیہ تھا۔ اس کی عمر کم و بیش چالیس برس تھی۔

"اس کا نام کیا ہے؟" یہ سوال رٹلینڈ نے پاس والی کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کیا۔

"ہنری گڈرایو"

"گڈرایو ——— گڈرایو ———"

رٹلینڈ کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے اثرات ظاہر ہوئے اور اُس نے دوبارہ مجرم کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس وقت گڈرایو کی آواز ایک سوال کے جواب میں سُنائی دے رہی تھی۔ رٹلینڈ نے آواز کو نہایت غور سے سُنا اور اس کے اندرونی جذبات کی کیفیت اُس کے چہرے پر ظاہر ہوگئی۔

مجرم کو حقیر سے جرمانے کی سزا دی گئی۔ جس پر ملزم نے بتایا کہ نہ تو اُس کے پاس جرمانے کی رقم موجود ہے اور نہ اس کی اتنی استعداد ہی ہے کہ وہ اسے مہیا کر سکے۔ اس کی کل کائنات وہ چند کپڑے تھے جن میں لپٹا ہوا وہ اُن کے روبرو کھڑا تھا۔ وہ پچھلے ہی دن اس شہر میں آیا تھا، بالکل بے مایہ، اور آج اُسے کسی قدر کام مل گیا تھا۔ یہ سب بیان اس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ بے کم و کاست سنا دیا۔ اس کے علاوہ اس کی تقریر سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ محض ایک ادنےٰ درجے کا کاریگر ہی نہیں۔ اس کی زبان! اگرچہ اسے کسی خاص تہذیب و آراستگی سے کوئی نسبت نہ تھی اس کی اعلیٰ تربیت کی شاہد تھی۔

"اس کا جرمانہ میں ادا کر دوں گا" یہ خیال رٹلینڈ کے دل میں آیا۔ "اور میں عدالت سے باہر اس سے ضرور چند باتیں کروں گا۔"

ملزم مزید نصف گھنٹہ تک کمرہ عدالت میں ٹھہرایا گیا اور جب رٹلینڈ کی ہدایت کے مطابق ملزم ایک

علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا تو یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک مجسٹریٹ اس سے گفتگو کرنے کا خواہشمند ہے
"کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں۔ کہ تم براک ہرسٹ کے سکول میں تعلیم پاتے رہے ہو؟" یہ مجسٹریٹ کا پہلا سوال تھا
"ہاں! میں وہاں پڑھتا رہا ہوں۔" یہ جواب گڈ ایو نے مسکراتے ہوئے اور سوال کرنے والے کے چہرے کی طرف متواتر دیکھتے ہوئے دیا۔" میں نے '۶۲' میں سکول چھوڑ دیا تھا"

"اچھا' مجھ سے ایک سال پیشتر۔ کیا تمہارے ذہن میں میری کوئی یاد محفوظ ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ نہیں، لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔"

"میرا نام رٹلینڈ ہے ۔۔۔۔۔ ڈک رٹلینڈ"

گڈ ایو نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا اور پرانی اور فراموش شدہ شناسائی کو ایک مرتبہ پھر تازہ پاکر نہایت مسرت آمیز لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ تیس سال ہوئے وہ ایک اچھے مشہور سکول کے دارالاقامت میں کبھی جدا نہ ہونے والے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے مخلص جان نثار رہے تھے۔ ہنری گڈ ایو ایک ادنےٰ درجے کے دوکاندار کا بیٹا تھا۔ اور اُس کی آیندہ زندگی کی کامیابی کا دارومدار تمام تر اُس کی اپنی مساعی اور جدوجہد پر تھا۔ دوسری طرف ڈک رٹلینڈ کی شاہراہِ زندگی نہایت ہموار اور امید افزا تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں گڈ ایو ایک دفتر میں ٹھونس دیا گیا تھا جہاں وہ محض بیکاری اور ہنسی مذاق میں تضیع اوقات کرتا رہا۔ سولہ برس کی عمر میں اُس نے سمندر کی وسیع و عریض دنیا میں اپنی زندگی کی مشکل کا حل تلاش کرنا شروع کیا اور اُس دن سے آج تک وہ ایک الٹے تلتے "آوارہ گرد" کی زندگی اختیار کرکے سینۂ زمین کو روندے چلا جا رہا تھا۔

رٹلینڈ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔" تم ضرور میرے گھر آنا۔ حسنِ اتفاق سے میں چند دنوں سے گھر میں بالکل اکیلا ہوں۔ میری بیوی اور لڑکیاں لندن میں ہیں اور میرا گھر یہاں سے بمشکل نصف گھنٹے کے رستے پر ہے۔ ہر شخص تمہیں رستہ بتا سکتا ہے۔ میں ڈیڑھ بجے تمہارا منتظر ہونگا"

"لیکن میرے جرمانے کا کیا انتظام ہوگا"

"ہاں! اس کا فیصلہ بھی ہم وہاں ہی کریں گے"

جب مجسٹریٹ گھر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا جہاں گرد دوست ایک سایہ دار سرسبز قطعہ زمین پر خوب پاؤں پھیلا کر لیٹا ہوا ہے۔ وہاں کا مالی اُس کی باتوں سے اُسے کوئی مشتبہ آدمی سمجھ کر اس کی نقل و حرکت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔

گڈ ایو نے پوچھا" یہاں گرد و نواح میں نزدیک ہی کہیں کوئی تالاب یا ندی ہے - جہاں آدمی ایک غوطہ لگا سکے؟"

" یہاں تو کوئی نہیں ہے - لیکن اگر تمہارے لئے ایک اچھے خاصے غسل کا انتظام کر دیا جائے - تو تمہیں کیا مضائقہ ہے؟"

" بالکل کوئی نہیں - یہ تو میں نے صرف اس صورت میں کہا تھا اگر اس کا نعم البدل میسر نہ ہو سکے"

پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا - اُن کے لباس میں اگرچہ ایک حیرت انگیز فرق تھا - مگر بعض امور کی بنا پر اُن کا دوبارہ اس انداز میں مل بیٹھنا تعجب خیز نہ تھا - یہاں گڈ ایو نہایت عمدہ ساز و سامان کے درمیان گھرا بیٹھا تھا لیکن اردگرد کی اِن بیش قیمت چیزوں سے وہ قطعاً مرعوب نہ ہوا تھا اور اس پر گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار بالکل ظاہر نہ ہوئے تھے - اُس نے وہاں خوب سیر ہو کر کھایا اور پیا اور نہایت خوشی کے ساتھ اپنے ایامِ گذشتہ کی باتیں کرتا رہا - اُس کا میزبان، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے سر سے تفکرات کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو چکا ہے - اور خادم جو قریب ہی خاموش کھڑا تھا اپنے آقا کی اِس طفلانہ مسرت اور اُس کی اِس عجیب و غریب نوع کے مہمان کے ساتھ اس قدر ارادت اور بے تکلفی دیکھ کر بہت حیران ہو رہا تھا - ابھی تک گذرے ہوئے زمانے کا کوئی تذکرہ نہ ہوا تھا - وہ ابھی اپنا سکول والا لڑکپن یاد کر رہے تھے، بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑ رہے تھے، اسی طرح پُرانے مذاق کی باتوں پر قہقہے مار رہے تھے - اور اپنے کرکٹ اور فُٹ بال کے دلفریب دنوں کو یاد کر رہے تھے - گڈ ایو اپنے مختلف دوستوں کے متعلق پوچھ رہا تھا - اب وہ اکیلے تھے اور زیادہ آزادی کے ساتھ باتیں کر سکتے تھے -

رٹلینڈ نے کہا "گینز کہیں غائب ہو گیا تھا - اس کا باپ چند مایوس کُن واقعات میں پھنس گیا - اور مجھے ڈر ہے کہ وہ بیچارہ ——————"

گڈ ایو نے چلّا کر جواب دیا "ہاں! دس بارہ سال ہوئے میں نے اُسے نیوزیلینڈ میں دیکھا تھا - وہاں وہ ایک سرائے میں شراب تقسیم کرنے پر ملازم تھا"

" اخاہ!"

" اور پاٹس —————— ٹوڈی پاٹس، سیمی پاٹس نہیں - اُس سے میں سماٹرا میں ملا تھا - وہاں وہ مرچ کی کاشت کرنے والے ایک زمیندار کے پاس منشی کا کام کرتا تھا - اُن دنوں اُسے باری کے بخار کی شکایت

تھی اور اب تو اُسے مرے شاید مدت گزر چکی ہو گی۔"

رٹلینڈ نے پوچھا "تم نے اتنی دنیا کیسے دیکھ لی ؟ کیا صرف سمندر کی ملازمت کے دوران میں ؟"

"ہاں ! صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے میں جہاز پر نوکر ہو جایا کرتا تھا۔ خشکی پر تو مجھے تقریباً کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ میں بڑھئی کا کام جانتا ہوں ـــــــ تمہیں یاد ہے ۔ یہ فن میں نے سکول میں سیکھا تھا۔ ماہی گیری میں بھی مجھے کافی شغف ہے ۔ اور کبھی کبھار میں درزی کا کام بھی کر لیتا ہوں اپنی فنِ نقاشی اور مصوری کی قابلیت پر مجھے بہت فخر ہے ۔ اور گاہے گاہے میں عکسی تصویریں اتارنے کا شغل بھی اختیار کر لیا کرتا ہوں۔ صرف انگلینڈ میں مجھے اپنی روزی کمانے میں دقت پیش آتی ہے۔ میں بالعموم اپنے وطن کو بھی واپس چلا آتا ہوں۔ اگرچہ اب یہاں میرا کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا ۔ گھر کی زندگی سے میں بہت جلد اُکتا جاتا ہوں ۔ میں ایک جگہ مستقل سکونت اختیار کرنے کی بہت تدبیریں سوچتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اس ارادے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ پانچ ہفتے ہوئے میں باہیا سے سوتھیمپٹن گیا تھا ـــــــ وہاں میرا ایک پُرانا دوست تمباکو کی تجارت کرتا ہے ۔ اور اس سے ملنے کے لئے میں جمیکا سے آیا تھا ۔ اچھا ، تو جب میں وہاں اُترا میرے پاس صرف ایک یا دو ڈالر تھے ۔ موسم نہایت خوشگوار تھا ۔ اِدھر اُدھر گھوما مگر کام کے کچھ آثار نظر نہ آئے ۔ یہاں وطن میں مَیں بالعموم گھروں کی نقاشی کا کام لے لیا کرتا ہوں ۔ لیکن یہ کام بھی ہر وقت آسانی سے میسر نہیں ہو سکتا ۔ سخت اور ناشائستہ کاموں کو میں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ پچھلی مرتبہ پانچ سال کا عرصہ ہوا ہے کہ مجھے کینٹ میں کھدائی وغیرہ کا کام کرنا پڑا تھا مگر میں نے اُسے پسند نہ کیا۔"

رٹلینڈ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا زندگی ہے!"

"کچھ ایسی بُری بھی تو نہیں ـــــــ"

"تم میرا مفہوم نہیں سمجھے ۔ میرا مطلب ہے ، کیا ہی عمدہ اور مسرت بخش زندگی ہے ! ۔ میں تمہاری اِس زندگی پر رشک کرتا ہوں ۔ گڈ لِو ! میرا دل ، میری رُوح تمہاری اِس زندگی پر رشک کر رہے ہیں۔"

"اچھا ، واقعی ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ ایک آدمی جس کے پاس ایسا گھر ہو نہایت آزادی سے جب چاہے آئے اور جب اس کا جی چاہے چلا جائے ، جیسے اس کی طبیعت چاہے ـــــــ"

اُس کا میزبان چلا اُٹھا "آزادی سے ظاہری باتوں پر مت جاؤ ۔ تمہیں تو دنیا اور اُس کے واقعات کی زیادہ خبر ہونی چاہیئے ۔ دُنیا میں کوئی ایسا آدمی نہ ہو گا جو مجھ سے زیادہ غلامانہ زندگی بسر کر رہا ہو۔"

اُس کی آواز کانپتی ہوئی خاموش ہوگئی اور وہ دل ہی دل میں اپنی بے اختیاری اور بے احتیاطی پر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا جس نے اُسے اپنی تمام خانگی تکلیفات کھول کر اُس کے سامنے رکھ دینے کی اجازت دے دی تھی۔

"آؤ، باہر باغ میں چلیں، عزیز دوست! ایک سگار سُلگا لو اور کچھ اور جیب میں ڈال لو۔"

اِس دوپہر کو اپنے ایک ہمسایہ کے ہاں رٹلینڈ کی دعوت تھی اور وہ اُس میں شامل ہونے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اُس کا وہاں نہ جانا بے انتہا حیرت کا باعث ہوتا۔ اور اُس کی عدم موجودگی سے اُن لوگوں کو بہت مایوسی ہوتی جو اُس کی شمولیت کو اپنے لئے باعثِ فخر قرار دیتے تھے۔ لیکن جوں جوں دعوت کا وقت قریب آتا گیا۔ وہ اپنے دلچسپ رفیق کو تنہا چھوڑ کر ہمسایوں کی تکلیف دِہ صحبت کے خیال سے بہت پژمُردہ اور افسردہ خاطر ہوتا گیا آخر کار کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ہرگز نہیں جائے گا۔ اُس نے سوچا کہ جب اُس کی بیوی اِس فروگذاشت کی خبر سُنے گی تو بہت حیران ہوگی اور کہے گی "لیکن میرے پیارے رچرڈ، یہ یقیناً ———" اُس نے تصوّر میں یہ آواز سُنی اور اُس کے سُننے کے لئے کان بند کر لئے۔ وہ صرف گڈ ایو کی آواز کو غور سے سُنتا رہا۔ گڈ ایو اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

" ——— دوسرے دن ہم نے ہارن کو دیکھا اور میں اپنی تمام مشکلات کو بھُول گیا۔ تمہیں یاد ہے کہ سکول کے زمانے میں ہم کس طرح اُس کے اِردگرد گھوما کرتے تھے۔ اور کتنی گہری دلچسپی سے اُس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اب جس وقت میں نے اُسے دیکھا تو مجھے بے اختیار تم یاد آ گئے تھے ——— بے شک تم۔"

سات بجے کے قریب جب سورج غروب ہو رہا تھا اور ہوا میں خُنکی پیدا ہو گئی تھی رٹلینڈ نے اُٹھ کر ایک انگڑائی لی اور کہا:-

"یہ کھانے کی پہلی گھنٹی بجی ہے۔ گھنٹے لمحوں کی طرح گذر گئے ہیں۔"

"گڈ ایو نے ہنستے ہوئے کہا خیر کچھ بھی ہو، مجھے تو کافی بھُوک لگ رہی ہے۔"

"بھئی میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ نجانے کتنے طویل برسوں کے بعد مجھے آج اِس قدر بھوک محسوس ہوئی ہے۔ دیکھو، یہ ہوا سمندر پر سے تیرتی ہوئی آ رہی ہے۔ کیا زندگی ہے! کیا ہی زندگی ہے!! یقیناً تم آج رات یہاں ہی ٹھہرو گے۔ تمہارا یہاں آنا یہ بالکل خداداد بات ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شباب کے دن پھر لوٹ آئے۔ میں پھر چیزوں کو اِس طرح دیکھ رہا ہوں جس طرح ———"

اُس نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا اور سر جھکا کر گڈ ایو کی سی قابلِ رشک زندگی کے تصور سے مسرور ہو کر ٹہلنے لگا۔

کھانے کے بعد ــــــــــ نہایت بے قاعدہ کھانے کے بعد ــــــــــ وہ کُتب خانے میں گئے جہاں گڈ ایو کی بے تاب نگاہیں الماریوں اور کتابوں کے پُشتوں پر رقص کرتی رہیں۔

"کیوں؟ تمہارے پاس یہاں سفر و سیاحت کی کتابوں کے سوا اور تو کچھ ہے ہی نہیں، رٹلینڈ! یہ معما میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر سیر و سیاحت کے متعلق ہمیشہ تمہارے وُہی خیالات رہے ہیں جو سکول کے زمانے میں ہوا کرتے تھے تو یہ کیا ستم ہے کہ تم یوں رہینِ خانہ ہو گئے ہو؟ بیوی! ورنہ بچے! تم کافی امیر آدمی ہو۔ پھر اور لوگوں کی طرح دنیا کی سیاحت کرنے میں تمہیں کونسا خیال مانع رہا ہے؟"

واقعی شادی سے پہلے محبت کے دنوں میں وہ اکثر یہ خیال کر کے مسرور ہوا کرتا تھا کہ وہ اور اُس کی محبوب بیوی دُور دراز ممالک کا سفر کریں گے اور دُنیا کی تمام مسرتوں اور عجائبات سے لطف اندوز ہوں گے۔ شادی کے بعد پہلے مہینے کی تقسیم اوقات میں مصر کی سیر بھی شامل تھی۔ لیکن مسز رٹلینڈ کو دیگر ممالک کی سیاحت کا شوق نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ایلپس تک بھی نہ پہنچنے پائے تھے کہ واپس لوٹ آئے۔ اس کے بچوں کی پیدائش نہایت تیز تسلسل کے ساتھ ظہور میں آتی رہی اور اس طرح وہ نہایت سُرعت سے روز بروز خانگی مصروفیتوں کے جال میں گرفتار ہوتا گیا حتےٰ کہ اُس بیچارے شوقین دولتمند کی سیاحت کی اُمید آخر مایوسی میں گم ہو کر فنا ہو گئی۔ کسی دُور دراز سفر کے خیال پر مسز رٹلینڈ ترحّم آمیز انداز میں صرف مسکرا دیا کرتی تھی ــــــــــ ایک ایسی خوفناک مسکراہٹ جسے اُس کا شوہر خوب سمجھتا تھا ــــــــــ اُس کی خوفناک تقدیر کی مسکراہٹ!

"رچرڈ بہت متلوّن المزاج آدمی ہے۔" ایک مرتبہ اُس نے اپنی بیوی کو اپنی ایک سہیلی سے یہ کہتے ہوئے سُن لیا تھا۔ اِن الفاظ کے معانی کا بوجھ اُس کے نزدیک کس قدر دہشت ناک تھا!

انہوں نے ایک بہت بڑی اٹلس کھولی اور رٹلینڈ اپنے دوست کے ملک بہ ملک سفر کو غور سے ذہن نشین کرتا گیا۔ اٹلس کے اُوپر اُن کے سر تقریباً ملے ہوئے تھے۔ دونوں انتہائی ربط و اُلفت کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک مرتبہ پھر سکول کے لڑکے معلوم ہو رہے تھے۔ اِسی انداز سے وہ کئی بار سکول کی بنچوں پر بیٹھ چکے تھے۔ کوئی بڑا سا نقشہ اُن کے گھٹنوں پر ہوتا تھا اور وہ دونوں نامعلوم رقبہ جات کے انکشاف کے منصوبے اور تجویزیں سوچا کرتے تھے۔ اُن دنوں رٹلینڈ بہت پُرجوش، سرخ رنگ اور تنومند تھا۔ اُسے ایس

بات کا احساس تھا کہ وہ سفر کے اخراجات کے متحمّل ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور ہنری گڈ ایو بیچارا صرف سیاحت کی آرزو میں کر کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ رٹلینڈ اگرچہ اب ایک دولت مند آدمی اور اپنے علاقے کی عظیم ترین شخصیت تھا۔ لیکن اپنی زندگی کے تیس بہترین سال یوں پیچھے چھوڑنے کے بعد جب وہ گڈ ایو کو اُن مسرّتوں اور خطروں کا تذکرہ کرتے ہوئے سنتا جو کرۂ زمین کے طویل سفر کے دوران میں اُس نے دیکھے تھے۔ تو اُس کا دل اندر ہی اندر جلتا اور جوش کھاتا تھا۔

اُس نے مضطربانہ انداز میں ٹہلتے ہوئے کہا "آہ! تم نے بہترین زندگی بسر کی ہے۔ تمہارا دماغ دنیا کے مصائب و آلام اور ارضی سرور و انبساط کے مختلف تجربات کی دولت سے پُر ہے۔ لیکن میں اِس لحاظ سے محض شکستہ حال، جاہل اور مفلس و نادار ہوں۔ تم نے دُنیا کے واقعات اور حوادث پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اور میں بدنصیب اور پست ہمت زندگی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ایک قابلِ تحقیر کونے میں دبک کر بیٹھا رہا۔ مَیں عدالت میں جاتا ہوں۔ ایک بڑی سی شاندار کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ لوگوں کو ایک اُلّو کی طرح دانشمند اور سنجیدہ نظر آتا ہوں اور غریب مفلس لوگوں کو قید خانے میں بھیجتا رہتا ہوں۔ بس یہ ہے وہ سب کچھ جو میں نے اِن طویل تیس برسوں میں حاصل کیا ہے۔ تم بہتر سے بہتر لوگوں کے درمیان رہے ہو، بہترین مصروفیتیں تمہارا شغل رہی ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے رہے ہو، ایک حقیقی انسان کی طرح مسرّتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہو اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھتے رہے ہو۔ اُف! جب میں اپنے گذشتہ تیس برسوں پر غور کرتا ہوں اور اپنی بے مصرف زندگی کا مقابلہ تمہاری شاندار زندگی کے ساتھ کرتا ہوں تو اس عظیم نقصان کا احساس مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ کیا تم اُن لوگوں کا تصور کر سکتے ہو جن کے ساتھ میرا واسطہ رہا ہے؟ اُن آدمیوں اور اُن عورتوں کا جو صبح کے وقت اور لباس پہنتے ہیں اور شام کے وقت اور، جنہیں لباس تبدیل کر کے اپنے آپ کو حسین سے حسین تر بنانے کے سوا دنیا کی اور کوئی بات اہم اور دلچسپ نظر نہیں آتی۔ جب ہم اپنے علاقے میں شراب کے امتناع کے لئے پُرامن جلسے منعقد کرتے ہیں اُس وقت تم وسیع سمندر کے درمیان طوفان خیز موجوں کے خلاف جنگ آزما ہوتے ہو یا کسی نئے بندرگاہ پر اُترتے ہو اور ایک نئی دُنیا اور نئے لوگ تمہارے سامنے ہوتے ہیں۔"

گڈ ایو نے ایک بلند قہقہہ لگا کر کہا "ارے بھئی رہنے بھی دو۔ ابھی وقت بہت نہیں گیا۔ تم عمر میں مجھ سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہو۔"

رٹلینڈ نے امکانات کی ایک وسیع دنیا اپنے سامنے کھلتی ہوئی دیکھی اور مبہوت و مسرور نگاہوں سے گڈ ایو کی طرف دیکھتا رہا۔"

اُس نے زیر لب کہا "ہاں! ہاں!! میں ابھی دُنیا کی کچھ سیاحت کر سکتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر ایک دفعہ پھر اٹلس کی طرف مُڑا اور شمالی امریکہ کا نقشہ دیکھنے لگا۔ "یہ ایک چیز ہے جس کے دیکھنے کا مجھے بے حد شوق ہے ـــــ دریائے ایمیزن!"

گڈ ایو نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا "یہاں سے صرف پندرہ روز کا سفر ہے۔"

"پندرہ روز کا! اچھا! صرف پندرہ روز کا ـــــ"

رٹلینڈ کے ہونٹوں سے یہ کلمات اِس طرح نکلے۔ جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو اور جب اُس نے نقشے پر اِس عظیم الشان دریا کے بہاؤ کے راستے کا سُراغ لگانا شروع کیا تو اُس کی اُنگلی کانپ رہی تھی۔

گڈ ایو نے کہا "پہلے تم باہیا جانا اور وہاں میرے نمبا کو والے دوست سے ملنا۔ وہ نہایت عمدہ آدمی ہے اور تمہیں ایک گھنٹہ میں اِتنی باتیں بتا دے گا جتنی میں ایک ہفتہ میں بھی نہیں بتا سکتا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ سفر میں مَیں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

رٹلینڈ کھڑا ہو گیا اور متحیر ہو کر اپنے مہمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں نہیں؟ کیا تمہاری مراد سفر کے اخراجات سے ہے؟ اُن کی میرے لئے کیا حقیقت ہے؟ صرف ایک بار یہ کہہ دو کہ تم چلو گے اور ـــــ"

یہاں وہ رُک گیا اور اُس نے اپنا ہاتھ ہوا میں یوں پھیلا دیا جیسے اُس کے سامنے کوئی نہایت دشوار مہم تھی۔ وہ رکاوٹیں جو رٹلینڈ کی سیاحت میں مزاحم تھیں اگرچہ گڈ ایو کے نزدیک بے حد مضحکہ خیز حیثیت رکھتی تھیں لیکن حقیقت میں اُنہیں سے رٹلینڈ کے جذباتِ سیاحت کی بلند پروازی ہمیشہ پامال ہو کر رہ جایا کرتی تھی۔

گڈ ایو نے بھرا ڈیا نوس کی فرحت بخش ہوا کے تصوّر سے لطف اندوز ہو کر کہا "میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔"

میزبان جس کا چہرہ فرطِ طرب سے سُرخ ہو رہا تھا کہنے لگا "شائد ہم باہیا سے بھی دُور تک کی سیاحت کر سکیں گے۔ اگر میں ایک دفعہ انگلینڈ سے باہر نکل پڑا۔ تو صرف ایک ملک کی سیاحت میری تشنگی کو نہیں بجھا سکے گی۔ کم از کم دو یا تین سال۔"

رٹلینڈ کی آواز کانپ گئی اور آنکھیں تمتا اُٹھیں اور گڈ ڈ ایو اُسے ایک نہایت ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا رہا۔

"کیا تم میری مرضی کے مطابق وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہو کر میرے ساتھ سفر کرنے کے لئے تیار ہو؟"

ہاں! بیشک!! لیکن تم کب تک روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

رٹلینڈ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک لمبا سانس کھینچا اور سنجیدگی سے کہا۔

"آج بُدھ ہے ——— میں ہفتہ کی صبح کو گھر سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہوں۔"

"پھر تو ہمیں اپنے لئے کوئی جہاز دیکھنا چاہیئے۔"

"ہاں! لیکن خواہ ہمیں جہاز ملے یا نہ ملے میں ہفتہ کی صبح کو جہاں تم چاہو تم سے مل سکتا ہوں۔ ایک دن اور میرے پاس ٹھہرو۔ میری مصروفیت تو بے شک بہت زیادہ ہے لیکن میں تمہیں اپنے قریب ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم جمعہ کے روز چلے جانا اور میں ہفتہ کے روز لِور پول یا سوتھیمپٹن جہاں تم چاہو تم سے آملوں گا۔"

وہ بہت رات گزرے پر بھی بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جہاں اور بہت سی باتیں طے ہوئیں۔ وہاں اس بات کا فیصلہ بھی کر لیا گیا کہ دوسرے دن صبح کو گڈ ڈ ایو اپنے ادنٰے درجے کے کپڑے اُتار دے اور وہ لباس پہنے جو رٹلینڈ جیسے امیر آدمی کے مہمان کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔ اس سلوک سے گڈ ڈ ایو پر بہت زیادہ تشکر و امتنان کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔ تیس سال کی جانباز زندگی نے اسے ہر بات کو نہایت سادگی اور بے تکلفی سے پرکھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی امیر اور دولت مند آدمی مہربان ہو کر اپنے کسی غریب دوست کو دنیاوی تفکرات سے نجات دلانا چاہتا ہو تو اس میں اتنی بڑی بات ہی کیا ہے؟ گڈ ڈ ایو ایک اکھڑ، سیدھا سادھا، صاف گو اور دیانتدار شخص تھا۔ اور اس میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے کوئی تدبیر سوچنے کی بالکل اہلیت نہ تھی۔ گڈ ڈ ایو کی خصلت اور اخلاق کی خوبیاں آج بھی رٹلینڈ کے سامنے اس کی اسی طرح سفارش کر رہی تھیں۔ جس طرح کسی عہدِ گذشتہ میں کیا کرتی تھیں۔ سادہ زندگی ہشفقت اور اپنے ماتحتوں کی رفاقت اس کے لئے کبھی ذلت کا باعث نہ ہوئی تھی۔ آداب و تہذیب کی کمی کے مقابلے میں گڈ ڈ ایو کو اخلاص، نیک نیتی، نیک مزاجی اور دل و دماغ کی تازگی ملی تھی۔ رٹلینڈ کے معاملات اسے عجیب تمسخر آمیز روشنی میں نظر آتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کا دوست نسوانی سختیوں کی فضا میں نہایت کٹھن زندگی بسر کر رہا تھا اور گڈ ڈ ایو کے نزدیک یہ صورت حالات سخت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ اپنے پُرانے رفیق کو ان افسوسناک بندھنوں سے آزادی دلانے کے خیال سے بہت

خوش ہو رہا تھا اور یہ مذاق اُس کے نزدیک بہت پُرلطف تھا۔ کہ ڑلینڈ اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں اس افسوسناک اسیری سے بھاگ نکلنا چاہتا ہے۔

بے شک مجسٹریٹ کی تجویز یہی تھی۔ رات کے وقت سونے کی کوشش کو بے سُود پاکر ڑلینڈ ساری رات بیٹھا اپنے متعدد معاملات کو سُلجھاتا رہا، مختلف کاغذوں کو ترتیب دیتا رہا، چھٹیاں لکھتا رہا، اور اپنے ذاتی، خانگی اور سرکاری اُمور پر غور کرتا رہا، وہ عجلت جس کے ساتھ اُس نے اِس ارادے کو مستقل کر لیا تھا۔ اور وہ قلبی مضبوطی جس کے ساتھ وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے پر تُلا ہُوا تھا۔ اس کے نزدیک اس کی فطرت کا ایک معجز نما اور حیرت انگیز انکشاف تھی۔ کیونکہ درحقیقت اُس کی طبیعت کا رُخ بہت سے کمزور قوتِ فیصلہ والے اور متلوّن المزاج لوگوں کی طرح فلسفیانہ اوہام کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ منصوبہ فوراً عمل میں آ جانا چاہیئے۔ گڈ ایوکا اُس کی بیوی کی عدم موجودگی میں آ نا عین اُس کی آرزو کے مطابق تھا اور وہ اس معاملے پر جتنا سوچتا تھا۔ اتنا ہی جلد گھر بار کو چھوڑ کر نکل جانے کو اس کا دل چاہتا تھا۔ اُس کی بیوی اور بیٹیاں ہفتہ کی شام کو واپس آنے والی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایک خط لکھ کر چھوڑ جائے گا۔ کہ اُسے ایک دوست کی ہمراہی میں دو ایک روز کے لئے باہر جانے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ بعد میں، لیکن اس سے پیشتر کہ اُس کی بیوی اُس کے انتظار میں مضطرب و بے قرار ہو، وہ اُسے مکمل کیفیت لکھ بھیجے گا۔

فرار کی جو تجویز اُس نے سوچ رکھی تھی اُس میں اب کوئی ایسی سنگین مزاحمت نہ تھی جو اُسے بھاگ نکلنے سے روک لیتی۔ وہ تمام ایسے معاملات اپنے قانونی مختار کو سونپ سکتا تھا۔ جو اس کے خیال کے مطابق اُس کی بیوی نہ نبھا سکتی تھی۔ اُس کی روانگی اُس کے خاندان کی زندگی میں قطعاً کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھ سکتا تھا۔ کہ اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹیاں اپنی شاہراہِ زندگی پر اسی پُر امن اور با عزت طریقہ سے گامزن رہیں گی جیسے وہ ہمیشہ رہتی چلی آئی تھیں۔ نقدی اور روپے کے معاملات میں اُس کی بیوی ہمیشہ خود مختار رہی تھی اور وہ اپنے خانگی معاملات کو بہ نسبت اپنے خاوند کے زیادہ بہتر طریقہ پر سنبھال سکتی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اپنی اولاد سے زیادہ دیر جدا رہ کر اسے کسی کوفت یا رنج کا متحمل نہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ بیٹیاں بہ نسبت اُس کے اپنی ماں کے ساتھ زیادہ ربط رکھتی تھیں اور وہ لڑکی جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا تھا مر چکی تھی۔

ہاں! ہفتہ کی صبح، اور وہ ان تمام چیزوں کی ذمہ داریوں سے نجات حاصل کرے گا۔ جو اُس کی قطعی آزادی کے پُر سرور احساس میں ہمیشہ مخل ہوتی تھیں۔ ایک طفلانہ سرخوشی نے اسے اِس تمام تحیر، طعن و تشنیع اور بیہودہ گوئی سے

بے خبر کر دیا تھا جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑنے والا تھا۔

طلوعِ آفتاب کے قریب اسے کچھ پژمردگی سی محسوس ہوئی ــــــ تکان نہیں، اور نہ سو جانے کی خواہش ــــــ بلکہ صرف خفیف سی کمزوری، کچھ اس قسم کی نقاہت جو اُس نے کل محسوس کی تھی۔ اور اُس نے اسے قدرتی طور پر غیر معمولی دماغی ہیجان کا نتیجہ سمجھا۔ لیکن یہ حالت کچھ ایسی نہ تھی۔ جس کا علاج شراب کے ایک گھونٹ سے نہ ہو سکتا ہو۔ وہ لیٹ گیا لیکن اُسے نیند نہ آئی۔

سارا دن اگرچہ اُس کی طبیعت افسردہ رہی لیکن وہ اپنے کام میں منہمک رہا۔ آج موسم پھر بہت گرم تھا۔ اور اِس وجہ سے اُسے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

" اُس نے کھانے کے وقت گڈ ایو کو بتایا کہ اُسے خلافِ معمول اپنی حالت میں کچھ تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ اور کہا۔ میری حالت جہاز پر پہنچ کر بہت جلد درست ہو جائے گی۔ صرف سمندر کا سفر ہی مجھے بے حد مرغوب ہے۔ میں نے نہایت جاہلانہ زندگی بسر کی ہے۔ کیا میں مسرت سے دیدہ و دانستہ احتراز نہیں کر تا رہا ہوں؟ اگر میں اسی طرح زندگی بسر کرتا چلا جاتا۔ تو بقول ہلٹ کے میرا دلی اضطراب اور روحانی بیکلی پچاس سال کی عمر کے قریب ہی میری زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔"

"گڈ ایو نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ہاں! اِس میں کیا شک ہے۔"

انہوں نے وہ طویل شام پھر اٹلس کو اپنے سامنے کھول کر گذار دی۔ اور ٹلینڈ ایک دفعہ پھر اپنی سیاحت کے تصورات کے جال میں پھنس گیا۔ جب وہ بستر پر لیٹا تو اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور اُبھری ہوئی تھیں۔ اور اُس کے گال لال انگاروں کی طرح سُرخ ہو رہے تھے۔ ایک یا دو گھنٹے تک وہ بستر پر بے خوابی کی ایک ہولناک کیفیت میں تڑپتا اور کروٹیں بدلتا رہا اور پھر طوفان اور غرقابی کے خوفناک خوابوں میں کھو گیا۔ جن کی وجہ سے وہ صبح تک ہراساں و پریشاں رہا۔

جمعہ کی صبح کو گڈ ایو روانہ ہو گیا۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ سوموار کے روز ایک جہاز سوتھیمپٹن سے ریوڈی جنیرو کی طرف روانہ ہوگا۔ اور یہی وہ مقام تھا جہاں سے اُنہیں اپنی سیاحت کا افتتاح کرنا تھا۔ نئے لباس میں گڈ ایو کو کسی قدر تکلیف سی محسوس ہوئی۔ لیکن اپنی شخصیت کے ظاہری جلال کے تصور سے وہ اتنا خوش تھا کہ شاداں و فرحاں روانہ ہو گیا۔ ٹلینڈ نے اُسے کافی نقدی دے دی تھی۔ جس سے وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ سوتھیمپٹن سے سفر کی ضروری چیزیں خرید لے۔

اُس نے جہاز والوں کے گماشتے کو دو آدمیوں کی جگہ محفوظ رکھنے کے لئے تار دے دیا تھا اور اُسے تسلی بخش جواب وصول ہو چکا تھا۔

آج ہلکی ہلکی بارش ہو گئی تھی اور رٹلینڈ موسم کی ٹھنڈک کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اُس نے کسی قدر تکلف کے ساتھ اس موسم کا تصور کیا جس میں اُس کے سفر کا زمانہ بسر ہونے والا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ کہ تختۂ جہاز پر پندرہ یوم کا قیام اُس کی صحت اور زائل شدہ توانائی کو بحال کر دیگا۔ اُسے بظاہر یقیناً کوئی تکلیف نہ تھی۔ البتہ اُس کا دماغی ہیجان اُس کے جسم پر کسی قدر ضرور اثر انداز ہوا تھا، اور بس۔ اگر برازیل میں اُن کی طبیعت نہ بہلی تو معمولی بات ہے۔ وہ اور اُس کا دوست شمال یا جنوب، کسی طرف کو نکل جائیں گے۔ وسیع دُنیا اُس کے سامنے یوں پھیلی پڑی تھی جیسے اس اٹلس کے اوراق جن پر وہ کئی مرتبہ جھکا تھا۔ اُس نے اپنی سیاحت کو بالکل لامحدود کر دیا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ وطن سے کسی بد خبر کے سوا اور کوئی چیز اُسے ایک یا دو سال سے پہلے واپس نہ لا سکے گی۔

اُس نے سوچا کہ جب وہ اپنی سیاحت سے واپس آئے گا۔ تو وہ پہلا سا رٹلینڈ نہ ہوگا۔ اور پھر اُس کی بیوی کو معلوم ہوگا کہ اب رٹلینڈ کی معاملہ فہم آنکھوں اور تجربہ کار شخصیت کے سامنے اُس کی نسوانی حکومت کا دَور ختم ہو چکا ہے۔

اُس نے اپنا انتظام بالکل مکمل کر لیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ اُسے بیوی کا خط ملا جس میں اُس نے ہفتہ کے روز اپنی واپسی کی خبر لکھی تھی اور اپنے شوہر کی توجہ چند ادنےٰ سی دل خراش تکلیفوں کی طرف منعطف کرائی تھی۔ رٹلینڈ پڑھ کر ہنس دیا اور اُس نے خط کو ایک طرف پھینک دیا۔ دوپہر کے وقت اپنے آپ کو کسی کوشش وسعی کے ناقابل محسوس کر کے وہ اپنے مطالعہ خانے کی ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اُس کے دل کی حرکت بہت تیز تھی۔ اُس نے اپنے دماغی اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کی جو اُسے تکلیف دے رہا تھا۔ لیکن اِس کے دل کی بیکلی لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اُس نے شام سے رات اور رات سے صبح کی اور چاہا کہ دن چڑھے اُس کی آنکھیں سوتھیمپٹن کا نظارہ دیکھ رہی ہوں۔

کھانے کے وقت اُس نے صرف تھوڑے سے شوربے پر اکتفا کیا۔ اُس کی مریضانہ حالت خود اُس سے کسی طرح چھپی ہوئی نہ تھی۔ اور اس اندیشے کی ہیبت نے کہ مبادا وہ صبح روانہ ہونے کے ناقابل ہو اسے خطرناک طور پر مضمحل اور مضطرب رکھا۔ کھانے کی میز سے اُٹھ کر وہ پھر مطالعہ خانے میں چلا گیا اور ایک اخبار لے کر آرام کرسی

میں دراز ہوگیا۔ یہاں وہ اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ اور اُس کے منہ سے ایک لمبی آہ نکلی۔

صبح دس بجے کے قریب اُس کے ملازم نے اُس سے کچھ بات کرنی چاہی۔ اُس نے مطالعہ خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اُسے کھول کر اندر داخل ہوگیا مگر قریب آکر دیکھنے پر اُسے معلوم ہُوا کہ اُس کا آقا سو رہا ہے۔

ایک گھنٹہ کے بعد وہ پھر کمرے میں آیا۔ رٹلینڈ نے ابھی تک کوئی حرکت نہ کی تھی۔ نوکر نے ذرا قریب ہوکر دیکھا تو اُسے محسوس ہُوا کہ اس کے آقا میں ایک تعجب خیز تبدیلی پیدا ہوچکی ہے۔ وہ سننے کے لئے جھک گیا لیکن رٹلینڈ سانس نہیں لے رہا تھا!

دوسرے دن سوتھیمپٹن کے سٹیشن پر مہری گڈ ایوان لوگوں میں جو مختلف گاڑیوں سے اُتر رہے تھے۔ بے فائدہ اپنے عزیز دوست کو تلاش کرتا رہا۔ اُس نے آزردگی کے لہجے میں اپنے دل میں کہا۔ وہی ہُوا۔ جس کا مجھے خطرہ تھا۔ اُس کی بیوی واپس آگئی ہے اور اُس نے اُسے روک لیا ہے ”

(ترجمہ) **عبدالعزیز**

حسنِ سخن

اب الجھنا جنوں سے ہے بے کار ۔۔۔ جیب میں نام کو نہیں اک تار
ہنس رہے ہیں وہ میری میّت پر ۔۔۔ ہے تماشا خزاں رسیدہ بہار
زلف برہم کا تذکرہ تھا فقط ۔۔۔ کیوں اُلجھتے ہیں سبحہ و زنّار
شکوہ کرتے ہی کشتنی ٹھیرا ۔۔۔ بات کی تھی کہ کھچ گئی تلوار
جان لینے کی آپ فکر کریں ۔۔۔ جان دینا تو کچھ نہیں دشوار!

بتکدے میں کبھی حرم میں کبھی
ہے تپش بھی عجب خدائی خوار

عبدالطیف تپش

محفلِ ادب

اپنی کمائی

صبح کے وقت امیر باپ نے اپنے کاہل اور آرام طلب بیٹے کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ جا کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملیگا۔
لڑکا۔ بے پروا، کمزور اور متکبر تھا۔ اور اُسے محنت و مشقت کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس گیا، اور رونے لگا۔ ماں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو، اُس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار دیکھے تو اُس کی محبت سے برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنا صندوق کھول کر ایک اشرفی لی اور بیٹے کو دے دی۔

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا آج تو نے کیا کمایا۔

لڑکے نے جیب سے اشرفی نکال کر باپ کے سامنے رکھ دی۔ باپ نے کہا اسے کوئیں میں پھینک آ۔

لڑکے نے بلا تامل تعمیل کی۔ دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس نے دوسرے دن بیوی کو میکے بھیج دیا۔

تیسرے دن پھر اُس نے لڑکے کو بلایا۔ اور کہا۔ جا کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملے گا۔

لڑکا اپنی بہن کے پاس جا کر رونے لگا۔ بہن نے اپنا سنگاردان کھولا۔ اس میں سے ایک روپیہ نکالا اور بھائی کو دیدیا۔

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا آج تو نے کیا کمایا۔

لڑکے نے جیب سے روپیہ نکال کر باپ کے سامنے رکھ دیا۔ باپ نے کہا اسے کوئیں میں پھینک آ۔

لڑکے نے بلا تامل تعمیل کی۔ دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے دوسرے دن بیٹی کو اُس کے سسرال بھیج دیا۔

اُس کے بعد ایک دن اُس نے پھر اپنے بیٹے کو بلایا۔ اور کہا۔ جا کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملے گا۔

لڑکا سارا دن غمگین رہا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے لیکن انہیں دیکھنے والی محبت کی آنکھیں گھر میں نہ تھیں مجبوراً شام کے وقت وہ اٹھا اور بازار میں جا کر کوئی محنت مزدوری کا کام تلاش کرنے لگا۔ اور آخر اُسے کام مل گیا۔ ایک سیٹھ نے کہا میرا صندوق اٹھا کر گھر پر لے چل۔ میں تجھے دو آنے کے پیسے دوں گا۔

امیر باپ کے امیر بیٹے نے صندوق اٹھایا اور اُسے سیٹھ کے مکان پر پہنچا آیا لیکن اس وقت اس کا جسم پسینہ میں شرابور تھا۔ اُس کے پاؤں کانپتے تھے اور اُس کی گردن اور پیٹھ میں درد ہو رہا تھا۔

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا۔ آج تو نے کیا کمایا؟

لڑکے نے اپنی جیب سے دونی نکال کر باپ کے سامنے رکھ دی۔ باپ نے کہا اسے کوئیں میں پھینک آ۔

لڑکے کی آنکھوں سے غصہ کے شعلے نکلنے لگے۔ بولا۔ میری گردن ٹوٹ گئی ہے اور آپ کہتے ہیں کوئیں میں پھینک آ
دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ دوسرے دن اُس نے اپنا کاروبار بیٹے کے سپرد کردیا۔

"چندن"

غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط

سید شاہ کرامت حسین ہمدانی المتخلص کرامت کے نام

از دہلی محلہ بلی ماراں۔ ۶ مئی ۱۸۵۹ء

جیتے رہو اور خوش رہو۔ ع اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

تمہارا خط آج صبح کو آیا میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ آج کل یہاں کا حال کچھ نہ پوچھو۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھا دی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائیگی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑھ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے باقی خیر و عافیت ہے ؎

لبِ خشک۔ در تشنگی مردگاں کا　　　زیارت کدہ ہوں۔ دل آزردگاں کا

میرے اس شعر میں اظہارِ ناکامی کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مصرعہ اول کے آخر میں "ہوں" محذوف ہے تشنگی استعارہ ہے آرزو و شوق سے مطلب یہ ہے کہ میں گویا لبِ خشک ہوں اُن لوگوں کا جو آرزو و شوق میں مر گئے ہیں اور میں زیارت گاہ ہوں آزردہ دل لوگوں کا

شب غم مرا تڑپنا وہ جگر میں درد ہونا　　　کبھی رکے آہ کرنی کبھی آہ کرکے رونا

تمہارا یہ مطلع بہت اچھا ہے اور مجھے پسند ہے۔ دوسرے مصرعہ کو یوں بنادو ع
کبھی آسماں کو تکنا کبھی آہ کرکے رونا

"رو کے آہ کرنی" کے بجائے "آسماں کو تکنا" زیادہ برمحل ہے۔

نجات کا طالب غالب

"درندیم"

رقص

ہاں اٹھائے روحِ موسیقی رباب زر فشاں!　　　کھولتا ہوں رقص کی تعریف کرنے کو زباں!
رقص کیا ہے؟ خاک کے دل میں خروشِ کائنات!　　　پیکرِ فانی میں گرمِ نازِ لافانی حیات!

جلوۂ محدود کے دل میں ہے ایمائے شباب! حسنِ لامحدود بن جانے کا شیریں پیچ و تاب!

رقص کیا ہے؟ کوئی دریا جیسے تھم تھم کر بہے! انکھڑیوں کی شعر گوئی، ساعدوں کے زمزمے!

محفلِ صورت میں لیلائے معانی کا بناؤ! چشمکِ بیباک میں سیّال نغموں کا بہاؤ!

خیر سمجھا دوں ذرا لانا تو مینائے شراب! رقص اُس موقع پہ چہرے سے الٹتا ہے نقاب!

جب صبا کی سنسناہٹ اور چینی کی کھنک! قامتِ نازک میں بن جاتی ہے ہلکی سی لچک!

رقص کیا ہے؟ لرزشِ مژگاں کا لحنِ بے خروش! نرم اعضا میں تمنائے ہم آغوشی کا جوش!

خالِ خد کی نغمہ ریزی دست و پا کی گفتگو! نرگسِ مخمور میں طغیانِ حرفِ آرزو!

رقص کیا ہے؟ معنیِ بے لفظ کی شرحِ خموش! جرأتِ پنہاں کی انگڑائی تمنا کا خروش!

خون کی گردش میں ہے وہ کر بہ رنگِ نے زیر و بم! حوصلوں کی بیقراری ولولوں کا پیچ و خم!

جنبشِ اعضا میں اُن اشعارِ مبہم کا ظہور! نطق کی پرواز سے ہے آشیانہ جن کا دور!

رقص کیا ہے؟ نرگسِ بیدار کا خوابِ گراں! جنبشِ ابرو کی گویائی اشاروں کی زباں!

دست و پا کے لوچ میں وہ نرم لحنِ بے پناہ! گونج اٹھیں جس سے رگیں سن سکے جس کو نگاہ!

جوش حدِ عقل و دانش سے گذرنے دے مجھے!
بس بس اب خاموش ہو اور رقص کرنے دے مجھے!

"خیالستان"

فنِ تصنیف

لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں کمال کبھی نہ آسانی سے پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ اس کے لئے انتہائی محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔ کسی وقیع تحریر کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ نہایت آسانی اور عجلت میں لکھی گئی ہے غلط ہے۔ فی الحقیقت وہ طویل اہتمام اور دیرینہ مشق کا نتیجہ ہے۔ بعینہ یہی مثال دوسرے فنون کی ہے۔ مثلاً ڈرائنگ کا ایک بہترین نمونہ جس میں نسبتہً کم خطوط کے ذریعہ مقابلتہً زیادہ صنّاعی اور ہنرمندی ظاہر ہوتی ہو، عاجلانہ اور بے تکلف گردشِ قلم کا مرہون نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے کمال دیدہ ریزی، مشق، تصحیح اور تکرار کا۔

اعلیٰ اور کامیاب مصنفین بہت زیادہ محنتی اور محتاط ہوتے ہیں۔ آرنلڈ، اسٹیونسن، پیٹر وغیرہم اپنی تصانیف کے نہایت بے درد اور سخت نقاد واقع ہوتے تھے۔ وہ خود اپنی تحریروں میں کمی کیا کرتے تھے، اضافہ کرتے تا آنکہ اُن کی تشفی ہو جاتی۔

"ایوان"

نئی کتابیں

قرآن اور نئی روشنی۔ عصر کے مشہور اسلامی فلسفی علامہ طنطاوی جوہری کی عربی کتاب "القرآن والعلوم العصریہ" کا اردو ترجمہ ہے جسے سید حبیب احمد صاحب ثاقب کاظمی امروہوی نے اپنی سلیس اور آسان زبان میں لکھا ہے۔ علامہ موصوف نے اس کتاب میں مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین اور علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور مسلمانوں کے تنزل کے اسباب بیان کرنے کے بعد ان کو ترقی کی راہیں دکھائی ہیں۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ یہ کتاب الہامی ہے اور انہیں مسلمانانِ عالم کو بیدار کرنے کے لئے عالم الغیب کی طرف سے یہ بیانات القا ہوئے ہیں۔ واقعی قرآن حکیم کی تفسیر میں جو نکات انہوں نے پیدا کئے ہیں اور جس جوش کے ساتھ انہوں نے اس کتاب کو لکھا ہے وہ ہمیں ایک الہام ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے دنیا کی کئی ایک زبانوں میں ہو چکے ہیں اور ہمیں سید حبیب احمد صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کے ہاتھوں تک اس کی رسائی کا سامان کر دیا۔ مسلمانوں کو اس کے مطالعے اور اشاعت کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے۔ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ترقی بک ڈپو، جھونا مارکٹ، کراچی سے طلب فرمائیے۔

رہنمائے صحت۔ اس نام سے مولوی محمد اعظم خاں صاحب نے مہاتما گاندھی کی ایک مفید کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ اس میں عام فہم انداز میں ملکی ضروریات کے مطابق حفظانِ صحت کے تقریباً تمام اصول بیان کر دئے گئے ہیں۔ مترجم اور مصنف کے مقدمات کے علاوہ کتاب کے نو باب ہیں جن میں صحت کے معنی، انسان کے جسم کی تشریح، ہوا، پانی، غذا، ورزش، لباس اور جنسی تعلقات پر دلائل درج ہیں۔ فاضل مصنف نے سب سے زیادہ اہمیت جنسی تعلقات کے باب کو دی ہے۔ حقیقت میں یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور کچھ عرصے سے موجودہ زمانے کے مغربی مصلحین کی توجہ خاص طور پر اس طرف ہو گئی ہے لیکن اس باب میں مہاتما گاندھی کے بعض خیالات سے ہمیں اتفاق نہیں۔ وہ انسان کو ایسی نفس کشی کی ترغیب دیتے ہیں جس کے لئے وہ پیدا نہیں کیا گیا۔ باقی ابواب ایسے ہیں کہ ہر شخص کو انہیں اپنا دستور العمل بنانا چاہئے۔ ترجمہ نہایت اچھا ہے۔ حجم ۲۴۴ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ، مولوی محمد اعظم خاں صاحب، نصیر ولا، عثمان پورہ، حیدرآباد دکن۔

محمود گاواں۔ مولفہ جناب مولوی محمد نظیر الدین صاحب بی اے۔ یہ کتاب دکن کے مشہور مدبر و منتظم وزیر خواجہ عماد الدین محمود گاواں کی سوانح عمری اور ان کے کارناموں پر ایک آزاد تبصرہ ہے جسے مولف موصوف نے بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد نہایت محنت اور تحقیق سے لکھا ہے۔ خواجہ محمود گاواں ایک ایسا ہمت انسان تھے جنہوں نے حوادثِ زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کر کے بالآخر ایسا نام اور شہرت پیدا کی کہ دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ نظیر الدین صاحب کی اس تالیف میں خواجہ جہاں کے اوصاف اور کارناموں کا ذکر ایسے دلکش پیرائے میں کیا گیا ہے کہ آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حجم ۵۵ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔ پتہ، مکتبہ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن۔

جلد ۲۰ — نمبر ۴

فہرست مضامین

بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء

تصاویر:- ۱- فونتین بلو کا محل ——— کتب خانہ
۲- علامہ اقبال

جہاں نما

اسلام اور مسائلِ حاضرہ پر ڈاکٹر اقبال کا تبصرہ

راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے حال ہی میں سر محمد اقبال جب بمبئی سے گزرے تو ایک اخبار کے نمائندے نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران میں ہندوستان کے اس عظیم الشان شاعر نے اسلام اور مسائلِ حاضرہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اُن کا ایک مختصر سا مرقع ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ اسلام تمام بنی نوع انسان کے لئے اتحاد اور اخوت کا پیغامبر ہے اور ملوکیت کا نظام جس میں زبردست زیردستوں کا شکار کرتے ہیں اور اُن کا خون چوس کر پرورش پاتے ہیں اسلام کے بلند مقاصد میں حائل ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میرے دل میں کسی قوم یا کسی ملت کے خلاف کسی قسم کا تعصب نہیں ہے۔ میری آرزو صرف اس قدر ہے کہ اسلام ایک دفعہ پھر اپنے دورِ اول کی سادہ اور دلآویز صورت میں جلوہ گر نظر آئے۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ہندوستانی مل جل کر صلح و آشتی سے رہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خواہ ہر قوم اپنی انفرادی ہستی اور اپنے تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھے پھر بھی اس قسم کا اتحاد اور صلح جویانہ تعلقات بالکل ممکن ہیں۔

ملوکیت کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے اظہارِ خیال کے لئے درخواست کی گئی تو انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں ملوکیت کا ہر ایسا نظام جو دوسروں کو پامال کرتا ہو غیر مقدس ہے۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے مخالفین میں سے ہیں۔ موجودہ ملاقات میں انہوں نے اس بات کو بہت اہمیت دی کہ قرآن زمین کو ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال کرنے کا مخالف ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ اپنے اُن نیک نیت نقادوں کو کیا جواب دیں گے جن کا خیال ہے کہ "سیاست دان اقبال" "شاعر اقبال" پر غالب آگیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا موجودہ طرزِ عمل آپ کی شاعری سے ہم آہنگ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اپنی ذات کے متعلق کسی قسم کے خیالات کا اظہار میرا کام نہیں۔ یہ میرے نقادوں کا کام ہے مگر یہ ضروری ہے کہ وہ میرے متعلق جو رائے بھی قائم کریں میری تحریروں کے مطالعہ کے بعد قائم کریں۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بہت کم نقاد اُن کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ قوم پرستی کے متعلق میرے خیالات میں ایک خاص انقلاب آچکا ہے۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں میں بھی ایک پُرجوش قوم پرست تھا، حالانکہ اب میں ایسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب میں زیادہ صحیح طور پر

سوچ سکتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری بعد کی تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں جو اس ملک میں بہت کم سمجھی جاتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ ریاستوں کے نظام کی بقا کے حامی ہیں۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ دل سے میں جمہوریت کا قائل بھی نہیں ہوں۔ جمہوریت مجھے محض اس لئے گوارا ہے کہ اس کا کوئی بہتر بدل موجود نہیں۔

دورانِ ملاقات میں اقبال سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ سیاسی رہنما کے بجائے آپ شاعر کی حیثیت میں ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ادبیات سے میری دلچسپی کم نہیں ہوگئی، نہ میں نے وہ شغل ترک کیا ہے۔ فی الحقیقت اب بھی میں ادبیات ہی کو اپنا اہم ترین کام سمجھتا ہوں۔

سوال کیا گیا کہ "مجلسِ اقوام" اور کانفرنسوں کے فریب کا پول کھولنے میں آپ نے سب سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ آپ کو "گول میز کانفرنس" پر بہت اعتماد ہے۔ کیا آپ اپنے اس طرزِ عمل کی توجیہ کرنے کی تکلیف کر سکتے ہیں۔

شاعر اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اطمینان سے اپنا حقہ پینے میں مشغول ہو گیا۔

اس سوال پر کہ آپ قوم پرستی کے مخالف کیوں ہیں؟ ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا کہ قوم پرستی اسلام کے بلند تر اصول کی راہ میں حائل ہے۔ اسلام کسی عقیدہ کا نام نہیں۔ یہ ایک مکمل معاشرتی دستور ہے۔ اس نے نسل و رنگ کا امتیاز مٹا کر ایک اہم ترین مسئلہ حل کیا ہے۔ یہ تمام بنی نوعِ انسان کے دل و دماغ کو ایک مشترک روش پر ڈالنا چاہتا ہے۔ اسی نے اول اول نوعِ انسان میں اتحاد اور روحانی اشتراک کا خیال پیدا کیا۔ عہدِ حاضر کی قوم پرستی اس بلند نصب العین کے لئے ایک رکاوٹ ہے۔ اور یہی قوم پرستی کے خلاف میری دلیل ہے۔

عربی ممالک میں اتحاد کے امکان کے متعلق ڈاکٹر اقبال سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں ایسے اتحاد کا حامی ہوں لیکن بہ حالاتِ موجودہ اس کے راستے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ انہوں نے کہا عربی زبان کو میری نظروں میں بہت وقعت حاصل ہے۔ میرے خیال میں مشرقی زبانوں میں یہی ایک زبان ہے جس کا مستقبل ایک زندہ رہنے والی زبان کا مستقبل ہے۔ مذہب کے بعد عربی اقوام میں ان کی زبان کو ان کا سب سے بڑا رشتۂ اتحاد تصور کرتا ہوں۔

ڈاکٹر اقبال کا خیال ہے کہ اسلام کے مستقبل کی تشکیل میں ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ غالباً بہت اہم ہوگا۔ اسلام کو اپنے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بہت سی توقعات ہیں جنہیں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اسلام اور اسلامی معاملات سے ضروری واقفیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر علما موجودہ اقتصادی اور سیاسی مسائل سے ضروری واقفیت حاصل

کرلیں تو گذشتہ حالات کا علم اُن کو اسلام کے مستقبل کے متعلق سوچنے میں بہت مدد دے سکتا ہے اور اس طرح وہ اسلام کی بہت بڑی خدمت کرسکتے ہیں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہے میں نے اپنی حقیر کوششیں اس مقصد کے لئے صرف کی ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ ابھی میں اس کے متعلق اور بھی لکھوں گا۔

میں نے اسلامی فلسفے کا مطالعہ نئے فلسفے کی روشنی میں کیا ہے۔ اب میں یہی بات فقہ کی مدد سے کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں محض دینیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے مقابلہ میں بہت اہم ہے۔

میں فقہ کو بہت اہمیت دیتا ہوں حالانکہ علما نے صدیوں سے اسے پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ قرآن کا مطالعہ ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے کرنا چاہئے جو قوموں کے ظہور، ارتقا اور زوال پر روشنی ڈالتی ہے۔ الہامی کتابوں کی تاریخ میں غالباً قرآن ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے قوموں کا ذکر زندہ اجسام کی حیثیت سے کیا، جو دوسرے زندہ اجسام کی طرح جوان ہو کر بالآخر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ قرآن سمجھتا ہے کہ قومیں بعض خاص قوانین کے تابع رہی ہیں اور وہ ان قوانین کے اخلاقی پہلو پر دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں زیادہ زور دیتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ وہ تقریباً تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی آرزو رکھتے ہیں لیکن روپے کی کمی اکثر ممالک کے سفر کی اجازت نہ دے گی۔ بہرحال انگلستان سے واپسی پر وہ مصر ضرور جائیں گے۔

درصل وہ "جدید دنیائے اسلام" پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں اور حالات کے مطالعہ کے لئے وہ تقریباً تمام اسلامی ملکوں میں پھرنا چاہتے ہیں، مگر پھر وہی وسائلِ سفر کی مشکل کا سوال ہے جس کے متعلق وہ فی الحال یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

امن یا جنگ؟

جنگِ یورپ کے خاتمے سے لے کر اب تک یورپ کے اربابِ سیاست عالمگیر امن کے مستقل قیام کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں اور ابھی خدانخواستہ عرصۂ دراز تک انہی کوششوں میں مصروف رہیں گے۔ اس سلسلے میں اس وقت تک دو کانفرنسیں ہوچکی ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ بحری جنگ کے امکانات کو کم کرنے کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔ پہلی کانفرنس واشنگٹن میں اور دوسری لندن میں منعقد ہوئی۔ نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں کوششیں مایوس کن ثابت ہوئیں۔ اب آئندہ سال ماہِ فروری میں ایک تیسری کانفرنس کا انعقاد جنیوا میں ہونے والا ہے تاکہ تخفیفِ اسلحہ کے مسئلے میں باہمی مشورے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوسکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صلح کے متعلق اچھی اچھی باتیں کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ان زریں باتوں پر عمل کیا جائے۔

اس وقت دنیا کی متمدن اقوام سامانِ جنگ پر ہر سال نوے کروڑ پونڈ خرچ کر رہی ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم سے پہلے

ریاست ہائے متحدۂ امریکا آلاتِ حرب پر نو کروڑ بیس لاکھ پونڈ خرچ کرتی تھیں لیکن اب یہ خرچ ستره کروڑ پچاس لاکھ پونڈ تک پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں انگلستان اسی مد پر چھ کروڑ پونڈ خرچ کرتا تھا لیکن ۱۹۳۱ء میں یہ مصارف بڑھ کر گیارہ کروڑ دس لاکھ پونڈ تک پہنچ چکے ہیں۔ یہی کیفیت روس فرانس اور دیگر ممالک کے مصارفِ حرب کی ہے۔

امریکا کی تجویز ہے کہ آئندہ سات سال میں اپنے بیڑے کے لئے بیس کروڑ پونڈ کے صرف سے متعدد جنگی جہاز تیار کرے۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ یہ تجویز اس زمانے میں قابلِ عمل قرار دی گئی ہے جب تمام دنیا کے ممالک کی مالیات نہایت مخدوش حالت میں ہیں۔

برطانیہ نے زہریلی گیسوں کے امتحان کے لئے بمقام پورٹن (سالزبری) ایک تجربہ گاہ قائم کر رکھی ہے۔ اس تجربہ گاہ پر صرف سالِ رواں میں ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ یہ رقمِ خطیر نہ صرف گھوڑوں بلیوں اور بکریوں پر بلکہ ان جانوروں کے علاوہ اُن نوجوان رنگروٹوں پر تجربے کرنے میں صرف ہوگی جنہوں نے گراں بہا رشوتوں کے لالچ میں اپنے زندہ جسم زہریلی گیسوں کے اثر و نفوذ کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ اس طرح نئی نئی زہریلی گیسوں کی خاصیتیں دریافت کی جا رہی ہیں تاکہ آئندہ جنگ کے موقع پر ہلاکت پھیلانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

دنیا میں امن کا قائم کرنا کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ یورپ کا دماغ اس قسم کے مہلک تجربوں کے امتناع کے لئے کسی بین الاقوامی مفاہمت تک پہنچ سکے۔

جنگِ عظیم کے مہیب نقصانات کی فہرست پر صرف ایک نظر ڈالتے سے دل کانپ جاتا ہے۔ اس جنگ میں ایک کروڑ انسان ہلاک ہوئے جو اپنے پیچھے دو کروڑ زخمی، نوے لاکھ یتیم اور پچاس لاکھ بیوائیں چھوڑ گئے!

جس قدر بارود زہریلی گیس اور جنگی جہاز زیادہ تیار کئے جائیں گے اُسی قدر جنگ کے موقعے زیادہ پیدا ہونگے اور انسان کی وحشیانہ حسِ نبرد ہر وقت بیدار رہے گی۔ قیامِ امن کا راستہ یہ ہے کہ باہمی بدگمانیاں دور کی جائیں۔ ایک قوم دوسری سے خوف کھانا چھوڑ دے اور اربابِ سیاست کی نیتیں حرص کینے اور سازش سے پاک ہوں۔

سابق قیصر کی سیرت کا ایک روشن پہلو

گذشتہ جنگِ عظیم میں خون و آتش کا جو ہولناک کھیل کھیلا گیا اُس کا سب سے بڑا ذمہ دار سابق قیصرِ جرمنی سمجھا گیا ہے اس لحاظ سے شاید اکثر لوگوں کے نزدیک قیصر دنیا کا سب سے بڑا سنگدل اور قسی القلب انسان ہے۔ جنگ کے آغاز سے لے کر اس وقت تک مہذب دنیا نے کبھی قیصر کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ اس لئے شاید ذیل کی دلچسپ کہانی جو قیصر کی سیرت پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالتی ہے اکثر لوگوں کے لئے باعثِ انشراح ثابت ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی غم و موت

کی آسمانی صفات سے لازماً خالی نہیں ہوتا۔

حال ہی میں فیلڈ مارشل سر جان فرنچ کے سوانح حیات پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے کہ سابق قیصر نے ایک موقع پر ایک انگریز افسر کو جو جرمنی کا اسیر جنگ تھا محض اعتبار پر تین ہفتے کی رخصت دے دی تاکہ وہ اپنی بیمار ماں سے ملاقات کر سکے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایسٹ سرے رجمنٹ کا کپتان کیمبل زخمی ہو کر جنگی قیدی کی حیثیت سے قیصر کی فوج کے ہاتھوں میں پڑا۔ اسی وقت کپتان کو اپنی ماں کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ ماں بیٹے کو ایک دوسرے سے انتہائی محبت تھی بلکہ ماں بیٹے کی پرستش کرتی تھی۔ اُسے اپنے بیٹے کے افسوسناک انجام سے سخت صدمہ ہوا۔ ادھر کپتان ہسپتال میں پڑا ہوا ہر وقت اپنی ماں کی علالت کے خیالوں میں محو رہتا۔ اُسے امید نہ تھی کہ جرمنی کا جنگی دفتر اُسے اُس کی ماں سے ملنے کی رخصت دے گا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے رخصت مل جائے تو غالباً میری ماں کی جان بچ سکتی ہے۔ آخر اس نے امید کے خلاف امید باندھی اور قیصر کے نام ایک ذاتی عرضداشت اس مقصد کے لئے بھیجی۔ کپتان کی حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے علم ہوا کہ قیصر نے اُس کی مطلوبہ رخصت کی درخواست منظور کر لی ہے۔

فونتین بلو کا محل ——— کتب خانہ

فونتین بلو کا محل پیرس سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ خاص نپولین کا محل ہے جسے اُس نے ورسائی کو چھوڑ کر جہاں فرانس کے قدیم لوئی بادشاہوں کے محل اور باغ تھے اور جہاں فرانس کے بادشاہ انقلاب فرانس سے قبل رہتے تھے بنوایا تھا۔ اس محل کے دوسری طرف فونتین بلو کا جنگل ہے جو فرانس کے سب سے خوبصورت جنگلوں میں ہے۔ مقابل کی تصویر میں اس محل کا کتب خانہ دکھایا گیا ہے۔ کتب خانے میں ایک تحریر محفوظ ہے جس میں لکھا ہے کہ اتحادی دول کی مرضی کے مطابق (جو فرانس کے خلاف تھیں اور جن کے ہاتھوں نپولین نے شکست کھائی) میں فرانس کے تخت و تاج کو چھوڑتا ہوں تاکہ یورپ میں امن قائم رہے۔ اسی محل کے اندرونی صحن میں کھڑے ہو کر نپولین نے ایلبا کے جزیرے میں جلاوطن کئے جانے سے قبل اپنے سپاہیوں کو خطاب کیا۔ اس محل میں نپولین کے تخت کا کمرہ، سونے کا کمرہ، کونسل کا کمرہ وغیرہ سب اِس وقت تک خوب سجے سجائے موجود ہیں۔

نواہائے راز

جس رُخ پہ نظر ڈالی تصویر تری پائی
جس لب سے صدا نکلی تقریر تری پائی

ہر برگ کو ہر گل کو مکتوب ترا جانا
لوحِ دل و جاں پر بھی تحریر تری پائی

کس طرح رہا ہوں میں اس قید سے اے مالک
جب ہر بُنِ مُو پر اک زنجیر تری پائی

ٹوٹے ہوئے دل سے بھی الفت نہ گئی تیری
ہر ایک خرابے میں تعمیر تری پائی

اب میری خطاؤں سے اغماض نہ کر آقا
الطاف سے شیریں تر تعزیر تری پائی

تقدیر کو کیا روئیں تدبیر کو کیا پیٹیں
تقدیر تری دیکھی تدبیر تری پائی

ہم رہ سے بھٹک سکتے اتنی بھی نظر کب تھی
جو اپنی خطا دیکھی تقصیر تری پائی

حامد علی خاں

دائمی شباب

پنجابی میں ایک نہایت پُرمعنی ضرب المثل ہے جس کا قریب ترین مفہوم یہ ہے

وقت کی نماز، بے وقت کی ٹکریں

عام مطلب تو یہی ہے کہ کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو نماز کو بے وقت ادا کرنا گویا یونہی سر پھوڑنا ہے مگر اس معمولی سی بات کی تہ میں جو راز ہے یہ ہے کہ اگر کوئی وقت پر نماز ادا کرے گا تو قدرۃً کسی مسجد میں **باجماعت** نماز ادا کریگا گویا اصلی نماز میں خدا کی عبادت اس قدر مقصود نہیں جس قدر کہ مسلمانوں کا جمع ہونا اور مل کر کچھ کرنا ۔ نماز عشق ہے مگر خدا کا نہیں، ہرگز نہیں، مسلمانوں سے عشق کا نام نماز ہے ۔ خدا محض بہانہ ہے ۔ کوئی اسے یوں سمجھ لے کہ جو شخص بُرے مسلمان کو بھی بُرا کہے وہ نمازی نہیں، صرف سر پھوڑنے کا عادی ہے ۔

کہاں میں کہاں یہ وعظ کی دھن مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ جو مطلب ادا کرنا چاہتا ہوں وہ وعظ ہی کے رنگ میں ادا ہو سکتا ہے جس طرح نماز کا کمال یہ ہے کہ نماز عشق بن جائے چاہے وہ خدا ہی کا عشق ہو اور مسلمانوں سے عشق کے پایۂ کمال کو نہ پہنچے اسی طرح عشق کا کمال یہ ہے کہ وہ نماز بن جائے جس مرد میں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنی معشوقہ کا کوئی عیب اسے نظر آتا ہے وہ مرد عشق سے بے بہرہ ہے ۔ خام عشق عشق ہی نہیں محض سر پھوڑنا ہے ۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ عشق کرو تو شباب میں کرو کیونکہ شباب کے بعد یہ تانا بانا رنگ نہیں پکڑتا ۔ کہاں بھوسلے رنگ کی خاکستری زندگی اور کہاں وہ ارغوانی شادمانی جو شباب میں عشق کی کامرانیوں کا انعام ہے ۔

شباب کا عشق، بڑھاپے کی ٹکریں

یہ عبارت یہاں تک لکھی جا چکی تھی کہ اُس قصے کا خیال آگیا جس میں ایک سائنس دان شیشے کا ایک ایسا گھٹاٹوپ ایجاد کرتا ہے کہ مرتے وقت اگر اس بلوریں گھٹاٹوپ کو مرنے والے کے اوپر جما دیا جائے تو روح یا وہ روحانی طاقت جس سے انسان زندہ ہے خود بخود بلوریں گھٹاٹوپ کے اوپر کے حصّہ میں سما کر جو بجلی کے قمقموں کی طرح کانچ کا بلب ہے، آپ ہی بند ہو جاتی ہے ۔ یوں تو نظر کچھ نہیں آتا مگر ایک خاص قسم کی ایکس ریز سے اس بلب کو جو دیکھا جائے تو یہ روح یا طاقت نہایت

خوشنما رنگوں کا مجموعہ ہے اور اس طاقت کی رنگینیوں کی سحرکاریاں کسی حد تک خارج از قیاس ہیں۔ اس ستم ایجاد سائنس داں نے یہاں تک کیا کہ دو روحوں کو ایک ہی بلب میں بند کر کے بھی دیکھا۔ متضاد روحیں تو ایک دوسری کے ساتھ ملتے ہی گویا جل بھن کر خاک ہو گئیں مگر مانوس روحیں اور بھی زیادہ چمکیں۔ جن روحوں میں کچھ قدرتی انس تھا وہ تو ایک دوسری سے مل کر اس طرح شعلہ زن ہوئیں کہ ہیرے موتی پانی پانی ہوں، لعل و زمرد پھیکے پڑ جائیں۔ اس سائنس داں کا مطلب کوئی تماشا قائم کرنا تو نہ تھا صرف یہ دکھانا تھا کہ وہ جادو جس کا نام انسان ہے مرنے پر تلف نہیں ہوتا۔ رہتا ہے اور ایسا رہتا ہے کہ اگر نااہل سے پالا نہ پڑے تو پہلے سے بہت زیادہ آب و تاب کے ساتھ۔

یہ قصہ یونہی درمیان میں آگیا۔ روحیں اگر رنگین شعلے ہیں تو شباب میں عشق کی برقی رو انہیں اور بھی زیادہ نمایاں کر سکتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ شباب صرف وہ فساد ہے جو محض جسمانی جوانی کا ایک خاصہ ہے یا اس شباب کا کوئی الگ معیار ہے

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے کبھی اپنی بلند آواز کو کسی ایسی چیز کے لئے ضائع نہ کرتا جو ہر ذی روح میں قدرتی طور پر ضائع ہوتی ہے۔ جوانی ذاتی ضائع ہوتی رہتی ہے اور اسے ضائع ہونا چاہیئے۔

"جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی"

جوانی جاکے نہیں آتی جس شباب کا یہاں ذکر ہے اس کا آنا مشکل ہے مگر آجائے تو پھر کبھی نہیں جاتا۔ جنہیں یہ شباب حاصل نہیں وہ اسے اُس خدا سے طلب کریں جو

دائمی شباب

ہے اور جو اسی لئے ہمہ تن عشق ہے اور جسے اسی لئے کبھی سزا اور جزا کی فرصت ہی نہ ہوگی۔

اس نازک انوکھے مسئلے کو کون سمجھے گا؟ لوگوں میں یہ غلط العام مروج ہے کہ انسان بچہ پیدا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان بے انتہا بوڑھا پیدا ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر ہی پہلے چار پانچ مہینے میں اس بیچارے پر ہزارہا قرن گذر جاتے ہیں۔ شکل مچھلی سے بدلتے بدلتے کتے کی طرح بن کر پھر انسانی ڈھانچہ اختیار کرتی ہے۔ کیا صانع ازل ہر "مغرور شکاری بوند" پر اس قدر محنت محض اس لئے صرف کرتا ہے کہ شباب کے بعد بڑھاپا ہو؟ لاحول ولا قوۃ ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے سچ ہو جو صرف جسم کے لئے زندہ ہیں گو مجھے اس میں بھی شک ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ انسان باقی ذی روح چیزوں سے مختلف ہے۔ بادل کی جڑ سمندر میں ہے پھول کی جڑ زمین میں ہے۔ روشنی کی جڑ تاریکی میں ہے۔ یہ سب چیزیں باہر کی طرف پھولتی پھلتی ہیں مگر انسان کی جڑ ہماری دنیا ہے۔ انسان وہ پھول ہے جو اللہ کی طرف کھلتا ہے اس پھول کی خوشبو عشق ہے مگر یہ خوشبو صرف اسی شباب میں ظاہر ہوتی ہے جس کو دوام ہے۔

فلک پیما

ایران سے ایک خط

مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایران سے ایک مفصل خط اپنے ایک عزیز کے نام لکھا ہے اس کے کچھ اقتباسات سید مقبول حسین صاحب کی وساطت سے ہمیں بغرضِ اشاعت موصول ہوئے ہیں۔

ایران میں آج کل ہندوستان سے زیادہ امن وامان ہے۔ بلوچی، ازبیگ، ترکمان، کرد، ایسی قومیں ہیں جن کا پیشہ حضرت آدم کے زمانے سے لے کر ۱۹۲۵ء تک ڈاکہ زنی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ رضا شاہ نے سب کے دماغ درست کر دیئے ہیں، جہاں کہیں جائیے کوئی خوف وخطرہ نہیں ہے خدا کرے یہ حالت قائم رہے جنگل، بیابان، دشت، ہر طرف پولیس اور فوج کے تھانے قائم ہیں، تمام دن تھانے کے اوپر "ممالک محروسۂ ایران" کا جھنڈا (جو ہمارے کانگرس فلیگ کی طرح سہ رنگی یعنی سفید اودے اور سرخ رنگ کا ہے) لہراتا رہتا ہے، شام کو جھنڈے کے اوپر ایک لالٹین ٹانگ دیتے ہیں تاکہ مسافروں کو معلوم ہو جائے کہ آبادی کہاں ہے۔ میں نے ایران کے ہر کونے میں یہ تھانے پائے ہیں۔

فوج اور پولیس کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ ایرانی اپنے آپ کو طبعًا سست اور کاہل سمجھتے ہیں۔ اس سستی کو دور کرنے کے لئے دولت نے قاعدہ بنایا ہے کہ ہر ایرانی کے لئے دو یا تین سال فوج یا پولیس میں کام کرنا فرض ہے۔ پولیس کی وردی سفید اور بہت بھدّی ہے۔ فوج کی وردی وہی ہے جو یورپ کی قوموں میں رائج ہے، پہلوی ٹوپی ہر فوجی بلکہ ہر ایرانی کے لئے ضروری ہے۔ میں نے کچھ ایرانیوں سے دریافت کیا کہ تم ایک فرنچ کیپ کو کیوں اپنا ملّی لباس سمجھتے ہو، ان کا جواب ہے، کہ ہم نے اس کو مسلمان اور ایرانی کر ڈالا ہے۔

فوج اور پولیس کے لئے قانونًا حکم ہے کہ کوئی ایسی چیز استعمال نہ کریں جو ایران میں نہ بنی ہو اسلحۂ جنگ اس قاعدے سے مستثنٰے ہیں۔ حال میں ایک نئے قانون کے ماتحت یورپ سے تمام ان اشیا کا آنا بند کر دیا گیا ہے جو ملّی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہیں مثلاً "اشیاء برائے زینت چہرہ ولباسِ زناں" پاوڈر، ریشم کے کپڑے، سگار اور ہر قسم کی شراب جو یورپ میں تیار ہوتی ہو۔ برخلاف اس کے وہ شراب جو ایران میں ایرانی انگوروں سے تیار ہوتی ہو، اس کو یہاں کے باشندے مذہبًا نہیں تو ملتہً جائز سمجھتے ہیں۔ شراب خواری کا چنداں رواج نہیں ہے۔ کچھ لوگ اگر پیتے بھی ہیں تو کم پیتے ہیں۔ میں نے آج تک ایک بھی ایسا ایرانی نہیں دیکھا جو مدہوشی کی حالت میں ہو۔ یورپ کی جو چیزیں بالکل ممنوع نہیں ہیں اُن پر سو فی صدی کا ٹیکس لگایا جاتا

ہے مثلاً اچھا خوشبودار کاغذ (جس پر آپ کو لکھنے کی عادت ہے) اس کا ایران میں لانا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی لائے تو اس کو ملازمان گمرک (چُنگی کے عہدہ دار) چھین لیتے ہیں۔ اوسط درجہ کے کاغذ پر ۱۰۰ فیصدی کا ٹیکس ہے۔ برخلاف اس کے ردی کاغذ یعنی وہ کاغذ جو روزمرہ کے استعمال اور کتابوں کے چھاپنے کے لئے ضروری ہے بغیر ٹیکس دیئے ہوئے آتا ہے اور چنداں گراں نہیں۔ باہر کے سگار، تمباکو، سگریٹ اب یہاں بالکل نہیں آسکتے، ایرانی سگرٹ خراب نہیں ہوتے اور قیمت میں گولڈ فلیک سیزرز وغیرہ سے بہت کم ہیں۔ اچھی قسم کے سگرٹ یہاں نہیں بنتے ہیں۔

گاؤں کی عورتوں کے علاوہ آپ کی تمام ایرانی بہنیں بجز انگریزی فراک اور لمبی جرابوں کے اور کوئی لباس پہننا نہیں جانتیں۔ یہاں تک کہ حاجیوں، مولویوں اور اہل دین کے خاندانوں میں بھی یہی لباس رائج ہے۔ طہران میں کچھ عورتوں نے پردہ چھوڑ دیا ہے۔ اور سگرٹ پیتی ہوئی ہیٹ پہن کر نکلتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اب تک کم ہے۔ بالعموم یہاں ایک سیاہ برقع رائج ہے جس کو یہاں کی اصطلاح میں چادر کہتے ہیں۔ یہ بہت بھدا، خوفناک اور کریہہ المنظر ہوتا ہے۔ اگرچہ چادر جسم کو ڈھانپ رکھے تو کافی ہے چہرے کا چھپانا چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ آنکھیں، ناک اور اوپر کا ہونٹ عام طور پر کھلا رہتا ہے برخلاف ہندوستان کے یہاں شریف گھرانے کی بیبیوں کے لئے مکان کے باہر کام کاج کے لئے جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ آج کل ایران میں شاید ہی کوئی عورت ایسی ہو جو ہندی مسلم عورتوں کی طرح تمام زندگی گھر میں نظر بند رہی ہو۔ بایں ہمہ کسی معمولی ایرانی مرد کی جرأت نہیں ہوتی کہ طہران کے علاوہ (یہاں یورپ کا اثر کسی قدر زیادہ ہے) کہیں اور اپنی بی بی ماں یا بہن کے ساتھ سڑک پر گھومے عورتیں ہمیشہ اکیلی چلتی ہیں یا اپنا الگ جھنڈ بناتی ہیں۔ برسر راہ عورتوں اور مردوں میں کبھی گفتگو نہیں ہوتی، الّا بضرورت سخت کچھ دن ہوئے کہ ایک ایرانی دوست کے ساتھ تفریح کے لئے مشہد میں نکلا تھا۔ دوسری طرف سے اُن کی خانم نمودار ہوئیں اور سر سے کچھ اشارا کیا۔ بیچارے بہت گھبرائے۔ کیا کرتے۔ نظر زمین کی طرف کی، پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتار سے سڑک کے دوسری طرف گئے اور پھر صرف ایک لفظ کہہ کر واپس بھاگ آئے، بھاگتے وقت سڑک کے دونوں طرف دیکھتے تھے کہ کہیں مجھے کسی دوست یا واقف نے تو نہیں دیکھ لیا۔ امید ہے کہ چار پانچ سال کے بعد یہاں کے مردوں میں زیادہ جرأت و ہمت ہو جائیگی۔

میرا خیال تھا کہ ایرانی مردوں اور عورتوں میں یورپ کا لباس حال میں رائج ہوا ہے، لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ مجھے اکثر ایرانیوں نے یقین دلایا ہے کہ انہوں نے اپنے والدین کو ہمیشہ یورپین لباس میں دیکھا ہے۔ ایک آغا صاحب جن سے مجھے کل ملنے کا اتفاق ہوا کہنے لگے کہ میں پینتیس سال سے یہ لباس پہن رہا ہوں اور میرے ماں باپ نے میری پیدائش سے بیس سال پہلے یہ لباس اختیار کیا تھا۔ غالباً ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانہ سے پہلے لباس اروپا کا رواج ہو چلا تھا، اب تو مزدور کاشتکار سب کوٹ اور پتلون ڈانٹتے ہیں۔ کچھ گاؤں کی عورتوں کو بھی میں نے فراک میں دیکھا۔ پرانا ایرانی لباس بالکل مفقود

میں جس حصہ میں ہو کر آیا ہوں تقریباً تمام ویران ہے۔ اکثر میلوں تک ایک پتی یا جھاڑی نہیں دکھائی دیتی جس دن سے کوئٹہ چھوڑا ہے ایک خودرو درخت نہیں دکھائی دیا، صرف چشموں کے آس پاس پھلوں کے درخت ہوتے ہیں شیشم، برگد، پیپل یا نیم کی طرح کے کوئی درخت یہاں نہیں ہیں۔ زمین غالباً اچھی ہے لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے بے کار پڑی ہے۔ فطرت نے ایران کے لئے کچھ نہیں کیا، جو کچھ دکھائی دیتا ہے انسانی کوشش کا نتیجہ ہے۔

موسم یہاں کا منصوری اور نینی تال جیسا ہے۔ لوگوں کی صحت اچھی ہوتی لیکن متعہ کی رسم کی وجہ سے مرض بہت پھیل گیا ہے۔ اکثر شریف خاندان اس میں مبتلا ہیں، اور زیادہ تر مریض ایسے ہیں جن کو یہ بدنصیبی وراثتہً حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ موروثی ہے اس لئے اس کا اعتراف بھی برا نہیں سمجھتے: جو نعمت ہر گھرانے میں موجود ہے اُس کو کون بُرا کہے۔ دورِ جدید میں سنا جاتا ہے کہ متعہ کو معیوب سمجھنے لگے ہیں اور یہ رسم کسی قدر کم ہو گئی ہے لیکن اہلِ دین کا طبقہ اس رسم کا حامی ہے اور دولت نے اب تک اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کی جرأت نہیں کی۔

یہاں تمام اشیا ہندوستان کے مقابلہ میں ارزاں ہیں سوائے اُن چیزوں کے جو یورپ سے آتی ہیں برخلاف اس کے وہ چیزیں جو روس سے آتی ہیں وہ بہت سستی ہیں۔ یورپ کے باشندے خاص کر روسی ملک کے ہر حصہ میں ملتے ہیں۔ ارمنی اور دیگر عیسائی قوموں کی کافی تعداد ہے۔ دورِ پہلوی کے اور کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے یورپ کے باشندوں کے دماغ سے گھمنڈ بالکل نکال دیا ہے۔ پہلے یورپین سمجھتے تھے کہ اُن کو ایران کے قوانین توڑنے کا حق حاصل ہے۔ رضا شاہ نے ایسے چند مجرموں کو سخت سزا دی۔ اب سب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھتے ہیں۔ ایران سے سونا باہر لے جانا منع ہے۔ حال میں ایک بہت بڑی موٹر کار کمپنی کا مینیجر گرفتار ہوا ہے جس نے سونے کی سلاخیں بنائی تھیں تاکہ موٹر کار کے پیچھے لگا کر اُن کو ملک کے باہر لے جا سکے، رضا شاہ کا حکم ہوا ہے کہ یہ ہرگز نہ خیال کیا جائے کہ وہ یورپین ہے۔ جو قانونی سزا ہے وہ دی جائے۔

میں جس حصہ میں ہوکر آیا ہوں تقریباً تمام ویران ہے۔ اکثر میلوں تک ایک پتی یا جھاڑی نہیں دکھائی دیتی جس دن سے کوئٹہ چھوڑا ہے ایک خودرو درخت نہیں دکھائی دیا۔ صرف چشموں کے آس پاس پھلوں کے درخت ہوتے ہیں شیشم، برگد، پیپل، نیم کی طرح کے کوئی درخت یہاں نہیں ہیں۔ زمین غالباً اچھی ہے لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے بے کار پڑی ہے۔ فطرت نے ایران کے لئے کچھ نہیں کیا، جو کچھ دکھائی دیتا ہے انسانی کوشش کا نتیجہ ہے۔

موسم یہاں کا منصوری اور نینی تال جیسا ہے۔ لوگوں کی صحت اچھی ہوتی لیکن متعہ کی رسم کی وجہ سے مرض بہت پھیل گیا ہے۔ اکثر شریف خاندان اس میں مبتلا ہیں، اور زیادہ تر مریض ایسے ہیں جن کو یہ بدنصیبی وراثتہً حاصل ہوئی ہے۔ چونکہ موروثی ہے اس لئے اس کا اعتراف بھی برا نہیں سمجھتے: جو نعمت ہر گھرانے میں موجود ہے اُس کو کون بُرا کہے۔ عہدِ جدید میں سنا جاتا ہے کہ متعہ کو معیوب سمجھنے لگے ہیں اور یہ رسم کسی قدر کم ہوگئی ہے لیکن اہلِ دین کا طبقہ اس رسم کا حامی ہے اور دولت نے اب تک اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کی جرأت نہیں کی۔

یہاں تمام اشیا ہندوستان کے مقابلہ میں ارزاں ہیں سوائے اُن چیزوں کے جو یورپ سے آتی ہیں۔ برخلاف اس کے وہ چیزیں جو روس سے آتی ہیں وہ بہت سستی ہیں۔ یورپ کے باشندے خاص کر روسی ملک کے ہر حصہ میں ملتے ہیں۔ ارمنی اور دیگر عیسائی قوموں کی کافی تعداد ہے۔ دولتِ پہلوی کے اور کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے یورپ کے باشندوں کے دماغ سے گھمنڈ بالکل نکال دیا ہے۔ پہلے یوروپین تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اُن کو ایران کے قوانین توڑنے کا حق حاصل ہے۔ رضا شاہ نے ایسے چند مجرموں کو سخت سزا دی۔ اب سب ٹھیک ہوگئے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھتے ہیں۔ ایران سے سونا باہر لے جانا منع ہے۔ حال میں ایک بہت بڑی موٹر کار کمپنی کا مینیجر گرفتار ہوا ہے جس نے سونے کی سلاخیں بنائی تھیں تاکہ موٹر کار کے پیچھے لگا کر اُن کو ملک کے باہر لے جاسکے۔ رضا شاہ کا حکم ہوا ہے کہ یہ ہرگز نہ خیال کیا جائے کہ وہ یوروپین ہے۔ جو قانونی سزا ہے وہ دی جائے۔

محمد حبیب

بادل

(سانیٹ)

چھائے ہوئے ہیں چار طرف پارہ ہائے ابر،
آغوش میں لئے ہوئے دنیائے آب و رنگ،
میرے لئے ہے اُن کی گرج میں سرودِ چنگ،
پیغامِ انبساط ہے مجھ کو صدائے ابر
اُٹھی ہے ہلکے ہلکے سُروں میں نوائے ابر،
اور قطرہ ہائے آب بجاتے ہیں جلترنگ،
گہرائیوں میں روح کی جاگی ہے ہر امنگ،
دل میں اُتر رہے ہیں مرے نغمہ ہائے ابر!

مدّت سے لُٹ چکے تھے تمنا کے بار و برگ،
چھایا ہُوا تھا روح پہ گویا سکوتِ مرگ،
چھوٹی ہے آج روح مری اس جمود سے۔
ان بادلوں سے تازہ ہوئی ہے حیات پھر،
میرے لئے جوان ہے یہ کائنات پھر،
شاداب ہو گیا ہے دل اُن کے سرود سے!

راشد وحیدی

دشمن کا سُراغ

اُس رات مسٹر اسحاق نہایت شوق سے والٹرلس پرگوہر کا گا نا سن رہے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے آپ ہی آپ کہا "واقعی یہ گیت اچھا تھا" ۔۔۔ دفعتہً باہر سے دو گولیاں چلنے کی دہشتناک آواز آئی اور اُن کے سر کے ادھر والی کھڑکی کے شیشے چُور چُور ہو کر گر پڑے (جس کمرے میں مسٹر اسحاق بیٹھے تھے وہ مکان کی سب سے نچلی منزل میں تھا)

اُنہوں نے وہی کچھ کیا جو ہم میں سے ہر شخص ایسے موقع پر کرتا ہے یعنی ایک لمحے تک وہ بالکل بے حس وحرکت بیٹھے رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یکایک اُن پر خوف طاری ہؤا اور انہیں احساس ہؤا کہ کسی نے ان پر دو گولیاں چلائی ہیں۔ اُن کے سامنے کے دروازے کی لکڑی چھل گئی تھی اور اُس کے نیچے گولی دھنسی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے خیال کیا کہ گلی میں دوڑ پڑیں اور اس بدمعاش کو گردن سے جا پکڑیں لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جوں جوں انسان عمر میں بڑھتا جاتا ہے وہ اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ پہلے ارادے کو ترک کر کے دوسرے پر عمل کرتا ہے۔ چنانچہ مسٹر اسحاق ٹیلیفون کی طرف جھپٹے اور پولیس کو بلایا۔

"ہیلو! کسی کو فوراً بھیجو۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔"

کسی نے نیم خوابیدہ آواز میں پوچھا "لیکن کس جگہ؟"

مسٹر اسحاق نے غصے سے لال پیلا ہو کر کہا، جیسے پولیس والے اس حملے کو روک سکتے تھے "یہیں میرے مکان پر"

"کس قدر سینہ زوری ہے، ایک بے قصور آدمی پر جو آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا ہو اس طرح بلاوجہ گولہ باری شروع کر دی جائے اس کی تفتیش سختی سے کرنی ہوگی یہ خوب ہے کہ ۔۔۔"

اسی نیم خوابیدہ آواز نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا میں کسی کو بھیجتا ہوں"

اضطراب انگیز غصے میں مسٹر اسحاق کے منہ سے جھاگ اُبل رہا تھا۔ انتظار کے یہ لمحات انہیں صدیاں محسوس ہو رہے تھے۔ آخر ایک لمبا تڑنگا کڑیل انسپکٹر پولیس پہنچ گیا۔ اور اس نے نہایت غور سے اُس کھڑکی کا معائنہ شروع کر دیا جس میں سے گولیاں آئی تھیں۔

اُس نے نہایت متانت سے کہا "کوئی شخص یہاں گولیاں چلاتا رہا ہے۔"

مسٹر اسحاق نے غصہ سے کہا "یہ تو میں بھی آپ کو بتا سکتا تھا میں یہیں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا"

انسپکٹر نے ایک چاقو کی مدد سے دروازہ میں سے گولی نکالتے ہوئے کہا "سات نمبر کی گولی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پرانے فوجی ریوالور سے چلائی گئی ہے۔ دیکھئے نا۔ یہ شیطان جو کوئی بھی تھا، ضرور اُس سامنے کے جنگلے پر کھڑا ہوگا۔ اگر وہ فرش پر کھڑا ہوتا تو گولی ضرور اوپر نکل جاتی۔ تو جناب اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا"

مسٹر اسحاق نے تلخی سے کہا "عجیب بات ہے۔ میں سمجھا تھا کہ اُس نے دروازے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے"

انسپکٹر نے اس دخل در معقولات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے کہا "لیکن وہ تھا کون؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اُس کے ٹھکانے کا صحیح پتہ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ مجھے اُس کی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا اور ویسے بھی مجھے پوچھنے کا خیال نہیں آیا"

انسپکٹر نے اُسی متانت سے کہا "اس سے تو معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے اور آپ کا شبہ کس پر ہے؟"

اب مسٹر اسحاق کو صبر کا یارا نہ رہا۔ انہوں نے غصہ سے کہا "حضرت من اول تو میں نے اُس سؤر کو دیکھا نہیں اور اگر وہ اس قدر انتظار کرتا بھی کہ میں کھڑکی میں سے اُسے سلام کر سکتا۔ تب بھی میں اس اندھیرے میں اُسے پہچان نہ سکتا تھا۔ حضور والا اگر میں اُس سے واقف ہوتا تو آپ کو اس وقت زحمت دینے کی ضرورت ہی کیا تھی"

انسپکٹر نے اطمینان آمیز لہجے میں کہا "ہاں بات تو معقول ہے۔ لیکن شاید آپ سوچ کر کوئی ایسا شخص بتا سکیں جسے آپ کی موت سے فائدہ پہنچنے والا ہو۔ یا جو آپ سے کسی بات کا انتقام لینا چاہتا ہو۔ ورنہ جناب آپ جانتے ہیں کہ یہ چوری کی واردات نہیں ہے۔ کوئی چور گولی نہیں چلاتا جب تک کہ اس کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔ ممکن ہے یہ کوئی ایسا آدمی ہو جسے آپ کے ساتھ دشمنی ہو۔ اس کا فیصلہ صرف آپ ہی کر سکتے ہیں ——— اور پھر ہم اس پر غور کریں گے"

مسٹر اسحاق حیران سے ہو کر رہ گئے۔ واقعی انہیں ان باتوں کا خیال ہی نہ آیا تھا۔

انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "مجھے تو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں" اور اپنی تمام پُر امن اور تنہا زندگی پر ایک نظر دوڑائی "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ یقیناً کوئی نہیں ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا، میں تو تنہا ہی رہتا ہوں۔ کہیں جاتا آتا بھی نہیں اور نہ دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دیتا ہوں۔ کسی کو میری دشمنی سے کیا مطلب؟"

انسپکٹر نے کندھوں کو سکوڑتے ہوئے کہا "درست ہوگا لیکن شاید آپ کل تک اس معاملہ پر اچھی طرح روشنی ڈال

سکیں۔ آپ کو یہاں تنہائی میں ڈر تو نہ معلوم ہوگا؟"

مسٹر اسحاق نے ذرا تامل سے کہا "نہیں تو" اور جب وہ اکیلے رہ گئے تو آپ ہی آپ کہنے لگے "عجیب بات ہے۔ میری جان لینے کی کسی کو کیا ضرورت تھی۔ بھلا میں نے جو راہبوں کی سی زندگی بسر کرتا ہوں۔ کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ دفتر جاتا ہوں اور پھر سیدھا گھر آجاتا ہوں۔ میری تو راستے میں بھی کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوتی۔ پھر کسی کے لئے میری جان لینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ لوگوں کے اس غیر منصفانہ رویہ کے متعلق ان کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُنہیں اپنی مظلومیت پر رحم آنے لگا۔ "دیکھو! میں ایک گھوڑے کی طرح مسکنت اور مشقت کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ دفتر کا کام گھر پر بھی آکر کرتا ہوں، حدودِ شرافت سے کبھی ذرہ بھر بھی تجاوز نہیں کیا۔ کبھی میں نے عیش وعشرت میں قدم نہیں رکھا۔ گھونگے کی طرح اپنے خول میں گھسا رہتا ہوں اور ڈرتا!! کوئی آتا ہے اور مجھے اپنی گولی کا ہدف بنانا چاہتا ہے۔ لوگ کس قدر شیطان صفت ہیں۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ کسی کو مجھ سے ایسی دیوانہ وار نفرت کیوں ہے؟"

وہ بستر پر بیٹھے تھے۔ پاؤں سے اتارا ہوا بوٹ ابھی اُن کے ہاتھ ہی میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہے تھے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "اس معاملے میں ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ اُس نے مجھے کوئی اور شخص سمجھا ہوگا جس کے ساتھ اس کی دشمنی ہوگی۔ یقیناً یہی بات ہے۔ کیونکہ مجھ سے کسی کو ایسی نفرت ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

مسٹر اسحاق کو یکایک کچھ یاد آگیا اور گھبراہٹ میں اُن کے ہاتھ سے بوٹ گر گیا۔ "ہاں یہ ممکن ہے۔ اس میں میری بیوقوفی تھی، لیکن اُس وقت بے ساختہ وہ بات میری زبان سے نکل گئی۔ اُس وقت میں رب نواز سے باتیں کررہا تھا لیکن نتائج کو سوچے بغیر میرے منہ سے اُس کی بیوی کے متعلق ایک بُری بات نکل گئی تھی۔ گو سب جانتے ہیں کہ وہ بے شرم ہر نتھو خیرے سے آنکھیں لڑاتی پھرتی ہے اور اُس کے شوہر کو بھی اس کا علم ہے لیکن وہ اپنے اس علم کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اور مجھے دیکھو گدھوں کی طرح بک اُٹھا......

مسٹر اسحاق کو یاد آگیا کہ رب نواز اس وقت کڑوے گھونٹ کی طرح کچھ نگل رہا تھا اور اُس کی انگلیاں غصے سے ہتھیلی میں کھبی جاتی تھیں۔ انہوں نے خوفزدہ آواز سے کہا "الٰہی بچائیو! اُسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ ممکن ہے وہ اُس سے دیوانہ وار محبت کرتا ہو یہ درست ہے کہ میں نے صفائی کے لئے بڑی لفاظی سے کام لینا شروع کیا لیکن وہ تو اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس میں اب شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُس کے پاس میری دشمنی کی معقول وجہ موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ گولیاں اُس نے نہ چلائی ہونگی۔ ایسا خیال کرنا بے وقوفی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا کرے بھی تو حق بجانب......"

مسٹر اسحاق عجب حیرانی سے زمین کی طرف گھور رہے تھے "ہاں، اور اس درزی کا معاملہ!" انہوں نے بڑی کوشش سے تمام واقعات کو اپنے ذہن میں یکجا کیا "پندرہ سال تک میں اس سے اپنے کپڑے سلواتا رہا اور پھر ایک دن میں نے سنا کہ وہ تپ دق کے تیسرے درجے میں ہے۔ یقیناً ایسے کپڑے پہننے میں ہر انسان کو تامل ہوگا جن میں ایک مدقوق درزی کھانستا رہا ہو، سو میں نے اس سے کپڑے سلوانے بند کر دیئے۔ وہ میرے پاس آیا اور التجائیں کرنے لگا۔ کہتا تھا کہ میرے پاس ایک ٹانکے تک کا کام نہیں ہے۔ میری بیوی بیمار ہے، اور میں اپنے بچوّں کو کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بار بار کام مانگتا تھا۔ الٰہی توبہ! بیچارہ مردے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کا پسینہ بہتا ہوا دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کس قدر بیمار ہے۔

"میاں فیض! دیکھو ان باتوں سے کیا فائدہ۔ میں کسی کاریگر کو کام دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔"

اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا اور شرم اور خوف سے پسینے میں تر بتر ہو گیا "حضور! آپ کے میں بڑی محنت سے سیوں گا" میں حیران ہوں کہ اس کی چیخیں کیوں نہ نکل گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں ——" مسٹر اسحاق نے ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کیا "میں نے اسے مایوس واپس کر دیا۔ میں نے کہا "اچھا میں غور کروں گا" اور ایسے فقروں کا مطلب یہ بیچارے اچھی طرح جانتے ہیں۔ یقیناً یہ شخص میرا دشمن ہو سکتا ہے۔" مسٹر اسحاق نے خوفزدہ ہو کر کہا "یقیناً یہ بہت بری بات ہے کہ ایک شخص تو اپنی زندگی کے لئے التجائیں اور منتیں کرے اور دوسرا اسے نہایت بے دردی سے واپس کر دے لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ اس میں کام کرنے کی سکت ہی نہیں۔"

مسٹر اسحاق کا دل مغموم تر ہوتا گیا۔ "اور یہ ایک اور ناخوشگوار واقعہ تھا۔ میں نے دفتر کے چپڑاسی کو کس قدر سخت سست کہا۔ دفتر کی ایک فائیل نہ ملتی تھی اور میں نے اس کو بلا کر اس طرح ڈانٹنا اور گالیاں دینا شروع کیں جیسے وہ کوئی سکول کا لڑکا تھا اور پھر دوسروں کی موجودگی میں "اسی طرح تم دفتر کی چیزیں سنبھالتے ہو بدکردار! تم نے دفتر کو مرغیوں کا ڈربہ بنا رکھا ہے۔ میں تمہیں برخاست کر دوں گا" اور پھر وہ فائیل میری اپنی دراز سے نکلی۔ اس بے چارے نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ وہ کانپتا رہا اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھپکتا رہا۔

مسٹر اسحاق کے جسم میں گرمی کی ایک لہر دوڑ گئی "لیکن ایک افسر کا اپنے ماتحتوں سے معافی مانگنا بھی تو بھلا معلوم نہیں ہوتا۔" یہ بات انہوں نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہی "مانا میں نے اس پر کسی قدر سختی ہی کی۔ لیکن یہ ماتحت اپنے افسروں سے کس قدر نفرت کرتے ہونگے۔ اچھا ٹھہرو۔ میں اسے اپنے کوئی اترے ہوئے کپڑے

دے دوں گا۔ لیکن شاید اس سے وہ اور بھی برا مانے۔"

اب مسٹر اسحاق سے بستر پر لیٹا بھی نہ جاتا تھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلنگ پوش نے انہیں جکڑ رکھا ہے۔ وہ گھٹنوں کے گرد باہیں لپیٹ کر بیٹھ گئے اور تاریکی میں گھورنے لگے۔ "اور پھر اشفاق احمد والا واقعہ۔ وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ آدمی ہے نظمیں بھی لکھتا ہے۔ لیکن جب اُن کاغذات کے ضمن میں اس سے ایک غلطی ہوگئی تو میں نے کہا، لڑکے! اسے دوبارہ کرو۔" میں کاغذات اس کے میز پر پھینکنا چاہتا تھا لیکن وہ کم بخت اس کے پاؤں میں جا گرے۔ اور جب وہ انہیں اٹھانے کے لئے جھکا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میں اپنا سر پیٹ لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس لڑکے سے محبت بھی ہے۔ لیکن میں نے اسے کس قدر بے عزت کیا۔ حالانکہ میری نیت یہ نہ تھی۔

مسٹر اسحاق کے واہمہ نے ایک اور چہرہ پیش نظر کر دیا۔ اور یہ اُن کے دفتر کے رفیق کار جلیل احمد کا تھا "بیچارہ جلیل، وہ ہیڈ کلرک بننا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے بجائے میں مقرر ہوگیا۔ تنخواہ میں چند روپیوں کے اضافے کی بات تھی اور اس بیچارے کے چھ بچے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے بڑے لڑکے کو کالج میں داخل کرانا چاہتا تھا لیکن اب اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا الوجود اور نکمے کا اپنا قصور ہے۔ سنا ہے اس کی بیوی نہایت جھگڑالو اور ہڈیوں اور پوست کا ڈھانچا ہی ہے۔ بیچارے دوپہر کو سوکھی روٹی ہی پر گذارا کرتے ہیں۔ بیچارہ جلیل! وہ ضرور خفت محسوس کرتا ہوگا۔ میں باوجود مجرد ہونے کے اس سے زیادہ تنخواہ پاتا ہوں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جب وہ میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے تو میں ضرور گھبرا جاتا ہوں۔"

ان پشیمانیوں سے مسٹر اسحاق کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ "ہاں، اور ہوٹل کا وہ ملازم جو میرے چند آنے کے پیسے ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کو بلایا اور اُس نے کھڑے کھڑے اُسے موقوف کر دیا اور کہا "خبیث چور! میں خیال رکھوں گا کہ شہر بھر میں تجھے کوئی ملازمت نہ دے۔" اس شخص نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا اور چپکے سے نکل گیا۔ اس کے کندھے، قمیص سے ابھرے ہوئے اب بھی مجھے صاف دکھائی دیتے ہیں۔"

مسٹر اسحاق پھر وائرلیس سٹ کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے آلہ اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔ لیکن وائرلیس سٹ بھی خاموش رات کے ان خاموش لمحات کا ہمنوا تھا۔

مسٹر اسحاق نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ہر وہ شخص انہیں نظر آنے لگا جس کے ساتھ انہیں دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اور جو انہیں آج سے پہلے کبھی یاد نہ آیا تھا۔

صبح وہ نہانے نہیں گئے۔ طبیعت مضطرب تھی اور چہرہ زرد تھا۔

انسپکٹر پولیس نے کہا "ہاں جناب تو کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی سوچا ہے جسے آپ کے ساتھ دشمنی ہو؟"

مسٹر اسحاق نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنے زیادہ لوگ ہیں جن کے متعلق امکان ہے کہ مجھ سے عداوت رکھتے ہونگے کہ ———" انہوں نے عجب بیچارگی سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی "حقیقت تو یہ ہے کہ انسان بتا ہی نہیں سکتا کہ کتنے لوگوں کو اُس نے اذیت دی ہے۔ میں اب اس کھڑکی کے پاس کبھی نہ بیٹھوں گا۔ اور میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اس تمام معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔

مظفر احمد (ترجمہ)

سمندر اور اُس کے موتی

سمندر کے پاس موتی ہیں!
اور آسمان کے پاس ستارے!
لیکن میرے دل، آہ، میرے دل کے پاس فقط محبت!!!

سمندر اور آسمان کی سلطنتیں وسیع ہیں!
لیکن میرا دل اِن سے کہیں زیادہ وسیع ہے!!
اور موتیوں اور ستاروں سے میری محبت کہیں زیادہ روشن اور پُر نور ہے!!!

اے ننھی، نوجوان حسینہ! میرے دل کی بے پایاں سلطنت میں سما جا!
میرا دل، سمندر، اور آسمان، محبت کی گرمی سے پگھل رہے ہیں!!

عظیم قریشی لدھیانوی (ہائن رش ہائنے)

شباب

(۱)

ایک گُلرو مطربِ رنگیں نوا
ہے فرازِ کوہ پر نغمہ سرا

ساز اس کا کیف سے لبریز ہے
ہر ترانہ اس کا وجد انگیز ہے

کہہ رہا ہے دل کشا انداز میں
یاس کا نغمہ نہیں اس ساز میں

میری قسمت میں نہیں لکھی شکست
آسماں بھی سامنے میرے ہے پست

حلقۂ مہتاب ہے میری رکاب
نامور ہوں، نام ہے میرا شباب

(۲)

ہائے! وہ کالی بلا، تاریک رات
کانپتی ہے جس سے ساری کائنات

ساتھ لائی ابر اور طوفان کو
ہیبت و تخریب کے سامان کو

اک طرف برقِ تپاں کا اضطراب
اک طرف زور آزما تنہا شباب

نام ہلنے کا نہیں لیتا مگر
جیسے پتھر ہو کوئی کہسار پر

کہہ رہا ہے "صبحِ خنداں ہے قریب
چھپ چلی ہے رات کی شکلِ مہیب

خلد میں ہوتا ہے مردوں کا قیام
اوجِ سدرہ پر رقم ہے ان کا نام

ہے نظر میں اُن کی چرخِ ہفتمیں
طائرِ دل اُن کا ہے طوبیٰ نشیں"

(ہیرالڈ بیگ بی)

کلیم

کوکو

گاؤں کے گرد و نواح میں لوکس کسان کا گھر "حویلی" کے نام سے موسوم تھا۔ کوئی اس کی وجہ تسمیہ نہ جانتا تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے وقت صرف مالک کی تونگری اور خوشحالی کو ملحوظ رکھتے تھے اور یہ خاص مکان جسے یہ نام دیا گیا تھا ایک ایسے شخص کی ملکیت تھا جس کی زمین گاؤں کی تمام کھیتیوں سے زیادہ وسیع، زرخیز اور محفوظ تھی۔

اس کا کھیت چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد شاندار بلند درختوں کی پانچ قطاریں تھیں جو سیب کے باغ اور ان دار درختوں کو میدانی علاقے کی تیز و تند ہوا سے بچاتی تھیں۔ وہاں کے اندر ایک لمبی عمارتوں کا سلسلہ تھا جس میں غلے اور گھاس وغیرہ کا ذخیرہ رکھا جاتا تھا، سخت اور ناہموار پتھر کے بنے ہوئے استھانوں کی ایک قطار تھی جس میں مویشی بندھتے تھے۔ ایک اصطبل تھا جس میں تیس گھوڑے باندھے جا سکتے تھے، اور سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی بھی جو ننھے سے قلعہ کی مانند دکھائی دیتی تھی اس میں شامل تھی۔

صاف ستھری کھاد کے ڈھیر قرینے سے پڑے رہتے تھے۔ حفاظت کرنے والے کتوں کے لئے تازی خانے بنے ہوئے تھے اور لمبی لمبی گھاس میں لاتعداد مرغ اور دوسرے جانور اڑانیں بھرتے پھرتے تھے۔

ہر روز کھانے کے وقت گھر کے سب آدمی (جن کی تعداد پندرہ تھی) باورچی خانے کی لمبی میز پر جمع ہوتے تھے جہاں ایک گہری پھولدار رکابی میں پڑے ہوئے گرم گرم شوربے میں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔

تمام جانور ——— گھوڑے، گائیں، سؤر اور بھیڑیں ——— خوب پلے ہوئے اور صاف ستھرے تھے اور اُن کی پرورش بہت عمدہ طریقے سے کی جاتی تھی۔ لوکس جو ایک مضبوط اور دراز قد آدمی تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہر چیز معمول کے مطابق درست ہے یا نہیں ہر روز تین مرتبہ اپنی جاگیر میں گشت کیا کرتا تھا۔

ایک بہت بوڑھا سفید گھوڑا جس پر اس کے مالکوں کی خاص شفقت تھی اصطبل سے بہت دور بندھا رہتا تھا۔ اس کی مالکہ اس کی زندگی کے اختتام تک اسے آرام میں رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس غریب جانور نے کسی زمانے میں کٹھن وقتوں پر اس کی رفاقت کی تھی۔ ایک چھوٹا سا شریر لڑکا جس کا نام "ازاڈور ڈوول" تھا اور جسے لوگ اختصار کے طور پر "زیڈور" کہتے تھے اس کمزور جانور کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ زیڈور کا صرف یہ کام تھا کہ موسم سرما میں اسے

دانہ کھلاتے اور اُس کے بستر کا انتظام کرتے۔ اور موسم گرما میں ہر روز چار مرتبہ چراگاہ میں جاکر اس کو ایک میخ سے کھول کر دوسری میخ سے باندھتے تاکہ اسے کثرت کے ساتھ تازہ اور اچھی گھاس مل سکے۔

یہ بوڑھا جانور بچارا اب تقریباً بیت چکا تھا اور اُس کی ٹانگیں گھٹنوں اور ٹخنوں کے نزدیک اس قدر سوج رہی تھیں کہ اُس کے لئے ہلنا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔ اس کا کوٹ جسے مدّت سے کسی سائیس نے کبھی برش کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی اس کے پہلوؤں پر سفید بالوں کے گچھے کی طرح لٹک رہا تھا، اور چابک کی چند ضربوں سے غم و حرماں کا بے پناہ احساس اُس کی آنکھوں میں جھلکنے لگتا تھا۔

جب زیڈور[1] اسے کھول کر چراگاہ میں لے جانا چاہتا تو یہ اس قدر آہستہ چلتا کہ لڑکا اس کی اگاڑی سے پکڑ کر زور زور سے کھینچتا اور اُسے اپنی پوری قوت کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا، چلّاتا اور گالیاں دیتا تھا اور اپنے اس فرض کو بے مصرف محسوس کر کے نہایت نفرت آلود نگاہوں سے اس بوڑھے شکستہ دل جانور کی طرف دیکھتا تھا۔

کھیت میں کام کرنے والے باقی نوکروں نے جلد ہی لڑکے کے اس تنفر کو محسوس کر لیا جو اس کے دل میں کوکو کے متعلق تھا۔ اور وہ اسے دق کرنے اور اپنا دل بہلانے کے لئے ہر وقت اس سے اُس کے گھوڑے کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے ہم عمر بھی اسے ہمیشہ دق کرتے چنانچہ وہ گاؤں میں "کوکو زیڈور" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

لڑکے کا غم و غصہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور وہ اس جانور سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ وہ ایک دراز قد لمبی ٹانگوں والا نحیف لڑکا تھا اور اس کے تخت ... سرخ بال اس کے سر پر بیٹھ کر ... اس کی حالت بظاہر نہایت کمزور معلوم ہوتی تھی اور باتیں کرتے وقت وہ اس طرح ہکلاتا اور رکتا تھا جیسے خیالات اس کے تنگ اور وحشی دماغ میں کوئی شکل و صورت اختیار نہیں کر سکتے۔

یہ بات اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آئی تھی کہ اُس کی مالکہ کوکو کو ابھی تک کیوں پال رہی ہے۔ اس کا دل اس خیال سے بہت کڑھتا تھا کہ اس مریل گھوڑے کو ناحق اچھا چارہ دے کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ اُس کے نزدیک بے انتہا بے انصافی تھی کہ اس مفلوک الحال جانور کو جونہی یہ کام سے فارغ ہو فوراً چارہ دے دیا جائے اور وہ اسے سخت بے وقوفی خیال کرتا تھا کہ اچھے اچھے جو اس پر ضائع کئے جائیں ——— اس بوڑھے مفلوج گھوڑے پر ——— حالانکہ جو کافی مہنگے بھی تھے بعض اوقات کوشش سخت احکام کے باوجود بھی وہ اس کے مقررہ چارہ میں کمی کر دیتا۔ اور اُسے پہلے سے نصف وزن میں جو دیتا۔ اسی طرح اُس نے بھوسے اور خشک گھاس کی خوراک بھی کم کر دی۔ اور اُس کی طفلانہ روح اس غریب جانور کے ساتھ بے انتہا نفرت ...

[1] گھوڑے کا نام ہے

وقت بے قرار رہنے لگی ۔۔ اُس کی حریص، مکار، وحشی، بزدل اور ناپاک روح!

. . . .

موسم گرما آگیا اور اُسے پھر دن میں چار مرتبہ جانور کی جگہ بدلنے کے لئے چراگاہ کی طرف جانا پڑا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہ بھاری بھاری قدم گھسیٹتا ہوا چراگاہ کی طرف جاتا تھا اور اس معمول سے اس کا قہر و غضب روز بروز زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ کھیتی باڑی کرنے والے کسان اُس کے پیچھے آوازے کستے تھے "دیکھنا بھئی زبڈور! گوگو ہمارا بھی سلام کہہ دینا!" وہ انہیں کچھ جواب نہ دیتا تھا۔

اُس نے ایک جھاڑی میں چابک چھپا رکھی تھی۔ جب وہ اُسے ایک جگہ سے کھول کر دوسری جگہ باندھ دیتا اور جانور گھاس چرنے میں مشغول ہو جاتا تو وہ نہایت چالاکی کے ساتھ دبے پاؤں جانور کے پیچھے سے ہو کر نکلتا اور نہایت بے رحمی سے اُس کی رانوں اور پہلوؤں پر زور زور سے چابکوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ جانور بیچارہ دولتیاں چلاتا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا وہ چابک کی ضربوں سے بچنے کے لئے رسی کے سرے پر میخ کے اردگرد سرکس کے گھوڑے کی طرح چکر کاٹتا تھا اور لڑکا دیوانوں کی طرح اسے مارتا اور دانت پیستا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا۔

پھر وہ پیچھے سے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھنے کے آہستہ آہستہ واپس چلا جاتا اور گھوڑا اپنے سوجے ہوئے پہلوؤں اور کانپتے ہوئے نتھنوں کے ساتھ اپنی بوڑھی اور ضعیف آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا اور اپنا سفید بالوں اور کمزور ہڈیوں والا سر اس وقت تک دوبارہ زمین کی طرف نہ لاتا جب تک کہ دور فاصلہ پر لڑکے کا نیلا جبہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔

اب راتیں کافی گرم ہونے لگی تھیں اس لئے گوگو کو جنگل کے پیچھے ندی کے کنارے سونے کی اجازت مل گئی تھی اور صرف زبڈور ہی وہ شخص تھا جو اسے دیکھنے کے لئے وہاں جاتا تھا۔ وہ ایک پہاڑی کے ڈھلوان پر اس سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ جاتا اور آدھ آدھ گھنٹہ تک بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہتا اور وقتاً فوقتاً ایک نوکدار پتھر اس کی طرف پھینک دیتا۔ غریب گوگو سر اُٹھا کر ہوا میں اپنے دشمن کی طرف دیکھتا رہتا تھا اور اُس کی سوانگی تک اُسے سرنیچا کر کے چرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک خیال ہر وقت اس چھوکرے کے سر میں چکر کھاتا رہتا تھا "اب اس جانور کی پرورش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ یہ کوئی کام نہیں کرتا!" وہ سمجھتا تھا کہ جانور نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی اس بری نیت پر تلا ہوا ہے کہ وہ اس خوراک کو بے رحمی کے ساتھ تلف کرتا چلا جائے جس کے حقیقی حقدار دوسرے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان اور خود خدا کے لئے دنیا میں کچھ بھی باقی نہ رہے ۔۔۔ ہاں! خود اس زبڈور کے لئے بھی کچھ باقی نہ رہے جسے اپنی روزی کمانے کے لئے سال میں تین سو پینسٹھ دن کام کرنا پڑتا ہے

چنانچہ رسی کی طوالت کو گھٹاتے گھٹاتے وہ آہستہ آہستہ چراگاہ میں گوگو کے حصے کی تازہ گھاس کا رقبہ کم کرتا گیا۔

جانور کمزور اور نحیف ہوتا گیا اور روز بروز موت کی طرف جھکتا چلا گیا۔
رسّی توڑنے کے لیئے اُس کی جسمانی کمزوری کسی طرح بھی اُس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اگلی ٹانگوں پر جھک کر وہ سرسبز گھاس کی طرف گردن لمبی کر کے منہ بڑھاتا تھا ۔۔۔ اس گھاس کی طرف جو اُس کے بالکل قریب تھی، جسے وہ سونگھ تو سکتا تھا مگر چُوم نہ سکتا تھا۔
ایک صبح زیڈور کو نیا خیال سوجھا اور وہ یہ کہ کوکو کی جگہ بالکل تبدیل نہ کی جائے کیونکہ وہ اس مریل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کے معمول سے بہت تنگ آچکا تھا۔
اس روز زیڈور اپنے انتقام کے نظارے سے حظّ اٹھانے کے لئے وہاں آیا۔ کوکو نے اس کی طرف ملتجیانہ انداز سے دیکھا۔ زیڈور بجائے اُسے پیٹنے کے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر اُس کے ارد گرد ٹہلتا رہا۔ اُس نے گھوڑے کو وہاں سے کھول کر سرسبز گھاس والی جگہ پر باندھنے کے لیئے بظاہر حرکت بھی کی مگر اُس نے اس میخ کو جس کے ساتھ جانور بندھا ہوا تھا ایک دو ٹھوکروں سے اور مضبوطی کے ساتھ زمین میں گاڑ دیا اور اپنی نئی تجویز پر مسرور ہو کر وہاں سے چلا گیا۔
لڑکے کو جاتے دیکھ کر گھوڑا اُس کو واپس بلانے کے لئے ملتجیانہ انداز میں ہنہنایا مگر شریر لڑکا اسے چراگاہ میں گھاس کی پتیوں سے دو مضبوطی سے بندھا ہوا تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا۔
جانور بھوک کی شدّت سے بےتاب ہو کر گھاس تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا جو اُس کے نتھنوں کو چھو رہی تھی۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گیا اور گردن کو آگے کی طرف پھیلا کر اپنے موٹے کف آلود ہونٹوں کو حرکت دیتا رہا مگر بےکار۔ اس کا جسم سارے دن کی ہولناک اور بےسود جدوجہد سے تھک کر چور ہو گیا۔ اور وہ بھوک جو اُسے رفتہ رفتہ نگلے جا رہی تھی ارد گرد کی سرسبز گھاس کے قطعوں کے نظارے سے خوفناک طریقہ پر بڑھتی گئی۔
لڑکا اس روز پھر نہ آیا وہ دن بھر جنگل میں پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں پھرتا رہا۔ دوسرے دن جب وہ آیا تو اُس نے دیکھا کہ کوکو نڈھال ہو کر زمین پر پڑا ہوا ہے کوکو نے اسے دیکھا تو جگہ کی تبدیلی کی امید کر کے بصد مشکل اپنے ناتواں جسم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔
زیڈور نے اس کی میخ کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ادھر اُدھر پھرا، جانور کی طرف دیکھا اور مٹھی بھر کیچڑ اُس کی ناک کی طرف پھینکی جس سے اُس کے سفید چمڑے پر سیاہ چھینٹوں کے نشان پڑ گئے۔ اس کے بعد وہ سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
کوکو اس وقت تک کھڑا رہا جب تک لڑکا اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا اور پھر یہ محسوس کر کے کہ گھاس تک پہنچنے کی تمام مساعی بےسود ثابت ہو گی اپنے پہلو پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔
دوسرے دن زیڈور بالکل نہ آیا۔

جب زیڈورا ایک دن بعد آیا تو اُس نے دیکھا کہ کوکو بدستور زمین پر پڑا ہے اور اُس نے محسوس کیا کہ جانور اب قطعی طور پر حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

وہ وہاں دیر تک کھڑا رہا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی ساری کارروائی کو دیکھتا رہا مگر اُسے کسی قدر حیرت ضرور تھی کہ یہ سب کچھ اس قدر جلدی کیونکر ختم ہوگیا۔ اُس نے نعش کو اپنے پاؤں سے چھوا، اُس کی ایک ٹانگ اوپر کو اٹھائی اور پھر نیچے گرا دی، اُس کے پہلو پر بیٹھ گیا اور دیر تک زمین میں آنکھیں گاڑ کر دیکھتا رہا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے دماغ میں کوئی خیال تھا یا وہ کسی بات پر غور کر رہا تھا۔

جب وہ واپس کھیتی میں پہنچا تو اُس نے اس واقعہ کی اطلاع کسی کو نہ دی کیونکہ وہ گھوڑے کو ایک قطعہ سے کھول کر دوسرے قطعہ میں باندھنے کے وقت کو پرندوں کے گھونسلوں کی تلاش میں صرف کرنا چاہتا تھا۔

وہ مظلوم کوکو کو دیکھنے کے لئے دوسرے دن پھر گیا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو چند کوے اُس کے جسم پر سے اُڑے۔ اُس کے مردہ جسم کے اردگرد کی مختصر سی فضا مکھیوں کی ناخوشگوار بھنبھناہٹ سے بھری ہوئی تھی۔

اُس نے اس خبر کا اعلان کر دیا۔ گھوڑا اس قدر بوڑھا تھا کہ اُس کی موت کسی کے لئے باعثِ حیرت نہ ہوئی
لوکس نے دو مزدوروں کو حکم دیا

"اپنے پھاوڑے اور کدالیں لے جاؤ اور جہاں کوکو پڑا ہے وہاں ایک گڑھا کھود دو"

اور لوگوں نے کوکو کو اسی جگہ دفن کر دیا جہاں اُس نے بھوک سے بیتاب ہو کر جان دی تھی۔

زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہاں سے سرسبز گھاس کی چند خوشنما پتیاں پھوٹ نکلیں۔

عزیز (ترجمہ)

تجلّیات

یہ خواب ہے کہ حقیقت، نہ ہو سکا معلوم!
رہی یہ بات کہ "کچھ ہے" سو وہ بھی کیا معلوم!

شبِ سیاہ ہے طوفانِ باد و باراں ہے
نہ راہبر ہے، نہ ہمدم، نہ راستا معلوم

وہ مسکرا دیئے سُن کر فسانۂ غمِ ہجر
جو میری جان پہ گزری، کسی کو کیا معلوم!

یہ داستانِ وفا چھیڑنے سے کیا حاصل
نہ ڈال مجھ پہ یہ افسوں تری وفا معلوم!

اثرؔ فسانۂ ہستی بھی کیا فسانہ ہے!
کچھ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اثرؔ صہبائی

"لہو پکارے گا آستیں کا"

بہت کم ایسے خون کیے گئے ہونگے جن کے قاتلوں کا پتہ نہ لگ گیا ہو۔ کیونکہ خونی کا جرم کسی نہ کسی طرح سے ظاہر ضرور ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر خود خون کرنے والا اپنی زندگی سے تنگ آکر اپنے جرم کا گواہ بن جاتا ہے۔ اس کی گفتگو اس کی بھیانک نظر۔ اور اس کی وحشت سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اُس نے خون کیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ قتل وخون کے مقدمات میں عدالت مجرم کی صورت سے بہت کچھ معلومات حاصل کرلیتی ہے اور واردات قتل کی تفتیش میں پولیس کو اتنی کاوش نہیں کرنا پڑتی جتنی چوری اور ڈاکے وغیرہ سے متعلق مقدمات میں، کیونکہ قتل کے بعد قاتل کی حالت انسان کی سی نہیں رہتی۔ وہ دیوانہ وار اپنے سائے سے ڈرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ابھی عرصہ نہیں ہوا کہ ایک خونی کو پولیس نے واردات کے بعد آتے ہوئے دیکھا۔ وہ سڑک پر آرہا تھا مگر بالکل اس طرح جیسے کوئی شراب کے نشے میں ہو کبھی سڑک کی داہنی طرف چلتا کبھی بائیں طرف اور کبھی ٹھٹھک کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اسی طرح ایک خونی خون کرنے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگا کہ "میں نے فلاں فلاں شخص کو مار ڈالا ہے۔ اب میں کیا کروں" لوگوں نے اُسے تھانے کا راستہ بتا دیا۔ اور یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ خونی خون کرنے کے بعد سیدھا تھانے چلا گیا اور وہاں سب صاف صاف بیان کردیا۔

غرض قتل کرنے کے بعد فوراً ہی قاتل کچھ ایسا بدحواس ہوجاتا ہے کہ اُسے خود اپنی زندگی وبال ہوجاتی ہے بشرطیکہ پیشہ ور خونی قزاق نہ ہو۔ کیونکہ مشاق خونی کے نزدیک تو کسی کو مار ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں۔

انہیں مندرجہ بالا کیفیتوں کو مدنظر رکھ کر ایک انگریزی شاعر نے مشہور مثل "Murder will out" کی تصویر لٹریچر کے ذریعے سے نہایت ہی پُر رعب پیرائے میں بیان کرکے کھینچی ہے۔ اس عبارت کے پڑھنے سے پڑھنے والے کے دل پر بھی کسی قدر خوف سا طاری ہوجاتا ہے۔ اس میں شاعر نے دکھایا ہے کہ خونی کیوں خود بخود اقبال جرم کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس سے مصوری، لٹریچر اور خفیہ پولیس سے نسبت رکھنے والے لوگوں کو بہت سی باتیں معلوم ہوجائیں گی۔ کیونکہ علم النفس کی اکثر نمایاں خصوصیات پر مصوری لٹریچر اور سی آئی ڈی کے بہت سے اصول مبنی ہیں۔ اس لئے ذیل میں لفظ بلفظ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ اردو میں بھی اس دردناک اور سنسنی پیدا کرنے والی مصوری کی مثال موجود ہے

"لیوبک میں کسی سوداگر کے مکان پر ایک اجنبی شخص آیا۔ اس کا خیر مقدم نہایت اچھی طرح کیا گیا لیکن چونکہ گھر آدمیوں سے بھرا تھا اس لئے علیحدہ کمرے میں اس کے لئے انتظام کردیا گیا۔ اس کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ

تھی کہ اُسے تنہائی میں متعجب کرتی۔ آخر کار اُس نے ایک تصویر کی طرف نگاہ ڈالی اور خیال خود بخود اُدھر مائل ہو گیا۔ وہ سر کی تصویر تھی لیکن اس کی ہیئت میں ایک غیر معمولی، خوفناک اور خارج از دنیا ایسی کوئی شے تھی کہ گو دیکھنے میں نمایاں معلوم ہوتی تھی تاہم دیکھنے سے خواہ مخواہ دل پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ بدن کے روئیں کھڑے ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص اُس تصویر کو ایک بار دیکھ لے تو اُس کی حیرت انگیزیوں پر بغیر غور کئے رہ نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس تصویر کا خیال اس مہمان کے دماغ میں بھر گیا اور طبیعت کو گونہ بے چینی سی ہوئی۔ جب وہ سو گیا تو اُس نے بار بار اسی سر کو اپنی طرف غور کرتے ہوئے دیکھا۔ صبح کو میزبان نے اُس کی صورت سے پہچان لیا کہ شاید اچھی طرح نیند نہیں پڑی۔ جب وجہ پوچھی تو تصویر کا ذکر کیا گیا۔ صاحب خانہ کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اور کہا کہ اچھا ہٹا دی جائے گی اور یہ کہ جب کبھی اس کمرے کا استعمال کیا جاتا تھا تو تصویر ضرور علیحدہ رکھ دی جاتی تھی مگر صرف اب کی بار جلدی میں کچھ خیال نہیں رہا۔ مزید استفسار پر میزبان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ اُس میں شک نہیں یہ تصویر ہیبت ناک ہے لیکن چونکہ وراثتہً خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ اس لئے نہ تو اسے علیحدہ کرنے کو دل چاہتا ہے نہ خراب کرنے کو۔ اس کا قصہ یوں ہے:۔

"میرا باپ کسی کام سے ہامبرگ گیا تھا۔ جب ایک قہوہ خانے میں پہنچا تو کھانا کھاتے وقت اُس نے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا جس کی صورت میں ایک خاص خصوصیت تھی۔ وہ اجنبی نوجوان ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اکیلا کھانا کھانے لگا۔ اس کی صورت سے دماغ کی بے چینی عیاں تھی۔ اور کبھی کبھی وہ اپنا سر اِدھر اُدھر پھیرتا کہ گویا کچھ سُن رہا ہو۔ بعد ازاں ایک دم کانپ جاتا۔ چہرہ پیلا پڑ جاتا اور پھر کوشش کر کے کھانا کھانے لگتا۔ میرے باپ نے اس شخص کو لگاتار دو تین دن تک اسی حالت میں دیکھا اور چونکہ اس سے کسی قدر مانوس بھی ہو گیا تھا اس لئے ایک دن بے چینی کا سبب پوچھا۔ اُس اجنبی نوجوان کو میرے باپ کی گفتگو اور ہمدردی سے کچھ تسکین سی ہو گئی۔ چنانچہ بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص اٹلی کا باشندہ تھا مگر بہت غریب۔ تاہم صاحبِ ہنر ہونے کی وجہ سے اپنا پیٹ پال لیتا تھا اور مصوری و نقاشی کر کے اپنی گزراوقات کے لئے بہت کچھ پیدا کر لیتا تھا۔ میرے باپ اور اس نوجوان میں ملاقات بڑھتی گئی۔ . . . . اور میرے باپ کو اپنی بے چینی پر بہت زیادہ متعجب دیکھ کر ایک دن آخر کار اُس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا۔

"میں شہرِ روم کا رہنے والا ہوں۔ ایک امیر آدمی کی سرپرستی میں نہایت آرام سے رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی بات پر تکرار ہو گئی اور آپس میں گالی گلوچ کی نوبت آ گئی۔ میرے آقا نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ بات بات میں اُ

مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ مجھ میں خودداری اور غصّہ بہت ہے۔ اس لئے اُس کی اس حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ مرتبے کی وجہ سے میں اس امیر کو برابری کی لڑائی پر آمادہ نہیں کرسکتا تھا مگر چھپ کر ایک مرتبہ چپکے سے اُسے قتل کردیا۔ گو میں اب اپنے ملک سے بھاگ کر ہام برگ آگیا ہوں۔ لیکن دل کو چین نہیں۔ قتل کے چند ہی دن بعد میں نے سڑک پر کسی کو اپنا نام لے کر پکارتے ہوئے سنا۔ جب میں نے پھر کر دیکھا تو اسی آقا کی شکل نظر آئی جو اس قدر غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ بیان نہیں کرسکتا۔ اُس وقت سے مجھے کبھی سکون نصیب نہیں ہوا۔ ہر وقت، ہر جگہ، اور صحبت میں میں کتنا ہی مشغول کیوں نہ رہوں اُس آواز کو ضرور سنتا ہوں اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھے رہ نہیں سکتا۔ اور جب میں اس طرح دیکھتا ہوں تو وہی شکل گھورتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آخر کار ایک دن یاس و بیم کی حالت میں میں نے اپنا چہرہ بالکل اس کے روبرو کردیا اور آنکھ سے آنکھ ملا کر نہایت غور و خوض سے جب وہ شکل میری طرف گھور رہی تھی میں نے اس کی خوابی تصویر دماغ میں قائم کرلی اور پھر کاغذ پر اتار لی۔

"میں نے اس پریشانی کی حالت میں بہت وقت سے یہ دن گذارے ہیں اب میرے لئے زندگی وبال ہوگئی ہے جو ایسا بار ہے کہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میرا ارادہ ہے کہ کچھ خرچ جمع ہوجانے پر تو میں واپس جاؤں اور خود کو انصاف کے حوالے کردوں تاکہ سُولی پر جا کر اس جرم کی تلافی ہوجائے۔"

اس کے بعد سوداگر نے مہمان سے کہا کہ اجنبی نوجوان نے مروّت اور ہمدردی کے عوض میرے باپ کو یہ تصویر مکمل کرکے دے دی۔ یہ وہی تصویر ہے جس کا اثر ابھی تک نہیں مٹا۔"

ناظرین "اس اجنبی نوجوان" کی اس حالت کو خواہ قوتِ ایمانی کی طرف منسوب کریں خواہ ضمیر کی طاقت کہیں یہ ظاہر ہے کہ جرم اور خصوصاً خون کے جرم کا خوف اور پچھتاوا خیال میں ایسا جم جاتا ہے کہ تصویر میں تشکیل پاکر نظر آنے لگتا ہے ایسے ہی واقعات کی بنا پر اردو زبان میں بھی ایک مثل مشہور ہے کہ "خون سر پر چڑھ کر بولے گا" خواہ کتنا ہی چھپایا کیوں نہ جائے۔ بقولِ شاعر ع

"جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا"

سیّد مقبول حسین احمد پوری

محفلِ ادب

آرٹ اور لٹریچر

اپنے گھر کے اندر بیٹھ کر جب ہم خوشی سے ہنستے ہیں یا دل پر کوئی چوٹ لگنے سے روتے ہیں تو ہم یہ کبھی نہیں سوچتے نہ سوچنے کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ ہنسنا چاہئے تھا یا ہماری اشکباری کم ہوئی ہے۔ لیکن جب ہمیں اپنی مسرت یا غم و افسوس دوسروں پر ظاہر کرنا مقصود ہو تو ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

جس وقت کوئی عورت اپنے بیٹے کی موت پر آہ و زاریاں کرتی ہوئی اپنے گاؤں کی گلیوں سے گزرتی ہے تو صرف اپنے بیٹے کی جدائی پر نہیں روتی۔ بلکہ وہ گاؤں والوں پر اپنی بدنصیبی کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہے خود بخود رونا اور بات ہے دوسروں پر اپنی مصیبت ظاہر کرنا اور بات ہے۔ بیٹے کی موت پر جس قدر رونا اقتضائے قدرت ہے۔ رنج و غم کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ رونا پڑتا ہے۔

لیکن آخر الذکر فعل کو اگر کوئی مصنوعی کہہ کر اُس کی توہین کرے تو یہ بے جا ہو گا۔ کیونکہ اظہارِ افسوس بھی افسوس کا ایک جزو ہے۔ میرا بیٹا دنیا کی اک ضروری چیز ہے۔ اس کی جدائی میرے لئے دنیا کا اک بدترین سانحہ ہے لیکن اُس کی موت پر جو رنج مجھے ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ نہ کوئی دوسرا اس رنج کو محسوس کر سکتا ہے۔ اُس کے مرجانے پر بھی دنیا کے کام اُسی طرح جاری رہتے ہیں۔ لوگ ہنستے ہیں گاتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں اور اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ ماں دنیا کی اس بے پروائی اور سنگدلی کو دیکھتی ہے تو اُسے صدمہ ہوتا ہے۔ اور وہ جسم و روح کی پوری قوت سے رو کر دنیا کو بتانا چاہتی ہے کہ میرے بیٹے کی موت دنیا کا معمولی واقعہ نہیں۔ کائنات کی ایک غیر معمولی مصیبت ہے۔

جس حد تک رنج و غم ہمارا اپنا ہے اُس حد تک ہم اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور یہ قدرتی ہے لیکن اُس احساس کو دوسروں پر ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے تو ضبط کی دیواریں گر جاتی ہیں اور ہماری آہ و زاریاں قدرتی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔

ہمارے غم میں جس قدر زیادہ لوگ ہمارے ساتھ شریک ہوتے ہیں اُسی قدر اس غم کی صداقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم کسی بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں تو یہ ہماری بھاری کمزوری، بیوقوفی یا جہالت نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے دوسرے لوگوں پر بھی وہی حالت طاری ہے۔ ہمارا غم خیالی نہیں ہے حقیقی ہے۔ یہ سوچ کر ہمیں طبیعت کا فرا سا حل جاتا ہے۔

میری تکلیف میرے قریب ہے۔ مجھے محسوس ہوتی ہے۔ وہ تمہاری تکلیف نہیں ہے۔ نہ تمہارے قریب ہے اس لئے تم اُسے محسوس نہیں کر سکتے۔ تم مجھ سے دُور ہو سو وہ تمہیں چھوٹی نظر آتی ہے۔ اس لئے جس قدر فاصلہ میرے اور تمہارے مابین حائل ہے اُسی اندازہ سے اس تکلیف کو بڑا کر کے ظاہر کیا جائے تبھی تم اُسے اس قدر بڑا دیکھ سکو گے جس قدر کہ میں اُسے دیکھتا ہوں۔

لہذا یہاں پر افراط کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ جو چیز دوسروں کو دکھانا مقصود ہو۔ اُسے کسی قدر بڑھانا قدرتی ہے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے یہ اور بات ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جو چیز جس قدر چھوٹی ہوگی اسی قدر لوگوں کو حقیر و کم بضاعت معلوم ہوگی۔ اور اُسے پُر صداقت ثابت کرنے کے لئے بڑا کر کے دکھانا ہوگا۔

جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے، وہی اصول ادبی دنیا میں بھی کام کرتا ہے۔ کسی شئے یا حالت کو جیسی کہ وہ ہے اُسی طرح ہو بہو بیان کر دینے کا نام آرٹ نہیں ہے۔ آرٹ اُسے اس طریق سے بیان کر دینے کا نام ہے کہ اُس کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر بھی وہ حالت طاری ہو جائے جو بیان کرنے والے کے دل و دماغ پر حاوی ہے۔

لیکن اس کا طریق کیا ہے؟ باہر کی دنیا میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اک حقیقت ہے۔ اور ہمارے حواس اُس کی شہادت دیتے ہیں لیکن دنیائے ادب میں جو کچھ دکھانا مقصود ہے قدرتی ہونے کے باوجود آنکھ کو نظر نہیں آتا۔ ادب اس کمی کو پورا کرتا ہے۔

دنیوی صداقت اور ادبی صداقت میں یہاں سے فرق شروع ہو جاتا ہے۔ دنیائے ادب کی خیالی ماں اس طرح نہیں روتی جس طرح وہ روتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا انتہا درجہ کی غلطی ہے کہ دنیائے ادب کی خیالی ماں کی آہ و زاریاں غیر فطرتی ہیں۔ ایک عورت جب روتی ہے، اُس کے آنسو جب گالوں پر بہتے ہیں اور دیکھنے والوں کو جب اس کا بچہ اور اُس کی دیکھی ہوئی جانی پہچانی ہوئی عہدِ طفلی کی دلکش ادائیں یاد آتی ہیں تو اُن پر رقت کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اُس عورت میں یہ طاقت نہیں، کہ وہ اپنے دل کی حالت کو لوگوں پر کامل طور سے نقش کر دے۔

لہذا لٹریچر کو بجا طور پر فطرت کا آئینہ نہیں کہا جا سکتا اور یہ صرف لٹریچر ہی کا حال نہیں، کسی بھی آرٹ میں قدرت کی ہو بہو نقل و نقاشی نہیں کی جاتی۔ قدرت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، سامنے دیکھتے ہیں اور حقیقت میں دیکھتے ہیں لٹریچر اور آرٹ جو کچھ دیکھتے ہیں کسی دوسری طرح دیکھتے ہیں۔ قدرت میں حقیقی شئے نظر آتی ہے۔ لٹریچر میں صرف سایہ دکھائی دیتا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں لٹریچر میں شعر و شاعری اور نغمہ و نے کی امداد لینا پڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تصنیف کا لباس

مصنوعی ہونے کے باوجود اُس کی روح قدرتی صداقت سے بھی زیادہ حقیقی اور روشن و منور نظر آنے لگتی ہے

یہاں میں نے "زیادہ حقیقی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور اس کا خاص مطلب ہے۔ انسانی جذبات سے متعلق قدرتی صداقت آلودہ، شکستہ اور عارضی ہوتی ہے۔ بحرِ دنیا میں لہریں ہمیشہ اُٹھتی رہتی ہیں اور ایک دوسری سے اُلجھتی رہتی ہیں۔ قدرت کے اس وسیع سٹیج پر جب ہم جذباتِ انسانی کے ناٹک کو دیکھتے ہیں۔ تو ہم اُن کے درمیان خطوطِ امتیاز کھینچتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق بہت کچھ فرض کر لیتے ہیں۔ کیا کوئی شخص ایسا ہے جو دعوے کے ساتھ سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکے کہ میں نے اپنے قریبی سے قریبی رشتہ دار کو بھی کامل طور پر پہچان لیا ہے۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے دماغ نے اس کا مطالعہ بہت حد تک کر لیا ہے۔ اگر اس کے احساسات اور جذبات کا تمام تر مطالعہ کیا جائے۔ اس کی ایک ایک تفصیل کو یاد رکھا جائے تو ہم اپنے دماغ میں اس قدر مہین اور لطیف خطوط کھینچ لیں گے کہ ہمارے لئے اُس کا شناخت کرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اس لئے ہمارا دماغ جس خط کو مناسب سمجھتا ہے۔ یاد رکھنے کے لئے انتخاب کر لیتا ہے، باقی کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس لئے جو کچھ ہم دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ زیادہ حقیقی ہو سکتا ہے۔ بالکل حقیقی نہیں ہو سکتا۔

لٹریچر جس شے کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اُسے اُس کی کامل صورت میں پیش کرتا ہے۔ جو شے بڑی ہے اُسے بڑھاتا ہے، جو شے چھوٹی ہے اُسے گھٹاتا ہے، جو جگہ خالی ہے اُسے پُر کرتا ہے۔ لٹریچر دماغ کا مقلد ہے۔ دماغ فطرت کا آئینہ نہیں ہے۔ نہ لٹریچر فطرت کا آئینہ ہے۔ دماغ فطرت کی پیداوار کو دماغی رنگ دے دیتا ہے اسی طرح ادب دماغ کی پیداوار کو ادبی حیثیت دے دیتا ہے اور دونوں کا طریقِ عمل یکساں ہے لیکن دونوں میں کامل یکسانیت نہیں ہے۔ دماغ جو کچھ یاد کرتا ہے اپنی ضرورت کے لئے کرتا ہے۔ لٹریچر جو کچھ بناتا ہے دوسروں کو مسرور کرنے کے لئے بناتا ہے۔ اپنے لئے مختصر یادداشت ہی کافی ہے لیکن دوسروں کے لئے یہ یادداشت قطعی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اسے پورے طور سے پروان چڑھانا پڑتا ہے اور اس کو ایسی روشنی میں، اس طریقہ سے، ایسی جگہ رکھنا پڑتا ہے۔ کہ سب کی نظر یکساں پڑے۔ بالعموم دماغ اپنا مواد فطرت کی تصاویر سے منتخب کرتا ہے اور لٹریچر اپنا مواد دماغ کی یادداشتوں سے حاصل کرتا ہے۔ دماغ کی تصویر کو باہر لانے کے لئے لٹریچر کی ضرورت ہے اس طرح فطرت سے دماغ میں اور دماغ سے لٹریچر میں جو کچھ منتقل ہوتا ہے، وہ حقیقت سے کوسوں دور ہو جاتا ہے لیکن وہ رہتا پھر بھی حقیقی ہے۔

لٹریچر کا کام یہ ہے کہ اندر کی چیز کو باہر لے آئے۔ جذبات کو زبان میں منتقل کر دے اپنی چیز وقفِ عام کر دے اور عارضی حالتوں کو مستقل شکل دے دے۔

"چندن"

مغلیہ ہندوستان کی ایک جھلک

دہلی کے رہنے والے ایک مغل بچّہ تھے انہیں لڈو کے نام سے بڑی نفرت تھی۔ لال قلعہ کے بادشاہزادوں نے ان کا لقب میرزا لڈو بیگ رکھ دیا تھا اور میرزا لڈو بیگ کو لڈو کے نام سے چڑتے تھے مگر دو دو سیر لڈو کھا لیتے تھے، مثلاً لال قلعہ میں کسی بادشاہ زادہ کے سلام کو گئے، بادشاہزادہ صاحب نے نوکر کو اشارا کیا اُس نے سیر دو سیر لڈو لا کر دیوانخانہ کے طاق میں رکھ دیئے اور میرزا صاحب کو صاحب عالم نے حکم دیا کہ دیکھئے اُس طاق میں ایک گلدستہ رکھا ہے اُسے اُٹھا لائیے۔ میرزا صاحب طاق کے پاس پہنچے تو دیکھا طاق میں گلدستہ کے بجائے ایک طباق لڈوؤں کا بھرا رکھا ہے۔ اب کیا تھا لڈو بیگ بپھر پڑے پہلے تو انہوں نے صاحب عالم کے نوکروں کو گالیاں دیں پاجی ہیں ایسے ہیں ویسے ہیں بدمعاش ہیں جس سے مجھے چڑ ہے وہی میرے سامنے لا کر رکھی ہے۔ پھر صاحب خانہ کی دھجیاں لینی شروع کیں خدا اس لال قلعہ کو اجاڑے لال قلعہ والوں نے سر سے کنواں کھود رکھا ہے نادر شاہ ایک پھیرا ایران سے دلی کا اور کرے تو مزا آئے۔ لڈو جو میرے جانی دشمن ہیں انہیں میرے لئے لگا رکھا ہے مگر میں اپنے دشمنوں کو کب سلامت چھوڑنے والا ہوں سب کو نگل جاؤں گا یہ کہا کرتے تھے اور ایک ایک لڈو کھائے جاتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ بادشاہزادے اُن کی بکواس سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے آخر میں جب گذارہ کی صورت دلّی میں نہ دیکھی تو باہر چلے گئے تھے، ایک بڑے راجہ کے ہاں مصاحبوں میں داخل ہو گئے تھے وہاں بھی بننے لگے تھے اور لڈو بیگ کہلانے لگے تھے۔ ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں حاضر تھے۔ راجہ صاحب نے سرِ دربار اُن کے چڑانے کے لئے لڈو کا نام لیا اور میرزا صاحب نے تلوار نکال کر راجہ صاحب پر حملہ کیا مگر کسی درباری نے اُن کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور کہا یہ بدخواہ ہے اِسے دربار سے نکال دیجئے۔ مہاراجہ نے کہا لڈو بیگ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی ایسا وضعدار آدمی وفادار بھی ہوتا ہے۔ وقت پر جاں نثاری کرتا ہے۔ میرزا لڈو بیگ کو خلعت ملا اور ساری عمر خوشی سے کٹی۔

"ساقی"

مغل مصوری

سیر و شکار کے مناظر کو پردۂ تصویر میں نمایاں کرنا مغل مصور کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ جہانگیر جب کبھی شکارگاہ میں جلوہ افروز ہوتا، چابکدست مصوّر اُس کے ہمرکاب ہوتے اور اُس کے کارناموں کو رنگ و روغن سے چمکا کر دادِ شجاعت دیتے تھے۔ جہانگیر شیر کے شکار کا بہت شائق تھا، مغل مصوری کے ہر مرقع میں ایسی متعدد تصویریں ملتی ہیں جو اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اس نادر مجموعہ

کی ایک تصویر نہایت حیرت انگیز منظر پیش نظر کرتی ہے - شیر خوفزدہ ہاتھی کی پشت پر سوار ہے - جسے بادشاہ اپنی خالی بندوق سے روکے ہوئے ہے، متوحش مہاوت بادشاہ کو خطرہ میں چھوڑ کر ہودہ سے کود پڑا ہے - اب ناظر کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے کہ شیر کے چنگل سے کس طرح بادشاہ کی مخلصی ہوئی ؟ مگر ذکی الفہم مصور نے یہ مشکل بھی اس طرح آسان کردی ہے کہ ایک مسلّح سوار کو شیر کے تعاقب میں جھپٹتے ہوئے نمایاں کردیا ہے، سوار نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرکے غیر معمولی تیزی سے گھوڑا چھوڑ دیا ہے، چہرہ پر جوشِ وفاداری کا رنگ غالب ہے، ایک ہاتھ میں راس ہے دوسرے سے بار بار نیزہ تول رہا ہے، غرض ایک لطیف کنایہ سے مصوّر نے ساری داستان مکمل کردی ہے، پھر سونے پر سہاگا یہ کہ بزدل مہاوت کی کرتوت کو اس پہلو سے واضح کیا ہے کہ تصویر میں جان پڑ جانے کے علاوہ تفریح و تفنّن کا سامان بھی فراہم ہوگیا ہے، جس سے دیکھنے والے کی دماغی بے چینی سکون و مسرت سے بدل جاتی ہے -

"زمانہ"

وہ زندہ ہیں

مجھ سے یہ نہ کہو کہ وہ مرچکے ہیں ـــــ وہ عالی منش گروہ، غیر مرئی ابطال کی وہ آسمانی فوج - وہ اپنی قوم کے سروں پر ایک زندہ بادل کی طرح منڈلا رہے ہیں - کیا وہ مرچکے ہیں جن کی آواز اب بھی ہماری آوازوں سے بلند آرہی ہے ؟ کیا وہ مرچکے ہیں جو اب بھی مصروفِ کار ہیں ؟ کیا وہ مرچکے ہیں جن کا اثر اب بھی معاشرہ پر قائم ہے اور جو لوگوں کے دلوں میں بلند تر مقاصد اور عالی تر قومیت کی روح پھونک رہے ہیں -

تمام پہاڑ اسی طرح قائم رہیں گے، اور تمام دریا اسی طرح چلتے رہیں گے، اور تمام وادیاں اسی طرح لہلہاتی رہیں گی، اور جب تک پہاڑ ریزہ ریزہ نہ ہوجائیں، اور جب تک دریا اپنی رفتار پر قائم رہیں، اور جب تک بادل چشموں کو سیراب کرنا نہ چھوڑ دیں، اور جب تک چشمے ابلنا اور ندیاں گانا نہ بھول جائیں - قومی حافظے کی کتاب میں اُن کے نام زرّیں حروف میں چمکتے رہیں گے -

"رمائی میگزین"

نئی کتابیں

عبادت اور اُس کی غایت، مولفہ مولانا میرزا ابو الفضل صاحب۔ یہ کتاب سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے کی گئی ہے۔ آنحضرت صلعم نے سورۂ فاتحہ کو اُمّ الکتاب کہا ہے جس کا مطلب ہے کہ قرآن مجید کی تمام تعلیمات اس میں بصورتِ اجمال موجود ہیں۔ اس لئے اس کو پڑھ لینا گویا ایک طرح تمام قرآن کے مطالب سے آگاہ ہو جانا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صرف ایک خدا کی مشیت کی تکمیل کرنا ہماری عین عبادت ہے، اور اسی عبادت کی توفیق طلب کرنا ہمارا عین مذہب ہے۔ جس فلسفیانہ انداز میں یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس کی داد کچھ اہلِ بصیرت ہی دے سکتے ہیں۔ کتاب نہایت عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر چھپی ہے اور مجلد ہے۔ حجم ۸۳ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: مینجر کتابستان، ۱۷ ایلی روڈ، الہ آباد۔

حافظِ شیراز حافظ کی نظر سے، از مولوی سید یوشع صاحب بی اے (علیگ) اس کتاب میں حافظ علیہ الرحمۃ کے کلام پر ایک جدید قسم کا تبصرہ کیا گیا ہے یعنی حافظ کے کلام کے محاسن خود حافظ کے کلام سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کام کے لئے شاعر کے کلام پر ایک زبردست عبور ہونے کی ضرورت تھی۔ مصنف کے حسنِ انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے اہل ہیں۔ انہوں نے حافظ کے کلام کا اس دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں کہ آدمی اُن کے ذہن کی رسائی پر حیران رہ جاتا ہے۔ حجم ۵۷ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ، حیدر آباد، دکن سے طلب فرمائیے۔

تذکرۂ ریختی۔ مرتبہ جناب مولوی سید تمکین صاحب کاظمی ہاشمی فاضل، ایم آر اے ایس۔ یہ کتاب ۴۳ ریختی گو شعرا کے مختصر حالات اور انتخابِ کلام پر مشتمل ہے۔ ریختی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ریختے کی تانیث ہے۔ ریختے میں مردوں کی زبان ہوتی ہے ریختی میں عورتوں کی۔ فرق اتنا ہے کہ ریختے میں عموماً پاکیزہ اور مہذب خیالات کی ترجمانی کی جاتی ہے لیکن ریختی میں غیر مہذب اور بسا اوقات فحش خیالات بیان ہوتے ہیں۔ اگرچہ لکھنے والے ریختی کے بھی مرد ہیں لیکن یہ اُس زمانے کی ایجاد ہے جب ہندوستان کے "مرد بھی زن" ہو چکے تھے۔ ریختی میں اُس دور کی بگڑی ہوئی معاشرت کا نقشہ ہے جب لکھنؤ کے رؤسا و امرا میں عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ اگرچہ یہ صنفِ ادب مخربِ اخلاق ہونے کی وجہ سے زیادہ ترقی نہ کر سکی لیکن اس میں عورتوں کے جذبات اور زبان اس خوبی سے ادا ہوتے ہیں کہ فطرتِ نسوانی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سیّد صاحب نے اس کتاب کو "علم برادرانِ شرم و حیا" سے ڈرتے ڈرتے شائع کیا ہے لیکن ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کی اشاعت سے ایک قومی سرمایہ کو محفوظ و منظم کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط اور مفید مقدمہ ہے اور آخر میں مشکل الفاظ اور محاورات کی فرہنگ ہے۔ اشعار کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ حجم ایک سو صفحات سے زائد قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ حیدر آباد، دکن۔

جلد ۲۰ — نمبر ۵

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۱ء

تصویر:- نینوا کے کھنڈر

ہُمایوںؔ کی دسویں سالگرہ

کی

مسرت انگیز تقریب پر چندے میں عظیم الشان رعایت

پانچ روپے کے بجائے تین روپے سالانہ

غیر معمولی ضخیم اور شاندار سالگرہ نمبر

جنوری ۱۹۳۲ء میں ہمایوں کی دسویں سالگرہ ہے۔ اس مسرت انگیز تقریب پر اس مرتبہ "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا جائے گا اور یہ پرچہ خود ہمایوں کے گزشتہ سالگرہ نمبروں سے ہر طرح بہ مدارج فائق ہوگا۔ ظاہری و باطنی محاسن کے اعتبار سے یہ نفیس اور ضخیم مجموعۂ ادب اردو رسائل کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

سرورق۔ بدستور سابق کسی حیرت کار مصوّر کے انوکھے خیال کا مرقع ہوگا۔

تصاویر جو عرصۂ دراز کی تحقیق اور جستجو کے بعد بہ صرفِ زرِ کثیر حاصل کی گئی ہیں بہ غایت دلفریب اور بے مثال ہونگی۔

علمی و ادبی مضامین ایسے گراں پایہ ہونگے کہ خود ہمایوں کو ان پر ناز ہوگا۔

حصۂ نظم بہترین نقادوں اور شاعروں کے انتخاب اور جادونگار شعرا کے فلک پرواز تخیل کا عطر ہوگا۔

افسانے بلند پایہ اور سحر طراز افسانہ نگاروں کے سرمایۂ ناز کارناموں سے چنے جائیں گے جو دنیا کے کاروبار سے تھکے ہوئے دماغوں کو ادب و شعر کی لطیف اور کیف انگیز طلسماتی فضاؤں میں لے جائیں گے۔

مزاحیہ مضامین اور حکیمانہ نکتے اہلِ ذوق کی تفریح کا سامان فراہم کریں گے۔

سالگرہ نمبر کی دوسری دلفریبیاں بالیدگیٔ روح کا سرمایہ ہونگی۔

چندے میں رعایت

اس مسرت انگیز تقریب پر چندے میں بھی عظیم الشان عارضی رعایت کردی گئی ہے چنانچہ اس اعلان کے بعد دسمبر ۱۹۳۱ء کے آخر تک جو حضرات "ہمایوں" کی خریداری قبول فرمائیں گے اُن سے ۱۹۳۲ء کے لئے پانچ روپے کے بجائے تین روپے سالانہ چندہ وصول کیا جائے گا (ششماہی کے خریدار ایسی رعایت سے مستثنیٰ ہیں) اور ساتھ ہی ہمایوں کا یہ عظیم الشان نمبر بھی زائد قیمت کے بغیر ان کی نذر کیا جائیگا۔

ناظرین ہمایوں سے درخواست ہے کہ وہ نہ صرف اپنی عنایات کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ اس عظیم الشان رعایت کے پیش نظر اپنے حلقۂ احباب میں وسیع پیمانے پر ہمایوں کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش کرکے انہیں اپنے ادبی لطف کا شریک اور ہمایوں کو اپنا ممنونِ احسان بنائیں۔

خریداری کی فرمائشیں جلد از جلد بھجوا دیجئے تاکہ اسی اندازے سے پرچہ تعداد کثیر میں طبع کیا جائے۔ مشتہرین ابھی سے اپنے لئے جگہ محفوظ کرالیں۔

نوٹ: بہتر ہے کہ خریداری کی فرمائشیں دسمبر کے پہلے ہفتے تک دفتر میں موصول ہوجائیں کیونکہ بصورتِ دیگر ممکن ہے کہ خریداروں کی کثرت کی وجہ سے ہم دیر میں فرمائش کرنے والے حضرات کا مطالبہ پورا نہ کرسکیں۔

مینجر "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

جہاں نما

میراں بائی

مس سلیڈ

کرنل انھرٹن نے مس سلیڈ کے متعلق ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے :-

بیس سال گزرے جب اینگلو انڈین حلقوں میں امیر البحر سر ایڈمنڈ سلیڈ کی بیٹی کے نام سے ہر شخص واقف تھا۔ اس کے سیاہ بال، اس کی حیرت انگیز خوبصورت آنکھیں اور اُس کا نفیس لباس ضرب المثل تھا۔ وہ اس زمانے میں ایک انگریزی بورڈنگ سکول کر نئی نئی نکل کر آئی تھی۔ اُسے رقص اور ٹینس کھیلنے میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ اس کی والدہ جو انگریزی حلقہ ہائے معاشرت میں بہت سربرآوردہ تھی خاص خاص تقریبات پر اُسے میزبان کے فرائض سپرد کیا کرتی تھی۔ ان دنوں انگلستان جانا اور وہاں کی عشرت و مسرت سے بہرہ اندوز ہونا مس سلیڈ کی عزیز ترین آرزوؤں میں سے تھا۔

چالیس سال کی عمر میں بھی وہ فیشن کی دلدادہ اور نمائش پسند تھی لیکن یہ بات واضح طور پر معلوم ہو رہی تھی کہ اب وہ "میم صاحب" کی طرزِ زندگی سے مطمئن نہیں رہی۔ اِس وقت اُس نے گاندھی مہاتما سے ملاقات کا فیصلہ کیا جسے اس کے پیرو وشنو دیوتا کا دسواں اور آخری اوتار سمجھتے ہیں۔

خوبصورت اور خوش لباس عورت اور گہری آنکھوں والے شکستہ استخواں پیر مرد کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، اس کا علم کسی کو نہیں گاندھی کی بلند اور تیز آواز نے چند الفاظ میں مس سلیڈ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اُس نے دنیا اور اُس کے تمام لوازم یک قلم ترک کر دیئے اور میراں بائی کا نام اختیار کر کے گاندھی کی ایک عاجز پیرو بن گئی جسے اُس کے حلقۂ احباب میں تمام لوگ یا تو مکار اور یا ایک خطرناک دیوانہ تصور کرتے تھے۔

آج کل میراں بائی کے قریبی عزیزوں میں سے اس کی صرف ایک بہن باقی ہے جو ہندوستان کے کسی انگریز عہدہ دار کی بیوی ہے اور جو غالباً میراں بائی سے نامہ و پیام وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ انگریزی سوسائٹی میں اب مس سلیڈ کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی اس اولیں ملاقات کے بعد مس سلیڈ جس کے حسن کا کبھی شہرہ تھا اور جو لاتعداد عقیدتمند آنکھوں کا تارا تھی، گارے کے ایک کچے جھونپڑے میں رہتی ہے۔ موٹی جھوٹی غذا کھاتی ہے۔ کھادی کے کپڑے پہنتی ہے۔ روزے رکھتی ہے اور اُن کے دوران میں دہی دودھ پی

یا موٹی روٹی کے سوا کچھ نہیں کھاتی ۔ وہ ہر صبح پو پھٹنے کے وقت اُٹھتی ہے اور گاندھی کی ذاتی خادمہ کی حیثیت سے اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی ہے ۔ باقی وقت وہ گاندھی کے لئے کھانا پکانے چرخا کاتنے اور قدیم ویدوں کے مطالعے میں گزارتی ہے۔ وید ہندوؤں کی مذہبی اور غالباً دنیا کی قدیم ترین کتابیں ہیں ۔

گاندھی کہیں بھی ہو وہ ہر روز ایک مجلس منعقد کرتا ہے ۔ پہلے مس سلیڈ اپنی جھونپڑی سے نکل کر گاندھی کے لئے ایک گدی بچھاتی ہے اور پھر نہایت عجز و انکسار سے اس کا انتظار کرتی ہے ۔ آخر گاندھی آلتی پالتی مار کر گدی پر بیٹھ جاتا ہے اور گفتگو کرتا ہے ۔ اس کے اٹھنے پر میراں بائی نہایت احترام سے اُس کا پاپوش اُٹھا کر سامنے رکھتی ہے اور اس کے بعد گدی اُٹھا کر اپنے لنگوٹ بند آقا کے پیچھے پیچھے اُس کے جھونپڑے میں لے جاتی ہے ۔

مقصدِ زندگی

پروفیسر ہکسلے کے خیال کے مطابق ضروریاتِ زندگی کے حصول کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد ایک فرد کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنا کوئی ایسا مقصدِ زندگی بنائے جو کبھی کامل طور پر پورا نہ ہو سکے یا بالفاظِ دیگر اپنا کوئی ایسا نصب العین قرار دے جو اس کی ذات کو مسلسل اور متواتر ترقی کے منازل طے کراتا رہے ۔ ادب و موسیقی یا دوسرے فنونِ لطیفہ میں سے کسی ایک کے سحر و حسن کے ہم جتنے دلدادہ اور پرستار بنتے ہیں اتنی ہی فنونِ لطیفہ کے ارتقا اور تکمیل کی ممکنات وسیع نظر آنے لگتی ہیں اور ذوقِ سلیم کو ان میں دلچسپی کا اتنا ہی زیادہ سرمایہ نظر آتا ہے ۔

جس قدر ہم صحیح اصولِ زندگی کی پیروی کے لئے مستعد ہوتے ہیں اسی قدر کامل زندگی کا افق ہم سے دور ہوتا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اسی قدر زیادہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس تک پہنچنے کی جد و جہد جاری رکھنے کے قابل ہے ۔

فن کار مصنفین

موجودہ مغربی مصنفین میں سے ایچ جی ویلز، جان گالزوردی، جارج برنارڈ شا، جی کے چسٹرٹن اور جان میسفیلڈ سے بڑھ کر کوئی بھی فن کاری کے ساتھ علم کی آمیزش کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ۔ بقول ایک ہم عصر کے یہ پانچوں شخص انسانی فطرت، اُس کی ضروریات اور انسان کی فلاح کے لئے اُن کی حقیقی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں ۔ یہ نہ صرف عالم ہیں بلکہ فن کار یا صناع بھی ہیں جس کا ثبوت اُن کے دل افروز خیالات و بصائر کے اندازِ اظہار میں موجود ہے ۔ انسانی زندگی کے متعلق ان تینوں کے خیالات کی روش فرداً فرداً باختصار یوں پیش کی جا سکتی ہے ۔ ویلز سائنٹسٹ ہے، گالزوردی فن کار، شا فلسفی، چسٹرٹن

جمہوریت پسند اور میسفیلڈ شاعر۔

برنارڈشا کہتا ہے "چھوڑ دو رسم و رواج کی تمام بیہودہ پابندیوں کو، فضول اخلاقی قوانین کو اپنے رواجی مذہب کو اور تنگ خیال واعظوں کی احمقانہ اصطلاحات کو"۔

ویلز کہتا ہے "اگر تم اپنی دماغی جسمانی اور روحانی قوتوں سے صحیح طور پر کام لو تو دنیا جنت بن سکتی ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے مقصدِ حیات کی تقدیس کا احساس کرو اور کامیابی کی منزل کی طرف فاتحانہ جرأت کے ساتھ قدم بڑھاؤ"۔

گالزوردی کا خیال ہے "انسان ایک محبوب، خوش آئند اور مسرور ہستی ہے جس کی شخصی آزادی اس کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اگر اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے تم اِس آزادی میں خلل انداز ہو، تو تم گویا انسان کی تباہی کا باعث ہو گے"۔

چسٹرٹن کہتا ہے "تم نے انگلستان کی صورت بگاڑ دی ہے۔ اور تمہاری نام نہاد تہذیب نے انسانی زندگی کے تقریباً تمام روشن پہلوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ جب تک تم دکھ کے لئے اپنے دلوں کو بدرجۂ غایت ذکی الحس نہ بناؤ گے تم دکھ کا خاتمہ نہیں کر سکتے، اور نہ وہ راحت پیدا کر سکتے ہو جس کے لئے انسانی فطرت ترس رہی ہے"۔

میسفیلڈ کہتا ہے "میں تم کو اُس ذلت اور افتادگی کے گیت سناؤں گا جسے ہم گوارا کر رہے ہیں۔ یہ ذلت اور افتادگی دنیا کی بہترین اور بلند ترین چیز کی ذلت اور افتادگی ہے، یعنی انسانی فطرت کی ذلت اور افتادگی۔ میں اپنے گیتوں سے تمہیں پشیمان ہونے میں مدد دوں گا"۔

انگلستان اور ہندوستان

جے کے چسٹرٹن اس حقیقت پر اندوہ و تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ جتنا انگلستان ہندوستان کے قریب ہوتا ہے اتنی ہی اُس پر اپنی نارسائی کھلتی جاتی ہے "جس قدر انگلستان یہ سمجھتا ہے کہ میں اب ہندوستان کو سمجھ گیا ہوں اسی قدر وہ اسے سمجھنے کے ناقابل ہے جب ہمیں حیدر علی مسلمان کی مقاومت معروف کا سامنا تھا۔ دونوں طرف ایک ہی طرح کے ہتھیار چل رہے تھے اور لڑائی کی دنیا بھی ایک ہی تھی لیکن اب جس وقت کہ ہمیں گاندھی مہاتما کی مقاومت مجہول سے واسطہ پڑا ہے۔ ہم اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتے ہیں جو ہمارے لئے اتنی ہی اجنبی ہے جتنی جادو کی سرزمین"۔

نینوا کے کھنڈر

یہ تصویر ایک انگریزی مصوّر برٹن بریوٹیر کے موقلم کی آفرینش ہے۔ اس مصوّر کو قدیم مناظر کی تصویر کشی کا خاص فن تھا۔ چنانچہ اس قسم کے موضوعات پر اس کی کئی تصاویر مشہور ہیں۔

دنیا کی بے ثباتی کا یہ حسرت آفریں مرقع دامانِ نگاہ کو عبرت و موعظت کے سینکڑوں گنجینوں سے بھر دیتا ہے۔ نینوا کے خستہ حال عظیم الشان ایوانوں پر تباہ شدہ شاہی دالانوں پر اس وقت سکوت کی حکمرانی ہے۔ اگرچہ نمرود جیسا باجبروت بادشاہ اس کا موسّسِ اول تھا اور جلیل القدر شاہی تاجداروں کی عظمت و شوکت نے اس کو چار چاند لگائے مگر آئینِ قضا اس کے انجام پر بھی ازل سے کل من علیہا فان کی مہر ثبت کر چکا تھا۔

ان شاہی بارگاہوں اور محلسراؤں نے عیش و نشاط کے ہزاروں نیم شبی ہنگامے دیکھے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آخر ان عشرت گاہوں کے اینٹ اور پتھر اور ستون تک گناہ کے غیر مقدس نظاروں کی تاب نہ لاکر لرز اٹھے اور اب ان کی تیرہ روزگاری اور شکستہ حالی آسمانی فیصلے کی قہرمانی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکی ہے۔

نینوا کے کھنڈروں کی باقاعدہ تحقیق کے کام میں اوّلیت کا سہرا لیئارڈ (۱۸۴۵-۴۷) کے سر پر ہے۔ اس کے بعد یہ کام دوسرے لوگوں نے جاری رکھا۔ چنانچہ شاہی تعمیر اور سنگ تراشی کی حیرت انگیز باقیات بے نقاب ہوئی ہیں، اور ایسے کتبے پائے گئے ہیں جو اس قدیم شہر کی تاریخی قدامت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نینوا بے قاعدہ چوکور صورت میں دجلے کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ ڈھائی میل کے طول میں پھیلا ہوا تھا اور عرض میں یہ کسی جگہ ایک میل سے زیادہ نہ تھا اس کو ہر طرف سے ایک مضبوط فصیل گھیرے ہوئے تھی۔

اب اُس قدیم طنطنہ و شکوہ اور عشرت و نشاط کے مناظر کے آئینہ دار یہ شکستہ و ریختہ کھنڈر رہ گئے ہیں جن کی خاموشی زبانِ حال سے اپنی نگونساری کی نوحہ خوانی کر رہی ہے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

حامد علی خاں

"چھان"

مضمون نگار نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔ تجربے کو فوراً قلمبند کرتے وقت وہ تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا کہ "چھان" کس زبان کا لفظ ہے کس کا نہیں۔ "حقیقت نگاری" میں یہ بڑی دقت ہے کہ علمیت اُس وقت عموماً رخصت ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ عام زندگی لے لیتی ہے۔ مضمون نگار پنجابی ہے۔ سو پڑھی ہوئی اُردو کے ساتھ دل میں پڑی ہوئی پنجابی بھی مل جل گئی۔ جب خیالات قلمبند ہو گئے تو خیال آیا کہ "چھان تو اپنے گھر کی چیز ہے۔ پرائے لوگ اسے بھوسا اور اس کی تانیث بھوسی اور چوکر وغیرہ کہتے ہیں۔ اب مشکل پڑی بھوسا بھوسی چوکر لکھو تو خیال اور مضمون دونوں غائب، چھان رکھو تو زبان والے سر پر سوار۔ ہمایوں سے دریافت کیا گیا تو اُس نے اس کا علاج یہ "اداری ملاحظہ" تجویز کیا۔ اب آگے مضمون نگار جانے اور قارئین!

مُدیر

"جلٹ" کے "محفوظ" اور بردبار اُسترے سے میں اپنے چہرے پر کے ہر روز بغاوت کرنے والے بالوں کی سرکوبی میں منہمک تھا کہ ننھا اور ننھی دونوں ساتھ ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ اُن کا معمول ہے کہ وہ ہر روز صبح کو باہر سے گھوم گھام کر واپس آتے ہیں۔ تو سیدھا میرے "کپڑا بدلی" والے کمرے کا رخ کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ "ابا جان حجامت بناؤ" "مھامت بناؤ" "ہاؤ" اُن نکھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہیں بھی اپنے کام سے اکتا چکا ہوتا ہوں گھر کو ان سے خالی دیکھ کر سوچ بچار کا کوئی کام ان کے وارد ہونے سے پہلے پہلے کر لیتا ہوں کہ یہ شیطان آئیں گے تو اُدھم مچائیں گے اور پھر سوائے بعض قسم کے رسمی خطوط لکھنے کے اور کچھ نہ ہو سکے گا۔ جہاں یہ آئے ان کے آگے کوئی مُحبت کام نہیں دیتی۔ بڑوں سے تو بحث کر لی، نوکروں کو دھمکا لیا، کسی سے اس طرح نجات پائی کسی سے اُس طرح لیکن یہ فی البدیہہ مخلوق شاید اپنے خالق کا بھی کہنا نہ مانے۔ دیکھ لیجئے۔ ہم اشرف المخلوقات کو اللہ میاں نے زمین پر اپنا "خلیفہ" بنا کر اُتارا لیکن یہ "ریٹھے ممیں" ذرا خاطر میں نہیں لاتے خیر شکر ہے کیونکہ اسی سرکشی کے باعث ان سے اور انہیں کے دم سے باوجود اس "خلافت" اور باوجود دنیا کی خشک مزاجی کے زندگی ہمارے لئے دلچسپ ہے اور رنگین۔

ننھا ننھی دونوں اندر آ گھسے اور دروازہ پٹ سے کھول دیا اور کھلا ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی انہیں دیکھتے ہی خود ہتھیار ڈال دیئے اور کہا "آؤ حجامت دیکھو حجامت"۔ مگر بچے قانون اور باقاعدگی کو بڑوں پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود جو وقت پر جی میں آئے گزرتے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے بہن کے سامنے ہی صاف کہہ دیا کہ "اب ابا جان کی حجامت ہو گی حجامت"۔ اس پر میں

چپ ہو رہا لیکن پھر اتفاقاً اُنھوں نے میری چھڑی کو تاکا، چھڑی تھی ایک، کھلاڑی دو۔ اب میری شامت آئی، کیا کروں دونوں چھڑی مانگنے لگے۔ میں بھی "امدادِ باہمی" اور "اجتماعی زندگی" کے متعلق کتابیں پڑھنے اور مضمون لکھنے میں کچھ دنوں سے مصروف تھا۔ میں نے فوراً تجویز کی کہ دونوں "باری باری" + پہلے تو ان میں کچھ دھینگا مشتی سی ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ جلد میری تجویز کی تائید میں وہ ساتھ کے برآمدے کی طرف چل دیئے اور "گھوڑا گھوڑا" کھیلنے لگے۔ ننھے نے چھڑی ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر کہا "میں ہوں گھوڑا" اور ننھی سے کہا "تم میرے پیچھے ہو جاؤ اور کہو تم بڑے چھنان (شیطان) ہو"! غرض ننھی اُس کے پیچھے ہو لی۔ وہ آگے آگے یہ پیچھے پیچھے، وہ چھڑی گھسیٹتے بھاگا پھرے اور یہ کہتی جاتے "چھان گھوڑا چھان"!

"چھان"! یہ تھا ننھی کا نام حضرت شیطان کے لئے "چھان"! میرے کان کھڑے ہو گئے۔ منّی سی گڑیا نے خوب نام رکھ دیا۔ اور کائنات کے مسئلے کو خوب حل کیا + خدا تھا گیہوں، کائنات کی چکی میں پسا اور آٹا اور "چھان" بنا اور بن رہا ہے آٹا انسان اور "چھان" شیطان + اب انسانوں کی دنیا میں آٹے کی تعریف ہو رہی ہے کیونکہ یہاں ہر ایک بھوکا ننگا ہے اور چھان کی برائی ہو رہی ہے۔ کون موٹا پہنے اور موٹا کھائے مگر اُف آٹے کو نہیں اپنے آپ کو کھا رہے ہیں + اگر تھوڑا سا یہ شیطان کو بھی نگل جائیں کم از کم کچھ چبا ہی لیں تو ان کی یہ حالت نہ ہو جواب ہے کہ کھاتے ہیں پیٹ بھر کے اور جی بھر کے لیکن بدن وہی منحنی کا منحنی + پرانے لوگ تو کہتے ہی تھے اب بعض نئے سمجھدار بھی ماننے لگے ہیں کہ آٹے کے ساتھ اگر چھان ملا لیا جائے تو تندرستی اور طاقت کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے + میں بھی سوچتا ہوں کہ میں جو مدت سے "آٹا سا" ہو رہا ہوں اگر اپنے آٹے میں اپنی ننھی کا تھوڑا سا "چھان" ملا لوں تو شاید کام کا آدمی بن جاؤں +

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حالت اُس وقت درست ہو گی جب وہ شیطان کو بھی اپنے کاموں میں نیک نیتی کے ساتھ شریک کرے گا۔

ل ب

کلامِ محسنؔ

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ
کلامِ نعتیہ رکھا مری زباں کے لئے

ہنود کے نزدیک گانا جزوِ عبادت ہے کیونکہ اس سے روح کی نشوونما ہوتی ہے، مگر ہر قسم کا گانا اس مرتبہ کا مستحق نہیں، جزوِ عبادت تو وہی چیز ہوسکتی ہے جو عبادت کی طرح مقدس ہو مگر اس کی کوئی تخصیص برہمنوں نے نہیں کی اور موسیقی کو جو عرفِ عام میں "گانا" ہے جزوِ عبادت مان لیا۔ مسلمانوں نے شاعری کو بھی اس مرتبہ تک پہنچانے میں سعی کی ہے جس کا اظہار حمد و نعت کے ذریعہ سے کیا گیا ہے، خصوصاً نعت کے ذریعے سے کیونکہ نعت جس میں پیغمبر کی تعریف کی جاتی ہے بہ نسبت حمد کے جو خدا کی ہے، زیادہ آسان ہے۔ پیغمبر کا تصوّر ممکن ہے خدا کا تصوّر ناممکن۔ غرض باعتبارِ نعت شاعری موسیقی کی طرح مقدس ہے مگر جس طرح ہر قسم کا گانا مقدس نہیں، شعرائے اسلام کا عام کلام بھی مقدس نہیں، کلامِ نعتیہ مقدس ہے اور یہ تقدس ایک مقدس ہستی کے تقدس سے مستعار ہے۔ اس اعتبار سے مسلمان اگر تمام و کمال نہیں تو کم از کم اصنافِ شاعری کو بہبودِ عاقبت کا سبب ضرور خیال کرتے ہیں، اور اس دنیائے فانی میں کلامِ نعتیہ چھوڑ جانا سعادتِ جاودانی سمجھتے ہیں۔

باعتبارِ مفہوم نعت کو مناجات، مرثیہ اور سلام وغیرہ کے مرادف نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ مناجات وغیرہ کا مفہوم نعت کے لگ بھگ ہونے کے باوجود اس سے بہت مختلف ہے۔ نہ عیسائیوں کی دعاؤں، سکھوں اور ہنود وغیرہ کے مذہبی گیتوں سے نعت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ چیزیں "حقّانی"[1] کی طرح مختلف مذاہب میں مشترک ہیں۔ نعت حقّانی نہیں گو حقّانی کی طرح قوّالی میں شامل ہے۔ نعت کا تعلق خاص طور پر شاعری سے ہے، حقّانی کا موسیقی سے۔ نعت لکھی جاتی ہے، حقّانی گائی جاتی ہے۔ اسی طرح مذہبی کتابوں مثلاً مہابھارت، رامائن اور مثنوی معنوی وغیرہ کو بھی موسیقی کے اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کیونکہ ہر شخص بلاقیدِ مشرب و ملّت ان کو اس لحن و لہجہ میں پڑھنے کا مجاز ہے جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ مگر باعتبارِ شاعری ان

---

[1] حمد اور حقّانی میں قدرے اختلاف ہے، وہ یہ کہ حمد میں صرف خدا کی تعریف ہوتی ہے اور حقّانی میں عبرت، موعظت اور دنیا سے بیزاری کے مضامین بھی۔ حمد علم ادب سے متعلق ہے حقّانی موسیقی سے علیٰ ہذا القیاس۔

کتابوں کے چند مخصوص شعر الگ کئے گئے ہر شخص ان کو نہیں لکھ سکتا البتہ ترجمہ وغیرہ ممکن ہے۔ نعت سے ان کا اختلاف یوں اور نمایاں ہے کہ سری رام چندر جی وغیرہ کی تعریف اگر ان تمام واقعات کے ساتھ کی جائے جو والمیکی یا تلسی داس کی رامائن میں درج ہیں تو شاید "رامائن" کہلائے لیکن پیغمبر اسلام کی تعریف میں چند اشعار ہی نعت کہے جا سکتے ہیں۔ اس طرح رامائن لکھنے والے ابھی تک صرف ہندو ہی ہوئے ہیں۔ نعت لکھنے والوں میں ہندو و مسلمان دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ایک نعتیہ شعر[1] تلسی داس کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

غرض "حقانی" کے وسیلے سے ہندوؤں نے موسیقی کو جزوِ عبادت قرار دیا اور "نعت" کے وسیلے سے مسلمانوں نے شاعری کی عزت بڑھائی اس طرح بہ اعتبار جزو نغمہ بااعتبار کل ہندو موسیقی کو جزوِ عبادت اور مسلمان شاعری کو مقدس سمجھتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی مقدس شاعری کی تخصیص کر دی ہے اور علاوہ شاعری کے گانا بھی اس تخصیص سے بری نہیں کیونکہ وہ گانا جو بقولِ سعدی "قوتِ روح"[2] ہے فارسی میں "سماع"[3] اور اردو میں "قوالی" کہلاتا ہے۔ قوال نعت بھی گاتے ہیں اور حقانی بھی۔ اس طرح نعت بہ اعتبارِ نظم و نغمہ شاعری و موسیقی میں مشترک ہے مگر اس کی اہمیت خاص کر شاعری سے متعلق ہے اس لئے یہ شاعرانہ عبادت ہے اور شاعر و غیر شاعر ہر مسلمان اس کے لکھنے پڑھنے اور سننے کو سعادتِ دارین سمجھتا ہے۔

یہاں یہ ایک سطحی اعتراض بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے تو شاعری کو ناجائز قرار دیا ہے۔ نعت وغیرہ کا پہلو لے کر اس کو جزوِ عبادت کہنا تو بڑی زیادتی ہوگی اور زیادتی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا تضادِ صریح! اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کو فنِ شعر سے بیر نہیں بلکہ اس فنِ لطیف کو آوارگی، کاہلی اور پستیٔ اخلاق کا ذریعہ بنانے سے اس کو عناد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُس شاعری کی مخالفت کرتا ہے جو عرب جاہلیت میں معارضِ اخلاق تھی۔ ایسی شاعری سے اس کو مخالفت نہیں جس کا موضوع نصیحت و موعظت ہو جو بنی نوعِ انسان میں شمیمِ محبت پھیلا سکے اور ان برگزیدہ ہستیوں کے بڑے دلوں سے ہمارے چھوٹے دلوں کو ملا سکے جن کی تعریف خود فطرت اپنی زبان سے کر رہی ہے۔ بڑوں کی محبت سے بڑائی آ ہی جاتی ہے اگر شاعری ایسی محبت کا سبب ہو سکے تو اس کو جائز ہی نہیں بلکہ مقدس سمجھنا چاہئے، یہی دلیل مصوری اور موسیقی پر صادق آتی ہے۔ تقدس کا سبب "جادوئے سامری" یا "شیوۂ آذری" نہیں بلکہ اس کے لئے تو "سلیقۂ کلیم" اور "قرینۂ خلیل"

---

[1] اس کا ایک مصرعہ راقم کو یاد ہے وہ یہ ہے ؎ "تلسی بیکنٹھ نہ جائیے بنا محمد نام"

[2] سعدی کا شعر ہے

بہ از روئے زیباست آوازِ خوش | کہ آں حظِ نفس است ایں قوتِ روح (گلستان)

[3] "سماع" یہ اصطلاح ہندوستان ہی کی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔

چاہیئے۔[۵۱]

نعت پر اظہارِ خیال کرتے وقت موسیقی، مصوری اور شاعری وغیرہ سے متعلق سطحی اعتراضات و شکوک کو صاف کرنا محض "دوگانۂ وفا سے جفا نما" نہ تصور کیا جائے کیونکہ یہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ایک حقیقتِ واقعی کا اظہار ہے۔ اس بظاہر غیر متعلق تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف جو ایک مقدس وجود کے محاسنِ اخلاق سے نسبت رکھتا ہے، رجوع ہونا فوائے دماغ کو باوضو کرکے حواسِ خمسہ کی طہارت کے ساتھ اپنے مطالعہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا ہے گرچہ باوجود اس دماغی شست و شو کے ایک عقیدتمند شاعر یہی کہے گا کہ ؏

"مشہور نام تو خواندن کمال بے ادبی ست"

المختصر نعت میں عموماً شاعرانہ تعلیوں، علمِ بیان کی ترکیبوں، صنائع بدائع کی خوبیوں اور بحر و وزن کی نغمہ آفرینیوں کے ساتھ پیغمبرِ اسلام کے وجودِ ظاہری و باطنی کی تعریف کی جاتی ہے اور آپ کے محاسنِ اخلاق پر روشنی ڈالی جاتی ہے، یہی ہمارے اس مضمون کی اصل تمہید ہے اور یہی اس کا خلاصہ۔

جس طرح بادشاہوں کے یہاں درباری شعرا ہوتے تھے پیغمبرِ اسلام کی سرکار میں بھی (کیونکہ خدا نے آپ کو روحانی بادشاہت اور دنیا کی سلطنت دونوں عطا فرمائی تھیں) حسّان بن ثابت نامی ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ مسلمان اُن کو مداحِ رسول کہتے ہیں۔ عرب کے بعد اسلامی تہذیب ایران میں چمکی ایران کے نعت گو شعرا میں ملا جامی زیادہ مشہور ہیں یوں تو عرفی اور سعدی کی طرح تمام شعرا کم و بیش نعت لکھتے ہی تھے جیسے کہ آج کل ہندوستانی مسلمانوں میں نعت لکھنا بہبودِ عاقبت خیال کیا جاتا ہے۔ نعت میں جامی کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہے اور نہایت کامل خیال کیا جاتا ہے

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

مگر در اصل اس میں کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں معلوم ہوتی بجز اس کے کہ یہ مصرعہ نعت کا ابتدائیہ خلاصہ کہلا سکتا ہے۔ اس مصرعہ سے بڑھ کر تو اودھ کے مرحوم تعلقدار راجہ نوشاد کا یہ شعر ہے ؎

ادب سے زباں تمام کر گئیاں ہیں   حبیبِ خدا کو خدا کہتے کہتے

اس شعر میں شاعری کی تمام خوبیوں کے علاوہ حمد و نعت دونوں موجود ہیں کیونکہ شاعر نے اپنی عبودیت اور خدا کی بزرگی کا اعتراف پہلے مصرعہ میں لفظ "ادب" سے کر دیا ہے اور دوسرا مصرعہ شاعرانہ بے ساختگی کے ساتھ نعت کا خلاصہ ہے مفہوم پورے شعر میں ہے۔

---

۵۱ اقبال: نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا   تو ہلاکِ جادوئے سامری میں قتیلِ شیوۂ آذری

ہندوستان کے نعت گو شعرا میں شہیدی، غلام امام شہید، اکبر جلال پوری، مولوی کیف اور میر احدی اجمیری وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں۔ علاوہ ان کے حضرت امیر مینائی، میر مہدی مجروح اور انیس و دبیر کو بھی نعت لکھنے اور مداح رسول ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر محسن کاکوروی ان سب پر سبقت لے گئے۔ محسن نے تو زیادہ تر نعت ہی پر قلم اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ بعض بعض جگہ وہ ملا جامی سے بھی بڑھ گئے۔ خود فرماتے ہیں سے

کیا شیراز کو پامال اردوئے معلّٰی نے ۔۔۔ گیا مان اصفہاں لوہا مری تیغ مہنّد کا

ہمیں مولانا موصوف کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اُن کے صاحبزادے محمد نور الحسن ایڈوکیٹ ہردوئی کی مختصر شرح حیات سے معلوم ہوا جو موصوف نے اپنے والد مرحوم کے مجموعۂ کلام میں شائع فرمائی۔ آپ تحریر فرماتے ہیں حضرت محسن کاکوروی سیّد علوی تھے۔ اُن کے اجداد آستانۂ رسول اللہ اور ارض مقدس حجاز سے جدا ہو کر قصبۂ صحرام (نواح خواف) میں جو بغداد و ممالک خراسان کے وسط میں واقع ہے آباد ہوئے۔ قاری محمد صدیق (المعروف بہ ابو محمد خافی) اس خاندان میں اول شخص ہیں جو ہندوستان آئے اور سلاطین لودی کے عہد میں قصبۂ کاکوری ضلع لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی۔ ان کی اولاد کا وطن مالوف اس وقت تک یہی قصبہ ہے۔ مولانا محسن کے والد مولوی حسن بخش کے دو باکمال فرزند مولوی محمد محسن اور مولوی محمد احسن[۱] پیدا ہوئے۔ مولوی محمد محسن ۱۲۴۳ھ میں بمقام کاکوری تولد ہوئے۔ مداح رسول کا بچپن لہو و لعب میں گذرا مگر اسکول کے عام لڑکوں کی طرح ان میں شرارت بالکل نہ تھی۔ وہ شیکسپیر کی طرح امیروں کے باغوں میں جا کر پھل پھلاری توڑ نا معیوب سمجھتے تھے۔ قدرت ان کو ابتدا ہی سے مداح رسول بنا رہی تھی۔ خود اُن کے صاحبزادے نے لکھا ہے کہ مولانا محسن کے بچپن کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ فٹ بال اور کرکٹ وغیرہ کا نام بھی سننے میں نہ آتا تھا۔ عوام کے بچے گولی کوڑی کھیلتے اور شرفا کے لڑکے پتنگ بازی کی دوڑ دھوپ سے ریاضت کے فوائد حاصل کرتے تھے۔ ان کی پتنگ بازی عملی طریقے سے مذہبی خیالات و مذہبی اصول کو دل پر بٹھانے کا ذریعہ تھی۔ "تین چار بجے شب سے اُٹھ کر نماز تہجد پڑھنا اور تلاوت کلام مجید کے بعد درود شریف پڑھ کر ڈور پتنگ پر دم کرنا کہ اس کے اثر سے پتنگ نہیں کٹے گا مذہبی عقیدت کے رگ و پے میں سرایت کرنے کا ذریعہ تھا" ۔۔۔ نو سال کی عمر میں آپ کو کلام نعتیہ لکھنے کی بشارت ہوئی۔ مولوی ہادی علی اشک اپنے خالہ زاد ماموں سے اصلاح لیتے رہے۔ سن بلوغ پر کچھ عرصہ ملازمت بھی کی، عدالت مین پوری میں بعہدۂ نظارت کام کیا۔ بعد ازاں وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرہ میں قیام فرمایا۔ حکام کی توجہ سے متھرا کے منصف بھی ہو گئے مگر ملازمت اور آزادی میں فطری بیر دیکھ کر آپ وکالت ہی سے راضی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے آپ کو کاکوری آنے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں پھر مین پوری جا کر اپنے آزاد پیشے میں مشغول ہوئے اور صاحبزادوں کی

---

[۱] آپ بھی شاعر ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو کلیات محسن دیباچہ

تعلیم کے بعد اُس کو بھی خیرباد کہی۔ باقی عمر یادِ خدا اور یادِ رسول میں صرف کر کے ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو رحلت فرمائی۔ مین پوری ہی میں آپ کا مزار ہے۔

کیا ملا محسن کی اس مختصر حیات سے ہم کو اٹلی کے نامور شاعر ڈینٹی کی حیات کا خاکہ یاد نہیں آجاتا؟ ۱۲۶۵ء میں ڈینٹی نے فلارنس میں آنکھ کھولی۔ بچپن تعلیم یافتہ معلّموں میں گذرا اس لئے لہو و لعب سے بھی وہ کوئی نہ کوئی درس لیتا ہی رہا۔ سن شعور آنے پر چند لاطینی کتب پر عبور حاصل کیا اور معلّمِ اول ارسطو کے فلسفہ سے واقفیت حاصل کی۔ سپاہگری اور تجارت، قانون اور ملازمت سب میں قسمت آزمائی۔ فلارنس کا محبِّ وطن بھی رہا لیکن زمانہ کی ستم ظریفیوں نے اُسے چین نہ لینے دیا۔ آخر جب حکامِ عہد کی سختیوں اور اپنی جلاوطنی، تنہائی اور کس مپرسی کی وجہ سے اُس کو ہندوستانی غدر سے بھی زیادہ مصیبتیں اٹھانی پڑیں تو وہ مشاغلِ دنیا سے دل برداشتہ ہو گیا اور مادی دنیا کو خیالی دنیا پر قربان کر کے لٹریچر کی طرف مائل ہوا جس کا نتیجہ ڈینٹی کی مشہور تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" ہے۔

وہ اخلاصِ قلب جس نے ڈینٹی کو فضائے فردوس کے خواب دکھائے، یا جس نے انگریزی شاعر ملٹن کے خیالات کو "فراقِ فردوس" کے مناظر تک بلند کیا وہی مولوی محسن کی زبان پر آکر "شفاعت و نجات" "صبحِ تجلی" "چراغِ کعبہ" اور "مدیحِ خیر المرسلین" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر اردو زبان کی اشاعت بھی دنیا کے بڑے حصوں میں ہوتی تو آج محسن بھی ڈینٹی کی طرح پوجے جاتے۔ محسن ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے رگ و پے میں جذبۂ وطنیت سمایا تھا۔ ان کی شاعری میں بھی اسی جذبہ کی جھلک نظر آرہی ہے۔ کبھی وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی ماونٹ ایورسٹ پر نقیبِ رسالت حضرت بلال اذان دے رہے ہیں۔ کبھی اُن کو نظر آتا ہے کہ اس پر کنہیا جی بانسری کی آواز میں ربِ ارنی پکار رہے ہیں۔ شوالک کے پہاڑ ان کو کوہِ طور کے مناظر دکھاتے ہیں اور کاشی و پریاگ سے انہیں یثرب و بطحیٰ کی یاد آجاتی ہے۔

ذیل میں "مدیحِ خیر المرسلین" کے چند مشہور اشعار کا انتخاب لکھا جاتا ہے جو اُن کے جذبۂ وطنیت پر شاہد ہیں ؎

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل — جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی — کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی — ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی — پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھئے ہوگا سری کشن کا کیونکر درشن — سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں — تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا — نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے — نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل[1]

تہ و بالا کئے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے — بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

جوگیا بھیس سے ہے چرخ لگائے ہے بھبھوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

شاخ شمشاد پہ قمری سے کہو چھیڑے ملار — نونہالانِ گلستاں کو سنائے یہ غزل

(غزل)

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل — تیرتا ہے کبھی گنگ کبھی جمنا بادل

خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل — رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل

سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی — روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل

جب تلک برج میں جمنا پہ کھلنے کا نہیں — بے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل

دیکھتا گر کبھی محسن کی فغان و زاری — نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

مگر ان تلمیحاتِ وطن اور دیسی طرزِ نگارش کے باوجود مولانا محسن نے قدیم اردو شاعری کی وضعداری کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ممالکِ عرب اور ایران سے متعلق تلمیحات جو عربی و فارسی زبانوں کے ذریعہ سے اردو کو حاصل ہوئیں وہ بھی اسی قصیدۂ نعت میں نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہیں۔ فارسی نما اصطلاحات اور استعاروں کو ٹھیک اسی طرح ہندی الفاظ اور دیسی طرزِ نگارش سے ملایا گیا ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد برادرانِ ہنود کی تمام شکایتیں جو اردو زبان سے متعلق ہیں رفع ہو جاتی ہیں مثلاً ؎

ابرِ پنجابِ تلاطم میں ہے استادِ ناظم — برقِ بنگالۂ ظلمت میں ہے گورنر جنرل

شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ — چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

قمریاں کہتی ہیں طوطی سے مزاجِ عالی — لالۂ باغ سے ہے ہندوئے فلک کھیم کسل[2]

جس طرف کو گئی بجلی پھر اُدھر آ نہ سکی — قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر — مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول

سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیِ لب — چمنِ حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل

[1] بنارس میں منگل کا ایک میلا ہوتا ہے۔ [2] کھیم کسل یعنی مزاج شریف۔

صاف آمادۂ پرواز ہے شاما کی طرح　　　پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم ہیں کاجل

شاہدِ گل کا لئے ساتھ ہے ڈولا بادل　　　برق کہتی ہے مبارک تجھے سہرا بادل

راجہ اندر ہے پری خانے کا بانی　　　نغمۂ نے کا رسیا کشن کنھیا بادل

کتنا بے قید ہوا کس قدر آوارہ پھرا　　　کوئی بن رہ نہ بچا اس سے نہ کوئی استھل

کبھی گنگا پہ بھٹکتا ہے کبھی جمنا پر　　　گھاگھرا پر کبھی گذرا کبھی سوئے چمبل

چھینٹے دینے سے نہ محفوظ رہے قلزم و نیل　　　نہ بچا خاک اڑانے سے کوئی دشت و جبل

آخر کار دشت و جبل چھاننے کے بعد شاعر نے بادل کو اپنے مقامِ محمود پر پہنچا ہی دیا۔ "پلگرم کلاؤڈ" یا "حاجی بادل" نے تیرتھ برت سے فارغ ہو کر:-

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں　　　کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

یعنی اُس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں　　　خرمنِ برقِ تجلی کا لقب ہے بادل

تارِ بارانِ مسلسل ہے ملائک کا ورود　　　پئے تسبیحِ خداوندِ جہاں عزّ و جل

کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوسِ بریں　　　کہیں بہتی ہوئی نہرِ لبن و نہرِ عسل

کہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل　　　کہیں رضواں کا کہیں ساقیِ کوثر کا عمل

کنزِ مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے　　　اک طرف مظہرِ قدرت کے عیاں شیش محل

عاشقِ جلوہ طلب گار کہیں چشمِ قبول　　　نازِ معشوق کے پردے میں کہیں حسنِ عمل

باغِ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ　　　انبیا جس کی ہیں شاخیں عُرَفا ہیں کوپل

گلِ خوشرنگ رسولِ مدنی و عربی　　　زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر　　　نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر　　　بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول

جی میں آتا ہے لکھوں مصرعِ برجستہ اگر　　　وجد میں آ کے قلم ہاتھ سے جائے نہ اچھل

منتخب نسخۂ وحدت کا یہ تھا روزِ ازل　　　کہ نہ احمد کا ہے ثانی نہ احد کا اوّل

مناظرِ فردوس کے بعد ایک غزل کے ذریعہ سے مناظرِ حجاز اس طرح دکھائے جاتے ہیں اور پھر مناجات میں گریز ہے ؎

چھوڑ کر میکدۂ ہند و صنم خانۂ برج آج کعبے میں کھچا آتا ہے مصلّا بادل
سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا شہسوارِ عربی کے لئے کالا بادل
بحرِ امکاں میں رسولِ عربی درِّ یتیم رحمتِ خاصِ خداوندِ تعالیٰ بادل
محسنؔ اب کیجئے گلزارِ مناجات کی سیر کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل میرے ایمانِ مفصّل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل کہ مری جان مدینہ کو جو چلتی ہے تو چل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبریل اشارہ سے کہ ہاں بسم اللہ سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

الغرض مولانا محسنؔ کے کلام میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جن کو الگ الگ نمایاں کرنا زیادہ مناسب ہے وہ خصوصیتیں جذبۂ وطنیت، عصمتِ تخیل، بلندیٔ تشبیہ اور سودیشی طرزِ نگارش ہیں۔ مولانا کے سودیشی طرزِ نگارش اور جذبۂ وطنیت سے متعلق مثالیں اوپر لکھی گئیں۔ بڑی بحروں کے علاوہ چھوٹی بحر کی نظموں میں بھی یہی رنگ ہے مثلاً ؎

ہیں یہ کیا رنگ تمہارے محسنؔ مست کیوں ہو گئے پیارے محسنؔ
کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے
زردی چھائی ہوئی رخساروں پہ سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
چھپ گیا چاند ستارا ہو کر اڑ گیا آئینہ پارا ہو کر
جال پھیلائے ہیں منتر والے بال کھولے ہوئے گھونگھر والے
بیٹھے جنگل میں نہ یک سُو ہو کر کالے کوسوں پھرے آہو ہو کر
بیٹھے بیٹھائے یہ سودا تم کو کیا ہوا میرے کنھیّا تم کو
جھوٹی کھاؤ نہ ہزاروں قسمیں پھینک دو دل جو نہیں ہے بس میں
لو سنبھالو مجھے غش آتا ہے دل کہیں اور لئے جاتا ہے

الفاظ سے زبان کی سادگی اور دیسی انسیت ظاہر ہے لیکن جہاں کہیں مولانا موصوف نے مقدس مناظر یا فردوسی

فضاؤں کا نقشہ کھینچا ہے وہاں نہایت پاک و مطہر الفاظ اور نورانی تلمیحات کو استعمال کر کے اپنی عصمتِ تخیل کا ثبوت دیا ہے مثلاً "صبحِ تجلی" کے یہ اشعار ؎

سامانِ ظہور کی ہے تمہید — قدرت پہ یہ ہو رہی ہے تاکید
فیضِ روح القدس عیاں ہو — افشائے رموزِ کن فکاں ہو
اللہ اللہ کیا سماں ہے — ہر شے کو حیاتِ جاوداں ہے
ہستی و عدم میں ایک لے ہے — لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
رضواں نے کہیں سبیل رکھی — ہر کوزے میں سلسبیل رکھی
گلدستے بہشت نے بنائے — جبریل درود پڑھتے آئے
نازل ہوئے عرش سے فرشتے — سب "حی علی الفلاح" کہتے
گم نورِ وجود میں عدم ہے — آغوشِ حدوث میں قدم ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی — بندے کے لباس میں خدائی
اس وقت دیار میں عرب کے — مطلع سے تجلیاتِ رب کے
بُرجِ شرفِ قریشیاں میں — اور ہاشمیوں کے خانداں میں
اسلام کا آفتاب چمکا — بے پردہ و بے نقاب چمکا
شاہنشہِ انبیا محمدؐ — تاجِ سرِ اصفیا محمدؐ
گنجینۂ اصطفا محمدؐ — آئینۂ حق نما محمدؐ

صبحِ ولادت کی نورانی کیفیت کے مناظر تو دن کے مناظر ہیں۔ رات کے مناظر شبِ معراج کے بیان میں ملاحظہ ہوں "چراغِ کعبہ" کے یہ اشعار پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ عالمِ لاہوت کی پُرسکوت فضاؤں میں شاعر کا خیال گھوم رہا ہے ؎

ہے نامِ خدا سوادِ تحریر — "واللیل اذا سجیٰ" کی تفسیر
ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم — ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم
طالع میں نہیں یہ شب کسی کے — اختر سو بار سو کے جاگے
انوار کا ہے ورودِ پیہم — تاروں کی برس رہی ہے شبنم
نازل سوئے عالمِ مجازی — امواجِ محیطِ بے نیازی

دیکھا ہے خدا نے اپنا عالم — آئینہ بنا کے قدِ آدم
آیا سوئے بزمِ "لی مع اللہ" — آئینے میں جیسے پرتوِ ماہ
نزدیکِ خدا حضور پہنچے — اللہ اللہ دُور پہنچے
خلوتگہِ کبریا کو دیکھا — آنکھوں کی قسم خدا کو دیکھا

بلندیٔ تشبیہ تو شعرائے مشرق کا حصّہ ہے اور شاید با تاملّی وہ اس سے بڑھ کر ندرتِ تشبیہ و استعارہ پیدا کرنے میں دنیا کے کسی شاعر کو ملکہ نہیں حتیٰ کہ دانایانِ فرنگ اور علمائے مغرب بھی ان کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔ مگر جہاں تک نعت پیغمبرؐ کی تعریف میں تشبیہوں کے استعمال کو دخل ہے مولانا محسن بھی مصنفِ رامائن کے مدِّمقابل نظر آئیں گے۔ کیونکہ ایک نورانی پیغمبر کی تعریف کے لئے ویسی ہی پر تقدیس اور نورانی تشبیہوں کا لانا کوئی آسان کام نہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار ؎

آثارِ سحر ہوئے نمایاں — سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں
"واللّیل" کو ختم کر چکا ہے — آمادۂ دورِ "والضحیٰ" ہے
عنوانِ فلک ہے دُرِّ منثور — لوحِ زرّینِ سورۂ نور
عالم میں ہے آفتاب تاثیر — آبِ حلب و ہوائے کشمیر
پستی کا دماغ آسماں پر — اوجِ افلاک فرش گستر
وہ ہے "بلغ العلیٰ" کی تفسیر — یہ ہے "کشف الدجیٰ" کی تعبیر

صبح کے وقت طیورِ خوش الحان کا بولنا، سبزہ کا لہلہانا، کلیوں کا سبز پتیوں میں موتیوں کی طرح چمکنا، پھولوں کا کھلنا وغیرہ سب ایک پیغمبر کی خصوصیات کے حامل ظاہر کئے گئے ہیں۔ مثلاً ؎

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل — ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل
نوبت ہے صدائے قمریاں کی — تیاری ہے باغ میں اذاں کی
سبزہ ہے کنارِ آبجو پر — یا خضر ہے مستعدِ وضو پر
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدے میں جھکی ہے
غنچے میں ہے خامشی کا عالم — یا صومِ سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے — اور آبِ رواں طواف میں ہے

اور لطف یہ ہے کہ جو جیسا درخت ہے اس کے لئے ویسی ہی پُر تقدیس تشبیہ بھی ہے مثلاً ؎

ہے استغراق نیلوفر کو　　پاسِ انفاس ہے سحر کو

کہتا ہے اسٹ رنگ لجا کو[1]　　"سو تو ہمن قبل ان تمو تو"

خرقہ ہے نصیب یاسمن کو　　عمامہ ملا ہے نارون کو

بعض اوقات تو بلندیٔ تشبیہ کے اعتبار سے مولانا نے خیالات کو حد سے متجاوز کر دیا ہے جس سے اہل شریعت کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی دیسی تلمیحات کے استعمال ہی سے اُن کو اختلاف تھا مگر حضرت امیر مینائی مرحوم نے ملا محسن کی طرف سے ایسے اختلاف کا سبب ہونے والے شکوک کو رفع کر دیا تھا۔ کلیاتِ محسن کے شروع میں امیر مرحوم کا مقالہ درج ہے مگر ذیل کے اشعار تو واقعی مبالغہ کی حد سے بھی متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سراپائے رسول لکھنے کے لئے سیاہی کی ترکیب کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے ؎

روشنائی کی یہ ترکیب ہے شمع بے دود　　جس کی ترتیب کو جبریل امیں ہیں موجود

گوند ہو شجرۂ طوبیٰ کا بقدرِ مقصود　　پانی لیں چشمۂ کوثر سے مگر پڑھ کے درود

صورتِ دیدۂ موسیٰ ہو پُر انوار کھرل

شمع سے طورِ معلّیٰ کی اڑائیں کاجل

لیکن ہمارے ہندوستانی نعت گو شاعر نے اس نظم میں بھی ہندوستانیت اور دیسی انداز کو برقرار رکھا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ جب سراپائے رسول لکھنے کا ارادہ کیا تو ؎

رنگ و بو ظاہر و باطن کے سب اک جا ہو کر

میرے ہاتھوں پہ تصدّق ہوئے گجرا ہو کر

اور ایک جگہ ہندوستان کے مشہور شہر امرت سر کو بھی نہایت خوبی سے اسی نظم میں کھپا دیا ہے ملاحظہ ہو ذیل کا شعر ؎

کشورِ کاکل پُر پیچ و خم سرور ہے　　نہ ختن ہے نہ خطا ہے نہ یہ عنبر سر ہے

ندرتِ تشبیہ سے متعلق ذیل میں چند اشعار کا انتخاب اور لکھا جاتا ہے مثلاً ؎

(خیمہ)　جشن کا روز ہے معنی کے شہِ اقدس کا　　اور اونچا کرو خیمہ فلکِ اطلس کا

(تکیہ)　تنگیٔ بزمِ جہاں دیکھ کے گھبراتے ہیں　　گاؤ تکیہ کرۂ ارض کا اٹھواتے ہیں

---

[1] "لجاؤ" کو اودھ میں "چھوئی موئی" کہتے ہیں۔ ممالکِ متوسط میں اس پودے کو "شرمئی" بولتے ہیں۔

(رخ)	شب معراج میں ہے شمع تجلّی روشن	لیلۃ القدر میں ہے نورِ الٰہی روشن
(ابرو)	مہِ کامل میں مہِ نو کی یہ تصویریں ہیں	یا کھنچی معرکۂ بدر میں شمشیریں ہیں
(ریش)	زیرِ رخسارِ مبارک وہ خطِ ریش شریف	رحل ہے جس پہ کھلا رکھا ہے قرآن شریف
(ناخن)	ہم نے یہ معجزۂ عقدِ انامل دیکھا	اک گھڑی میں مہِ نو کو مہِ کامل دیکھا
(کمر)	نہیں ثابت قدم اس نفی پہ استثنا بھی	یہ وہ لا ہے کہ نہیں جس سے بچا الّا بھی[1]

اصطلاحِ زبان کے اعتبار سے بھی مولانا محسن کا نعتیہ کلام ممتاز ہے۔ اگر شیکسپیئر یا میر و غالب کی طرح انہوں نے تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا ہوتا تو شاید "شیکسپیرین ڈکشنری" کی طرح "لغاتِ محسنی" لکھنے کی ضرورت پڑتی۔ مگر انہوں نے صرف نعت لکھی اور اس میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو یا تو بطورِ محاورۂ زبان مستعمل ہیں یا اُن کے پیشے یعنی وکالت سے متعلق دفتروں میں بولے جانے والے فقرے ہیں۔ محاورات کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

(۱)

چھپے تم مجھ سے کیوں سب ہنستے ہیں شاخیں نکلتی ہیں
تمہارے پردے میں عالم ہے ذوالقرنین کی سد کا

(۲)

کوئی شاخ آہوؤں کی جلوہ گری میں تو نہیں
کوئی سرخاب کا پر کبکِ دری میں تو نہیں

(۳)

غنچے نے پیش کئے گرچہ ہزاروں مضموں
"گفتگو اس میں ہے" بولی مری طبعِ موزوں

(۴)

لاکھ اگر اچھی سے اچھی کوئی تشبیہ کہے
چشمکیں مارے سخنگو "نظر فیہ" سے کہے

(۵)

آبِ حیواں نہ کہا خضر نے کو چھینٹے دیے
اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے

(۶)

کشتیٔ مے نہ چلی تیرے بغیر
میرے دریا ترے بیڑے کی خیر

---

[1] یہ تمام تشبیہیں مشرقی شاعرانہ انداز میں ہیں۔ مولانا حالی کے مفہوم سے "نیچرل" نہیں ہیں۔

(۷)

چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں　　عرق آیا ہوا پیشانی میں

(۸)

رکھ دیئے موسمِ گل میں کیونکر　　طاقِ نسیاں پہ سنہرے ساغر

دفتروں اور کچہریوں میں استعمال ہونے والے الفاظ و فقرے ملاحظہ ہوں ؎

(۱)

یہ سرکار سے جلدی مچلنے لگے　　کہ بے دستخط حکم آنے لگے

(۲)

پلا بے حساب اب تو ساقی مجھے　　دکھا اپنی واصل نہ باقی مجھے

(۳)

عجب کیا اگر کہیں حضرت نے امت کی حفاظت کا　　مچلکہ لے لیا دوزخ کے کارندوں سے محشر کا

(۴)

ہاں چلو حشر کے بازار کا سودا دیکھو　　نقدِ سرمایۂ امت کا سیاہا دیکھو

(۵)

جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں　　لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

خصوصیتِ بیان کے اعتبار سے اگر کلامِ محسن پر نظر ڈالی جائے تو اندازِ تحریر شعرائے مشرق کے مقابلے میں صرف سود لیشی طرزِ نگارش ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی بلندیٔ تخیل کی وجہ سے بھی ممتاز معلوم ہوگا۔ مثلاً چترِ شاہنشاہی کے مندرجۂ ذیل اشعار کلامِ عرفی سے کم بلندیٔ تخیل ظاہر نہیں کرتے اور تشبیہوں کی ندرت پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا گسائیں تلسی داس نے خود اردوئے معلّٰی میں قصیدہ کہا ہے ؎

رہے تا نیّرِ حسنِ پاک جب تک طورِ سینا میں　　عزیزِ مصر سے کنعاں رہے مشہورِ دنیا میں
اتارا ہو پری زادوں کا دل میں چشمِ بینا میں　　ہو ذکرِ گوپیاں گوکل میں بندرابن میں متھرا میں

[illegible] لکھا گیا تھا۔

تو محبوبِ جہاں اے یوسفِ پاکیزہ منظر ہو
کنھیّا برج والوں میں، پریزادوں میں اندر ہو

رہے جب تک بکامِ تشنہ کاماں رحمتِ باری — رہے برسات میں ہر چار سو چھائی ہوئی بدلی
متاعِ کاروانِ ابرِ گوہر بار ہو پانی — کنوئیں میں آبِ شیریں ہو بجائے یوسفِ مصری

ترا فیض اے سحابِ رحمت ہر دم فزوں تر ہو
کنواں ہو، نہر ہو، گنگا ہو، قلزم ہو، سمندر ہو

اندازِ بیان میں باوجود بلند پروازی کے غضب کی سادگی بھی ہے۔ ذیل کے اشعار میں کیفِ حرماں کی تصویر کیا ہی اچھوتے انداز میں کھینچی ہے۔ یہاں محسن غالب[1] کے مدِّ مقابل ہیں اور میر صاحب کے عام اندازِ کلام سے بھی آگے۔ مثلاً ؎

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا — دھڑکنے لگا دل تڑپنے لگا
ہنسی میں مرے آنسو بہنے لگے — مجھے لوگ سودائی کہنے لگے
نیا راگ لائی مری بےکسی — چھٹا دیس جنگلے کی دھن ہو گئی
چلی آتی ہیں ہچکیاں دمبدم — مجھے یاد آتے ہیں اہلِ عدم
نہ للہ مجھ کو سنبھالے کوئی — مرے منہ میں پانی نہ ڈالے کوئی
نہ قل ہو نہ پھول اور نہ میلہ رہے — مزا مردہ سب سے اکیلا رہے
مرے فاتحہ پر نہ آئے کوئی — جنازہ نہ میرا اٹھائے کوئی
نہ شمعِ لحد کا بھی آنسو بہے — فقط بےکسی مجھ کو روتی رہے
خفا کر کے محسن نہ پھیریں مجھے — فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے
نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی — بجز سجدۂ آستانِ نبی
ز اسمائے اور روزِ امید و بیم — "شفیعٌ متاعٌ نبیٌ کریم"

بعض جگہ اندازِ بیان میں ٹھیٹھ دیسی الفاظ نے جو لطف ظاہر کیا ہے قابلِ غور ہے مثلاً ؎

ادھر بھی ذرا ساقیٔ گلعذار — ہزاروں سہی تیرے امیدوار
نہیں جام کورے سکورے میں دے — کھنگالے ہوئے آبخورے میں دے

---

[1] کیفِ حرماں سے متعلق غالب کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

قیامت

بیابانِ وحشت میں ہر اک رواں — کفن کی اڑائے ہوئے دھجیاں
سحر پر ہُوا دوپہر کا یقیں — یہ ڈوبی ہے سارنگ میں بھیرویں
سروں پر ہمارے ہمارے گناہ — لگے کھیلنے مثلِ مارِ سیاہ
اُڑاتے ہوئے سر پہ مرقد کی دُھول — گئے ایسے جن کا نہ نیجا نہ پُھول

شفاعت

پپیہے نے لیں دل میں سوچکیاں — کہاں بولتا ہے "سکھی پی کہاں"
رکھے گا مرا رب مری آبرو — فَمَنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ لَا تَقْنَطُوْا

جنّت

وہ ریلا ہُوا باغِ فردوس میں — کہ میلا ہُوا باغِ فردوس میں
بڑھا ہر طرف جوئے رحمت کا آب — کٹورا بجانے لگا ہر حباب
بھرے خوانچے ایسے پھرنے لگے — کہ خود میوے دامن میں گرنے لگے
ہوا کیا کہ لڑکے مچاتے ہیں شور — لگا دو ہنڈولے سی طوبیٰ کی ڈور
جو لالہ ہے لاکھا جمائے ہوئے — تو نرگس ہے کاجل لگائے ہوئے
کہیں پھیل کر بیل بوٹا ہوئی — کہیں نکہت اُڑ کر فرشتا ہوئی

مقامِ محمود

ملیں نعمتیں سب کو بے انتہا — اور آخر کو ان نعمتوں کے سوا
بڑا ہاتھ دھو کر جو پیچھے وضو — گیا لے ہی معبود کے رُو برو
نماز آئی کھنچی بنا کیدِ تام — کہ کر چل کے سجدے سی پہلے سلام
موکد ہُوا صوم افطار کا — کہ تیار شربت ہے دیدار کا
یہ کہتا ہے ایماں کہ اے اہلِ ذوق — اُٹھا دیجئے پردۂ چشمِ شوق
عدم کو چلے ساعتِ نیک سے — دو عالم سے چُھٹ کر ملے ایک سے

اِن اشعار کے مطالعہ کے بعد اگر انگلستان کے مشہور شاعر شیکسپیر کا مقابلہ محسن سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیکسپیر مختلف

القسم انسانوں کے نمونے پیش کرنے میں ماہر ہے۔ اس کا کمال عموماً عالمِ انسانی سے متعلق ہے مگر مولانا محسن نے کروبیانِ ملاءِ اعلیٰ سے نسبت رکھنے والی ہستیوں کے نمونے پیش کئے ہیں اور جیسا کہ اوپر لکھی ہوئی مثالوں سے ظاہر کیا گیا ہے عالمِ امکان کی ہر شے کو کچھ ایسے الفاظ کے ساتھ جامۂ نورانیت میں ملبوس کیا ہے کہ ہر چیز بذاتِ خود رشکِ لامکان نظر آتی ہے قصیدوں مثنویوں اور نظموں کے علاوہ غزل سے بھی وہی آن بان ٹپکتی ہے مثلاً ؎

نہ لگے تجھ کو نظر اے قدِ رعنا والے　　بے طرح گھورتے ہیں عالمِ بالا والے

تجھ پہ کرتے ہیں فدا دین کو دنیا والے　　صدقِ دل سے کلمہ پڑھتے ہیں مولا والے

تجھ پہ مرتے ہیں ہزاروں رخِ زیبا والے　　نئے جنجال میں ہیں زلفِ چلیپا والے

ابھی دیکھے ہی نہیں قامتِ رعنا والے　　بہت اونچے نہ بڑھیں سدرہ و طوبیٰ والے

دلِ بیمار کوئی دم میں فنا ہوتا ہے　　میرے پہلو سے نہ اٹھیں دمِ عیسیٰ والے

قطرہ قطرہ میں مرے اشک کی موّاجی ہے　　مجھ سے کیا آنکھ ملائیں لبِ دریا والے

ہر قدم پر رہِ الفت میں اندھیرا گھپ ہے　　ہاتھ میں چاہئے مشعل یدِ بیضا والے

عشقِ بے پردہ محبت سے دکھاتا ہے چراغ　　راہ بھولیں نہ کہیں وادیٔ موسیٰ والے

یار کی باغ میں آمد ہے گھٹا چھائی ہے　　ہوشیار رہیں ساغر و مینا والے

مال کیا چیز ہے تیری تو خریداری میں　　جان دیں گے سرِ بازار زلیخا والے

آپ کیوں حشر میں پھرتے ہیں بھٹکتے محسن
چلئے بیٹھے ہیں جہاں یثرب و بطحا والے

زیادہ مثالیں طوالتِ مضمون کا باعث ہونگی۔ اس لئے آخر میں اتنا اور لکھ دینا چاہئے کہ اگر آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزوں کا اظہار قوتِ ناطقہ کے ذریعہ سے ہوبہو ہو جائے تو اُس کو قوتِ بیانیہ کی معراج سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ سرود و نغمہ جو اس عالمِ رنگ و بو کے ہر وجود کو محیط سمجھا گیا ہے زبان و بیان کے ذریعہ سے صدائے بازگشت ہو کر سنائی دیتا ہے۔ اس کمال کو عرفِ ادب میں فطرۃ طرازی کہتے ہیں۔ حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری اس کی تفسیر ہے اور شعرائے فرنگ کا کلام اس کی مثال۔ مگر اہلِ عقل کے نزدیک تو عالمِ وجود کی ہر موجود شے انسان کے دل کی حالت کا عکس مانی گئی ہے کیونکہ در اصل موجودات کی بوقلمونی کا انحصار دل کی کیفیت اور اس کی رنگینی پر منحصر ہے۔ اگر کیفِ قلب کسی فردوسی تخیل سے متاثر ہے تو ہر شے میں وہی اثر نمایاں ہوگا عرفِ ادب میں اس کو رنگینیٔ تخیل اور کیفِ جذبات کہہ سکتے ہیں علمائے مغرب میں برکلے کا فلسفہ اس

کی تفسیر اور شعرائے مشرق کا کلام اُس کی مثال ہے۔ اس مقابلہ پر نظر کرتے ہوئے مولانا محسن ہم کو شیکسپیئر کی ضد معلوم ہونگے۔ شیکسپیر کا تعلق دنیا سے ہے۔ محسن کا ماورائے دنیا سے۔ ایک مکان سے متعلق ہے دوسرا لامکان سے۔ شیکسپیر نے جولیئس سیزر وغیرہ کی طرح بادشاہ، سپہ سالار اور مفکر پیدا کئے۔ ملا محسن نورانی پیکروں کی تخلیق کا باعث ہوئے ہم محسن کے مناظرِ لاہوتی کا خیال کر کے پست خیالات سے باز رہ سکتے ہیں، وہ مناظر ہمارے دلوں میں محبت اور عقیدت کا جوش پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ایمان کی تقویت اور ہمارے اخلاق کی عصمت کا سبب ہو سکتے ہیں۔ کون ہے جو محسن کے اِن اشعار کو پڑھ کر اپنے خیالات کو عالمِ نور تک بلند ہوتا ہوا نہ پائے گا؎

بہار آئی ہے شب بس کر دیارِ غلد و کوثر میں   ابد تک اب خزاں ہوتی ہے پھولوں کی چادر میں

بھری ہے شوکتِ شاہنشہی اللہ اکبر میں   اذاں کی نغمہ نوبت بج رہی ہے ہفت کشور میں

ہوا ہے اللہ اللہ مطلعِ انوارِ محبوبی   شرف کی پہلی منزل تھی بنی ہاشم کے اختر میں

عیاں فرما کے "نورٌ علمک ما لم تکن تعلم"   کلام پاک کے تارے اتارے قلبِ انور میں

عبادت پھولتی پھلتی رہی ذاتِ مقدس سے   ریاضت باغ باغ آ کر ہوئی پاکیزہ پیکر میں

کلیدِ بابِ جنت نذر کی سلطانِ عالم کے   مسہری پھولوں کی مہکا کرے رضواں ترے گھر میں

درودِ غیر محدود آپ کی روحِ معظم پر   تسلسل رشتہ ہے جب تک ابد کے سلکِ گوہر میں

سلامِ غیر محدود آل و اصحابِ مکرم پر   دوامِ عیش ہے جب تک بہشتِ روح پرور میں

غرض انسان کے دل کی حالت عموماً اُن الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے جو اُس کی زبان سے ادا ہوں اگر دل میں پاکیزگی ہے تو الفاظ بھی پاک اور ستھرے ہونگے۔ اگر دل شمیم محبت سے معطر ہو رہا ہے تو الفاظ بھی ویسے ہی پیارے ہونگے۔ انسان بذاتِ خود ایک ہے، اُس کا دل بھی ایک ہے۔ اس ایک دل کی بدولت اگر وہ چاہے تو تمام دنیا کو ایک کر لے — کس طرح؟ — محبت سے دنیا کو محبوب بنا کے اور اپنے نورِ ایمان سے مخلوق کو روشن ضمیر کر کے۔ یہ نورانیتِ قلب ہی تھی کہ پیغمبرِ اسلام کی نغمہ نوبت آج تک تمام عالم میں بج رہی ہے۔ یہ دل کی محبت ہی تھی کہ اخلاقِ مسیح کو آج تک معاشرت کا اصولِ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اخلاصِ قلب ہی تھا کہ گوتم سدھارتھ کی نصیحتیں آج تک دلوں پر اثر کر رہی ہیں۔ اگر اِن زبردست ہستیوں کی تعریف کے لئے محسن ایسے انسان پیدا ہوں تو اُن کی تعظیم ہم کو اُسی طرح لازم ہے جس طرح اُن بزرگوں اور رہنماؤں کی جو خدا کی تعریف کر کے ہم کو خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔

سید مقبول حسین احمد پوری

نواہائے راز

آتے ہو میری قبر پہ کیوں بار بار تم
گویا ہو میرے دل کی طرح بے قرار تم

جو شمعِ بے فروغ سرِ شام بجھ گئی
اُس کا طواف کرتے ہو پروانہ وار تم

نکلی نہ اعتبار کے قابل مری وفا
کرتے ہو آہ اب بھی مرا اعتبار تم

مٹی میں موتیوں کو ملاتے ہو کس لئے
کیوں ہو شریکِ گریۂ شمعِ مزار تم

لپٹے ہوئے ہو خاک بہ سر تم مزار سے
اب خاکِ عرش ہے کہ بنے خاکسار تم

حامد علی خاں

گورستانِ سلاطینِ بہمنیہ بیدر

دو روزہ بوئے گل، رنگِ چمن، بادِ بہاری ہے
نہیں کچھ حسنِ فانی کی یہ سب آئینہ داری ہے
شکستِ رنگِ محفل کا یقیں ہے شمعِ روشن کو
مدام آنکھوں سے اس کی ایک سیلِ اشک جاری ہے
مثالِ خندۂ گل بے بقا ہر شے ہے دنیا کی
شکست انجام اس کی نخوت و گردوں وقاری ہے
نفس کی آمد و شد پر مدارِ زندگی ٹھہرا
برائے نام اس رشتہ میں ربطِ استواری ہے
فریدوں کا ہو قصہ یا سکندر کا ہوا فسانہ
زمانہ کے صحیفے پر وہ اک سطرِ غباری ہے
عدم کا "عرضِ خمیازہ" ہے یہ ہنگامۂ ہستی
سکوتِ سرمدی ورنہ ہر اک ذرّے پہ طاری ہے

زوال آمادہ ہیں سارے مظاہر بزمِ امکاں کے
فنا انجام تارے چرخ کے ذرے بیاباں کے

مرقع ہے یہ گورستانِ شاہی درد و عبرت کا
یہاں کا ذرہ ذرہ آئنہ ہے یاس و حسرت کا
سماں ہے بے کسی کا چار سو وحشت برستی ہے
ہوا ہے جنبشِ مژگاں سے عاری دیدہ حیرت کا
فلک پر مہر و مہ ہوں یا زمیں پر صلصل و بلبل
پڑا سب کے گلے میں طوق ہے آئینِ قدرت کا
رمِ آہو بہ مجبوری، نموئے گل بہ مجبوری
شکستِ دل بہ مجبوری، یہ ہے اسلوب فطرت کا
سرِ فرعونیت کو یہ نظارا ایک ٹھوکر ہے
عجب حسرت فزا مدفن ہے یہ دیرینہ عظمت کا
نظر آتا ہے پیراہن زمیں کا گل بدامن کیوں
ہوا ہے خون اس جا دبدبے کا جاہ و صولت کا

ہلاکِ گردشِ گردوں گدا و شاہ یکساں ہیں
"چراغِ رہگذارِ باد" مہر و ماہ یکساں ہیں

زمیں گلکار ہے خونابۂ شاہانِ اعظم سے
مفر کس کو ہے دنیا میں اجل کی تیغِ مبرم سے
کھڑے ہیں کوہِ برفانی کی صورت صف بصف روضے
فضائے پرسکوں میں، دور شورش گاہِ عالم سے
اٹھائے دوش پر بارِ گراں ہیں پانچ صدیوں کا
شکستہ ہو رہے ہیں آسماں کے جورِ پیہم سے

تحیر خیز ہے ان مقبروں کی رفعت و عظمت
کلس الجھے ہیں ان کے بادلوں کی زلف برہم سے
در و دیوار آئینے ہیں نقاشوں کی صنعت کے
بجا ہے روکشی ان کی صفا کو ساغر جم سے
یہ روضے عظمت گم گشتہ کی گویا نشانی ہیں
طلب کرتے ہیں رہ رہ کر خراج اشک پیہم سے

یہ منظر خواب ہستی کی ہے اک تعبیر ناکامی
یہاں کی خاک کے ذرے بھی ہیں تصویر ناکامی

یہاں جو سو رہے ہیں صاحب اورنگ و افسر تھے
خوش اقبالی میں وہ غیرت دہ فغفور و سنجر تھے
پھریرے اڑ رہے تھے ان کے شہر و کوہ و وادی میں
جہاں افروز گویا صورت سلطان خاور تھے
شرف اقبال کو حاصل تھا ان کی ہمرکابی کا
غلام ادنیٰ سے ان کے در کے مریخ و دو پیکر تھے
زوال ان کی جگرتابی سے مثل بید لرزاں تھا
وغا کے بیشہ پرشور میں گویا غضنفر تھے
رواں تھا سکہ اُن کے نام کا پہنائے عالم میں
قوائے عسکری سے باج گیر ہفت کشور تھے
کسی سے مرتبہ ان کے خطیبوں کا بیاں کیا ہو
سپہر و عرش خود جن کے لئے محراب و منبر تھے

جبیں گھستا تھا چرخ فتنہ آئیں آستانوں پر
نگاہیں مہر کی جاروب کش تھیں آستانوں پر

مگر زیر زمیں بے بس پڑے وہ خاک پر ہیں اب
جہاں اور اُس کے ہنگاموں سے بالکل بے خبر ہیں اب
جگا سکتی نہیں سونوں کو آواز جرس کوئی
نوا و نعرہ و شور و فغاں سب بے اثر ہیں اب
کہاں زیر زمیں فانوس ہیں یا شمع کافوری
دل حسرت زدہ کے داغ ہی تابندہ تر ہیں اب
عقابی شان سے جو وسعت گردوں میں اڑتے تھے
وہ نیرنگ زمانہ سے بنے بے بال و پر ہیں اب
وہ سیمیں تن کہ جن سے سوسن و نسریں تھے شرمندہ
فلک کی آسیا گردی سے گرد رہگزر ہیں اب
خزانے اپنے بحر و بر بھی جن کی نذر کرتے تھے
ہمارے اشک خوں ہیں اور وہ حسرت نگر ہیں اب

شکست انجام ہے تقدیر عز و شان و شوکت کی
لحد ہی آخری منزل ہے راہ اوج و عظمت کی

نہیں کچھ اعتبار زندگی اس بیت احزاں میں
نفس کو ہم نے مثل باد نے پایا رگ جاں میں
اجل کے ہاتھ میں بازیچہ ہے دنیا کہاں ہے یہ
شعاع مہر مصروف لعب ہے شبنمستاں میں

سرور و سرکشی کیسی۔ کہاں کا بادۂ راحت — ہے مثلِ برق جامِ عمر کی گردش خمستاں میں
جدھر دیکھو اُدھر سیلِ حوادث کے تھپیڑے ہیں — اماں حاصل کہاں جانِ حزیں کو ایسے طوفاں میں
یہ مشتِ خاک ہے لیلائے جاں کا عارضی محمل — اجل کا دوش پہنچاتا ہے نے کو پھر نیستاں میں
نظر آتی ہے ہر سُو موت کی ہنگامہ آرائی — ہوا میں، بحر میں، کہسار میں، شہر و بیاباں میں

فریبِ خواب ہیں سب بزمِ سلطانی کے ہنگامے
ہیں یکسر حرفِ باطل عقلِ یونانی کے ہنگامے

فلک نے یونہی اگلی ملتوں سے آشنائی کی — مگر آخر کو اس بیدادگر نے کج ادائی کی
ہزاروں ملتوں نے اس کو اپنا ہمنوا سمجھا — پر اس کے ذوقِ جدّت نے ہر اک سے بے وفائی کی
کیا تاراج اس ظالم نے چین و مصر و بابل کو — نہ دیکھی اس کے ہاتھوں سے کوئی صورت رہائی کی
ہوئے غرقابِ گردابِ حوادث اہلِ یوناں بھی — فلک تک دھوم تھی جن کے دماغوں کی رسائی کی
ہوئی خاموش مشعل رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی — ضیا باری سے اک عالم کی جس نے رہنمائی کی
کبھی مغلوں کی شوکت رشکِ شانِ سلیماں تھی — مگر اب آلِ تیموری پہ نوبت ہے گدائی کی

زمیں لاکھوں تمدّنہائے خوں گشتہ کا مدفن ہے
سکوں پرور لحد قسمت کے برگشتوں کا مامن ہے

نہ رکھ اے دل بھروسا چند روزہ زندگانی پر — طرب آرائیاں اس کی ہیں گویا نقش پانی پر
لحد ہے اُن شہنشاہوں کی کشتِ عمر کا حاصل — جنہیں تھا ناز اپنی توسنِ کشور ستانی پر
مسخّر گرمِ گفتاری سے جن کی ایک عالم تھا — کھڑی روتی ہے حسرت آج اُن کی بے زبانی پر
فلک پیما و خورشید آشنا جن کا تھا اندیشہ — زمیں اب فاتحہ پڑھتی ہے اُن کی نکتہ دانی پر
کیا خاموش شمعِ بہمنی کو بھی حوادث نے — چراغِ چرخ تھا قرباں جس کی ضو فشانی پر
ادیبؔ ان مقبروں کی خاک ہے سرمایۂ ملّت — عقیدت سے چڑھاؤ پھول اس قومی نشانی پر

لحد کے سونے والو تم پہ وا آغوشِ رحمت ہو!
تمہاری روح کا عشرت کدہ گلزارِ جنّت ہو!

محمد حسین ادیب

مصوّر کا راز

چند سال گزرے، میں نے چارلسٹن سے نیویارک جانے کے لئے ڈاک کے ایک جہاز میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرائی۔ جہاز کے کپتان کا نام ہارڈی تھا۔ موسم کی مساعدت کی صورت میں جہاز پندرھویں جون کو روانہ ہونے والا تھا۔ تاریخِ روانگی سے ایک دن قبل میں اپنے سفر کے متعلق بعض انتظامات کے لئے جہاز پر گیا۔

مجھے معلوم ہؤا کہ اس جہاز پر کثیر التعداد مسافر جانے والے تھے جن میں خواتین کی تعداد معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ مسافروں کی فہرست پر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ اُن میں سے کئی میرے شناسا تھے۔ دوسرے ناموں میں مجھے کارنیلیس وائٹ کا نام بھی نظر پڑا جسے دیکھ کر میں بہت خوش ہؤا۔ یہ ایک نوجوان مصوّر تھا جس سے میری بہت پرخلوص دوستی تھی۔ کالج میں ہم دونوں نے ایک ساتھ تعلیم پائی تھی اور ایک دوسرے کی صحبت میں گھڑیاں گزار چکے تھے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک تھا۔ اس قسم کے لوگ بالعموم انسانی صحبت سے متنفر، ذکی الحس اور جوشیلے ہوتے ہیں۔ یہی حالت کارنیلیس وائٹ کی تھی۔ لیکن ان صفات کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک انتہا درجہ کا وفاشعار اور محبت بھرا دل تھا۔

میں نے دیکھا کہ جہاز کے تین کمروں پر اُس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ مسافروں کی فہرست پر دوبارہ نظر ڈالنے سے معلوم ہؤا کہ اس کی بی بی اور دو بہنیں بھی اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔ جہاز کے کمرے زیادہ تنگ نہ تھے اور ہر کمرے میں سونے کے لئے اوپر تلے دو دو خواب گاہیں تھیں جن میں سے ہر ایک پر بمشکل صرف ایک آدمی سو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ان چار نفوس کے لئے تین کمرے کیوں مخصوص کئے گئے تھے۔ اس وقت میری دماغی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی جس میں انسان غیر متعلق باتیں معلوم کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ متجسس بن جاتا ہے اور میں بہ ندامت اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت میں زائد کمرے کے متعلق طرح طرح کے لغو اور احمقانہ قیاسات دوڑانے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اس معمے کو حل کرنے میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ آخر میں ایک نتیجہ پر پہنچا اور مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ سمجھ لی۔ تیسرا کمرہ غالباً کسی ملازم کے لئے تھا۔ میں نے دل میں کہا میں بھی عجیب احمق ہوں کہ اتنی کھلی ہوئی بات بھی میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے پھر ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہؤا کہ کوئی ملازم اُن کے ساتھ نہ جا رہا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے وہ کسی ملازم کو ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے

تھے کیونکہ فہرست میں "بہ حیثیت ملازم" کے الفاظ پہلے لکھے گئے تھے جو بعد میں نظری کر دیئے گئے تھے۔ پھر میں نے دل میں کہا "غالباً یہ کمرہ زائد سامان رکھنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز ہو گی جسے بغرض حفاظت وہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں میں سمجھ گیا، یہ کوئی تصویر ہو گی اور غالباً وہی جس کی فروخت کے متعلق وہ اطالوی یہودی نکولینو سے بات چیت کر رہا تھا" اس خیال نے میرا اطمینان کرا دیا اور اس وقت کے لئے میں اپنے تجسس سے کنارہ کش ہو گیا۔

وائٹ کی دونوں بہنوں کو تو میں جانتا تھا۔ وہ دونوں بہت ذہین اور زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ البتہ اس کی بی بی سے مجھے واقفیت نہ تھی جس سے ان دنوں وہ نیا نیا بیاہا گیا تھا۔ میرے سامنے بھی وہ اپنی بی بی کا ذکر کئی مرتبہ اپنے مخصوص پر جوش انداز میں کر چکا تھا۔ وہ اس کے حیرت انگیز حسن، اس کی فراست اور اس کی شائستگی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کا تعارف حاصل کرنے کے لئے بیتابی سے منتظر تھا۔

جس دن میں جہاز پر گیا (چودھویں جون کو) اسی دن وائٹ اور اس کے ہمراہی بھی جہاز پر آنے والے تھے۔ یہ بات مجھے کپتان سے معلوم ہوئی اور میں نے دلہن سے متعارف ہونے کی امید میں اپنے مجوزہ وقت سے ایک گھنٹہ زاید جہاز پر گزار دیا۔ آخر معذرت کا ایک رقعہ پہنچا کہ مسز وائٹ کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ کل روانگی کے وقت سے پہلے جہاز پر نہ آسکیں گی۔

دوسرے دن صبح اپنے ہوٹل سے نکل کر میں بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کپتان ہارڈی سے میری مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ "بعض وجوہ کی بنا پر (ایک مہمل لیکن آسان بہانہ) میں نے جہاز کی روانگی ایک یا دو دن کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ تیاری مکمل ہونے پر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا" یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی اس لئے کہ اس دن تیز جنوبی ہوا چل رہی تھی جو ہمارے سفر کے لئے ہر طرح سازگار تھی لیکن چونکہ میرے متواتر اصرار کے باوجود "بعض وجوہ" کے چہرے سے نقاب نہ اٹھ سکا اس لئے میں مجبوراً واپس چلا گیا اور صبر کے ساتھ جہاز کی روانگی کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا لیکن مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ آخر سخت انتظار کے بعد اطلاع آئی اور میں فوراً جہاز پر پہنچا۔ جہاز مسافروں سے لدا ہوا تھا۔ ہر طرف اس گہما گہمی اور چہل پہل کے آثار نمایاں تھے جو جہاز کے روانہ ہونے کے وقت نظر آیا کرتی ہے۔ وائٹ اور اس کے ہمراہی میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد آئے۔ میں نے دونوں بہنوں، دلہن اور مصور پر نظر ڈالی۔ آخرالذکر کے چہرے سے اس وقت سخت بیزاری اور بے دلی کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ یہ اس کی نظرت کا

خاصہ تھا۔ اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اُس نے اپنی بی بی سے میرا تعارف بھی خود نہ کرایا بلکہ یہ فرض مجبوراً اس کی بہن میرین کو ادا کرنا پڑا جو ایک بہت خوش اخلاق اور ذہین لڑکی ہے۔ مسز وائٹ کے چہرے پر گہرا نقاب پڑا ہوا تھا اور جب اُس نے میرا آداب قبول کرتے ہوئے اخلاقاً اپنا نقاب اُٹھایا تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوتا اگر مجھے تجربے سے یہ بات معلوم نہ ہو چکی ہوتی کہ میرے مصوّر دوست کے پُرجوش بیانات اُس وقت بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے جب وہ عورت کے حسن کی تعریف کر رہا ہو۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ جب کبھی گفتگو کا موضوع حسن ہو تو میرے دوست کا دماغ خالص مثالی حسن کی جنتوں میں پہنچ جایا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسز وائٹ کو میں نے شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل سیدھی سادھی عورت پایا بلکہ شاید بدصورت کا لفظ بھی اس پر صادق آسکتا تھا۔ ہاں اس کے لباس سے بلاشبہ غیر معمولی سلیقہ نمایاں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ میرے دوست کو غالباً دل و دماغ کی مقابلۃً زیادہ پائدار خوبیوں نے مسحور کیا ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد مسز وائٹ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میرا پرانا تجسس پھر مجھ پر غلبہ پانے لگا۔ کسی ملازم کی ہمسفری کا تو شائبہ تک باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے میں زائد سامان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کچھ عرصے کے بعد بندرگاہ پر ایک گاڑی آکر رکی جس میں صنوبر کا ایک مستطیل صندوق رکھا تھا۔ اسی کا انتظار تھا۔ اس کے پہنچنے پر جہاز نے فوراً لنگر اُٹھایا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم بندرگاہ سے نکل کر سمندر میں پہنچ گئے۔

یہ مستطیل صندوق جس کا میں نے ذکر کیا ہے طول میں چھ فٹ اور عرض میں ڈھائی فٹ تھا۔ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا اس لئے میں اس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش بتا سکتا ہوں۔ بلاشبہ اس صندوق کی ہیئت انوکھی تھی اور اس کو دیکھتے ہی مجھے اپنے قیاس کی صحت پر فخر ہوا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مصوّر کا زائد سامان ضرور ایک یا اس سے زیادہ تصاویر پر مشتمل ہوگا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک تصویر کے متعلق ہفتوں نکولینی سے گفتگو کرتا رہا ہے۔ صندوق کی صورت دیکھ کر میرا یہ گمان غالب تھا کہ اس میں لیونارڈو کی مشہور تصویر "عشائے ربانی"[1] کی نقل ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسی تصویر (عشائے ربانی) کی ایک اور نقل فلارنس کے ایک مشہور مصوّر کے ہاتھ کی بنی ہوئی نکولینو کے پاس پہلے بھی موجود ہے۔ پس مجھے اپنے موجودہ قیاس کی صحت میں بھی کوئی شبہ نہ رہا۔ اور میں اپنی دقیقہ رسی کا خیال کر کے بہ طمانیت زیرلب متبسم ہوا۔ وائٹ نے غالباً اب تک اپنی تصویروں کے متعلق کبھی کوئی راز مجھ سے نہ چھپایا تھا۔ لیکن اب وہ مجھ سے کترا رہا تھا۔ اور میری آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک نفیس تصویر کو مجھ سے بالا بالا نیویارک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی چپکے چپکے اُسے جی بھر کر ستانے اور دق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

---

[1] ایک مشہور تصویر جس میں حضرت مسیح آخری مرتبہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک لمبی میز پر مصروفِ طعام نظر آتے ہیں۔

ایک بات اب بھی میرے لئے بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی وہ یہ کہ مستطیل صندوق زائد کمرے میں نہ رکھا گیا بلکہ واٹ نے اُسے اپنے کمرے میں رکھوایا۔ صندوق کمرے کی تقریباً تمام سطح پر چھا گیا اور مجھے یقین تھا کہ مصور اور اس کی بی بی کے لئے بہت کچھ باعثِ تکلیف بن رہا ہوگا، بالخصوص اس لئے کہ قیر یا جس روغن سے اس صندوق پر بڑے بڑے حروف لکھے گئے تھے اس سے نہایت تیز اور ناگوار بلکہ میرے نزدیک ایک حد تک کریہہ بُو پیدا ہو رہی تھی۔ ڈھکنے پر یہ الفاظ لکھے تھے ـــــ "مسز ایڈیلیڈ کرٹس، البینی، نیویارک۔ بہ تحویل مسٹر کرنیلیس واٹ۔ یہ جانب اوپر۔ بہ احتیاط اُٹھایا جائے"۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ مسز ایڈیلیڈ کرٹس مصور کی بی بی کی والدہ ہیں لیکن میرے نزدیک یہ پتا و غیرہ محض ایک فریب تھا جو خاص طور پر میرے لئے کھیلا گیا تھا۔ اس لئے مجھے پورا یقین تھا کہ اس صندوق اور اس کی اشیا کا آخری ٹھکانا نیویارک میں میرے دوست کے تصویر خانے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

اگرچہ ہوا جہاز کی روانگی کے بعد ہی مخالف سمت اختیار کر چکی تھی مگر پہلے دو چار دن تک موسم اچھا رہا۔ تمام مسافر خوش تھے اور اپنے وقت کا بہت سا حصہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے میں گزارتے تھے۔ البتہ واٹ اور اُس کی بہنوں کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ واٹ کی حالت تو تعجب کے قابل نہ تھی اگرچہ وہ بھی معمول سے زیادہ خاموش بلکہ اندوہگیں نظر آتا تھا لیکن اُس کی بہنوں کی روش بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ باوجود میرے اصرار کے وہ دوسرے مسافروں سے دلچسپی نہ لیتی تھیں اور انہوں نے بھی سفر کا زیادہ حصہ اپنے کمروں کی تنہائی میں گزارا۔

مسز واٹ کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ خوب باتیں کرتی تھی اور جہاز کی خاتونوں سے بہت جلد کھل گئی۔ بلکہ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ اُسے مردوں سے لگاوٹ کرنے میں بھی کسی قسم کا باک نہ تھا۔ اس نے ہم سب کو بہت محظوظ کیا۔ میں نے "محظوظ کیا" کہا ہے اس لئے کہ اس سے زیادہ موزون لفظ مجھے نہیں ملتا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مسز واٹ دوسروں سے مل کر ہنسنے کے بجائے اُن کو اپنے آپ پر ہنساتی تھی۔ مرد اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے لیکن عورتوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایک سیدھی سادھی، نیک دل، ناتربیت یافتہ اور بے انتہا گنوار عورت ہے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ واٹ کس بات پر گرا ہے۔ اس عقدے کا عام حل دولت ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی صحیح نہ تھا کیونکہ واٹ نے مجھ سے خود کہا تھا کہ "مجھے اس شادی سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں پہنچا نہ اس کی توقع ہے۔ میں نے خالص محبت کے لئے شادی کی ہے اور میری بی بی کی غیر معمولی خوبیوں کے مقابلہ میں میری محبت ایک بالکل حقیر معاوضہ ہے"۔ یہ الفاظ یاد کر کے میری عقل چکرا گئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میرے دوست کے ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ بھلا مجھے اور کیا خیال آتا؟ اُس جیسا نفیس مزاج اُس جیسا ذکی الفہم اُس جیسا بلند خیال جس کی نگاہیں عیب کو بھانپنے اور حسن کو پہچاننے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں

اس عورت کو اپنی زندگی کا مالک بنا چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اُس کی بہت گرویدہ معلوم ہوتی تھی بالخصوص اُس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی محبت کا اظہار اور بھی زیادہ کرتی تھی۔ وہ بار بار اس قسم کی باتیں کہہ کر دوسروں کی تضحیک کا ہدف بنتی کہ "میرے پیارے شوہر وائٹ نے فلاں موقع پر چناں کہا اور فلاں موقع پر چنیں" لفظ شوہر اُسی کے لطیف انداز بیان کے مطابق اُسے ہر وقت "نوک زباں" رہتا تھا۔ اسی اثنا میں تمام اہلِ جہاز نے یہ محسوس کیا کہ وائٹ اپنی بی بی کی صحبت سے عمداً گریزاں رہتا تھا وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں تنہا بند رہتا تھا، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا اور اُس کی بی بی کو پوری آزادی حاصل تھی کہ حسبِ منشا جہاز کے مسافروں کی مجالس میں اپنا دل بہلاتی رہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اُس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بیچارہ مصوّر قسمت کے کسی ان بوجھے پھیر میں آکر یا فریب انگیز جذبات کی کسی جنونی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے سے ہر طرح ادنیٰ درجہ کی ایک عورت سے نادانستہ طور پر وابستہ ہو گیا ہے۔ اور اس قسم کی وابستگی کا قدرتی نتیجہ سریع اور قطعی نفرت کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ مجھے اس کی حالت سخت قابلِ رحم معلوم ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود میں "عشائے ربانی" کے معاملے میں اس کی خاموشی کو پوری طرح قابلِ معافی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اور اس کے لئے میں اس سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر چکا تھا ایک دن وہ جہاز کے عرشے پر آیا میں نے اپنی عادت کے مطابق اُس کا بازو تھام کر اِدھر اُدھر چکّر لگانے شروع کئے۔ اس کی افسردہ دلی جسے میں ان حالات میں بالکل بجا سمجھتا تھا، ذرا بھی کم نہ ہوئی تھی۔ اُس نے بہت سخت کوشش سے ایک آدھ بات کی، وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا میں نے اس سے ہنسی مذاق کی کچھ باتیں کیں اور اُس نے بے دلی سے مسکرانے کی کوشش بھی کی لیکن جب میں نے اُس کی بی بی کا خیال کیا تو اس بیچارے پر سخت رحم آیا اور مجھے تعجب ہوا کہ وہ مسکراہٹ کے یہ موہوم آثار بھی کیونکر اپنے چہرے سے ظاہر کر سکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے آخر کار چھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا ارادہ کیا، اور فیصلہ کیا کہ مستطیل صندوق کے متعلق مرموز اشارات و کنایات کا ایک سلسلہ شروع کروں گا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ میں بالکل اُس کی اِس پرلطف فریب کاری کا شکار ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے میں نے پردے پردے میں اس پر وار کرنے شروع کئے۔ چنانچہ میں نے "اُس صندوق کی عجیب و غریب ہیئت" کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں عیارانہ ہنسی ہنسا اور پھر شرارت سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے دہنے ہاتھ کی انگلی سے اس کی پسلی کو چھوا گویا مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

میرے اس بے ضرر سادہ سے مذاق پر وائٹ کی جو کیفیت ہوئی وہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بالکل پاگل ہو چکا ہے۔ پہلے وہ اس طرح ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھنے لگا گویا وہ میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد بظاہر میرے مذاق کا صحیح مفہوم بتدریج اس کے دماغ پر روشن ہونے لگا۔ اور اسی نسبت سے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے کٹوریوں میں سے ابل کر

باہر آنے لگے۔ اس کے بعد اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پھر خوفناک طور پر زرد۔ پھر اُس نے زور کا ایک قہقہہ مارا گویا میرے مذاق سے وہ بہت خوش ہوا ہے لیکن یہ قہقہہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور غالباً دس منٹ تک قہقہوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر وہ جہاز کے فرش پر زور سے چت گر گیا۔ جب میں اُسے اٹھانے کے لئے دوڑ کر پہنچا تو وہ بظاہر بالکل مردہ ہو چکا تھا۔

میں مدد کے لئے چلایا اور بعجلت جدوجہد کے بعد ہم اُسے آپے میں لائے۔ ہوش آنے پر بھی کچھ دیر تک وہ خفقانی باتیں کرتا رہا۔ آخر فصد کھول کر ہم نے اس کا لہو لیا اور اسے بستر پر ڈال دیا۔ دوسرے دن اس کی جسمانی صحت اچھی نظر آتی تھی البتہ اس کی دماغی کیفیت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کپتان کے حسب ہدایت میں اس کے بعد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کے ہوش و حواس کے تعطل کے متعلق کپتان مجھ سے پوری طرح متفق تھا۔ لیکن اُس نے مجھے جہاز کے دوسرے مسافروں کے سامنے اس قسم کا ذکر کرنے سے محترز رہنے کی تاکید کر دی۔

اس واقعے کے بعد جلد جلد متعدد ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے میرے تجسس کو اور بھی بڑھا دیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ مقدار میں سبز چائے پینے سے بے خوابی کی شکایت ہو گئی اور دو راتیں تو میں نے تقریباً آنکھوں میں گزار دیں۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ کھانے کے بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ وائٹ کے تینوں کمرے اس بڑے کمرے کے پیچھے تھے جنہیں ایک ہلکا پھلکا دروازہ بڑے کمرے سے جدا کرتا تھا۔ یہ دروازہ رات کو بھی کبھی مقفل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ہوا تقریباً مسلسل جہاز کے مخالف ہی رہی، اور کبھی کبھی خوب تیز، اس لئے جہاز کا ایک پہلو ہوا کی سمت مخالف میں خاصا دبا رہتا چنانچہ جب کبھی جہاز کا سیدھا پہلو ہوا کے بہاؤ کے مقابل ہوتا وہ ہلکا پھلکا دروازہ خود بخود کھل جاتا اور اسی طرح کھلا رہتا کیونکہ کوئی شخص اُٹھ کر اُسے بند کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ اب میرا کمرہ ایسے مقام پر تھا کہ جب اس کا دروازہ کھلا ہوتا (اور یہ گرمی کی وجہ سے میں ہمیشہ کھلا رکھتا تھا) تو ہلکے پھلکے کھلے دروازے میں سے مجھے جہاز کے اُس حصے کی بھی ایک جھلک نظر آ جاتی تھی جہاں وائٹ کے کمرے واقع تھے۔ جو دو راتیں میں نے بیداری کی حالت میں گزاریں اُن میں میری توجہ ایک نئی بات کی طرف منعطف ہوئی۔ وہ یہ کہ رات کے تقریباً گیارہ بجے مسز وائٹ اپنے شوہر کے کمرے سے نکل کر بہ احتیاط زائد الگ کمرے میں چلی جاتی جہاں رات کا باقی حصہ گزارتی اور علی الصباح وائٹ کے بلانے پر وہ پھر اُس کے کمرے میں چلی آتی میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں فی الحقیقت الگ ہو چکے ہیں اور یہ علیحدہ کمرے اُن کی مستقل علیحدگی اور طلاق کا پیش خیمہ ہیں۔ اس طرح آخر کار زائد کمرے کا راز بھی کھل گیا۔

ایک اور واقعے نے بھی مجھے متوجہ کیا۔ میرے مذکورہ دو رتجگوں میں مسز وائٹ کے الگ کمرے میں جانے کے بعد اس کے شوہر کے کمرے سے مجھے دھیمی دھیمی دبی دبی سی آہٹ سنائی دیتی۔ کچھ دیر تک اس آہٹ کو بغور سننے کے بعد

ہیں اس کی اصلیت سمجھ گیا۔ یہ مصور کے چوری چوری مستطیل صندوق کھولنے کی آواز تھی جو اس کے ہتھوڑے وغیرہ سے پیدا ہوتی تھی ہتوڑے کا سر اس نے آواز دبانے کے لئے غالباً کسی نرم اونی یا سوتی چیز میں لپیٹ رکھا تھا۔

اس طرح مجھے اپنے قیاسات پر اتنا اعتماد ہو گیا گویا میں ٹھیک ٹھیک بتا سکتا تھا کہ کس وقت وہ صندوق کا ڈھکنا علیحدہ کر چکتا ہے، کس وقت اُسے اٹھاتا ہے اور کس وقت پلنگ پر رکھتا ہے۔ آخری بات مجھے اس طرح معلوم ہوتی کہ جب لکڑی کا ڈھکنا پلنگ کے چوبی کناروں سے مس کرتا تو خفیف سی آواز نکلتی۔ فرش پر صندوق کا ڈھکنا رکھنے کے لئے بالکل گنجائش نہ تھی اس لئے وہ بہ احتیاطِ تمام اسے پلنگ پر رکھتا تھا۔ اس کے بعد اُس کے کمرے میں سکوتِ مزار چھا جاتا اور گجر تک یہی حالت رہتی۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت مجھے دھوکا سا ہوتا کہ میرے کان سسکیوں کی آواز سن رہے ہیں۔ لیکن یہ آواز ابھی اتنی دبی ہوئی ہوتی کہ میں اسے محض اپنے واہمۂ خلاق کا کرشمہ قرار دے سکتا تھا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ آواز سسکیوں اور آہوں سے مشابہ تھی لیکن درصل یہ اتنی موہوم تھی کہ میں سمجھتا تھا میرے اپنے کان بج کر مجھے دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وائٹ کو اس کا مصورانہ ذوقِ اشتیاق مالا یطاق بن کر صندوق کھولنے اور بیش بہا تصویر کے نظارے سے بھوکی نگاہوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات تھی؟ پس میں اس فیصلہ پر پہنچا کہ کپتان ہارڈی کی سبز چائے کے صدقے میں یہ فریبِ سماعت میری اپنی ہی پریشاں دماغی کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ بالا سہر دو راتوں میں میں نے آہٹ ہی سے واضح طور پر معلوم کر لیا کہ وائٹ صبح کے قریب صندوق پر ڈھکنا رکھ کر اپنے بے آواز ہتوڑے سے پہلے ہی سوراخوں میں دوبارہ کیلیں لگا دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دن کے لباس میں کمرے سے باہر نکلتا اور جا کر مسز وائٹ کو اُس کے کمرے سے بلا لاتا۔

جہاز کے سفر کا ساتواں دن تھا کہ جنوب مغرب سے تند ہوا کا ایک خوفناک طوفان اُٹھا۔ ہم ایک حد تک اس کے لئے تیار تھے کیونکہ عناصر ہمیں پہلے ہی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے لگا دی گئی اور جب ہوا رفتہ رفتہ زیادہ تیز ہوئی تو ہم نے بادبان لپیٹ کر نیچے کر دیئے۔ ۴۸ گھنٹے تک ہم اسی طرح بہ حفاظت جاتے رہے لیکن اس کے بعد غضب کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا جس نے پچھلے بادبان کے پرخچے اڑا دیئے۔ اب جہاز میں پے بہ پے پانی کی کئی موجیں آنی شروع ہوئیں۔ جن کی وجہ سے جہاز کا مطبخ اور عرشے کے کٹہرے کا بایاں حصّہ سارا گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمیوں کی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔ ابھی ہم اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے بادبان کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس کے بعد ہم نے ایک چھوٹا سا مضبوط طوفانی بادبان لگایا جس نے چند گھنٹوں تک بہت اچھا کام دیا۔

ہوا کا وہی زور و شور تھا اور اس کے تھمنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جہاز کے مستول وغیرہ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئے

اور اُن پر ہوا کی شدت کا بہت اثر پڑا۔ طوفان کے تیسرے دن پچھلا مستول ہوا کے ایک زوردار ریلے کے ساتھ جہاز کے ایک پہلو پر آرہا اور جہاز بری طرح ڈگمگانے لگا۔ متواتر ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہم اس مستول سے خلاصی پانے میں کامیاب ہوئے لیکن اسی وقت نجار دنبالہ جہاز کی طرف آیا جس نے اطلاع دی کہ جہاز کے زیریں حصے میں چار بالشت پانی جمع ہو چکا ہے۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ جہاز کے آب کش درست حالت میں نہ تھے بلکہ تقریباً بے کار ہو چکے تھے۔

اب ہر طرف سخت بدحواسی اور ناامیدی پھیل گئی لیکن اس کے باوجود ہم نے جہاز کا بار ہلکا کرنے کے لئے سامان سمندر میں پھینکنا شروع کیا اور باقی ماندہ دو مستول بھی کاٹ کاٹ کر پھینک دیئے۔ آب کش اب بھی کوئی کام نہ دے سکے بلکہ اس اثنا میں پانی اور بھی سرعت کے ساتھ رسنا شروع ہو گیا۔

غروب آفتاب کے وقت طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہمیں کچھ موہوم سی امید تھی کہ شاید کشتیوں کی مدد سے ہم اپنی جان بچا سکیں گے۔ رات کے ۸ بجے بادل کھل گئے اور چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ یہ ہمیں اپنے لئے ایک اچھا شگون معلوم ہوا چنانچہ ہمارے پژمردہ دلوں میں نامعلوم طور پر مسرت جھلکنے لگی۔

سخت جدوجہد کے بعد ہم نے کوئی خاص حادثہ پیش آئے بغیر بڑی کشتی سمندر میں اتاری جس میں تمام ملاح اور کثر مسافر سوار کئے گئے۔ یہ لوگ فوراً روانہ ہو گئے اور تین دن کی جانکاہ تگ و دو کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

اب کپتان کے علاوہ ۱۴ مسافر جہاز میں تھے جو دنبالے والی چھوٹی کشتی کے بھروسے پر زندگی کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ اس کو ہم نے بآسانی سمندر میں اتار لیا۔ اس میں کپتان اور اُس کی بی بی، وائٹ اور اس کے متعلقین، ایک فوجی افسر کی بی بی اور چار بچے اور میں مع ایک حبشی ملازم کے سوار ہوا۔ کشتی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی چند ضروری اوزار اور کھانے پینے کا کچھ سامان رکھنے کے بعد اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی اور کوئی دوسری چیز بچانے کا کسی کے دل میں کبھی خیال نہ آسکتا تھا۔ پھر آپ جانتے ہم سب کی حیرت کی کیا انتہا رہی ہو گی جب کشتی جہاز سے دس بیس ہاتھ کے فاصلے پر پہنچی اور وائٹ نے دنبالہ کشتی میں کھڑے ہو کر نہایت اطمینان کے ساتھ کپتان سے مطالبہ کیا کہ میرا مستطیل صندوق لانے کے لئے کشتی واپس لے جائی جائے۔

کپتان نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا "مسٹر وائٹ بیٹھ جایئے اگر آپ بالکل بے حرکت اور خاموش نہ بیٹھے رہیں گے تو کشتی کو الٹ کر ہم سب کو ڈبو دیں گے۔ کیونکہ کشتی بوجھ سے پہلے ہی دبی ہی ہے اور پانی اس کے کناروں تک پہنچ رہا ہے۔"

وائٹ نے اسی طرح کھڑے کھڑے بلند آواز سے کہا "صندوق مسٹر ہارڈی میرا صندوق۔ آپ میری درخواست کو کس طرح رد کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں اس کا بوجھ تو بالکل برائے نام ہے۔ وہ تو بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ آپ کو اپنی

والدہ مرحومہ کی قسم آپ کو خدا کی محبت کا واسطہ، اپنی نجات کی امید کے صدقے میں میری درخواست کو نہ ٹھکرائیے اور صندوق لانے کے لئے واپس چلئے"۔

اُس کی یہ دردبھری التجائیں سن کر کپتان کا دل بظاہر کچھ دیر کے لئے پسیج گیا لیکن جلد ہی اُس نے پھر وہی ترش روئی اختیار کر کے جواب دیا "مسٹر وائٹ آپ دیوانے ہیں میں آپ کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کر سکتا بیٹھ جائیے میں کہتا ہوں آپ کشتی کو الٹ کر سب کو لے ڈوبیں گے۔ ٹھہریئے ـــ پکڑو اسے ـــ روکو ـــ وہ چھلانگ لگا رہا ہے۔ وہ! ـــ مجھے یہی اندیشہ تھا ـــ بس گیا"۔

ابھی یہ الفاظ کپتان کے لبوں ہی پر تھے کہ وائٹ نے فی الحقیقت چھلانگ لگا دی اور چونکہ شکستہ جہاز کی اوٹ میں ہوا کا زور کم تھا وہ فوق الانسانی ہمت کے ساتھ جہاز سے لٹکے ہوئے ایک رسے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ طرفۃ العین میں وہ عرشۂ جہاز پر نظر آیا اور پھر دیوانہ وار نیچے اپنے کمرے کی طرف اتر گیا۔

اس اثنا میں موجیں ہماری کشتی کو جہاز کی اوٹ سے نکال کر دور لے گئی تھیں اور اب ہم ہیبت ناک سمندر کی طوفان خیز موجوں کا بازیچہ بنے ہوئے تھے۔ ہم نے واپس جانے کی پوری کوشش کی لیکن دہشت ناک طوفانی ہوا کے سامنے ہماری کشتی ایک تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی ہم کو یقین ہو گیا کہ قضا نے بدانجام مصوّر کی موت کے پروانے پر مہر لگا دی ہے۔

ہم بسرعت تمام دور دور ہو رہے تھے مگر ہم نے دیکھا کہ جہاز کے ایک نچلی زینے میں دیوانہ شخص (یہی اُسے ہم کہہ سکتے تھے) نمودار ہوا وہ ایک دیوزاد کی قوت کے ساتھ پورا صندوق کا صندوق گھسیٹتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا ہم اس کی طرف فرطِ حیرت سے بغور دیکھ رہے تھے کہ اُس نے تین انچ موٹا ایک رسّا پہلے جلدی سے صندوق کے گرد لپیٹا اور پھر جلد جلد اس کو کئی چکر اپنی کمر کے گرد دیئے۔ اس کے بعد دفعتہً صندوق اور اُس سے بندھا ہوا آدمی دونوں سمندر میں تھے اور چشم زدن میں دونوں ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہ میں غائب ہو گئے۔

فرطِ تاسف سے کچھ دیر کے لئے ہمارے چپو رک گئے اور ہماری آنکھیں اُس جگہ پر جم گئیں۔ اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹہ تک ہم بالکل چپ چاپ رہے اس کے بعد میں نے خاموشی کا سلسلہ توڑنے کی جرأت کی:۔

"کپتان صاحب آپ نے دیکھا وہ دونوں کس طرح دفعتہً ڈوب گئے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ عجیب بات نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ اپنا جسم صندوق سے باندھ کر سمندر میں کودا تو مجھے اس کی زندگی کی خفیف سی امید ہو گئی تھی"۔

کپتان نے کہا "یقیناً وہ گولی کی طرح تہ کی طرف گئے ہیں مگر نمک کے گھل جانے کے بعد وہ پھر اُبھریں گے"۔

میں نے حیران ہو کر کہا "نمک کیا معنی؟"

کپتان نے متوفی کے پس ماندہ عزیزوں کی طرف دیکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ کسی مناسب موقع پر یہ باتیں ہوں گی۔

سفر کا مقصد

ریل گاڑی تیزی سے جارہی تھی، دوسرے درجے کے ایک کمرے میں پانچ شخص سفر کر رہے تھے۔ دو مسافر جن میں ایک ذرا زیادہ باتونی اور اسی قدر لحیم و شحیم تھا اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے۔ ایک دبلا پتلا نوجوان اخبار دیکھ رہا تھا اور وقتاً فوقتاً ماتھے پر بل بھی ڈال لیتا تھا۔ ایک نوجوان مسافر کھڑکی میں سے سر نکالے دیر سے باہر جھانک رہا تھا اور کچھ سوچ کر بعض وقت خود بخود مسکرا بھی دیتا تھا۔

ایک صاحب جنہیں ضرورت سے زیادہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کی عادت تھی نہایت بے تکلفی سے سب کے چہروں کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد خود بخود اپنے ساتھ والے باتونی کو مخاطب کرنے کی غرض سے بولے "صاحب اب سگرٹ پھینک دیجئے بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ مبادا کہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ پھینک دیا؟ خوب۔ آپ کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟"

"بھوپال"

"بخیریت؟"

"جی ہاں وہاں میرے ایک عزیز ہیں، مسٹر عبدالغنی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل اُن سے کچھ کام ہے۔"

"بہت بہتر،" (پھر ذرا بلند آواز میں) "حضرات ہم پانچ مسافر اس درجے میں سفر کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں ایک دوسرے سے جس قدر قرب حاصل ہے اُسی قدر ہمارے سفر کے مقاصد متضاد ہونگے۔ اگر ہم میں سے ایک کے لئے اس سفر کا موضوع خوشگوار ہے تو کیا معلوم دوسرے کے لئے اسی قدر ناگوار ہو۔"

باتونی مسافر کا ساتھی:۔ "بالکل درست۔ لیکن صاحب میں ایک شادی میں شریک ہونے کے لئے جارہا ہوں۔"

"بہت خوب میرے خیال میں سب صاحبوں کو اپنے اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کرنی چاہیئے تاکہ ہم ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہو سکیں۔ قوم کی ترقی کا انحصار زیادہ تر باہمی اتحاد پر ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے پوست کندہ حالات سے واقف ہو جائیں۔"

وہی مسافر (اخبار پڑھنے والے نوجوان سے) "کیوں صاحب! کہاں کے ارادے ہیں؟"

"بس جہاں خدا لے جائے"

"لیکن آخر آپ کے سفر کا کوئی مقصد بھی تو ہوگا۔"

"کوئی خاص مقصد تو نہیں"

"بس سیر و تفریح؟"

"تقریباً یہی سمجھ لیجئے"

نوجوان جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا اُس کو مخاطب کرکے "کیوں صاحب آپ کو انسانوں سے نفرت ہے جو سب سے منہ موڑ کر جنگل کی طرف اس دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں"؛

نوجوان (سر اندر کی طرف پھیر کر) "حضرت گو میں باہر دیکھ رہا تھا لیکن آپ کی سب باتیں بغور سُن چکا ہوں (مسکرا کر) اور مجھے معلوم ہو گیا کہ رنج و راحت کا شریک بننے کے لئے اب آپ میرے "پوست کندہ حالات" معلوم کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ فی الحال مجھے کوئی رنج نہیں۔ البتہ آپ صرف میری راحت میں شریک ہونا چاہیں تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک پُرلطف بھی ہے"۔

وہی صاحب "ٹھہریئے ٹھہریئے کہیں آپ مرزا امجد علی صاحب مرحوم کے صاحبزادے شمیم تو نہیں ہیں؟"

نوجوان۔ "آپ کا خیال درست ہے"

وہی صاحب۔ "ارے شمیم تم مجھے پہچانتے نہیں، میں عبدالغفار ہوں۔ علی گڑھ میں میں نے تمہارے ساتھ انٹرنس کا امتحان دیا تھا۔

شمیم۔ (کچھ سوچ کر) "خوب! آپ غفار ہیں۔ لیکن اب آپ موٹے بہت ہو گئے ہیں تاہم آپ کی آواز ابھی موٹی نہیں ہوئی کیونکہ مجھے گوش آشنا معلوم ہو رہی تھی"۔

عبدالغفار "ارے بھائی تم بھی تو بالکل بدل چکے ہو۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہاں تو پلیٹ فارم پر میں نے تمہارے ہمراہ ایک شریف پردہ نشیں خاتون کو بھی دیکھا تھا وہ کون تھیں تمہاری"؟

شمیم۔ "وہ خاکسار کی بیوی تھی"

عبدالغفار "کیا شادی ہو چکی ہے؟"

شمیم۔ جی ہاں،

عبدالغفار۔ کس خاندان میں؟

شمیم ۔ میرے خسر خان بہادر مرزا الطاف علی صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔

عبدالغفار ۔ اجی وہ تو میرے ہم وطن ہیں ۔ ارے دوست تم تو قسمت کے بہت یاور نکلے کیا شادی بھی کر چکے ہو؟

شمیم ۔ پہلے اپنے ہوش و حواس درست ہو لینے دیجئے پھر بات کریں گے ۔

عبدالغفار ۔ نہیں بھائی میرا خیال دوسری طرف تھا لیکن بھئی تم نے کمال کر دیا ۔

شمیم ۔ (ہنستے ہوئے) تو جناب کیا میرا زوال چاہتے تھے ؟

عبدالغفار ۔ خدا نہ کرے ۔ اچھا بھئی وہ تم نے کیا کہا تھا کہ "میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں بلکہ پُر لطف بھی ہے"

شمیم ۔ یہ ایک طویل داستان ہے ۔

عبدالغفار ۔ اور ہمیں اس سے محروم رکھنے کی وجہ ؟

شمیم ۔ کوئی نہیں ۔ میں تو کسی زندہ دل فرد بشر کو یہ افسانہ سننے سے محروم رکھنا نہیں چاہتا ۔ صاحب اس کی "عملی تصنیف" کے لئے میں نے سخت محنت اور جانفشانی کی ہے ۔ اور اب اس کی تشریح کرنا میرے لئے کچھ دشوار نہیں ۔ بلکہ مسرت خیز ہے ۔

پہلے باتونی صاحب ۔ (جو اپنے ساتھی سے لگاتار باتیں کرنے کے باوجود شمیم کی تمام باتیں بھی سن رہے تھے) لیکن صاحب افسانے سے لطف اندوز ہونے کی حقدار تو تمام پبلک ہوتی ہے ۔

شمیم ۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے ۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں ۔

باتونی صاحب کا ساتھی ۔ پھر تو ہمیں بھی اپنی نشست چھوڑنا پڑی ۔

شمیم ۔ اس قصہ کا ہیرو چونکہ خود میں ہوں اس لئے اپنے متعلق چند ابتدائی حالات سے آپ کو واقف کر دینا ضروری ہے ۔ میرے والد مرزا امجد علی صاحب مرحوم تعلقدار میرے لڑکپن ہی میں انتقال فرما گئے تھے اور اپنی والدہ مرحومہ کی تو میں صورت سے بھی ناآشنا ہوں ۔ میں اکلوتا بیٹا تھا والد مرحوم نے میرے لئے اس قدر جاگیر اور نقد ترکے میں چھوڑا کہ آج تک بفضل خدا مجھے کبھی روزگار کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑا ۔ ان کی وصیت کے مطابق میں نے تعلیم پائی اور ایم اے کر لینے کے بعد سوائے اپنی جائداد کا معمولی انتظام کرنے کے مجھ پر کوئی خاص بار نہ پڑا ۔ بے کاری کی گھڑیوں کو پر لطف بنانے کے لئے میں نے اور میرے ہی جیسے چند بے فکر دوستوں نے ایک انجمن قائم کر لی جس کے ہر رکن کا فرض تھا کہ وہ کوئی ایسا انوکھا مذاق کرے جس کی نظیر مشکل ہو ۔ بعض وقت پبلک کی مردہ دلی اور حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو روکنے کے خیال سے عام لوگوں کو مفت مذاقیہ ڈراموں سے محظوظ کیا جاتا ۔ ہماری انجمن کو اگر کسی چیز سے دشمنی تھی تو وہ صرف رنج والم تھا ۔ اگر کبھی کوئی رکن کسی وجہ سے ملول ہو جائے تو اُسے فوراً انجمن سے نکال دینے کی دھمکی دی جاتی ۔ اداس آدمی ہماری انجمن میں بمنزلہ ایک زہر یلے

جرثوے کے سمجھا جاتا جو غم کی آگ سے مسرت کو تباہ کر دینے والا ہو۔ ہر رکن کو نئے نئے مذاق کرنے کے لئے بعض وقت سخت کوفت اٹھانا پڑتی لیکن جب شام کے وقت سب ارکان میرے ایک بنگلے پر جو محض اسی لئے مخصوص تھا جمع ہو کر اپنے اپنے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو یہ پر لطف گھڑیاں ساری کوفت بھلا دیتیں۔ اسی طرح ایک شام اب اخبار پڑھنے والے مسافر کی دلچسپی بھی اخبار سے کم ہونے لگی۔ ہم نے ایک نظر مسکراتے ہوئے دیکھا پھر بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا ہم سب جمع تھے اور ایک دلچسپ واقعے پر تنقید ہو رہی تھی جو اسی روز پیش آ چکا تھا۔ میرے عزیز دوستوں میں سے ایک نے لمبی ڈاڑھی لگا کر اور سبز جبہ پہن کر جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں وعظ کیا تھا۔ آپ نے وعظ کے دوران میں قوم کے یتیم و بے کس بچوں اور بیواؤں کی وہ حالت زار بیان کی کہ تمام بھولے بھالے سامعین پر رقت طاری ہو گئی۔ خود حضرت کی ریش مبارک بھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اس کے بعد دھڑا دھڑ چندہ جمع ہونا شروع ہوا بعض فاقہ مست اصحاب نے تو جیبیں ہی خالی کر دیں۔ میرا یہ دوست پہلے ہی اس شام اپنے دوستوں کو ایک پر تکلف دعوت کے لئے مدعو کر چکا تھا لیکن کسی کو ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ دعوت کے واسطے روپیہ فراہم کرنے کے لئے یہ صورت عمل اختیار کی جائے گی میں اس روز کسی وجہ سے دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن میرے دوسرے عزیز دوست نے بھی بلا وجہ دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور جب میزبان صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک ہوٹل میں بیٹھے قسم قسم کے نفیس کھانے تناول فرما رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ گذرے ہوئے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کئے جا رہے تھے تو میرا وہ دوست پولیس افسر کا بھیس بدل کر کچھ اپنے ہی جیسے سپاہیوں کے ہمراہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے ہتکڑی میزبان کو لگ گئی اور مہمان بھی زیر حراست لے لئے گئے۔ اس کے بعد مصنوعی پولیس افسر صاحب اور ان کے سپاہیوں نے ڈٹ کر وہ دعوت اڑائی۔ اور بعد میں ایک قہقہہ لگا کر تمام بھرم کھول دیا۔

مجھے جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس میں اپنے شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس کیا لیکن اسی وقت میں نے عہد کر لیا کہ اب ایک اس سے بھی بڑھ کر پر لطف ڈراما کیا جائے۔ اس کا پلاٹ میں مدت سے سوچ رہا تھا اور اس کی ابتدا دوسرے ہی دن ہو گئی احباب میں اکثر میری شادی کے متعلق چرچا رہا کرتا لیکن میں ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ ہندوستان کا موجودہ طریق ازدواج مجھے پسند نہیں۔ جب شادی کا مفہوم ہی خوشی ہے تو کیوں نہ اس کے لئے کوئی ایسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے وہ حقیقی معنوں میں شادی کہلا سکے۔

خان بہادر مرزا الطاف علی صاحب میرے والد مرحوم کے آشناؤں میں سے تھے۔ اس وقت تک مجھے خود ان سے کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوا تھا تاہم میں اس قدر جانتا تھا کہ وہ ایک زندہ دل، روشن خیال، نیک خو بزرگ ہیں۔ اور والد کی دلی خواہش تھی کہ میرا رشتہ انہیں کے گھر انے میں کیا جائے لیکن موت نے انہیں کچھ مہلت نہ دی۔

میں نے چند خاص دوستوں کو اپنا ہمراز بنا کر اپنی جائداد وغیرہ کا انتظام ان کے سپرد کیا اور انہیں اپنا آئندہ نظام عمل اچھی

طرح سمجھا کر کہہ دیا کہ میری غیر حاضری کی کوئی خاص وجہ مشہور نہ ہو۔ مجھے کسی لمبے چوڑے سامانِ سفر کی ضرورت نہ تھی اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر میں دوسرے دن خان بہادر مرزا الطاف علی (اپنے خسر) کی خدمت میں جا حاضر ہوا لیکن حضرات! سنئے اُس وقت میں اس حالت میں نہ تھا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے اور غلیظ تھے میرے پاؤں ننگے تھے۔ میرے منہ پر اور بالوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو منوں مٹی اور گرد جمی ہوئی تھی سب سے پہلے مرزا صاحب کے نوکروں نے میری تواضع کی کسی نے فقیر سمجھ کر گالیاں دیں کسی نے ایک چپت رسید کیا لیکن ہم کہاں ٹلنے والے تھے۔

(اب اخبار پڑھنے والا مسافر بھی اپنی جگہ چھوڑ کر قریب کی ایک نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر اب کوئی بل نہ تھا چہرے سے مسکراہٹ نمودار تھی)

اتنے میں مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جس کی عمر تقریباً پانچ یا چھ سال کی تھی ادھر آ نکلی۔ مجھے نوکروں کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے دیکھ کر دوڑتی ہوئی مرزا صاحب کے پاس گئی اور میری حالت زار کا نقشہ اُن کے سامنے پوری طرح کھینچ کر رکھ دیا۔ مرزا صاحب کا ایک نوکر ایک بڑا سا کتا جو کچھ دور بندھا ہوا تھا مجھ پر چھوڑنے کے لئے کھول ہی رہا تھا کہ وہ بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر تشریف لائے۔ نوکروں کو خوب ڈانٹا۔ پھر جیب سے ایک دونی نکال کر میری طرف مخاطب ہوئے "لو میاں اس دروازے سے بھاگ جاؤ" میں نے ذرا کھنکار کر کہا "سرکار میں فقیر نہیں ہوں" مرزا صاحب کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ پھر میرے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بولے "کہاں سے آئے ہو" میں نے جواب دیا "سرکار مجھے نوکری کی تلاش ہے۔ حضور کی بڑی تعریف سنی تھی کہ آپ غریبوں کی دستگیری کرتے ہیں۔

مرزا صاحب۔ ہمیں تو فی الحال شاید کسی نوکر کی ضرورت نہیں

میں "تو جناب پھر میں کہاں جاؤں"

مرزا صاحب۔ (کچھ سوچ کر) "اچھا ٹھہرو۔ تم کیا کام کر سکتے ہو؟"

میں "جناب خدا نے ہاتھ پاؤں دیئے ہوں تو انسان جو کام چاہے کر سکتا ہے۔

مرزا صاحب۔ اچھا اندر کے کام کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے تاکہ برتن صاف کر دیا کرو گے اور بیگمات جو کام بتائیں مثلاً بازار سے کوئی سودا وغیرہ منگانا ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میں۔ بہت بہتر سرکار برتن صاف کرنا تو میرا کام ہی ہے۔ اور بازار سے سودا خریدنا بھی میں خوب جانتا ہوں"

مرزا صاحب "کیا تنخواہ لو گے؟

میں "جو حضور عنایت فرمائیں"

مرزا صاحب ۔"فی الحال چھ روپے اور کھانا تمہیں منظور ہے؟"

میں ۔"سرکار میرے لئے یہ بھی زیادہ ہیں"۔

مرزا صاحب (ہنس کر)"زیادہ ہیں؟"

میں ۔"جی ہاں پہلے جہاں ملازم تھا وہ صاحب پانچ ہی روپے دیا کرتے تھے"۔

مرزا صاحب ۔"تمہارا نام کیا ہے؟"

میں ۔"جو کچھ جناب تجویز فرمائیں"۔

مرزا صاحب ۔"خوب! نام تو تمہارے ماں باپ نے رکھا ہوگا یا آج ہم تجویز کریں"۔

میں ۔"سرکار میرے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اب جو کسی کا جی چاہے اسی نام سے پکار لیتا ہے"۔

مرزا صاحب ۔"آج کل لوگ تمہیں کس نام سے پکارتے ہیں"؟

میں ۔"جناب مجھے شمّو کہتے ہیں"۔

مرزا صاحب ۔"شمّو؟ اصل نام کیا ہے شمس الدین؟"

میں ۔"جی نام تو کئی بن جاتے ہیں شمس الدین بھی شمیم بھی"۔

مرزا صاحب ۔"تمہیں کون سا نام پسند ہے؟"

میں ۔"سرکار سچ پوچھیں تو شمّو شمیم ہی سے بگڑ کر بنا ہے لیکن پہلے صاحب کا نام خود بھی شمیم تھا۔ اس لئے ایک دن انہوں نے مجھے دوسروں کے سامنے اپنا پورا نام ظاہر کرنے پر خوب زد و کوب کیا۔ اس روز سے اپنا بتلاتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔

مرزا صاحب نے ایک قہقہہ لگایا"اچھا یہ بات ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے تمہیں نکال بھی دیا"؟

میں ۔"جی نہیں میں خود ہی چلا آیا"۔

مرزا صاحب ۔"تمہارے ماں باپ کون تھے؟"

میں ۔"حضور میں نے انہیں دیکھا نہیں"۔

مرزا صاحب ۔"سنا تو ہوگا"۔

میں ۔"جناب سنا ہے کہ وہ ذات کے مغل تھے اور بڑے شریف تھے"۔

مرزا صاحب ۔"خوب مغل تو ہم بھی ہیں"۔

میں ۔"تو جناب پھر وہ کچھ اور ہونگے مجھے اچھی طرح معلوم نہیں"۔

مرزا صاحب "نہیں نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بجز ہمارے اور کوئی مغل ہو ہی نہیں سکتا۔ قسمت کے پھیر ہیں۔ تم شکل و صورت سے ایک شریف آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن فلاکت نے تمہارا حال ابتر بنا رکھا ہے۔ چلو اندر بیگم صاحبہ کے پاس۔ در اصل تم انہیں کے ملازم ہو۔ انہیں اپنی ضرورت کی چیزیں منگانے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔"

میں نے بہت بہتر کہا اور مرزا صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مرزا صاحب کی اہلیہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر بیٹھ گئیں۔ میں آداب بجا لایا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ذرا حیران ہوئیں لیکن جلد ہی مرزا صاحب نے انہیں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اب وہ خوش معلوم ہوتی تھیں۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولیں "اوئی تمہارا کیسا شوئے بھک منگوں کا سا حال بنا ہے۔ جاؤ تو ذرا اپنے کپڑے بدل کر آؤ۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر نگاہ نیچی کر لی اور خاموش رہا۔

مرزا صاحب نے کہا "اسے میرے دھلے ہوئے کپڑوں میں سے پہننے کے لئے کپڑے دے دو۔" میری باچھیں کھل گئیں۔ جیسے سی یوں ظاہر کیا جیسے کبھی دھلے ہوئے کپڑوں کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے مرزا صاحب کے سب کپڑوں میں سے ڈھونڈ کر جو کپڑے ناکارہ تھے نکال کر مجھے لا دیے۔ میں نے سلام کر کے لے لئے۔ اور نہانے کے لئے کسی مسجد کی تلاش میں نکل گیا۔ مجھے دو تین گھنٹے باہر ہی لگ گئے۔ کیونکہ تمام واقعات حسب وعدہ اپنے دوستوں کی ضیافت طبع کے لئے ان کو لکھ کر بھیجنے تھے۔

جب میں گھر آیا تو بیگم صاحبہ مع اپنی تینوں صاحبزادیوں کے چائے پی رہی تھیں۔ مرزا صاحب کی بڑی لڑکی خورشید کی شادی ہو چکی تھی لیکن اُن کے شوہر ابھی ولایت میں بیرسٹری کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ بھی اکثر یہیں رہتی تھیں۔ منجھلی قمر جو اس وقت میرے ساتھ سفر کر رہی ہیں نا کتخدا تھیں۔ اور تیسری ابھی بچی ہی تھی۔ سب سے بڑا لڑکا ایم اے میں تعلیم پا رہا تھا اور دوسرا ابھی انٹرنس کی تیاری میں مصروف تھا۔ بڑی صاحبزادی کے دو خرد سال بچے بھی تھے۔

میں بیگم صاحبہ اور اُن کی صاحبزادیوں کے سامنے آداب بجا لایا۔ بیگم صاحبہ میرے دیر لگا کر آنے سے سخت برہم ہو گئی تھیں۔ اتنے میں مرزا صاحب بھی باہر سے آ گئے اور بولے "بیگم! میں نہ کہتا تھا وہ بڑا سیدھا سادا اور شریف لڑکا ہے۔ دھوکا نہیں کرے گا۔ آخر آ ہی گیا۔"

بیگم صاحبہ نے آہستہ آہستہ منہ میں کچھ کہا اور پھر میری طرف مخاطب ہوئیں "کیا نام ہے تمہارا؟ سُن لے آج تجھے معاف کرتی ہوں۔ اس کے بعد پھر کبھی تو نے اس طرح باہر دیر کی تو نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ۔ مسجد ہی کوئی نہیں ملتی تھی تلاش کرتے کرتے دیر ہو گئی۔"

بڑی لڑکی بولی "اماں ابھی یہ نیا نیا ہمارے شہر میں آ رہا ہے۔ ابھی اسے یہاں کوئی ایسی واقفیت تو ہو گی نہیں" قمر بولی۔ "بعض وقت آدمی سے بھول بھی ہو جاتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ پھر خوش ہو گئیں۔ مرزا صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے "شتو! اب تو تم صاحب بہادر معلوم ہوتے ہو۔"

میں سکرانے لگا۔

مرزا صاحب "لیکن منہ دھونا تمہیں ابھی تک نہیں آیا۔ دیکھو ابھی تک منہ پر مٹی لگی ہے"۔

میں "سرکار آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤں گا"۔ اس پر تینوں خاتونیں ہنس پڑیں۔

اب میری زندگی ایک عجیب پرلطف طریقے سے بسر ہونے لگی۔ سارا دن ماما مجھ سے برتن وغیرہ صاف کراتی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رعب جتانے کے لئے خوب ڈانٹا ڈپٹا کرتی۔ جو ردی اور ادنیٰ کام ہوتا تو غریب اور بے وطن جان کر مجھی سے کراتے۔ ادھر میں باہر نکلتا تو نوکروں کے سامنے اور بھی بیوقوف اور بھولا بھالا بن جاتا۔ ماما کی ڈانٹ اس طرح برداشت کرتا جیسے وہی میری اصل مالکہ ہو۔ اُدھر آہستہ آہستہ میں نے بیگم صاحبہ کے دل میں خوب شفقت کی جگہ لے لی۔ پہلے ہی دن جب نمونے کے طور پر انہوں نے مجھ سے کچھ کپڑا منگایا تو میں نے اپنی گرہ سے زیادہ قیمت دے کر اُن سے بہت کم دام لئے اس پر وہ بے حد خوش ہوئیں اور اُس روز تمام نوکروں کو خوب ڈانٹ ہوئی کہ تم سب بے ایمان ہو۔ میں نے جب یہ دیکھا تو چند دن بعد پھر ایک خوبصورت سا برتن تین روپے میں بازار سے خرید لایا اس کی بیگم صاحبہ کو ضرورت تھی۔ بیگم صاحبہ دیکھ کر خوش ہوگئیں اور بولیں "اے شمو یہ کہاں سے ملا؟" میں نے کہا سرکار بازار سے لا رہا ہوں۔

بیگم صاحبہ "کیا قیمت ہے اس کی؟"

میں۔ "سرکار دو روپے"

بیگم صاحبہ "اوئی توبہ یہ ماما مردار ابھی آٹھ دن نہیں ہوئے اس کی قیمت تین روپے بتا رہی تھی"۔ جا تو اس کو ساتھ لے جا اور اس کے سامنے ایک اور ایسا برتن خرید کر لے آ"۔ میں ذرا پریشان ہوا لیکن جلد ہی بولا سرکار دکان دار دکان بند کر کے ابھی ابھی کہیں چلا گیا تھا تاہم بیگم صاحبہ نے ماما کو بلا کر خوب ملامت کی کہ تو ہمیں دھوکا دے کر ایک روپیہ ہضم کرنا چاہتی تھی"۔ ماما مجھ پر دانت پیس کر بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی آئی "جانے موئے کا ٹاکس کا گھر لوٹ کر لے آتا ہے"۔

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ میں اُن کے سوٹ سلیقے سے تہ کرتا اور سنبھالتا ہوں تو وہ اپنا کام مجھ سے نہایت شوق سے کرانے لگے۔ ماما کو منع کر دیا کہ مجھ سے برتن نہ صاف کرایا کرے لیکن وہ کب منع ہوتی تھی۔ میں بھی جب موقع ملتا اسے بلا چون وچرا برتن صاف کر دیتا۔ اب گھر کے بچے بچے کو مجھ سے دلچسپی ہوگئی۔ بچے کہتے تھے کہ شمو کے ساتھ ہی باہر کو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ کہتیں بس میں اپنے کام سوائے شمو کے کسی سے نہ کراؤں گی۔ سب نوکر بدتمیز اور بے ایمان ہیں۔ مرزا صاحب چاہتے تھے کہ شمو صرف میری خدمت میں رہے۔ دونوں لڑکیاں چاہتی تھیں کہ شمو اپنے گذشتہ (من گھڑت) واقعات ہی بیان کرتا رہے۔ کیونکہ انجھے باتوں کو مذاق کے پیرائے میں بیان کر لینے پر خاص قدرت حاصل تھی۔ میں بھی حتی المقدور ہر شخص کو خوش رکھنے میں کسر نہ اٹھا رکھتا کیونکہ ہماری انجمن میں ہر قسم کی محنت برداشت کر لینا ہی سب سے بڑی فضیلت قرار دی گئی تھی۔

ایک دن میں باورچی خانے میں بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا کہ اتنے میں وہاں قمر آگئیں۔ میرے میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر کہا "شمیم اگر کوئی شخص تمہاری باتیں سنے تو کہے تم ایک گریجوایٹ سے کسی طرح کم نہیں لیکن اگر تمہارے کپڑوں کو دیکھے تو کبھی تمہارے ہاتھ کے صاف کئے ہوئے برتنوں میں کھانا بھی کھانا گوارا نہ کرے"۔ میں نے کہا "بی بی باتیں کرنا تو میرے اپنے اختیار میں ہے اگر کپڑے پہننے بھی اسی طرح اختیار میں ہوتے تو آپ دیکھتیں کہ میں کیسے اچھے کپڑے پہنتا"۔ قمر نے سادگی سے کہا "کپڑے نہیں ہیں تو ابا سے لے کر پہن لو"۔ اس کے بعد وہ چلی گئیں۔ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ دوستوں نے ایک خراب اور پرانے سے ٹرنک میں ایک دو سوٹ رکھ کر ضرورت کے وقت کے لئے میرے پاس بھجوا دیئے تھے۔ اپنی کوٹھڑی میں چپکے سے جا کر میں نے ایک سوٹ نکالا (جو بالکل مرزا صاحب کے ایک سوٹ سے مشابہ تھا) اور پہن لیا۔ کالر ٹائی وغیرہ درست کر کے پھر اپنی جگہ پر آکر برتن صاف کرنے لگا۔ اتنے میں ماما باہر سے آگئی۔ میری ادھر پشت تھی اُسے شاید مرزا صاحب کا دھوکا ہو گیا۔ بے اختیار اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی آواز سُن کر قمر اُن کی بڑی بہن اور بیگم صاحبہ بھی آگئیں۔ پہلے تو سب حیران ہوئے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا قمر نے ساری بات جو پہلے گذر چکی تھی بیگم صاحبہ کو سنائی۔ کچھ دیر میری اس وضع قطع اور برتن مانجنے پر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کو سوٹ کا خیال آیا۔ بولیں "بدبخت، مرزا صاحب اپنے سوٹ کا یہ انجام دیکھیں تو تمہیں کاٹ ہی ڈالیں۔ جا اُن کے آنے سے پہلے پہلے اتار کر رکھ دے"۔ میں نہایت فرمانبرداری سے اٹھا اور اپنا سوٹ اتار کر پھر اپنے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ بعد میں میں نے دونوں لڑکیوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔ خورشید بولیں "تو یہ شمو کیسا شریر نکلا۔ ابا جان کو کپڑے پہنتے دیکھ کر کیسے اُس نے بالکل اسی طرح پہن لئے جیسے مردار کا لباس ہی یہی ہے"۔

قمر۔ خیر ابا کو پہنتے تو سبھی نوکر دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ اگر بچپن میں اُس کے ماں باپ مر نہ جاتے جو واقعی کوئی شریف لوگ ہونگے تو ضرور یہ بیچارہ بہت ترقی کرتا"۔

خورشید۔ اور اس کا حوصلہ تو دیکھو ہم سے ڈر ابھی نہیں کہ ابا کے کپڑے اسے پہنے ہوئے دیکھ کر ہم خفا ہونگے۔

قمر۔ دانا ہے نا وہ ہمارے مزاج کو خوب سمجھ گیا ہے کہ کس بات پر ہم ناراض ہوتے ہیں اور کس پر خوش۔ میرے خیال میں حد سے زیادہ خوف کھانا بھی احمقوں کا کام ہے۔ دوسرے ابا جان بھی تو اس پر خاص شفقت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں تو خاص طور پر زندہ دل آدمی ہی پسند ہیں دیکھو کر ابھی تو ابا مجھ سے ناراض ہوا کرتے ہیں کہ تم بہت جلے دل والی ہو اور خورشید اچھی ہے جو ہنس مکھ تو ہے۔

خورشید۔ لیکن ایک بات یہ بدبخت کسی طرح نہیں سمجھتا کہ ہمیں گندے کپڑوں سے نفرت ہے۔ ابا بھی بہت چاہتے ہیں کہ یہ صاف رہا کرے

قمر۔ ہاں اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔

چند روز بعد ایک اور اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مرزا صاحب کے ہاں کوئی اجنبی مہمان اُن سے ملنے کے لئے آئے۔ مجھے تاکید

ہوئی کہ تمہارے سوائے کوئی شخص چائے لے کر نہ آئے اور مرزا صاحب نے یہ بھی کہا کہ ذرا اچھے کپڑے پہن کر چائے لانا۔ اب ماما تو چائے تیار کرنے لگی اور میں نے صابن لے کر اچھی طرح منہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ دھوئے۔ اور اس سے کہا چائے کشتی میں رکھ کر بیری کوٹھری کے سامنے رکھ دے میں کپڑے پہن کر لے جاؤں گا۔ ادھر میں نے پھر اپنا وہی سوٹ اور مرزا صاحب کا ایک بوٹ پہنا۔ چائے کی کشتی اٹھائی اور اس کمرے میں داخل ہوا جہاں مرزا صاحب تھے۔ مہمان نے جب ایک معزز شخص کو چائے کی کشتی اٹھا کر آتے ہوئے دیکھا تو ہچکچا کر اٹھ گئے۔ مجھ سے کشتی پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے جلدی سے میز پر رکھ دی۔ اور مہمان کو سلام کیا انہوں نے جواب دے کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا میں نے مجبوراً مصافحہ کیا وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تشریف رکھئے" میں بیٹھ تو گیا مگر مرزا صاحب کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ بار بار مہمان سے نظر بچا کر مجھ پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے لیکن میں نے بدستور نگاہ نیچے رکھی مہمان نے بتواضع چائے کی پیالی میرے آگے بڑھا دی اور مجبوراً مجھے پینا پڑی۔ مرزا صاحب کے غیظ و غضب کا بھی مجھے اندازہ تھا اور میں دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مہمان نے چائے پیتے ہوئے مجھ پر ایک شفقت کی نگاہ ڈالی اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا صاحبزادے کہاں تعلیم پاتے ہیں؟ مرزا صاحب نے سنی ان سنی ایک کر کے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ بزرگ مہمان کی شفقت برابر مجھ پر جاری تھی کبھی بسکٹ میری طرف بڑھاتے اور کبھی کیک کھانے کے لئے کہتے میں نہایت متانت سے سب کچھ کھائے جاتا۔ مرزا صاحب کو مجھ پر اس وجہ سے اور بھی غصہ آتا کہ اُن کے معزز مہمان مجھے ان کا بیٹا سمجھ رہے تھے، اور میں پہلے تو چائے خود اٹھا کر لایا۔ دوسرے اب اُلو کی طرح بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ مہمان کے ہر سوال کا جواب میں نہایت شرمیلے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر دیتا تھا۔ مرزا صاحب کو مارے گھبراہٹ اور غصّے کے بات کرنی دشوار ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مہمان کی کسی بات کا ایسا الٹا جواب دیا کہ بے اختیار مجھے ہنسی آگئی جوں توں کر کے چائے ختم ہوئی میں فوراً اُٹھا اور سب چیزیں سمیٹ سلام کر کے دروازے تک آیا، ایک لمحے کے لئے میں رکا اور پھر دہلیز میں بیٹھ کر کیک کے بچے کھچے ٹکڑے کھانے شروع کئے اب مرزا صاحب کا غصہ آخری درجے تک پہنچ چکا تھا۔ مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور بے اختیار اُن کے منہ سے کوئی سخت کلمہ نکل گیا۔

مہمان (یہ سمجھ کر کہ مرزا صاحب نے اُن سے کوئی بات کی ہے) "کیا ارشاد فرمایا جناب نے؟"

اب مجھ میں مرزا صاحب کا جواب سننے کی تاب نہ رہی فوراً کشتی اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد غالباً مہمان تو رخصت ہوا اور مرزا صاحب اندر آئے میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اب چاء کے برتن صاف کر رہا تھا۔ مرزا صاحب نے آتے ہی نہایت پرغضب لہجے میں مجھے آواز دی "شمو"!! میں جلدی سے ہاتھ دھو کر سامنے جا کھڑا ہوا۔ مرزا صاحب نے قمچی لے کر تڑا تڑ مجھ پر برسانی شروع کیں، ساتھ ساتھ کہتے جا رہے تھے، ملعون! گستاخ! اب تو حد سے بڑھ چلا ہے، آج تو نے ایک معزز شخص کے سامنے مجھے بہت خفیف کیا۔ چل یہاں سے دور ہو۔ نکل جا۔ اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ

کرنا میں مرزا صاحب کے پاؤں پر گر گیا اور کہا سرکار آج کی خطا معاف کر دیجئے۔ انہوں نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ بھی آ گئیں، مرزا صاحب نے مجھے چھوڑ دیا اور سارا حال اُن سے کہا۔ بیگم صاحبہ کو سُن کر ہنسی آ گئی لیکن انہوں نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ مرزا صاحب کو اول تو غصہ آتا ہی نہیں اور اگر آ جائے تو پھر کسی طرح رکتا بھی نہیں۔ یہ بات سارے گھر میں مشہور ہو گئی اور مرزا صاحب سے پوشیدہ ہر شخص ہی ہنستا تھا

شام کے قریب جب مرزا صاحب کا غصہ ذرا ہلکا ہوا تو میں نے سنا کہ بیگم صاحبہ انہیں سمجھا رہی ہیں "آپ نے خواہ مخواہ اس یتیم بچے پر ظلم کیا۔ وہ تو سارا دن ہنسی مذاق سے ہم لوگوں کو خوش کیا کرتا ہے، بازار بھیجوں تو اوروں سے دگنی چیز لاتا ہے۔ ایسا نوکر ہمیں کبھی نہ ملے گا۔ ہر کام اس سلیقے اور صفائی سے کرتا ہے کہ کیا بتاؤں جانے کس شریف کی اولاد ہے اور یتیم ہو کر ایسی سختیاں اٹھا رہا ہے" مرزا صاحب بھی اب زیادہ خفا نہ تھے بولے "اور تو خیر کوئی بات ہوئی ہم تو اس کے سوٹ پہننے کی داد دیں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ کم بخت اس قدر ذہین ہے لیکن اس وقت سوٹ پہن کر آنے کا موقع بالکل نہ تھا" بیگم صاحبہ نے کہا "وہ بیچارہ موقع بے موقع کیا جانے غریب پر رحم ہی کرنا چاہئے ہم بھی بچوں والے ہیں"۔ تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نے مجھے آواز دی "شمو! ادھر آؤ" میں فوراً دست بستہ حاضر ہوا۔

مرزا صاحب۔ "شمو! تمہیں کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

میں (مسکرا کر) "جی بالکل نہیں"

مرزا صاحب۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ آئندہ بھی ایسی شرارت کرو گے؟

میں "حضور میری مجال نہیں شرارت کرنے کی"

مرزا صاحب "معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے قصور سے شرمسار ضرور ہو"

میں نے نگاہ نیچی کر لی اور شرمندگی کے انداز میں مسکرانے لگا۔

مرزا صاحب۔ (جیب سے پانچ روپیہ نکال کر) لو یہ تمہیں دودھ کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

میں۔ "سرکار پانچ روپیہ کا دودھ کیا ہوگا؟"

مرزا صاحب (مسکرا کر) یہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ تم پانچ روپیہ کا دودھ بیک وقت خریدنا چاہتے ہو۔

بیگم صاحبہ (جلدی سے تین روپے اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے) "شمو! بس اب چپ رہ (مرزا صاحب کو مخاطب کر کے) بڑا بیشرم لڑکا ہے" میں سلام کر کے مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

عام طور پر گھر کے ملازموں کی عادت تھی کہ جب کبھی میرے پاس کوئی روپیہ وغیرہ دیکھتے خواہ میری تنخواہ ہی سے ہو جو مجھے بھولا بھالا اور بیوقوف سمجھ کر فوراً اسے اڑانے کے حیلے بہانے تراشنے لگتے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔

سب سے پہلے جو شخص باہر ڈیوڑھی پر ملازم تھا نہایت مغموم صورت بنا کر میرے پاس آ بیٹھا اور بولا "آج گھر میں کچھ نہیں پکا۔ فاقہ ہے"

میں "کیوں بھائی کیا بات ہے جو ایسے ہی فاقوں پر نوبت آ گئی"

وہی ملازم "بھائی شمو کیا کہوں گھروالی آٹھ پہر بیمار رہتی ہے۔ جو چار پیسے یہاں سے ملتے ہیں وہ بھی بال بچے کے پیٹ کاٹ کر دوا دارو کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ کیا کروں اور کہاں جاؤں (ذرا ٹھہر کر) اگر کہیں سے تنخواہ ملنے تک دو تین روپے مل جاتے تو میری مشکل "کشا" ہو جاتی۔ لے دے کے ایک تم ہی دین داتا نظر آتے ہو۔ اور کہاں مانگنے جاؤں"

میں نے چپکے سے دو روپیہ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا کسی سے بات نہ کرنا اُس نے کہا میری کیا عقل چرخ میں آ گئی ہے جو لوگوں سے کہتا پھروں گا۔

اس کے بعد جب میں آگ جلا رہا تھا تو ماما بولی "ارے شمو! سنتی ہوں سرکار سے تجھے پانچ روپیہ کا انعام ملا ہے"

میں "ہاں ملا تو ہے"

ماما "ملا تو پھر میرا حق"

میں "قمچیاں کھاتے کھاتے پیٹھ تو میری اُدھڑ گئی اور حق تیرا کہاں سے آ گیا"

ماما "میرا بھائی ایک روپیہ تجھ سے قرض کر کے مانگتی ہوں۔ قسم ہے مجھے قرآن پاک کی اگلے مہینے دے دوں گی۔ تیری بھانجی کئی دن سے ننگے سر پھر رہی ہے۔ اُس کے لئے اوڑھنی لاؤں گی"

مجھے خوب معلوم تھا کہ اس قسم کے تمام قرض ہمیشہ واجب الادا ہی رہ جایا کرتے ہیں لیکن پھر بھی میں نے ایک روپیہ نکال کر ماما کو دے دیا اور ساتھ ہی کہا جا تو اوڑھنی خرید لے میرا قمیص خواہ پھٹا ہی رہے" وہ بولی "تجھے کپڑوں کی کیا کمی ہے سرکار تجھ پر مہربان ہیں"

رات کے وقت جب میں اپنی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا تو سقے نے آواز دی "یار شمو! حقہ تازہ ہے۔ اب تو کبھی مل کر بیٹھے ہی نہیں ادھر تو آؤ" میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور خاموشی سے اُس کے پاس جا بیٹھا۔

سقا (چارپائی سے پیٹھ ٹیک کر) "ہائے میں مرا"

میں "یار ابھی تمہارے مرنے کے دن بہت دُور ہیں۔ کیوں بن آئی کو بلاتے ہو"

سقا "ارے ہم تو کہتے ہیں۔ کل کی آتی آج آئے کسی کی آئی ہی لگ جائے"

میں "آج گھر میں کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہوگی۔ ورنہ تم جان سے بیزار ہونے والے تو نہیں"

سقا "بھائی پانی ڈھوتے ڈھوتے میری پیٹھ دوہری ہو جاتی ہے اور پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ آدمی گھروالی کے طعنوں ہی سے چھوٹ

سکے۔ اس جٹے سے تو مرنا بھلا۔ گو میں کوئی طعنہ دینے تو نہیں آئے گا۔ اب کل ہی بھائی اور بھاوج آ رہے ہیں۔ تم ہی کہو گھر میں تو روٹی کا بھی رونا پڑا ہے۔ ان کی خاطر تواضع کہاں سے ہو گی۔ پہلے تو میں نے کہا تھا کہیں چند دن کے لئے نکل جاؤں۔

میں "ہاں بھئی بڑی مشکل بنی"

سقّا۔ "یار کیا بات ہے اگر کہیں سے دو دن کا انتظام کر دو کبھی کے رکھے رکھائے ہی سہی"

میں "قسم ہے مجھے کلام پاک کی جو میرے پاس ایک دمڑی بھی ہو (اپنی پھٹی ہوئی آستین دکھا کر) اگر پاس کچھ ہوتا تو میرا یہی حال رہتا؟"

سقّا۔ "بھائی کیوں ایمان گنواتے ہو۔ ابھی کریم ماما کا لڑکا کہہ رہا تھا تمہیں سرکار سے بڑا بھاری انعام ملا ہے"

میں۔ "ہاں ملا تو تھا لیکن میرے پاس ٹکنے کون دیتا ہے اُسی وقت ماما اور امیر بخش نے اُدھار لے لیا"

سقّا (غضبناک لہجہ میں) "ستیاناس ہو اس کٹنی ماما کا۔ بیڑا غرق ہو ڈائن۔ پیسے کی بو پا لیتی ہے۔ اور یہ امیر بخش رہ تو جائے افیونچیوں کا افیونچی صبح تک اس کی ڈاڑھی کا ایک بال بھی چھوڑا ہو تو بخشو نام نہیں۔ مجھے معلوم ہیں اس کی کارروائیاں۔ اور تم بھی نرے اُلّو ہو اصل اُلّو۔"

میں "بھائی میں پردیسی کیا جانوں۔ اگر تم ذرا پہلے مانگ لیتے تو مجھے تم سے کون اچھا تھا"

سقّا۔ سویرے سے کتنی بار بات میری زبان تک آئی پر میں نے کہا گھر کی بات ہے۔ ہم تم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں" آخر مایوس ہو کر سقے نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا "جاؤ بھائی سو رہو تمہاری آواز نیند سے بھاری معلوم ہو رہی ہے"

میں نے جاتے ہوئے دانستہ طور پر ایک روپیہ وہاں گرا دیا۔ اُس بیچارے نے سمجھا بے خبری میں مجھ سے گر گیا ہے۔ اور اس انداز سے اُٹھا کر جیب میں ڈالا۔ گویا واجب ہی یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں کسی ضرورت سے مرزا صاحب کے کمرے میں گیا وہ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے۔ سامنے میز پر "ٹائمز آف انڈیا" کا تازہ پرچہ رکھا تھا۔ اخبار دیکھے مدت گزر چکی تھی جس طرح کھوکا آدمی مٹھائی پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتا ہے وہی حالت اخبار کو دیکھ کر میری ہوئی۔ آخر ادھر اُدھر دیکھ کر اخبار اٹھا لیا۔ ایک انگریز حاکم اور ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کی دلپذیر اور محققانہ گفتگو نے مجھے ایسا محو کر لیا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کب میں پڑھتے پڑھتے مرزا صاحب کی بڑی سی آرام کرسی پر لیٹ گیا تھا۔ اتنے میں ایک نہایت ہلکی سی آواز سنائی دی "دیکھو دیکھو ادھر کیا ہو رہا ہے"۔ اس کے بعد کسی نے آہستہ سے کہا "ہیں یہ تو سچ مچ پڑھ رہا ہے" پھر کسی نے دبی زبان سے کہا "ذرا خاموش تماشا دیکھتے رہو"

صرف ایک لمحہ کے لئے میں ذرا گھبرا یا۔ لیکن جلد ہی مجھے تدبیر سوجھ گئی۔ میں نے اسی طرح برابر اخبار پر نظر جماتے ہوئے ایک تصویر کا منہ چڑانا شروع کر دیا۔ آنکھ ناک اور ہونٹوں سے عجیب عجیب شکلیں بنانے لگا۔ اتنے میں مرزا صاحب کا چھوٹا صاحبزادہ اور دونوں بڑی لڑکیاں مسکراتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ خورشید بولیں "یہ کیا حرکت ہے"؟ میں فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تصویر دکھا کر کہا میں

ذرا اس مردوے کا منہ چڑا رہا تھا۔ بی بی دیکھنا خدا نے شکل میرے ساتھی کو بھونڈی دی تھی تو کہیں چھپا کر رکھنا نہ کہ لگا ہے الٹا اخباروں میں "لکھا" کر نشر کرنے"

خورشید۔ "بیوقوف یہ تو کسی ریاست کا راجا ہے"

مرزا صاحب کا لڑکا ممتاز۔ "ارے بدتمیز یہ تو بتا تجھے ابا جان کی کرسی پر بیٹھنا کس نے کہا تھا"

میں۔ "میاں میری مجال نہیں یقین جانو کہ یہ صورت دیکھتے ہی مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ نہ جانے کہاں کہاں چوٹ آجاتی قسمت اچھی تھی جو کرسی پر گرا" اس پر سب ہنس پڑے۔

خورشید۔ "شمو! تجھے کتابوں سے لگاؤ تو بہت ہے لیکن تعجب ہے تو نے پڑھا خاک بھی نہیں"

میں۔ "بی بی اللہ کی قسم مجھے پڑھنے کا بڑا شوق ہے (ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ اٹھا کر قمر کو مخاطب کرتے ہوئے) بی بی آپ ہماری استاد بن جائیے اور آج ہی سے سبق پڑھانا شروع کر دیجئے"

قمر ہنس کر۔ "واقعی ایسے قابل آدمی کو پہلے پہل "ٹائمز آف انڈیا" ہی سے سبق پڑھنا چاہئے" اتنے میں مرزا صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور سب ادھر ادھر بکھر گئے

اسی طرح ہنسی خوشی یہ دن گزرتے رہے ہنسی مذاق اور کام کاج کی مشغولیتوں کے درمیان میں قمر کی عادات و خصائل کو پورے غور و فکر سے جانچتا رہا اور اسے بالکل اپنی طبیعت کے لئے موزوں پایا۔ اس کی بھولی بھالی سادہ سی طبیعت جس میں ذرا سے غور و فکر نے شامل ہو کر اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا میرے مطمئن کرنے کے لئے کافی تھی۔

بالآخر میرے ایما سے ایک عزیز دوست کا خط میرے لئے قمر کی خواستگاری کے متعلق مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کے متعلق مرزا صاحب کو لمبی چوڑی تفصیلات معلوم کرنے کی زیادہ حاجت نہ تھی۔ شاید بچپن میں وہ مجھے کبھی دیکھ بھی چکے ہونگے میری شکل و صورت، قابلیت، جائداد اور چال چلن کے متعلق خط میں میرے وکیل دوست نے "وکیلانہ" وضاحت سے کام لیا تھا اسی روز اس خط کی ایک نقل میرے پاس بھی پہنچ چکی تھی۔ میں گھر کے ایک ایک آدمی کے چہرے پر امید و بیم کی نگاہیں ڈالتا کہ دیکھیں اب تقدیر کیا فیصلہ کرتی ہے۔

مرزا صاحب وہ خط پا کر کچھ مطمئن معلوم ہوتے تھے اور بیگم صاحبہ تو عیاں طور پر خوش تھیں بلکہ میں نے انہیں ان کی بڑی صاحبزادی سے یہ کہتے بھی سن لیا کہ "خورشید مجھے زیادہ اطمینان تو اس بات سے ہے کہ وہاں قمر کی کوئی ساس نند نہ ہو گی۔ ساس نندوں نے تمہاری قدر پہچانی وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں"

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا آخر چند دن صلاح مشورے میں گذرے بعض وقت بحث مباحثے میں کھانے کو بھی خاصی دیر ہو جاتی رہی۔ اس پر

مجھے منہ دھوئے اُس روز تقریباً پورا ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ نہانے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد میں نے اپنا نفیس ترین سوٹ پہنا آنکھوں پر چشمہ بھی لگا لیا۔ اب آئینہ دیکھا تو میرے چہرے کی پہلی اور موجودہ ہیئت میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا "اب کس کی مجال ہے کہ میری نسبت "شمّو" ہونے کا خیال بھی دل میں لا سکے۔ ایک مدت کے بعد میں نے پاؤں میں بوٹ پہنا۔ اس کی ایڑیاں خاص طور پر ذرا اونچی دیکھ کر خرید لیا گیا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ میرا قد درمیانے کی حد سے گذر کر خاصا لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ جب ہوٹل سے نکلا تو معلوم ہوا کہ وقت بالکل قریب آپہنچا ہے۔ جلد جلد ایک موٹر کرایہ پر لی جو ہوا کی سی تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی چلی۔

موعودہ اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے ٹکٹ خریدا۔ بکنگ کلرک کا خیال تھا کہ گاڑی بہت جلد چھوٹنے والی ہے۔ اور واقعی پلیٹ فارم پر پہنچ کر دفعتہً میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ گاڑی نہایت سرعت کے ساتھ پلیٹ فارم سے نکلی جا رہی ہے۔ میرے دوست گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر جھکے ہوئے پریشان نگاہوں کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پلیٹ فارم پر میری تلاش میں نگاہیں ڈال رہے تھے۔ مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بے اختیار میں نے جیب سے رومال نکال کر مایوسانہ انداز میں ہلانا شروع کیا۔ جواب میں کئی ہاتھ ٹوپیاں اور رومال بلند ہوئے۔ ایک لمحہ کے بعد میں سنبھل گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے انہیں مطمئن کیا اور تقریباً دوڑتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کی غرض سے واپس مڑا۔ ایک صاحب جو مسکین صورت ملّاؤں کی سی وضع قطع بنائے ہوئے سامنے کھڑے تھے۔ خواہ مخواہ میرا رستہ روک کر بولے "صاحب بہادر ذرا میرے ٹکٹ کا نمبر تو پڑھتے جائیے اور بتائیے کس کلاس کا ہے" بے اختیار میرے منہ سے نکلا "بکو اس مت کیجئے!" اور میں بھاگ کر آگے نکل گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ اُس بیچارے نے شاید عمر میں پہلی اور آخری مرتبہ تیسرے درجہ کو چھوڑ کر کسی اور درجہ کا ٹکٹ خریدا ہو گا۔

خوش قسمتی سے وہی موٹر سامنے کھڑی ہوئی مل گئی۔ میں اچک کر اس میں سوار ہو گیا۔ اور شوفر سے صرف یہ کہا "جلدی کرو جلدی"۔

شوفر "اب کہاں تشریف لے جائیے گا؟"

میں "وہیں وہیں، خدا کے لئے جلدی کرو" شوفر نے مجھے حواس باختہ دیکھ کر خود ہی موٹر کا رخ باہر کی طرف پھیر لیا۔ موٹر چلی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے شوفر سے اپنا مدعا بیان کیا۔ آخر موٹر پھر واپس اُس اسٹیشن کی جانب روانہ ہوئی جدھر میری برات والی گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ اب اُس گاڑی کو صرف رستے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہرنا تھا۔ اور ایک منٹ کی دیر بھی مجھے گوارا نہ تھی۔ ہر منٹ کے بعد میں جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتا۔ وقت کے ساتھ ہی ساتھ میرا دل بھی اڑا جا رہا تھا۔ ہزار ہا قسم کی بے چینیوں کے علاوہ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر وقت پر وہاں بھی نہ پہنچا تو میرے دوست مجھے پرلے درجے کا بے تدبیر، احمق، اور کاہل سمجھیں گے۔

میں نے گھبرا کر شوفر سے کہا "تمہاری موٹر کی رفتار گدھے کی چال سے کسی طرح کم نہیں"۔

شوفر: "صاحب۔ موٹر تقریباً چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہے۔"

میں بار بار اضطراب کے موٹر میں تقریباً اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا "رفتار جس قدر ہو سکے تیز کرو۔" شوفر بیچارہ الگ حیران تھا کہ یہ کون پاگل آج میری موٹر میں گھس آیا ہے۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ نشست پر ایک جگہ آرام سے بیٹھنا بھی سخت دشوار تھا۔ بار بار پہلو بدلتا کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی نکالی وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ فوراً جیب سے دو روپے نکالے اور شوفر کی طرف پھینک کر کہا "اور زیادہ انعام ملے گا اگر تم نے رفتار تیز کر دی۔" شوفر نے رفتار ذرا بڑھا دی جو اُس وقت مجھے بہت کم معلوم ہوئی۔ میں نے کہا "رفتار ذرا اور تیز کرو۔ سڑک پر کوئی زیادہ آمد و رفت تو ہے نہیں۔" شوفر کو شاید میری بات بہت مضحکہ خیز معلوم ہوئی ہنس کر بولا "صاحب آپ کو جلدی کی وجہ سے شاید معلوم نہیں ہو سکتا۔ ورنہ سڑک پر تو خاصی آمد و رفت ہے۔ اگر میں نے کہیں ایک دو کا خون کر دیا تو راستے ہی میں رہ جاؤں گا۔"

میں نے بغیر اس کی بات پر غور کئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جس قدر روپے ہاتھ میں آئے اُس کی طرف پھینک کر بولا "کیا تمہاری موٹر کی رفتار پچاس پچپن میل فی گھنٹہ نہیں ہو سکتی۔"

اب موٹر آندھی کی سی تیزی سے اُڑی جا رہی تھی لیکن غنیمت ہے کہ سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے خیریت ہی گذری اور کوئی خاص حادثہ پیش نہ آیا۔ موٹر سے اتر جانے کے باوجود بھی پلیٹ فارم میں داخل ہونے تک میں اپنی ٹانگوں کو موٹر ہی میں تصور کئے رہا۔

پلیٹ فارم پر مرزا صاحب کے دونوں صاحبزادے اپنے کئی عزیزوں کی معیت میں براتیوں کے استقبال کے لئے پہلے ہی موجود تھے۔ گاڑی میرے دیکھتے دیکھتے آکر سٹیشن پر رک گئی۔ غنیمت ہے کہ اُس وقت کسی کو اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ عین میرے سامنے ایک فرسٹ کلاس کا کمرہ تھا۔ میں "استقبالیہ کمیٹی" سے نظر بچا کر فوراً اس میں داخل ہو گیا۔ میرے پرانے کرم فرما وکیل دوست تھے مجھے وہاں داخل ہوتے دیکھ لیا اور بقول اُن کے اُس وقت اُن کی جان میں جان آئی۔

میں پشت پر ہاتھ باندھے ذرا تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ تمام عزیزوں کی نگاہیں میری تلاش میں تھیں۔ جلد ہی وکیل صاحب سب کو میرے درجے کے سامنے لے آئے۔ مرزا صاحب کے صاحبزادوں اور دوسرے عزیزوں سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا "یہ ہیں دولہا میاں بندہ کے عزیز دوست مسٹر شمیم احمد ایم۔ اے۔" میرے برادرانِ نسبتی نے عقیدتمندانہ محبت کی نگاہیں میرے چہرے پر ڈالیں اور نہایت پُر جوش طریقے سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ عین اس وقت مجھے اس رسی کا خیال آیا جو چند گھنٹے پیشتر مسٹر امتیاز نے مجھے خیمہ باندھنے کی غرض سے لانے کو کہی تھی۔

آخر ہم سب موٹر گاڑیوں میں بیٹھ کر مرزا صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے میاں ممتاز جو کچھ عرصہ ہوا مجھے مرزا صاحب کی

کرسی پر بیٹھے دیکھ کر سخت برہم ہوئے تھے اس وقت نہایت فخریہ انداز سے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔

موٹر سے اترنے کے بعد سب سے پہلی آواز جو میرے کان میں پڑی وہ یہ تھی کہ اماں نہایت فصاحت و بلاغت سے کہہ رہی تھیں "ارے او ننو اور سنا ہے کہ مُوا بی قمر کی کلائی پر باندھنے والی دو ڈھائی سو کی "کلاک" بھی لے کر غارت ہوگیا"۔

مرزا صاحب مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے جوشِ محبت میں مجھے گلے سے لگا لیا۔ اُس وقت مجھے پورا اطمینان ہوا کہ کسی کے دل میں میرے شمّو ہونے کا شائبہ تک نہیں۔ جو لوگ گھر میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے میرے کان انہیں کی آوازوں پر لگے تھے۔ کوئی کہتا "کبھی وقت پر دغا دے گیا" کوئی کہتا "دنیا میں کس پر بھروسا کیا جائے" اور کوئی کہتا تھا کہ "بہتیرا تلاش کیا کہیں اس کا نام و نشان لگتا ہی نہیں"۔ میں سب کچھ سنتا اور دل ہی دل میں مسکراتا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ نکاح کے بعد فوراً میری طلبی اندر ہوئی۔ ابھی میں نے دہلیز میں قدم نہ رکھا تھا کہ بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی کسی سے کہہ رہی تھیں "ہے ہے کیا کروں دل نہیں مانتا کہ شمّو ایسا دغاباز تھا میرا تو دل دھک دھک کر رہا ہے باہر سڑکوں پر موٹریں اندھی ہوئی پھرتی ہیں کہیں نیچے آکر خدانخواستہ ......"

اتنے میں میں اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے بیگم صاحبہ کو سلام کیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ مستورات کے درمیان ایک کرسی پہلے ہی اس غرض سے رکھی ہوئی تھی۔ میں قدرے سر جھکا کر وہاں بیٹھ گیا۔ بڑی بوڑھیاں مجھ پر صدقے اور واری ہونے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے بیگم صاحبہ نے سلامی دی۔ اس کے بعد خورشید سامنے آئیں اور کہا "بھیا تم تو لڑکیوں کی طرح زمین پر جھکے جاتے ہو (ہنس کر) مجھے سلام تو کرو میں تمہاری بڑی سالی ہوتی ہوں"۔ ساتھ ہی دو اشرفیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ اس کے بعد وہ ذرا دوسری طرف چلی گئیں۔ ان کا بچہ ابھی تک نئے بوٹ کے لئے مچل رہا تھا۔ بڑے بڑے آنسو اُس کے دونوں رخساروں پر اب بھی بہہ رہے تھے اسے جاکر بہلانے لگیں۔ "وہ آیا شمّو ننھے کا بوٹ لے کر ابھی شمّو آئے گا"۔ میں نے دل میں کہا اب شمّو آچکا!

کچھ دیر بعد میں باہر جانے کے لئے اٹھا۔ خورشید بولیں "بھائی تم بھی کیا یاد کرو گے کہ پہلے پہل سالی نے پان تک نہ پوچھا (ہنس کر) بات یوں ہوئی کہ آج ہمارا پان لانے والا چار بجے سے کہیں اللہ کی راہ میں کوچ کر گیا ہے اور ہم اب تک بیٹھے اُس کی راہ دیکھتے رہے ذرا دیر ٹھہرو"۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "صبح سہی" اور باہر کی طرف چلا لیکن جان بوجھ کر ذرا قمر کے کمرے کے قریب آکر رک گیا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی "ارے خدا کی قسم میں نے پہلے بھی کہیں تیرے دولہا کو دیکھا ہے"۔

اب صبح باوجود کئی بار اندر سے بلاوا آنے کے میں اندر نہ گیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں دن کی روشنی میں عورتوں کی تیز نگاہیں مجھے پہچان نہ جائیں۔

آخر قمر کی رخصت کا وقت آن پہنچا گھر بھر کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ بہ مشکل اپنے سینوں میں قہقہوں کو روکے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ کب موقع ملے اور کب ہم یہ ہنسی کا خزانہ کھلے طور پر لٹا سکیں راستہ بھر طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہے اور آخر ہم اپنے گھر پہنچ گئے - وہاں میرے کئی دوستوں کی بیویاں اور کنبہ وغیرہ کی عورتیں پہلے ہی سے جمع تھیں جنہوں نے قمر کا خیر مقدم نہایت مسرت سے کیا۔

دعوت وغیرہ کے بعد جب مہمان رخصت ہوئے تو میں قمر کے زیور وغیرہ کی فہرست جو مرزا صاحب نے دی تھی لے کر بیٹھ گیا۔ اُس سے کہا میں آپ کو گنواتا ہوں ذرا دیکھتی جائیے کہ آیا سب زیور ٹھیک ہیں یا نہیں۔ جب ہاتھوں کے زیوروں کا نام آیا تو قمر شرماتے ہوئے بولی۔ اس میں ایک کلائی کی گھڑی گم ہوگئی ہے جو میری آپا نے مجھے دی تھی۔ آنے سے ایک دن پیشتر ہمارا ایک ملازم خبیث لے کر معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ شریر بھی بے حد تھا۔ خدا جانے شرارت کے لئے کہیں لے کر نہ بیٹھ رہا ہو"۔

میں نے نہایت متانت سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا "لیجئے اپنی گھڑی ذرا دیکھ لیجئے۔ ستار نے ٹانکا وغیرہ تو ٹھیک لگایا ہے یا نہیں"۔

قمر (حیرت کے لہجہ میں) ہیں آپ کے پاس کہاں سے آگئی۔

میں (چشمہ آنکھوں سے اتار کر تپائی پر رکھتے ہوئے) اس لئے کہ وہ خبیث ملازم آپ کا یہی خادم تھا۔

قمر (غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر) میرے اللہ یہ کیا معمّا ہے"۔

میں نے تمام واقعات مختصر طور پر اُسے کہہ سنائے - وہ بولی "اُف توبہ میں کس طرح یقین کروں"۔

آخر جب میں نے چند خاص خاص واقعات جو وہاں گزر چکے تھے بیان کئے تو اُس نے یقین کیا اور بولی اف توبہ آپ بھی کیسے شریر نکلے۔ خدا کی قسم میں آپ کی اُس کمبخت "مراحی" کی بات کا خیال ایک دم کے لئے نہیں بھولی اور اسی لئے میں کل سے آپ کے ہاں کی ہر ایک بوتل کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ رہی تھی"۔

اس کے بعد اُس کا اصرار تھا کہ جلد واپس ابّا کے ہاں چلو۔ بغیر اس بات کا انتظار کئے کہ مرزا صاحب کے ہاں سے کوئی شخص اُسے لینے کے لئے آئے۔ اب ہم خود اُن کی خدمت میں جا رہے ہیں۔ اور جناب یہی ہے اس عاجز کے سفر کا اصل مقصد"

یہ کہہ کر شمیم تیزی سے دروازے کی طرف لپکا ——— گاڑی ابھی ابھی ——— سٹیشن پر آ کر رک گئی تھی۔

عبد الغفار نے دیوانہ وار پلیٹ فارم پر چھلانگ ماری "ارے بھئی کہاں جاتے ہو۔ خدا کے لئے اتنا تو بتاتے جاؤ"...

"راہرو"

محفلِ ادب

مثنوی اسرارِ محبت

(سسّی پنوں کا قصہ)

اکتوبر ۱۹۳۱ء کے رسالہ اردو میں پروفیسر قاضی فضل حق صاحب کا ایک مضمون سسّی پنوں کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے محمد عمر نور الٰہی صاحبان کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے لوگ ہیر رانجھا اور سسّی پنوں کے پنجابی قصّوں کو مبتذل سمجھا کئے۔ اور فارسی اردو کے شاعروں نے ان قصّوں کو التفات کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور ثبوت میں فارسی اور اُردو کی اُن کتابوں کی فہرست پیش کی ہے جن میں یہ قصّے نثر یا نظم میں بیان کئے گئے ہیں۔ میں اس فہرست میں ایک اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں۔

میرے کتب خانے میں ایک مثنوی ہے جس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:-

"المنۃ للہ کہ قصہ سسّی پنوں مسمیٰ بہ مثنوی اسرارِ محبت در بیت السلطنت لکھنؤ طبع شد"

مصنف نے سسّی کی زبانی دو غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ایک اُس موقع پر جب وہ پہلی مرتبہ پنوں کو ڈھونڈھنے نکلی ہے اور دوسری اُس وقت جب اُس نے دوبارہ اپنے گھر سے نکل کر جنگل کی راہ لی ہے۔ نمونے کے لئے اول الذکر غزل اور "سسی کا سراپا" سے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

بس اپنا کچھ نہیں اب آہ چلتا — کہ دل کو لے گیا اک راہ چلتا
سمجھتا تو بھی تھی اک راہ کی بات — کہ مجھ کو بھی لئے ہمراہ چلتا
چھلاوے کی طرح سے دل کو چھل کر — رہا یک بار وہ دل خواہ چلتا
نہ جاتی جان گر چلنے سے اپنے — مجھے بھی کر کے وہ آگاہ چلتا
گیا یوں بر سے وہ دلبر یکایک — رہے جوں تن سے جی ناگاہ چلتا
رکھا اب ناتوانی نے مجھے ٹھور — نہیں زور اس پہ کچھ واللہ چلتا

یہ غزل مصنف نے غالباً کسی دوسرے شاعر سے مستعار لی ہے

سسّی کا سراپا

سراپا کیا لکھوں اُس شمع رو کا — کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود

ہر اک مُو اس طرح کا دامِ خوبی — بلا گرداں ہو جس پر شامِ خوبی

یہ کافر تھی درخشاں ان میں وہ مانگ — دلِ مجنوں کو جو لیلیٰ سے بے مانگ

دوپٹا چاند تارے کا زری باف — جو اوڑھے تھی کر اپنی پٹیاں صاف

سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شبِ دیجور میں چمکیں میں اختر

گوندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جیوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے

بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن — اچنبھا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں بکھیر — رگِ ابرِ سیہ جیسے ہو مہ پر

وہ کیفی انکھڑیاں تھیں صورتِ جام — ولیکن اُن سے کیا ہے نسبتِ جام

(منتخب) (اُردو)

پمپی کے عبرت آموز کھنڈر

چونکہ پمپی کے عبرت آموز کھنڈروں کو دیکھنے کے لئے بکثرت سیاح آتے رہتے ہیں۔ اس لئے اطالوی حکومت نے نہایت پختہ سڑک بنوائی ہے جو وسیوویس کے دامن سے ہوتی ہوئی اس مقام سے گذرتی ہے جہاں کبھی ہرکیولینیم آباد تھا۔ پمپی اور ہرکولینیم دونوں ایک ہی وقت میں تباہ ہوئے تھے۔ جہاں کبھی بیس ہزار کی عظیم الشان آبادی تھی۔ وہاں اب ٹوٹی ہوئی دیواروں۔ ٹوٹی ہوئی عمارتوں اور ٹوٹے ہوئے ستونوں کا ایک انبار ہے لیکن جو حصے دستبردِ روزگار سے بچ گئے ہیں وہ صاف بتا رہے ہیں کہ دولت کی فراوانی۔ اسبابِ معیشت کی افراط اور خوفِ بازپرس سے بے پروائی انسانی جمعیتوں اور آبادیوں پر جو ہولناک اخلاقی اور روحانی بیماریاں لایا کرتی ہیں وہ سب بیماریاں انتہائی شدت اور وسعت کے ساتھ پمپی پر طاری ہو چکی تھیں۔

ٹوٹی ہوئی دیواروں کے بعض حصوں کی نہایت حیاسوز تصاویر سے بالیقین معلوم ہو رہا ہے کہ اس تباہ شدہ بستی کے باشندوں کی سرکشی تمرد۔ طغیان اور اخلاقی و مذہبی نامرادی کی حالت کیا تھی۔ ہمارے گائڈ نے بعض مکانوں کا تفصیلی نقشہ ہمیں بتایا اور کہا۔ کہ اہلِ پمپی کے مکانوں کا کم و بیش ⅔ حصہ عیش و عشرت کے لئے وقف رہتا تھا اور ⅓ حصہ تخلیہ اور آرام کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کا مسلک یہ تھا کہ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ سب سے بڑھ کر تعجب اس بات پر ہے کہ وسیوویس شہر سے صرف دو میل کے فاصلے پر اپنی لامتناہی آتش افشانی کے ساتھ عذابِ الٰہی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ اس مقام پر آج بھی سیاح جائے تو اس کے دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے لیکن پمپی والے اس لبریزِ ہول فضا میں زندگیاں بسر کرتے تھے۔ اور اُن کی غفلت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

آخر ۲۴ - اگست ۷۹ء کو پمپی کی بدبختی پر آخری مُہر ثبت ہوگئی۔ ویسوویس کا دہانہ کھل گیا۔ اس سے لاوے کا جو آتشیں سیلاب نکلا۔ اس نے ہرکولینیم کی آبادی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور پتھروں کے ٹکڑوں کنکروں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی جو ہولناک بارش ہوئی اُس نے پمپی کو اپنا ہدف بنا لیا۔ ویسوویس کا یہ غیظ و غضب تین روز تک جاری رہا۔ پمپی کے بعض باشندے پہلے ہی دن شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اکثر باشندے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ دوسرے دن فضا دھوئیں اور سیاہ بادلوں سے اس درجہ تاریک ہو گئی اور پتھروں کی بارش میں اس قدر تندی آگئی کہ بچ کر باہر جانا غیر ممکن ہوگیا۔ چنانچہ جو لوگ پہلے دن نہ بھاگے وہ کنکروں اور پتھروں کے اس بیس فٹ اونچے انبار میں دفن ہوگئے جو پمپی شہر کی جگہ ویسوویس نے تین روز میں کھڑا کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ تین روز تک زمین کے اندر سے ہولناک آوازیں آتی رہیں۔ اور اُن کی وجہ سے اکثر اہل پمپی بے حد سراسیمہ حواس باختہ اور مختل ہوگئے۔ اسی حواس باختگی اور اختلال نے اکثر لوگوں کو بچاؤ کی بہترین تدبیر یعنی فرار سے باز رکھا۔ کھنڈروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر تقریباً بیضوی شکل میں آباد تھا۔ اس کے اردگرد مضبوط فصیل تھی جس میں آٹھ دروازے تھے۔ دو بڑے بازار شمال مشرق سے جنوب مشرق کی طرف متوازی شکل میں چلے گئے تھے۔ اور دو بڑے بازار جنوب مغرب سے شمال مغرب کی طرف متوازی شکل میں چلے گئے تھے۔ اس طرح شہر نو مختلف حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں اس کی کھدائی شروع ہوئی۔ اس وقت تک تقریباً ۲/۳ حصہ کھد چکا ہے۔ اور ۱/۳ حصہ باقی ہے جتنی چیزیں کھدائی کے دوران میں نکلیں۔ وہ ایک جگہ دو تین کمروں میں ترتیب کے ساتھ رکھ دی گئی ہیں۔ یہ پمپی کا میوزیم ہے۔ ان میں پانچ چھ انسانی ڈھانچے ہیں۔ ایک کتے کا ڈھانچہ ہے۔ سکے ہیں۔ کچھ برتن۔ کچھ زیورات کچھ دواخانے کا سامان اور چند بُت۔ پمپی میں پانی کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ سارے شہر میں سیسے کے نل لگے ہوئے تھے جن کے آثار جا بجا نظر آتے ہیں بعض بڑے بڑے مکانوں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کے رنگ۔ نقش و نگار اور تصاویر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ پمپی کو نقاشی اور مصوری میں مہارتِ تام حاصل تھی۔ اگرچہ وہ اس مہارت و کمال کو علی العموم تخریبِ اخلاق کے اسباب فراہم کرنے ہی میں صرف کرتے تھے۔ تمام بڑے بڑے ارکان کسی جانور یا پرندے کے نام پر موسوم ہوتے تھے۔ اور اس جانور یا پرندے کی تصویر بیرونی ڈیوڑھی میں بنا دی جاتی تھی ہم نے پمپی کے چوک۔ دار العدل۔ قید خانے۔ مارکٹ اور بعض دوسرے مقامات کے دیکھنے میں زیادہ وقت صرف کیا۔ ایک حصہ بازاری عورتوں کے لئے وقف تھا۔ اس کے بعض مکانات کی دیواروں پر نہایت حیا سوز تصاویر اب تک صاف نظر آرہی ہیں۔

مہر (انقلاب)

شیکسپیئر کی آمدنی

امریکہ کے ایک پروفیسر صاحب جو کئی سال سے شیکسپیئر کی آمدنی کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش میں تھے اُس

نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بحیثیت ایک ڈراما نویس شاعر اور ایکٹر کے اس کی آمدنی کا اوسط دو سو پچاس پونڈ سالانہ تھا، شیکسپیئر کے مرتبہ کے لحاظ سے یہ رقم بہت حقیر معلوم ہوتی ہے تاہم حقیقتاً اس قدر حقیر نہیں ہے، پونڈ کی موجودہ قیمت کے حساب سے یہ تقریباً دو ہزار پونڈ کے برابر ہے، پھر بھی مصنفین کو آج کل جو معاوضہ ملتا ہے اُس کے اعتبار سے بہت کم ہے،

(معارف)

عثمان ساگر

(گنڈی پیٹ)

آج تڑکے الحفیظ و الاماں ۔۔۔ دوستو عثمان ساگر کا سماں!
دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک ۔۔۔ بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دو رنگ
ظلمتیں تھیں نور سے گرم ستیز ۔۔۔ ولولوں پر تھی ہوائے تند و تیز
سامنے تھیں پتھروں کی بستیں ۔۔۔ نرم و رنگیں جھاڑیوں کی شکل میں
جزر و مد میں تھی بفرطِ اضطراب ۔۔۔ ساغرِ عثمان ساگر کی شراب
روحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں ۔۔۔ لو سنو کس طرح تھی موجیں رواں
جھاگ اڑاتی، پھاندتی، اڑتی ہوئی ۔۔۔ کپکپاتی، لوٹتی، مڑتی ہوئی
چلبلی، ابھری ہوئی، بکھری ہوئی ۔۔۔ جھینپتی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی
بجلیاں ان میں چمکاتی ہوئی ۔۔۔ دمبدم آتی ہوئی جاتی ہوئی
اِس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی ۔۔۔ پتھروں کو چھانٹتی دھوتی ہوئی
گرتی پڑتی مست سر دھنتی ہوئی ۔۔۔ مرتعش قالین سا بنتی ہوئی
زیر و بم کا ناز دکھلاتی ہوئی ۔۔۔ اُٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی
گنگناتی صف بصف آتی ہوئی ۔۔۔ لڑتی بھڑتی گونجتی گاتی ہوئی
مچھلیوں کو درسِ نو دیتی ہوئی ۔۔۔ ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی
ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی ۔۔۔ اینڈتی، اٹھلاتی بل کھاتی ہوئی
دمبدم ہنستی ہوئی، روتی ہوئی ۔۔۔ ملتی، کتراتی، جدا ہوتی ہوئی
جا بجا دلدل میں کاجل پارتی ۔۔۔ چوکڑی بھرتی، چھلانگیں مارتی
پَے بہ پَے غاروں کے اندر گھومتی ۔۔۔ ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی
بلبلاتی، بھاگتی، منہ موڑتی ۔۔۔ مڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی ۔۔۔ دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی
تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو ۔۔۔ یار کی کڑمل جوانی کا لہو

یہ سماں تھا اور اک رنگیں پرند ۔۔۔ روحِ شاعر کی طرح بے قید و بند
بے خودی کے جام چھلکاتا ہوا ۔۔۔ گزرا میرے پاس سے گاتا ہوا
نغمہ سُن کر اس قدر جی خوش ہوا
ہچکیاں لے لے کے میں رونے لگا!

(چندن)

تبصرہ

روحِ ظرافت مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل جودھپور حجم تقریباً ۲۸۰ صفحات چھوٹی تقطیع۔ کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

یہ کتاب مرزا صاحب موصوف کے آٹھ مزاحیہ افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے۔ ناظرینِ ہمایوں مرزا صاحب کے مزاحیہ لیکن پاکیزہ اندازِ تحریر سے واقف ہیں۔ مزاحیہ انداز میں لکھنا آسان کام نہیں۔ دماغ سوزی اور جان کاہی کے علاوہ اس کے لئے اُس وہبی جوہر کی بھی ضرورت ہے جو قدرت ہر کسی کو عطا نہیں کرتی۔ مقدمۂ کتاب میں ہمارے مشہور مضمون نگار مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے خوب کہا ہے کہ "خدا معلوم آج کل یار لوگوں نے مزاحیہ مضامین لکھنے کو کیا سمجھ لیا ہے۔ قلم اٹھایا اور اندھا دھند لکھنا شروع کردیا۔ یہ نہیں جانتے کہ اس رنگ میں لکھنا کچھ آسان کام نہیں ..... اگر مردی اور نامردی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے تو خوش مذاقی اور مسخرہ پن میں صرف ایک لفظ کا الٹ پھیر ہے۔"

مرزا صاحب کی تحریر سلیس اور شستہ ہوتی ہے اور ہزل کا یا بقول مرزا فرحت اللہ بیگ کے "مسخرہ پن" کا اس میں باوجود مزاح کے شائبہ تک نہیں ہوتا۔ کتاب کی زبان کے متعلق ہم مرزا فرحت اللہ بیگ کا یہ دلچسپ فقرہ نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں کہ "جابجا چلتے ہوئے فقروں کے موتی جڑے ہیں اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ باوجود انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے یہ صحیح اردو لکھتے ہیں"۔ مقدمہ نگار نے عظیم بیگ صاحب کے افسانے "رموزِ خاموشی" سے ذیل کا اقتباس دیا ہے جو نہ صرف مرزا صاحب کے سلیس اور شستہ اندازِ تحریر کا آئینہ دار ہے بلکہ اُن کے پاکیزہ مزاحیہ انداز پر بھی پوری روشنی ڈالتا ہے۔ ایک میزبان صاحب اپنے مہمان سے شناخت میں غلطی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کس قدر آپ میرے دوست کے ہم شبیہ ہیں! بالکل وہی ..... ہوبہو وہی۔ صرف ذرا آنکھیں آپ کی چھوٹی ہیں اور ذرا پیشانی کم کشادہ ہے۔ ورنہ آپ بالکل ہوبہو وہی ہیں۔ ہاں اور وہ عینک نہیں لگاتے اور ذرا ہونٹ اُن کے پتلے ہیں۔ ورنہ بالکل آپ کی شکل صورت ہیں۔ بس صرف آپ کی ناک اُن سے ذرا بڑی اور چوڑی ہے۔"

خط وخال کے اس بعد المشرقین کے باوصف ملاحظہ فرمائیے کہ غلط شناخت کا "عذرِ گناہ" کتنا "بدتر از گناہ" یا بہ الفاظ صحیح تر "مضحکہ از گناہ" ہے۔ اصحابِ ذوق اس کی داد خود دے سکتے ہیں۔ ہم ناظرینِ ہمایوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کو ضرور اپنے کتب خانے کی زینت بنائیں۔ مصنف سے طلب فرمائیے۔

فہرست مضامین

جلد ۲۰ — نمبر ۱۲

"ہمایوں" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء

تصاویر:- (۱) گھر کا بادشاہ (۲) جنگل کا بادشاہ

ہمایوں کا دسواں[1] سالگرہ نمبر

دو[2] سو سے زائد صفحات کا ذخیرہ ادب اور بیش بہا خوبصورت تصویریں

سالانہ چندے میں عارضی تخفیف

ایکہزار سے زائد صفحات کا خزانہ علم و ادب، درجنوں رنگین اور عکسی تصویریں (صہ ۸) کے بجائے صرف (۵ روپے) میں ایک سال

آیندہ پرچہ " ہمایوں " کا دسواں سالگرہ نمبر ہوگا۔ اس کے ظاہری و باطنی محاسن کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اُردو رسائل کی تاریخ میں یہ پرچہ یادگار رہے گا۔ مشاہیر ادب نے اس شاندار نمبر کے لئے اپنے بہترین نتائج تخیل عنایت کئے ہیں اور بعض ایسے بلند پایہ اہل قلم حضرات نے ہماری درخواست پر ہمایوں کے لئے لکھا ہے۔ جن کے نتائج افکار عام رسائل میں نظر نہیں آتے،

سالگرہ نمبر کے بعض مضامین

جنگ و جدال ۔ یہ دلچسپ ڈراما ادیب شہیر سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے ترکی زبان سے ہمایوں کے لئے اخذ کیا ہے۔ سجاد حیدر کا نام اور سجاد حیدر کا مضمون کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

شہزادی کا خط ۔ از مصور فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی ۔ دہلی کی ایک جلا وطن مغلیہ شہزادی کا المنامہ اپنی والدہ کے نام۔ یہ خط نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہے۔ خواجہ صاحب نے خاص طور پر ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے لئے لکھا ہے۔

انگریزی شاعری میں محبت کا تصوّر ۔ ایک زبردست مغربی نقاد کی نہایت بلند پایہ ادبی تنقید۔ مترجمہ جناب حمید احمد خاں صاحب ایم۔ اے، ترجمہ میں اصل کی خوبی اسی طرح قائم ہے۔

آزاد نگارستان اور دادا جان ۔ مشہور مزاحیہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کا لاجواب مزاحیہ مضمون۔ مرزا صاحب کے بہترین مضامین میں سے ہے۔

سسرے کا پُرسا ۔ از آغا حیدر حسن صاحب دہلوی۔ یہ امر مسلّم ہے۔ کہ دہلی کی نسوانی زبان لکھنے میں آغا حیدر حسن صاحب ہندوستان بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ مضمون نہ صرف زبان کے لحاظ سے بہترین ہے۔ بلکہ موضوع کے لحاظ سے بلا انتہا

دلچسپ بھی ہے۔ ہم آغا صاحب کے ممنون ہیں کہ ہماری درخواست پر انھوں نے یہ مضمون ہمایوں کے لئے لکھا۔

ڈیمانسٹریشن - از منشی پریم چند۔ منشی صاحب نے ہماری درخواست پر اپنا ایک بہترین افسانہ ہمایوں کے لئے عنایت کیا ہے۔ فن افسانہ نویسی میں پریم چند کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مشہور افسانہ نگار مہاشہ سدرشن صاحب کا ایک دلچسپ افسانہ بھی اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔

دمنتی - نہایت دلچسپ اور دلآویز ڈراما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب۔ ایم اے۔ میاں صاحب کے مضامین بارہا ناظرین ہمایوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ڈراما اُن کی تحریر کی تمام ادبی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔

مہابلی - ایک ایکٹ کا تاریخی ڈراما - از محمد عمر، نور الٰہی صاحبان۔ نور عمر صاحبان نے فن ڈراما کا جس قدر وسیع اور عمیق مطالعہ کیا ہے۔ بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا۔ یہ ڈراما اُن کی واقفیت فن کا شاہدِ عادل ہے۔

باغی - مولوی منصور احمد صاحب کا گراں پایہ اور دلچسپ افسانہ۔

اس کے علاوہ کئی بلند پایہ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین، افسانے اور نظمیں ہوں گی۔ شعرا میں حضرات جوش ملیح آبادی۔ احسن مارہروی، وحشت، اثر صہبائی، اصغر گونڈوی، مقبول حسین احمد پوری۔ اور کئی دوسرے مشہور نام قابلِ ذکر ہیں۔

تصاویر

اس نمبر میں تقریباً ایک درجن بڑے سائز کی تصویریں ہوں گی۔ جن میں یک رنگ و سہ رنگ تصویریں شامل ہیں۔ یہ تصاویر بے انتہا کاوش اور سینکڑوں روپے کے مصارف سے حاصل کی گئی ہیں۔

رسالے کے سرورق پر بھی ایک نہایت نفیس اور شاندار چار رنگ کی تصویر ہوگی۔ ایسی خوبصورت اور شاندار تصویریں پہلے کبھی "ہمایوں" میں بھی نہیں چھپیں۔

۳۱ دسمبر تک چندے میں تخفیف

دسویں سالگرہ کی تقریب میں چندہ عارضی طور پر بہت کم کر دیا گیا ہے۔ جو اصحاب ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء تک ۱۹۳۲ء کے لئے فرمائش خریداری بھیج دیں گے۔ اُن سے سالانہ چندہ پانچ روپے ۶ر کے بجائے تین روپے ۶ر لیا جائے گا۔ اور یہ شاندار سالگرہ نمبر بھی بلا زائد قیمت کے اُن کی نذر ہوگا۔ ناظرین "ہمایوں" سے درخواست ہے۔ کہ علم دوست حضرات کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچا کر "ہمایوں" کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں +

مینیجر ہمایوں - ۲۳ لارنس روڈ - لاہور

جہاں نما

کتب خانوں کی تحریک میں اسلام کا حصہ

مسٹر ایس۔ آر رنگا ناتھن نے ایک محققانہ مضمون لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانوں کی تحریک میں اسلام نے کتنا اہم حصہ لیا ہے۔ یہ تحریک اگرچہ ایک بالکل نئی تحریک ہے۔ لیکن زمانہ قدیم میں بھی اس کے متعلق بعض ابتدائی اصول بالکل آجکل کی طرح قائم ہو چکے تھے۔ مثلاً مغربی ایشیا کے مسلمان دسویں صدی میں بھی کتب خانوں کی تحریک کے علمبردار سمجھے جا سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ دسویں صدی کے آخر میں شہر بغداد کے اندر عوام کے فائدے کے لئے ۳۶ کتب خانے قائم تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں قاہرہ میں بھی ایک مشہور کتب خانہ موجود تھا۔ لیکن فارس کے قصبہ رامہرمز کے متعلق ہمیں بعض ایسی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ جن سے یقینی طور پر عہد حاضر کی تحریکات کی بو آتی ہے۔ اس کتب خانے میں نہ صرف کثیر التعداد کتابیں موجود تھیں۔ بلکہ زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے۔ کہ اس کا ایک نہایت قابل لائبریرین بھی تھا جو فلسفے سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ کتب خانے کے دوسرے عہدہ داروں کا انتخاب بھی اکابر شہر میں سے کیا گیا تھا۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ موجودہ دور میں بھی لائبریرین کے ضروری اوصاف اُن سے بالکل مختلف سمجھے جاتے ہیں۔ جو دسویں ہی صدی کے اندر رامہرمز کے روشن خیال باشندوں نے سمجھ لئے تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ لائبریرین کا عہدہ کم علم اور نکمے لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ جو اور کوئی کام نہ کر سکیں۔ اگر کوئی مدرس نالائق ثابت ہو تو وہ بالعموم لائبریری میں بھیج دیا جاتا ہے

مسٹر رنگا ناتھن لکھتے ہیں کچھ عرصہ گزرا مجھے ایک بلند مرتبہ افسر کا ایک پرجوش اور ہمدردانہ خط موصول ہوا۔ جس میں درخواست کی گئی تھی۔ کہ میں ادھیڑ عمر کے ایک ایسے شخص کو لائبریری میں جگہ دے۔ دوں جو انٹرنس کے امتحان میں بارہ دفعہ شامل ہوا مگر ناکام رہنے کی وجہ سے کوئی دوسری جگہ حاصل کرنے کے قابل نہ تھا۔ صاحبِ موصوف کہتے ہیں کہ جب سات سال قبل خود میں مدراس یونیورسٹی کا لائبریرین مقرر ہوا تھا۔ تو میرے بعض ہوا خواہوں نے جو تعلیمی دنیا میں بلند مراتب پر فائز تھے۔ نہایت افسوس ظاہر کیا۔ کہ میں ایک اس قسم کا کام اختیار کرنے والا ہوں۔ جو ایسے بے دماغ اور از کار رفتہ بڈھوں کے لائق ہے۔ جو اور کسی بات کے قابل نہ رہے ہوں۔ جب بیسویں صدی میں بھی لائبریرین کے عہدے کے متعلق اس قسم کے خیالات موجود ہوں۔ تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ فارس کے مسلمانوں نے اتنے قدیم زمانے میں لائبریرین

کی قابلیت کا کس قدر صحیح اندازہ کر لیا تھا۔

جہاں قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے کتب خانوں کی موجودہ تحریک کا ایک طرح سنگِ بنیاد رکھا وہاں کتب خانوں کی ترقی میں ایک اور طرح اس سے بھی زیادہ اہم حصہ لیا۔ اور یہ حصہ پندرھویں صدی میں انگلستان اور اس کی قوم کے حصے سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں مسلمانوں نے فن کاغذ سازی میں بعض اہم اصلاحات کیں۔ اس زمانے تک کتابیں میٹے اور پیپا پرس پر لکھی جاتی تھیں۔ اور اس لئے نہایت گراں قیمت اور عوام کی رسائی سے بالاتر ہوتی تھیں۔ مسلمانوں نے اوّل اوّل کاغذ سازی میں روئی وغیرہ کا استعمال ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاغذ ارزاں ہو گیا۔ اور مصر اور عرب گیارھویں صدی کے اواخر میں کاغذ کی تجارت کے اہم مرکز بن گئے۔ اُن دنوں اکثر ممالک یورپ اسلامی ممالک سے کاغذ کی درآمد کیا کرتے تھے۔

سٹیلن کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

اسد بے نے سٹیلن کی خانگی زندگی کے متعلق ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اگرچہ سٹیلن کو خانگی زندگی میں حصہ لینے کے لئے زیادہ وقت نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی اس کی طرز زندگی میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ دوسرے اشتراکیوں کی زندگی سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ ایام شباب میں سٹیلن نے ایک نوجوان جارجین لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا انقلاب سے دس سال قبل تشش کے کسی مرض سے انتقال ہو گیا۔ اُس بیوی سے سٹیلن کا ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد پچاس برس کی عمر میں جب وہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے پندرہ سال کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ ناجا الیلویا ایک پہاڑی لڑکی ہے۔ جو ایشیائی رواج کے مطابق ایک لونڈی کی طرح اُس کی فرمانبردار ہے۔

سٹیلن ایک اچھا لیکن ایشیائی طرز کا شوہر ہے۔ بڑے بڑے اشتراکیوں کی بیویاں کرملین میں رہتی ہیں۔ اور اُن کے طور طریقے وہی ہیں جو عموماً ایسی عورتوں کے ہوتے ہیں جو دفعتہً دنیا اور زندگی کے ہنگاموں سے دوچار ہو جائیں۔ اُرجانی کِڈس کی اسکیمو بیوی سے لیکر لٹویناف کی ذی مرتبت انگریزی بیوی تک سب گپ شپ، بے حقیقت سازشوں اور بیہودہ نسوانی گفتگوؤں میں حصہ لیتی ہیں۔ چونکہ حکومت کے تمام کاروبار کا مرکز کرملین ہے۔ اِن عورتوں کو اپنی نسوانی فطرت کے جوہر دکھانے کے خوب موقعے ملتے رہتے ہیں۔

صرف سٹیلن کی بیوی اس سے مستثنٰے ہے۔ سوویٹ حکومت کی تمام تاریخ میں سٹیلن کی بیوی نے ابتک ایک بھی بیہودہ بات نہیں اُڑائی اور رُوس کی اس "عظیم ترین" عورت کے خلاف ابتک ایک حرف بھی کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی وہ نقرکو رکی میں نہایت خاموشی اور شرم و حیا کی زندگی بسر کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صبح جب سٹیلن اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ تو محل کے بیرونی دروازوں کو باہر سے مقفل کر جاتا ہے! اور چابی اپنی

جیب میں رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ محض مذاق ہے لیکن پھر بھی اس سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوجاتا ہے کہ سٹیلن کی خانگی زندگی کس انداز سے گزرتی ہے،
حقیقت یہ ہے کہ سٹیلن کی بیوی کے متعلق لوگوں کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ رُوسی زبان سے تقریباً بالکل ناآشنا ہے۔ سیاسیات سے اُسے کوئی
لگاؤ نہیں، وہ بہت نوجوان ہے اور روس کے پچاس سالہ مختار مطلق کے دو بچوں کی ماں بن چکی ہے سٹیلن جیسا کہ کہا جاچکا ہے ایک اچھا شوہر اور
ایک اچھا باپ ہے۔ ایک مشہور عالم اشتراکی کی بیوی نے جسے چند دن سٹیلن کے ہاں بطور مہمان رہنے کا اتفاق ہوا سٹیلن کی خانگی زندگی
کی کچھ جھلکیاں دکھائی ہیں سٹیلن، اسکی بیوی اور اشتراکی کی بیوی سٹیلن کے نوزائیدہ شیرخوار بچے کے گہوارے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔
سٹیلن کی بیوی کو باورچی خانے جانا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی عدم موجودگی کے دوران میں اپنے شوہر سے بچے کا خیال رکھنے کو کہا سٹیلن نے
جس کے منہ میں اُس وقت پائپ تھا سر کے اشارے سے بغیر ایک لفظ کہے آمادگی کا اظہار کیا۔ ماں کے باہر قدم رکھتے ہی بچے نے رونا
شروع کردیا سٹیلن صاحب اُٹھے اور بچے سے عجب بے ڈھنگے طور پر کھیل کرنے لگے، ساتھ ہی حضرت نے ایک زور کا کش لگاکر تمباکو کا تمام دُھواں
بیچارے بچے کے منہ پر چھوڑ دیا۔ یہ حرکت بظاہر بچے کو بہلانے اور خاموش کرنے کے لئے کی گئی تھی لیکن بچے نے دفعتہً بطور احتجاج آسمان سر پر
اُٹھالیا۔ اس پر سٹیلن نے بچے کو گہوارے میں سے نکالا اور پدرانہ شفقت کا اظہار کرتے ہوئے پائپ اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ اب بچہ
اس طرح چیخنے لگا گویا اسے کانٹوں پر لٹا دیا گیا ہے سٹیلن نے یہ دیکھکر بچے کو نہایت بے پروائی سے پھر گہوارے میں ٹپک دیا، اور ساتھ ہی بولا۔
"اوّل درجے کا حرامی ہے یہ ذرا بھی بالشویک نہیں"۔ سٹیلن کی یہ شام بدمزہ ہوگئی اور سونے کے وقت تک وہ جھنجلایا ہوا سا رہا۔

اسکے باوجود سٹیلن کا دل مہربان بھی ہوسکتا ہے! اور وہ اپنے کنبے کے آرام کے لئے ایسے سامان فراہم کردیتا ہے جن سے وہ خود بے نیاز
بلکہ متنفر ہو۔ چنانچہ طفلس میں اسکی ماں جو پہلے درزن تھی شاہانہ شان و شکوہ سے رہتی ہے۔ جب سٹیلن کا نوجوان بیٹا ماسکو کے صنعتی مدرسے
میں کامیاب نہ ہوسکا اور سائینس کی تعلیم حاصل کرنے کا کسی طرح اہل ثابت نہ ہوا۔ تو سٹیلن نے اسے جارجیا کے ایک دُور افتادہ حصے میں
اس دُور اندیشانہ نصیحت کے ساتھ بھیج دیا کہ اگر تم انجنیر نہیں بننا چاہتے تو موچی بننے کی کوشش کرو لیکن جب سٹیلن کی بہن نے زیگوسلافیا
کے ایک اشتراکی کے ساتھ شادی کی تو اُس نے اِس تقریب کو ایسی ایشیائی شان سے منایا کہ اسمیں زارِ رُوس کا اسراف اور بدوی شوکت دونوں یکجا نظر آتی تھیں ◆

ادارہ ہمایوں

ہمایوں کے جائنٹ ایڈیٹر مولوی منصور احمد صاحب بوجہ ناسازیٔ طبع ہمایوں سے علیحدہ ہوگئے ہیں۔ چار سال تک جس جانفشانی اور تن دہی
سے انہوں نے ہمایوں کی ترقی کے لئے کام کیا اُس کے لئے میں اپنی اور ناظرین ہمایوں کی طرف سے اُن کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں ◆
اب اُن کی بجائے مولوی حامد علی خان جائنٹ ایڈیٹر ہونگے، اِن کی قابلیت اور اِن کا ذوقِ سلیم کسی تعارف کا محتاج نہیں ◆

بشیر احمد

ہندی شعرا کی جذبات نگاری

ہندی شاعری کے متعلق ناقدین فن کا خیال ہے کہ اس میں اب وہ شیرینی، ترنم اور نزاکت باقی نہیں رہی جو اس کا خاص حصہ ہے میرے خیال میں اردو شاعری کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے اور اس کا سبب ہندی میں بڑے بڑے سنسکرت اور اردو میں بڑے بڑے فارسی الفاظ کی بھرمار اور ٹھونس ٹھانس ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے موجودہ شعرا کے جذبات میں وہ روحانیت باقی نہیں رہی جو تلسی یا کبیر کے جذبات میں پائی جاتی ہے۔ بجائے عشق حقیقی کے اب عشق نام ہے فقط ان الفاظ کا کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں یا تم نے میرے خانہ دل پر قبضہ کر لیا ہے"۔ گو یہ الفاظ دیکھنے میں کیسے ہی خوشنما کیوں نہ معلوم ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے دل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ الفاظ فقط خانۂ دماغ میں گونج کر رہ جاتے ہیں اور قلب کی گہرائیوں تک پہنچنے کا راستہ نہیں پاتے۔ مسدس حالی کی طرز میں متعدد نظمیں لکھی گئیں جن میں سے اکثر کو فن کے لحاظ سے اس پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے لیکن سامع یا ناظر کے دل پر جو اثر مسدس حالی پڑھ کر یا سن کر ہوتا ہے کوئی دوسری نظم پڑھ کر یا سن کر نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ حالی نے ایک خاص حالت اور کیفیت سے متاثر ہو کر اور درد میں ڈوب کر یہ نظم لکھی۔ سچے جذبات کا سادہ اور سلجھی ہوئی عبارت میں اظہار کیا۔ بناوٹی خیالات کو جگہ نہیں دی لیکن دوسروں نے نقل کرنے کی کوشش کی اور خواہ مخواہ اپنی نظمیں آراستہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیں یہی وجہ ہوئی کہ اُن کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

کبیر اور تلسی داس کے ساتھ ہی ہم کو عبدالرحیم خانخاناں، امیر خسرو، ملک محمد جائسی اور سینکڑوں مسلمان شعرا بھی نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے ہندی کے ادبی خزانہ کو انمول جواہرات سے بھر دیا۔ اور سچ پوچھئے تو ان میں سے بعض کا کلام اس قدر بلند پایہ ہے کہ ان کا ایک ایک شعر ہندو شعرا کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہے۔

فارسی اور اُردو شاعری کے برخلاف ہندی شاعری میں عورت مرد سے مخاطب ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے اور ہندوؤں کے رسم و رواج کے پیش نظر یہی موزوں بھی ہے۔ شوہر کے مرنے پر اسی طرح اس کی بیوی چتا پر بیٹھ کر راکھ ہو جاتی ہے جس طرح پروانہ شمع پر اپنی جان قربان کرتا ہے۔ ہندی شاعری میں کوّا نامہ بر کا کام کرتا ہے اور پپیہا رقیب سمجھا جاتا ہے۔

اس مضمون میں ہم چند ہندی اشعار کا انتخاب ناظرین کی دلچسپی کے لئے مع شرح کے پیش کرتے ہیں۔

تن اجرا من کارا بگلا کا سا بھیس ۔۔۔۔ تو سے تو کاگا بھلا کہ باہر بھیتر ایک

شعر سادہ ہے اور ابتدائی اردو کی مثال شاعر نے کس خوبی سے ایسے لوگوں کی خبر لی ہے جو بگلا بھگت بن کر دھوکے کی ٹٹی کے پیچھے شکار کھیلتے پھرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اے شخص تو بظاہر تو سفید پوش ہے لیکن تیرا باطن سیاہ ہے۔ اس ریاکاری کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ تجھ سے تو کوا ہی بہتر ہے حالانکہ اُسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس پر بھی وہ قابلِ ترجیح ہے کیونکہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ اسی قماش کے بزرگوں کے متعلق حافظ کہتے ہیں:۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سعدی نے بھی ایسے ریاکار بزرگوں کی تصویر ان اشعار میں خوب کھینچی ہے لیکن ایک بالکل علیحدہ انداز میں

"کہ زنہار ازیں مردمانِ خموش پلنگانِ درّندۂ صوف پوش

کہ چوں گربہ زانو بہم بر زنند وگر صید ے اُفتد چو سگ در جہند

سے جو فروشانِ گندم نمائے جہاں گرد سالوس خرمن گدائے

لگی آگ ہے برکش کو جرنے لاگے پات توکیوں جرے ہے پنکھیا پنکھ ہے تیرے سات

شاعر انتہائی سادگی اور تعجب سے اس پرندے کو دیکھ کر سوال کرتا ہے جس کا آشیانہ ایک ایسے درخت پر ہے جس میں آگ لگ گئی ہے۔ درخت جل رہا ہے لیکن پرندہ اسی طرح درخت پر بیٹھا ہے اور اُڑنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ واقعہ شاعر کو بے حد تعجب خیز معلوم ہوتا ہے اس لئے وہ پرندہ سے کہتا ہے کہ اے پنچھی تو جان بوجھ کر کیوں موت کے منہ میں گر رہا ہے۔ تجھے تو خدا نے پر دیئے ہیں پھر اُڑ کیوں نہیں جاتا۔ اس وقت پرندہ محبت کا مارا پرندہ جواب دیتا ہے۔

پھل کھائے اس برکش کے گندے کینے پات اب ہے میرا دھرم یہ جر جاؤں ایہہ سات

سبحان اللہ وفاداری اسی کو کہتے ہیں اور محبت کا یہی حق ہے۔ پرندہ جواب دیتا ہے کہ میں نے اس درخت کے اتنے عرصہ تک پھل کھائے اور اس کے پتے اپنی بیٹ سے ناپاک کئے اب کیسے ممکن ہے کہ میں اس کو جلتا چھوڑ کر چلا جاؤں اور اپنی جان بچاؤں وفاداری اور محبت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں بھی اپنی جان قربان کروں اور جس طرح اتنے عرصہ تک اُس کے ساتھ بسر کی تھی اسی طرح اس کے ساتھ ہی مر بھی جاؤں۔

(میرا خیال ہے کہ یہ شعر شاعر نے ستی کے مناظر سے متاثر ہو کر کہے ہیں مسلم)

عبدالرحیم خان خاناں فضلائے عصر سے تھے۔ وہ نہ صرف عربی اور فارسی ہی میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ انہیں بھاشا میں بھی کمال

حاصل تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کا ہندی کلام بڑے بڑے ہندو شعرا کے دیوانوں پر بھاری ہے۔ کہتے ہیں۔

رحمن ہیت سراہیئے موئے میت کی آس　　　　میں کاٹ جل دھوئیے کھائیے ادھک پیاس

مچھلی پانی میں رہتی ہے اُسے پانی سے محبت نہیں عشق ہے بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی لیکن یہی نہیں کہ منہ دیکھے کی محبت ہو۔ مرنے پر بھی پانی سے محبت باقی رہتی ہے چنانچہ مچھلی پانی سے نکلنے کے بعد مر جاتی ہے۔ پکڑنے کے بعد دھوئی پکائی اور کھائی جاتی ہے مگر اتنی تکالیف اٹھانے کے بعد بھی اس کو پانی ہی کی تلاش رہتی ہے چنانچہ اسے کھانے کے بعد پیاس لگتی ہے ان تمام باتوں کو دیکھ کر شاعر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ محبت اس طرح کرنی چاہیئے جس طرح مچھلی کو پانی کے ساتھ ہوتی ہے یہی حقیقی محبت ہے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو محبت میں کمی نہ آنے پائے۔

منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے　　　　سر شمع ساں کٹایئے پر دم نہ ماریئے

گرو نانک کو لوگ فقط ایک مذہبی شخص سمجھ کر اُن کی تعظیم کرتے ہیں لیکن وہ ایک قابل شاعر اور معلمِ اخلاق بھی تھے کہتے ہیں۔

نانک ننھا ہو رہو جیسی ننھی دوب　　　　سبئے گھاس جر جائینگے دوب کی خوب

کہتے ہیں اے نانک خاکساری اختیار کرو کیونکہ خاکسار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا گھاس ہی کو دیکھو جانور اکثر چر جاتے ہیں لیکن دوب جس طرح ننھی اسی طرح قائم رہتی ہے۔

کڑوی بھینج بن سپنے ملٹے نتن کی تاب　　　　برے لگت سکھ کے بچن ہیئے بچارو آپ

شاعر کہتا ہے کہ ناصح کا قول اور اُس کی تعلیم چونکہ سچی ہوتی ہے لہذا بری معلوم ہوتی ہے الحق مُرٌّ لیکن ذرا، دل میں غور تو کرو کہ بخار کو کڑوی دوا ہی دور کرتی ہے۔ پس برائی کو دور کرنے کے لئے ضرور ہے کہ کڑوے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ گو یہ الفاظ بظاہر تلخ معلوم ہونگے لیکن ان کا نتیجہ اسی طرح میٹھا ہوگا جس طرح بخار کے لئے کڑوی دوا۔ ع جورِ استاد بہ زمہرِ پدر

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو چھٹکائے　　　　ٹوٹے سیں پھر نا جڑے جڑے گانٹھ پڑ جائے

خانخاناں کی نظر بڑی دور رس تھی اور وہ فطرتِ انسانی کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے رحمن محبت کے رشتہ کو کبھی قطع نہ کرو کیونکہ ٹوٹنے کے بعد اس کا جوڑنا مشکل ہے۔ بفرضِ محال اگر جڑ بھی جائے تو وہ بات باقی نہیں رہتی اور درمیان میں گرہ پڑ جاتی ہے۔ یہی خیال ہم کو ایک فارسی شاعر کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ مگر ایک دوسرے انداز میں وہ کہتا ہے ؎

پیوند دوستداری ازاں پارہ می کنم　　　　تا باز بندم و بتو نزدیک تر شوم

اس میں شک نہیں کہ خیال نہایت نادر اور پاکیزہ ہے لیکن میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ خانخاناں کا دوہا کہیں بہتر ہے جن لوگوں کو دوستی اور محبت کے متعلق ذاتی تجربات ہیں وہ ان دونوں شعروں کی ماہیت سے خوب واقف ہیں۔ ورنہ مستثنیات تو ہر چیز میں پائے جاتے ہیں۔

اسی خیال سے ملتا جلتا خیال ایک اور ہندی دوہے میں بھی نظر آتا ہے مگر ایک دوسرے انداز میں

من موتی دودھ رس سب کے یہی سبھاؤ　　　پھاٹے سے پھر نا ملیں سب کے یہی اپاؤ

یعنی دل، موتی، دودھ اور رس سب کی یکساں حالت ہے جس طرح ایک مرتبہ موتی ٹوٹ کر یا دودھ اور رس پھٹ کر نہیں ملتے اسی طرح محبت بھی ٹوٹ کر دوبارہ قائم نہیں ہوتی۔

سہجو نامی ایک ہندی شاعرہ کا کلام پند و موعظت اور اخلاقی نصائح سے بھرا ہے وہ اپنے ایک دوہے میں کہتی ہے۔

سہجو جگ میں یوں رہے جیسے جیھیا مکھ مانہہ　　　گھیو گھنا بھکش کریں تو بھی چکنی نانہہ

اے سہجو دنیا میں اس طرح رہو جس طرح منہ میں زبان رہتی ہے جو اگرچہ چکنا گھی کھاتی ہے لیکن آلودہ اور ملوث نہیں ہوتی

اردو کے ایک شاعر نے بھی اس خیال کو خوب ادا کیا ہے۔

آدمی کو چاہئے دنیا میں رہنا اس طرح　　　جس طرح تالاب کے پانی میں رہتا ہے کنول

جل سوکھے پنچھی اڑیں اورے سرن سمائیں　　　دیں میں بن پونچھ کی کہو رحیم کینھے جائیں

خانخاناں کہتے ہیں کہ اے رحیم گرمی سے تالاب کا پانی خشک ہو جاتا ہے تو چڑیاں اس تالاب کو چھوڑ کر دوسرے تالاب میں چلی جاتی ہیں لیکن مچھلیاں جن کا تالاب سے چولی دامن کا ساتھ ہے کہاں جائیں ان کے لئے تو کہیں جانے کا راستہ نہیں یہ تو پانی کے ساتھ اتنے عرصے تک رہیں اور اسی کے ساتھ اپنی جان بھی قربان کردیں گی۔

جو تو آیا جگت میں جگت ہنسے تو روئے　　　ایسی کرنی کر چلو پاچھے ہنسی نہ ہوئے

سبحان اللہ کس قدر بلند خیالی ہے پند و موعظت کے دفتر بھرے ہوئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تم دنیا میں آئے ہو تو تم کو چاہئے کہ اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لیتے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے بعد لوگ تمہارا ذکر برے الفاظ میں کریں اور تمہارا مذاق اڑائیں۔ اس دوہے کے دوسرے مصرع کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ذوق مرحوم نے بھی خوب کہا ہے

نام منظور ہے توفیض کے اسباب بنا   پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

دنیا میں نا اہلوں کی قدر ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ قابل اور لائق لوگ خستہ حال اور پریشان پھرا کرتے ہیں چنانچہ عرفی کہتا ہے۔

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار   نیافتم کہ فروشیم بخت در بازار

ایک ہندی شاعر بھی اسی خیال کو دوہے میں ادا کرتا ہے اور تمثیل کے ذریعے خیال کو مکمل اور مسلم الثبوت بنا دیتا ہے:

سانچے کوئی نہ پوچھے جھوٹے جگ بہیائے   گلی گلی گورس پھرے مدیرا بیٹھ بکائے

کہتا ہے کہ سچے کی عزت نہیں اور جھوٹ کی قدر ہے۔ لوگوں میں کھرا اور کھوٹا سمجھنے کی تمیز نہیں دیکھو دودھ ایسی اچھی چیز کو بازار میں لئے لئے پھرتے ہیں اور شراب دکان پر رکھ کر فروخت کی جاتی ہے۔

جو برتے جیسی ریت اُس سو ویسی برتے   سادھ سنت سے پریت کپٹی سے کرے کپٹ

سیدھی سادھی اور فطری تعلیم یہی ہے کہ جو جیسا کرے اُس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے چنانچہ سعدی کہتے ہیں۔

نکوئی بابداں کردن چنان ست   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اس تعلیم کے صحیح ہونے سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن عفو اور درگذر بھی کوئی چیز ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بعض جگہ عفو اور نرمی وہ کام دے جاتی ہے جو جبر و ظلم سے نہیں ہوتا انسان کو موقع دیکھ کر کام کرنا چاہئے کسی نے خوب کہا ہے

نہ حلوا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے   نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے

انسان کا قاعدہ ہے کہ جس وقت تکلیف ہوتی ہے تو دعائیں بھی مانگتا ہے اور عبادت بھی کرتا ہے مگر ایسی دعاؤں اور عبادتوں میں خلوص بہت کم ہوتا ہے اور بقول شاعر ع

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

کا معاملہ ہوتا ہے۔ اسی معمول کو دیکھ کر شاعر ایک پتے کی بات کہتا ہے۔

دکھ میں سمرن سب کریں سکھ میں کرے نہ کوئے   سکھ میں جو سمرن کریں دکھ کاہے کو ہوئے

وہ کہتا ہے کہ جب دکھ پڑتا ہے تو سب لوگ عبادت کرتے ہیں لیکن جب عیش و آرام حاصل ہوتا ہے تو کوئی خدا کا نام نہیں لیتا اگر یہ لوگ سکھ میں عبادت کریں تو دکھ اُن کے پاس ہی نہ آئے اور نہ انہیں دکھ کی حالت میں عبادت کرنے کی ضرورت پڑے۔

ہر کہ فریاد رسِ روزِ مصیبت خواہد   گو در ایامِ سلامت بجوانمردی کوش

(سعدی)

مشکل سے کوئی ہندی دان ہوگا جس نے سوامی تلسی داس جی کا کلام نہ پڑھا ہو۔ آپ کی تعلیم سراپا موعظت و اخلاق پر مبنی ہے وہ ہندوستان کے سعدی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تلسی آہ گریب کی کبھوں نہ کھالی جائے   مرے چام کی سانس سے سار بھسم ہو جائے

اے تلسی غریب کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی۔ دیکھو چمڑے کی دھونکنی سے جس وقت آہ (سانس) نکلتی ہے اُس سے لوہے ایسی چیز بھی جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ کسی فارسی شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور مقبول بھی مگر حقیقت یہ ہے کہ تلسی نے تمثیل کے ذریعہ چار چاند لگا دئیے۔ فارسی شاعر کہتا ہے

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن   اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

تلسی یہ سنسار میں رہئے سبھی ملائے   ملیں سینگھ ملائے نہیں انمل مارے گائے

شاعر خود کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے تلسی اس دنیا میں جتنے کام ہیں سب میل ملاپ اتفاق اور یک جہتی پر موقوف ہیں۔ اگر شیر کے ساتھ جو درندہ ہے مل جل کر رہو تو وہ نقصان نہیں پہنچاتا لیکن اگر اس گائے کے سامنے جاؤ جس نے تمہیں پہلے نہیں دیکھا یا جو تم سے مانوس نہیں تو اگرچہ وہ نہایت شریف جانور ہے پھر بھی تمہیں مارنے پر تیار ہو جائے گی۔

امی پیاوے مان بن موے نہ سو ہائے   مان سہت مرنو بھلو برس سے بولائے

شریف کے لئے ایک لفظ بہت ہے اور رذیل کے لئے ہزاروں گالیاں بھی کچھ نہیں شریف کو ہمیشہ اپنی عزت کا خیال رہتا ہے اور وہ اپنی عزت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی چیز کی حقیقت نہیں سمجھتا اس لئے وہ آبحیات کے ایسے پیالہ کو قبول نہیں کر سکتا جو عزت دے کر حاصل کیا جائے یہی نہیں بلکہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس خیال کو سعدی نے بھی نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

حقا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است   رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

اس سلسلہ میں مومن، تسلیم، اقبال اور نشتر جالندھری کے یہ شعر بھی قابلِ لحاظ ہیں۔

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے؟

مومن

مرا از شکستن چنیں عار ناید کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اقبال

منت ولا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے مرجائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے

نسیم لکھنوی

آزادیٔ دوام کی خاطر بھی اے اسیر صیاد کی خوشامد بے جا نہ چاہئے

نشتر جالندھری

تلسی بروا باگ کے سینچت بھی کملائیں رام بھروسے جو رہیں پربت پر ہریائیں

شاعر خدا پر بھروسا کرنے کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کس قدر لطیف پیرائے میں کہتا ہے کہ اے تلسی خدا پر بھروسا رکھنا چاہئے دیکھو باغ میں درخت پانی دینے پر بھی خشک ہو جاتے ہیں لیکن پہاڑوں پر جہاں کوئی پانی دینے والا نہیں درخت ہرے بھرے سرسبز و شاداب رہتے ہیں پس خدا پر بھروسا رکھو جو مسبب الاسباب ہے ضرور کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرے گا۔ اس خیال کو سعدی کے الفاظ میں سنئے۔ دونوں نے مثالیں دے کر خیال کو تقویت دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ذرا مشکل کام ہے۔ سعدی کہتے ہیں:۔

بے مگس ماند نہ ہرگز عنکبوت رزق را روزی رساں پرمی دہد

میرے خیال میں قناعت اور خدا پر اعتماد ضرور اچھا ہے لیکن یہ صرف انہیں لوگوں کے لئے ہے جو بالکل خدا سے واصل ہو جاتے ہیں اور دنیا سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ یہاں تقدیر و تدبیر کا لطیف مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ تدبیر کرے اس کا انجام تقدیر کے حوالہ کردے۔ خاموش بیٹھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کی کل چلنے سے رُک جائے گی۔

امیں ہلاہل مدھ بھرے سیت سیام رتنار جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اک بار

اس شعر کا مطلب لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ حضرت امیر مینائی نے مندرجہ ذیل شعر غالباً اسی سے اثر اندوز ہو کر کہا ہے۔

مارو بھی جلاؤ بھی آساں ہے سب تم کو آنکھوں میں ہلاہل ہے ہونٹوں پہ مسیحائی

ساجن تم مت جانیو تورے بن ہے چین گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

سبحان اللہ کیا بیان ہے اور کیا ندرت خیال ایک مہجورہ اپنے شوہر کو لکھتی ہے کہ اے میرے آقا ایسا نہ سمجھئے کہ میں آپ کی جدائی میں آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ ہائے میرا حال تو اس جدائی میں ایسا ہے جیسے کسی ہرے بھرے جنگل میں آگ لگ گئی ہو اور اس کے سرسبز و شاداب درخت آہستہ آہستہ جل رہے ہوں۔

ساجن جے میں یہ جانتی کہ پیت کئے دکھ ہوے نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت نہ کریو کوئے

اے میرے معشوق اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ عشق کا نتیجہ دکھ اور رنج ہے تو میں ساری دنیا میں ڈھنڈورا پٹواتی کہ کوئی کسی سے محبت نہ کرے۔ اس خیال کو ایک فارسی شاعر نے ایک دوسرے انداز میں ذرا علیحدہ ہو کر اس طرح کہا ہے۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

کوک کروں تو جگ ہنسے او رچپکے لاگے گھاؤ ایسی کٹھن سینہ کا کس بدھ کروں اپاؤ

شاعر کہتا ہے کہ اگر میں یار کے فراق میں آہ و نالہ کرتا ہوں تو دنیا مجھے دیوانہ سمجھ کر ہنستی ہے اور اگر ضبط سے کام لیتا ہوں تو اندر ہی اندر زخم لگتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی سخت مصیبت کا کیا علاج کروں۔ کسی فارسی شاعر کا یہ شعر بھی بے حد مقبول ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد وگر دم درکشم ترسم کہ مغز و استخواں سوزد

مندرجہ بالا دوہے کے سلسلہ میں ایک اور دوہا یاد آگیا جس میں شاعر نے بلند خیالی کی انتہا کر دی ہے ملاحظہ ہو۔

من ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھ جر جائے گونگے کا سپنا بھیو سمجھ سمجھ پچھتائے

سبحان اللہ حق یہ ہے کہ یہ دوہا مندرجہ بالا فارسی شعر اور ہندی دوہے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میں سوزِ فرقت کو دل میں رکھتا ہوں اور زبان پر اس کا ذکر نہیں لاتا تو دل جلتا ہے اور اگر کہتا ہوں تو منہ جل جاتا ہے۔ میرے فراق کا فسانہ تو ایسا ہے جیسے گونگے کا خواب کیونکہ وہ قوتِ بیانیہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے بار بار پچھتاتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا ہی کیوں۔

حقیقی دوست کا ملنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اور خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ہر شخص اپنے مادّی فائدے کا خیال رکھتا ہے اور بغیر اغراض کی وابستگی کے نہیں ملتا چنانچہ ایک شاعر جس کو ایسے تلخ تجربات ہو چکے ہیں کہتا ہے

ہوتی ہے ہر ایک کو منہ دیکھے کی پیت وقت پڑے تو جانیے کو بیری کو میت

دوست دشمن کا فرق اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب کوئی افتاد پڑ جاتی ہے ورنہ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ میں جان و دل سے آپ کے لئے حاضر ہوں اور آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار۔ مگر حقیقی دوست وہی ہے جو مصیبت کے وقت کام آئے چنانچہ سعدی کہتے ہیں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست در پریشاں حالی و درماندگی

روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی دیکھ پرائی چوپڑی مت للچاوے جی

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے نفس قناعت پیشہ بن۔ جو کچھ روکھی سوکھی روٹی خدا نے دی ہے صبر و شکر سے کھا۔ ٹھنڈا پانی پی کر خدا کا شکر ادا کر اور دوسروں کے مال پر لالچ کی نظر نہ ڈال۔

رحمن رہیو واں بھلو جب تک سیل سموچ سیل ڈھیل جب دیکھیے ترت کیجیے کوچ

شاعر انسان اور اُس کی سوسائٹی کا مطالعہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اے رحیم کسی مقام پر رہنا اس وقت تک مناسب ہے جب تک میزبان کے برتاؤ میں کمی نہ محسوس ہو لیکن جیسے ہی تم کو معلوم ہو کہ میزبان کے برتاؤ میں کمی پیدا ہوئی ہے یا اُس کو تمہارا رہنا تکلیف یا ناگواری کا باعث ہو رہا ہے فوراً اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ تلاش کرو کیونکہ خود دار ایسی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔

جے گریب پر ہت کریں تے رحیم بڑ لوگ کہاں سداما باپرو کہاں کرشن متائی جوگ

اے رحیم جو لوگ غریبوں کے ساتھ بھلائی کریں وہی لوگ بڑے ہیں۔ دیکھو سداما کرشن جی کی دوستی کے لائق نہ تھا لیکن کرشن جی نے اُس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔

تواضع اور خوش خلقی کے متعلق سعدی کا یہ شعر بھی مشہور ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست گدا گر تواضع کند خوئے اوست

رحمن مورسماد ھ اب مت بلیچھ میں ہوے پگ واکو پر تو رہے رہوں پر سم سے ہوے

شاعر کہتا ہے کہ اے رحیم میری قبر میرے معشوق کے راستے پر بنائی جائے تاکہ اکثر اُس کا پاؤں پڑتا ہے اور مجھے آرام اور چین

کی نیند حاصل ہو۔

آگ برہ کی تن لگی جرن لگے سب گات ۔۔۔۔۔ ناری چھووت بید کے پڑے پھپھولے ہات

سوزِ فرقت نے یہاں تک جلایا کہ زخموں کے دہانوں سے آگ نکلنے لگی بیچارہ حکیم میرا کیا علاج کرے گا اُس نے میری نبض پر مرض کی تشخیص کے لئے ہاتھ رکھا تو پھپھولے پڑ گئے

آجا پیارے نین ماں پلک ڈھانپ تجھے لوں ۔۔۔۔۔ نا میں دیکھوں اور کو نہ تو ہے دیکھے دوں

رقیب ہمیشہ مورد الزام اور شعرا کے نزدیک مردود رہا۔ رقابت کی آگ بھی سوزِ فرقت سے کم نہیں ہوتی چنانچہ ایک عاشق اپنے معشوق سے کس محبت اور الفت سے کہتا ہے کہ اے میرے پیارے آ میں تجھے اپنی آنکھوں کے اندر رکھ لوں تاکہ نہ میں کسی اور کو دیکھوں اور نہ کوئی تجھے دیکھ سکے۔ بھاشا کے شاعر نے معشوق سے یہ التجا کی لیکن آزاد کشمیری رقابت کے معاملہ میں اُس سے بھی بڑھ گئے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

نمی خواہم کہ در چشمم نشینی ۔۔۔۔۔ کہ آنجا ہم میانِ مردماں ہست

عبدالکریم شالو کے ہاں بھی یہ خیال اس طرح ادا ہوا ہے

ترا در دیدہ جا دادم کہ در چشمم نہاں باشی ۔۔۔۔۔ ندانستم کہ آنجا ہم میانِ مردماں باشی

بھیکا بات اگم کی کہبو سنن میں ناہ ۔۔۔۔۔ جو جانے سو نا کہے ۔ کہے سو جانے ناں

اے بھیکا آئندہ دنیا یا خدا کے متعلق کبھی علم حاصل نہ ہوا جو لوگ واقف ہیں (یا دوسری دنیا میں جا چکے ہیں) وہ ہمارے پاس آ کر کہہ نہیں سکتے اور جو ناواقف ہیں وہ مختلف باتیں کہتے ہیں لیکن اُن کی بات کا کیا اعتبار جب کہ وہ خود ناواقف ہیں ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ میر درد ؎

درد معلوم ہے کچھ پاس سے اپنے شب و روز ۔۔۔۔۔ لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

ہم تم سوامی ایک ہیں کہن سنن کو دوے ۔۔۔۔۔ من کو من سے تولئے دو من کبھو نہ ہوے

ایک عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ اے میرے آقا۔ اے میرے سرتاج ہم تم حقیقت میں ایک ہی ہیں گو کہنے کو دو معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر من کو من سے تولا جائے تو کبھی دو من نہ ہوگا۔

لفظ "من" (دل اور وزن) کا لطف صاحبانِ ذوق ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ دوہا اس طرح بھی سننے میں آیا ہے

ساجن ہم تم ایک ہیں کہن سنن کو دو   من کو من سے تول لے دو من کبھو نہ ہو

اس سلسلے میں ایک فارسی شعر بھی بہت مشہور ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی   تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

سرمہ دوں تو کرکرائے کاجل دیا نہ جائے   جن نینن ماں پیو بسے دوجا کون سمائے

سچ ہے پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔ شاعر ایک عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو کہتی ہے کہ میں اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہوں تو کرکراتا ہے اور کاجل کے لئے جگہ نہیں ملتی اس کا سبب فقط یہ ہے کہ ان آنکھوں میں تو "پی" یعنی معشوق بسا ہے پھر بھلا کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی دوسری چیز اُس کی جگہ حاصل کرے۔

میرزا کامران ابن شہنشاہ بابر کا یہ شعر بھی اس دوہے سے ٹکراتا ہے

طوطیٔ دل را بجز از نقش تو   ہیچ در آئینۂ ادراک نیست

کبیر آپ ٹھگائیے اور نہ ٹھگئے کو ے   آپ ٹھگے سکھ اوپجے اور ٹھگے دکھ ہوے

کبیر جی کی روحانی کرامات کا ایک زمانہ قائل ہے آپ کی تعلیم پند و موعظت کا گنجینہ ہے۔ چنانچہ اس مقام پر وہ ایک واقعہ کو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے کبیر انسان کا قاعدہ ہے کہ خود تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ دوسروں کو ٹھگ لے یا نقصان پہنچائے لیکن جب کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے تو اسے ناگوار ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے بلکہ ع ہرچہ برخود مپسندی بہ دیگراں ہم مپسند، پر عمل ہونا چاہئے

ایک عفت شعار خاتون جو اپنے شوہر سے جدا ہے اپنے پتی کو خط لکھنے بیٹھتی ہے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے، اور ہاتھ کانپنے لگتا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ہاتھ تو لکھنے سے بے کار ہو ہی چکے تھے، آنکھیں دیکھنے سے معذور ہو گئیں لہذا خط لکھنا ناممکن۔ مجبور ہو کر وہ کوّے (نامہ بر) سے کہتی ہے "اے میرے پیارے نامہ بر تو یہ سادہ کاغذ ہی لے جا کر دے دینا اور میرے پتی سے سارا حال زبانی کہنا کیونکہ میں خط لکھنے کے قابل ہی نہیں رہی" سبحان اللہ کس قدر لطیف دوہا ہے۔

کر کانپت پتیاں لکھت جل بھر آوت نین   کورو کاگج ہاتھ دے کہہ ہی کہیو بین

مومن مرحوم نے بھی اس خیال میں ایک اچھا شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں　　　لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

سونا لینے پی گئے سونا کر گئے دیس　　　سونا ملا نہ پی ملے روپا ہو گئے کیس

سبحان اللہ شعر سادہ ہے لفظی صنعت بھی ہے اور بلند خیالی بھی موجود ہے۔ ایک فرقت زدہ عورت اپنے شوہر کی یاد میں کہتی ہے کہ میرا معشوق دولت کمانے باہر گیا جس سے دیس سُونا (ویران) ہو گیا۔ ہائے اب تک نہ تو سونا (دولت) حاصل ہوا۔ اور نہ وہ ہی واپس آئے حالانکہ اسی امید میں میری لٹیں چاندی کی طرح سفید ہو گئیں۔

سانچے کو سانچا ملے ادھک بڑھے نیھ　　　جھوٹے کو سانچا ملے تڑ دے ٹوٹے نیھ

شاعر کہتا ہے کہ سچے آدمی سچوں کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں اُن کے ملنے جلنے سے محبت زیادہ ہوتی ہے لیکن اگر جھوٹے اور سچے کا ساتھ ہوتا ہے تو دونوں مل جل کر نہیں رہ سکتے اور رشتہ موافقت فوراً منقطع ہو جاتا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دو سچوں کی طرح دو جھوٹے ملیں تو کیا دوستی قائم رہ سکتی ہے؟

میں چاہوں اُڑ جاؤں پر بن اڑا نہ جائے　　　کا کھوں کرتار کو جو پر نا دیا لگائے

شاعر اپنے معشوق کی یاد میں محو ہو کر اس کے پاس پہنچنے کی تدبیریں سوچتا ہے لیکن اس کے پاس جانے کا کوئی وسیلہ نہیں لہذا وہ کہتا ہے کہ افسوس خدا نے مجھے پر نہیں دیئے۔ ورنہ میں اڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتا اور اس سے ملاقات کرتا۔

سیکھ نہ دیجئے با کو جا کو سیکھ سہائے　　　سیکھ نہ دیجے باندرا کہ گھر بئے کا جائے

اس دوہے میں شاعر نصیحت آمیز پیرائے میں کہتا ہے کہ نصیحت ایسے لوگوں کو کرنی چاہئے جو نصیحت قبول کریں۔ ایسے لوگوں کو نصیحت کرنے سے الٹا نقصان ہوتا ہے جو نصیحت کو قبول نہیں کرتے۔

اس دوہے سے ایک قصہ کا تعلق ہے کہ ایک مرتبہ جاڑے کی رات میں ایک بندر کو سردی کھاتے دیکھ کر ایک بئے نے اُس سے کہا کہ خدا نے تم کو انسان کی طرح ہاتھ پیر دیئے ہیں پھر کیوں نہیں تم اپنے لئے گھر بنا لیتے تاکہ آرام سے رہو۔ بندر سردی سے پہلے ہی جھلایا ہوا تھا اُس نے جھنجھلا کر بئے کا گھونسلا نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا۔

ارے پپیہے کلسڑے دیت کٹے پر لوں   پیا مرا ہیں پیا کی تو پی کہے سو کون

جوشِ رقابت میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ رقیب سے عداوت رکھنا اور اسے برُا بھلا کہنا مشرقی شعرا کا شیوہ ہے۔ چنانچہ اس دوہے میں ایک عورت پپیہے کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ ارے کمبخت پپیہے تو "پی۔ پی" کیوں پکار پکار کر میرے زخمہائے دل پر نمک پاشی کر رہا ہے پیا تو میرا ہے پھر تجھ کو کیا حق حاصل ہے جو پی کو پکارے۔

سمے سمے سندر سبے روپ کروپ نہ کئے   من کی رُوچی جتّی جتے نت تتّی روچی ہوے

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بد صورت نہیں موقع موقع سے ہر چیز اچھّی معلوم ہوتی ہے لہذا جس وقت دل کو جو چیز اچھی معلوم ہو وہی چیز اچھی ہے۔

یہ امرِ واقع ہے کہ بعض اوقات بہتر سے بہتر چیز بُری معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات بدترین اشیا میں بھی حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شیخ سعدی نے اسی لئے بادشاہوں کی طینت کے متعلق کہا ہے

"گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند"

تلسی سانچے سجن کو کاکر سکے کشنگ   بہا بِش لاگے ناہیں لپٹے رہیں بھجنگ

اے تلسی سچّے اور شریف آدمی کو جھوٹے اور ذلیل سے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ صندل کے درخت سے سانپ لپٹے رہتے ہیں لیکن اس پر زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اسی خیال سے ملتا جلتا ایک فارسی شعر بھی ہے

سفلہ گر بالا نشیند خفتِ اشراف نیست   کف بود بالائے دریا زیرِ دریا گوہر است

اس موقع پر مجھے ایک اور دوہا یاد آگیا جو غالباً تلسی داس ہی کا ہے۔

ہوت بھلے کے سُت برو بھلو برے کے ہوے   دیپک سے کاجل پرگھٹ کنول کیچ تے ہوئے

کہتے ہیں کہ اچھوں کے ہاں بُرے اور بروں کے ہاں اچھے پیدا ہوتے ہیں دیکھو شمع سے تو سیاہی نکلتی ہے اور کیچڑ سے کنول پیدا ہوتا ہے۔

اس شعر کا مطلب اردو کی ایک ضرب المثل "دلی کے گھر میں شیطان" سے ادا ہوتا ہے۔

میں ہیں کرے جو بکری گئے چھری پھروائے   مینا "جو ہُیں نا" کہے سب کے من کو بھائے

بکری جوانانیت کا دم بھرتی ہے اور "میں میں" کرتی ہے ذبح کی جاتی ہے لیکن مینا جو "میں نہیں ہیں نہیں" کہتی اور اپنے فانی ہونے کا اقرار کرتی ہے سب کو عزیز ہوتی ہے۔

من چاہے دلدار کو اور تن چاہے آرام ۔۔۔ دبدا میں دونوں گئے نہ مایا ملی نہ رام

انسان آرام کا خواہاں ہے اور نہیں چاہتا کہ تکلیف اور پریشانی میں گرفتار ہو۔

دل معشوق کو چاہتا ہے مگر جسم آرام کا خواہشمند ہے لیکن

وصالِ کعبہ میسّر نمی شود سعدی ۔۔۔ مگر کہ راہِ بیابان پرخطر گیرند

چندن پر دو چمار کیں نت اُٹھ جیرت چام ۔۔۔ کہو چندن کیسی بھئی پرو نیچ سے کام

شریف آدمی کو کسی وقت اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ذلیل اور کم مرتبہ آدمیوں سے سابقہ پڑنے پر ہوتی ہے۔ شاعر نہایت سوختہ دلی سے کہتا ہے کہ صندل کا ایک تختہ چمار کو مل گیا وہ اس کی حقیقت اور اوصاف سے ناواقف ہے لہذا اس پر چمڑا رکھ کر کاٹتا ہے۔ اب کوئی صندل سے پوچھے کہ ذلیل سے سابقہ پڑنے پر کیسی گذرتی ہے۔ اُس وقت تو اُسے بہت فخر و غرور تھا جب پیشانی پر لگایا جاتا تھا۔

اس شعر کا مطلب ان شریف لوگوں سے پوچھیے جن کو کسی ذلیل اور کم درجہ حاکم سے سابقہ پڑتا ہے۔

نیہہ سگا سوی سگا ہاڑ سگا نہیں کوے ۔۔۔ ماں بیٹھی تریا جرے اچرج جگ کو ہوئے

شاعر کہتا ہے کہ لوگ اعزہ و اقربا کو سگا کہتے ہیں لیکن سگا وہی ہے جس سے محبت ہو دیکھو بیٹے کے مرنے پر، ماں تو بیٹھی رہی ہے لیکن بیوی (جو غیر ہوتی ہے) ستی ہو کر قربان ہو جاتی ہے (میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا اس پر تعجب کیوں کرتی ہے)

میرے خیال میں شاعر کا خیال زیادہ واقعیت پر مبنی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیوی اپنے شوہر کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہو جاتی ہے لیکن ماں بیچاری تو کہیں کی نہیں رہتی۔ بچوں کی جدائی اسے کڑھا کڑھا کر مار ڈالتی ہے اور اس طرح گھل گھل کر مرنا اس مرنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے جو جل کر مرنے سے ہوتا ہے۔ ورنہ مستثنیات تو ہر شے میں موجود ہیں۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین پڑینگے روئے — بدنا ایسی رین کر کہ بھور کبھو نہ ہوئے

ایک عورت جس کا شوہر صبح کو سدھارنے والا ہے اکیلی بیٹھی سوچ رہی ہے کہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ بس آج میرا آقا صبح چلا جائے گا اور میں آنسو بہاتی رہ جاؤں گی چونکہ اس کے بس میں نہیں کہ شوہر کو جانے سے روکے لہذا خدا کی طرف رجوع کر کے کہتی ہے کہ خدایا اس رات کو اتنا طویل کر دے کہ اس کی صبح ہی نہ ہو

کاگا سب تن کھائیو اور چن چن کھیو ماس — پر یہ دو نین نہ کھیو ان پیا ملن کی آس

ایک عاشقِ صادق اپنے معشوق کی یاد میں گھر بار بلکہ ساری دنیا تج کر بیٹھا ہے تکلیف اور رنج سے حالت خراب ہے، مردوں کی طرح نڈھال پڑا ہے مگر آنکھیں کھلی ہیں کہ شاید اب بھی وہ نظر آجائے جس کے لئے یہ حال کیا۔ اتفاقاً اُسے مردہ سمجھ کر ایک کوّا قریب آکر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ اسے دیکھ کر کہتا ہے کہ اے کوّے آ اور شوق سے اپنا پیٹ بھر، میرا تمام جسم تیرے لئے حاضر ہے مگر ان دونوں "منتظر" آنکھوں کو چھوڑ دینا کیونکہ مجھے اب بھی امید ہے کہ شاید میرا معشوق آجائے اور یہ اُس کے دیدار سے کامیاب ہوں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور دوہا بھی مشہور ہے جو اول الذکر کی آواز بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

کاگا نین نکاس دوں پیا پاس لے جائے — پہلے سیس دکھائے کے پاچھے لینو کھائے

ایک حسرت نصیب مہجور، سوختۂ فراق عاشق اپنے نامہ بر کوے سے کہتی ہے کہ اے کوّے میں کوئی خط پتر نہیں بھیجنا چاہتی۔ یے میری آنکھیں حاضر ہیں انہیں اس کے پاس لے جا پہلے ان کو درشن کرانا اس کے بعد یہ تیرا حصہ ہیں انہیں کھا جانا۔ میرا کیا بغیر اُس کے زندگی بے کار ہے۔ یہ میرے کس کام کی

لکڑی جر کوئلہ بھئی اور کوئلہ جر بھئے راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

افسوس لکڑی جل کر کوئلہ اور کوئلہ جل کر راکھ بن جاتا ہے مگر میں کمبخت سوزِ فرقت میں اس طرح جلی ہوں کہ نہ تو کوئلہ ہی کہلانے کی مستحق ہوں اور نہ کوئی مجھے راکھ کہہ سکتا ہے۔

رحمن چپ ہو بیٹھئے دیکھ دنن کو پھیر — جب نیکے دن آئیں گے بنت نہ لگیئے دیر

اے رحیم سب کچھ کوشش کر چکے اب اپنا معاملہ خدا کے ہاتھ چھوڑ دو اور وقت کا انتظار کرو جب اچھے دن آئیں گے تو بگڑے کام آپ ہی آپ بن جائیں گے۔

رحمن وے نر مر چکے جے کہوں منگن جائیں
اُنتے پہلے وے مرے جن مکھ نکست نائیں

اے رحمٰن وہ لوگ زندہ نہیں حقیقت میں مردہ ہیں جو دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں لیکن اُن سے پہلے وہ لوگ مر چکے جن کے منہ سے سوال پر "نہیں" کا لفظ نکلتا ہے۔ دوسرا مصرع خانخاناں کی سخاوت کا گواہ ہے کیونکہ وہ نہایت سخی اور غربا پرور تھے۔

محمد عبدالوہاب مُسلم

غزل

ہر قدم پر احتمالِ جلوۂ منزل ہوا
بار ہا راہِ طلب میں امتحانِ دل ہوا

دوست ہی سر شئے نظر آنی تلاشِ دوست میں
انتہا ہے سنگریزوں پر گمانِ دل ہوا

آہ کرنا بھی رہِ تسلیم میں اک جرم ہے
اُف نہ کرنا بھی طریقِ صبر میں داخل ہوا

آنکھ کھولی تھی کہ پہلو میں تڑپ پیدا ہوئی
یہ نہیں معلوم کیونکر امتیازِ دل ہوا

دیکھ سکتا ہی نہیں کوئی جمالِ بے حجاب
اب ترا پہچاننا تو اور بھی مشکل ہوا

مانعِ خود رفتگی ہے لذتِ راہِ شہود
آپ سے اب تو گذرنا بھی مجھے مشکل ہوا

مل گیا جو اپنے دریا سے وہ قطرہ پھر کہاں
جو خیالِ درد آیا دل میں جزوِ دل ہوا

آدمی کے آدمی ہونے کی گویا دیر ہے
اِس طرف کامل ہوا اور اُس طرف واصل ہوا

گویا جہان آبادی

قلعۂ لاہور

قلعۂ لاہور! تیری شان و شوکت اب کہاں! ہر کسی کے دل میں جو تیری تھی عزت اب کہاں!

تھا ترا ہر کنگرہ پنجاب کا فرماں روا جس پہ تو نازاں تھا تیری وہ فضیلت اب کہاں!

کیا ہوا وہ عہدِ زرّیں، کیا ہوا مغلوں کا دَور جس سے دنیا کانپ جاتی تھی وہ سطوت اب کہاں!

حیف صد حیف! اے گزشتہ عظمتوں کی یادگار

جس کا دکھڑا رو رہا ہے تُو وہ عظمت اب کہاں!

دیکھنے آئے تجھے، دیکھا تو کیا؟ کچھ بھی نہیں تجھ سے حاصل حسرت و غم کے سوا کچھ بھی نہیں

تیری ناداری ٹپکتی ہے در و دیوار سے ہر طرف سے آرہی ہے اک صدا "کچھ بھی نہیں"

کل نمایاں تھی جہاں چغتائیوں کی کرّ و فر اب وہاں کچھ سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں

آج ہے سر پر ترے بربادیٔ فردا سوار

اور نشاں ہنگامۂ دیروز کا کچھ بھی نہیں

ممتاز حسن

گوّلی موّلی اُردو

دہلوی اردو، لکھنوی اردو، گلابی اردو، رنگین اردو (یعنی ٹیگور کے اردو عشاق کی زبان مثلاً یوں کہ جب کبھی میں تیرے ہیمیں چہرے کو دیکھ پاتا ہوں تو میری آنکھیں زریں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں) سنگین اردو (وہ "لرزہ بر اندام خیز" زبان جس میں ایک ایک لفظ ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ کا ہوتا ہے) اور اور ایسی ہی کئی مشہور و معروف اردوؤں کا ذکر تو آپ نے سنا ہی ہوگا لیکن آج ایک اور اردو آپ کے انفرادی و ملکی فائدے کے لئے اپنے چہرے پر سے گمنامی کا نقاب اُٹھانے کو ہے اور وہ ہے زندہ دلانِ پنجاب کی "گوّلی موّلی" اُردو!

"وہ تو (مصوّرِ غم کی طرح) خدا بھلا کرے "پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی" کا جس کی خالص اہلِ زبان کی تیار کی ہوئی کتابیں ہم نے پہلی دوسری تیسری جماعتوں میں پڑھیں، ان کتابوں کے لفظوں سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ملاقات کی۔ اُن لفظوں کے معانی کو بڑی مستعدی کے ساتھ رٹا۔ وہ "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے" اور "باپ بیٹھا حقّہ پی رہا ہے" اور "مولوی صاحب کا گھوڑا" اور "پنڈت جی کی بھلی" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" اور "میری پیاری اماں میری جان اماں" والی کتابیں اور وہ ساتویں آٹھویں جماعت والے "کورس" جن کے ذریعے سے ٹریننگ کالج کے "پیپل ٹیچروں" نے ہمیں اپنا تختۂ مشق بنایا۔ وہ جن میں مولوی ذکاءاللہ اور سرسیّد احمد خاں کے ناصحانہ مضامین کی گولہ باریاں تھیں مگر انصاف یہ ہے کہ انہیں میں تھیں ذوق و غالب کے سہرے کی وہ گل افشانیاں بھی جن میں ہم نے ہمیشہ "استادِ شہ" کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ابھی تھوڑی مدت ہوئی کہ مرزا غالب کے سہرے کے مقابل میں ہم نے بھی ایک جوتا تصنیف کیا جس کی ایک ضرب ملاحظہ ہو۔ سات دریاؤں والے شعر کا جواب دیا ہے

سات بھینسوں کے فراہم کئے ہونگے چمڑے ۔۔۔ تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر جوتا

اور مقطع عرض کیا ہے کہ:۔

جن کو دعوے ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو ۔۔۔ دیکھو اس طرح سے کھلتے ہیں سخنور جوتا

ان کتابوں کے علاوہ اردو قواعد کے اسم ضمیر اور اسم فاعل اور صفت مشبہ اور حروفِ مغیرہ اور مفعول لہو (لہٗ) بہو (بہٖ) مہو (معہٗ) منو (منہٗ)، لمبا سمبا فالتو (مالم یسم فاعلہ) سے ایک طرح کی نہل اور عقل مار دینے والی واقفیت بھی حاصل کی۔ غرض ان سب بری بھلی چیزوں سے اصلی اردو میں کچھ شُدبُد ہوئی امتحانوں میں پاس ہوتے، ماں باپ کو ہماری بُری بھلی رپورٹیں سکول سے

آئیں + پھر جب کتابی اور علمی اور سکولی اور کالجی اور امتحانی رکاوٹوں کو پھاند کر کچھ دم لیا تو کچھ اپنے طور پر شوقیہ، کچھ "ملکی" اخباروں کے روزانہ مطالعہ سے۔ کچھ "قومی لیڈروں کی سالانہ تقریروں سے اور کچھ پُرشور جلسوں میں، کچھ متین مجلسوں میں، کچھ محمڈن ہال کے مشاعروں میں اور کبھی کبھی کسی اردو زبان والے "ہندوستانی" سے مل ملا کر غرض ہزار جتنوں سے کچھ یہاں کچھ وہاں کچھ اِس سے کچھ اُس سے کبھی یوں کبھی دوں اردو زبان سیکھی سیکھ رہے ہیں اور جب تک دم میں دم ہے سیکھتے رہیں گے اور اپنی اولاد کو بھی یہی وصیت کریں گے کہ یا معشرِ پنجاب اس اردو زبان کے سیکھنے میں اپنے کام کا وقت تو نہیں مگر اپنی بیکاری کے تمام اوقات تم ضرور صرف کردینا کہ اسی سے ہماری تمہاری قوم کے لئے دنیا میں کامیابی اور اسی سے ہماری تمہاری "وطن" کیلئے آخرت میں سرخروئی ہے۔ آخر کیا کریں؟ اہلِ زبان تو اپنی زبان کو اپنے محاوروں سمیت منہ میں بند کئے بیٹھے ہیں۔ اب یہ ہم اکھڑ پنجابی "بیلوں" کا کام ہے کہ اردو کی کھیتی میں اپنا دقیانوسی ہل چلائیں اور اس میں صاف گوئی کے بیج بوئیں اور اپنی نیم علمیت کے پانی سے اُسے سیراب و فیضیاب کریں!

یہ سب کچھ کیا، نیک نیتی سے کیا، کر رہے ہیں۔ طوعاً و کرہاً کریں گے بےشک کریں گے، قوم کی خاطر جس کی خاطر کہو کرینگے بصد، بے سوچے سمجھے اور اُس محبت سے مجبور ہو کر جو اب ہمیں اس لال قلعے کی پری سے ہوگئی ہے۔ ہاں مجبور ہو کر کریں گے اور جو کچھ اب کرتے ہیں وہی دوزخ کی آگ کی طرح "ہمیشہ ہمیشہ" کریں گے ہاں ضرور! یہ سب کچھ مگر ذرا سُن لو کہ اس زبان کو پڑھا یعنی استادوں کو غلط سلط پڑھتے سُنا اور سیکھا یعنی سیکھنے کی بہترین کوشش کی اور اس کے متعلق ہمارے وہ سارے بلند آہنگ ارادے کبھی ہوئے اور ہیں جو ابھی اس فصاحت سے بیان ہوئے خدا گواہ یہ سب کچھ لیکن پھر بھی وائے قسمت کہ ہم فرقت نصیب پنجابیوں کا "نہ ہوا پر نہ ہوا شاہد اردو سے وصال"

خیر جانے تشویش نہیں، ہم خوش ہیں۔ ہم چپ سادھ لیں گے۔ ہم صبر "مصبر" کریں گے۔ علم کی دنیا نیم جاہلوں پر ہنسا کرے لیکن آج زمانے کا یہ طور ہے کہ بےعمل عالم نہیں بلکہ نیم جاہل عامل ہی ہند کی پرانی بنی ٹھنی عجیب الطرفین دنیا کو اس کے مرگ نما سکون سے بیدار کر کے صحیح زندگی سے روشناس کر سکتے ہیں۔

اور پھر اس شریفانہ اور بہادرانہ برتاؤ کے عوض ان نیم جاہلوں کا حق ہے کہ خود بھی کچھ جی لیں۔ بس اسی لئے "گولی مولی" اردو ایجاد ہوئی۔ نہیں نہیں "ایجاد" نہیں ہوئی، خود بخود در حد نہیں آئی اور اس کے زبانی اور دقیانوسی لیکن ہر دم "تازہ بنانہ نو بنو" فطری حسن آپ اب مجلس کے پردے ڈال جہالت ہونہ ہو کمینہ پن اور پست ہمتی ضرورت!

لفظ "گولی مولی"، "گولی" سے نکلا ہے جلیانوالے ڈاکٹر کی پکی گولی نہیں نہ گھروالی کی بکی گولی نہ وہ رنگدار گولی جس سے کبھی کھیلتے تھے۔ گولی جس کا لام مکسور ہے کسر نفسی کا مارا ٹوٹا ہوا سا نہیں بلکہ گولی جس کا لام مشدد ہے اور مشدد بھی ایسا کہ ایک

پنجابی ہی اس کی تشدید کو ادا کرسکتا اور وہی اُس کے تشدد سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے + پنجابیوں کی قوم اس نوع کے مشدّد لاموں سے ضبطِ نفس اور دلیری سیکھتی ہے اور انہیں لاموں کی شدت سے اُس کی روحانی وجسمانی تقویت کا اظہار ہوتا ہے مثلاً اردو والا کہے گا کسی ٹھہرے ہوئے سے کہے گا "چل بھی (چ ل زبر چل) پنجابی پکارے گا "چلّ وی"، دیکھئے لام کی تشدید میں جسمانی زور وقوت کا کیسا پرزور اظہار ہے، ساتھ ہی بجائے بھی کے وی سے روحانی نرمی ٹپک رہی ہے "چل وی" سبحان اللہ! ذرا انصاف سے روحانی وجسمانی کو الف کی ہم آہنگی ملاحظہ کیجئے۔ اسی طرح ہے "گلّ" بمقابلہ "گال" (بمعنی رخسار) یہ مانا کہ "گال" میں ایک صفائی ہے لیکن "گلّ" والا لوچ وہ بغددپن وہ ملائمت وہ زندگی سے لبریزی کہاں؟ وغیرہ وغیرہ

قصہ کوتاہ لفظ گوّلی موّلی کا منبع ومخرج لفظ گوّلی ہے گوّلی کے لغوی معنی ہیں باندی مجازاً شریر۔ اس کے مقابل میں لفظ ہے "بی بی" یعنی شریف نیک مزاج، دیکھئے بی بی بمعنی شریف گوّلی بمعنی شریر یعنی بی بی تو شریف بن کر بیٹھتی ہے اور گولی شرارت کرتی ہے۔ حق یہ ہے کہ گولی باوجود گولی ہونے کے کبھی فائدے ہی میں رہی اپنی شرارت میں بڑی کھیلے اور بی بی صاحبہ شریف ومتین بن کر جمی بیٹھی رہیں اور اسی لئے ایک ننھی بچّی کو پیار سے کہتے ہیں گوّلی۔

موّلی گوّلی کا مہمل ہے۔ تو گوّلی موّلی کو حیدرآبادی دارالترجمہ والے کہیں گے "باندی واندی"۔ اب انصاف کیجئے کہ کہاں "گوّلی موّلی" کی نزاکت، بےساختہ پن اور وارفتگی اور کہاں "باندی واندی" کا بےتکا پن اور یاوہ گوئی!

اس کے بعد "گوّلی موّلی" کا محلِ استعمال دیکھئے "گوّلیوں" یا "باندیوں" کا استعمال خدا کا شکر ہے اب وہ نہیں رہا جو ہوا کرتا تھا۔ اُس کے ذمہ دار ہمارے بڑے بزرگ تھے اور اُن کی ذمہ داری کو وہ خود سمجھیں اور اُن کا خدا۔ لیکن شکریہ اُن کا کہ اُن کے قابلِ اعتراض "عملوں" سے ہمارے لئے کیسے کیسے خوبصورت اور کارآمد لفظوں کی پیدائش عمل میں آئی! یہاں تھوڑی سی ذاتی تاریخ کا ایک بےتکلف جملۂ معترضہ درمیان میں آئے گا اور قارئین درگذر فرمائیں کیونکہ پنجابیت کے معنی اور کچھ بھی ہوں بےتکلفی ضرور ہیں + معلوم ہوتا ہے استاد ذوق نے ہم کو نہیں بلکہ کسی صاف گو پنجابی دوست نے استاد ذوق کو اس مشہور شعر میں خطاب کیا ہے کہ

اے ذوق! تکلّف میں ہے تکلیف سراسر آرام میں وہ ہیں جو تکلّف نہیں کرتے

کہا جاتا ہے کہ "جو تکلّف نہیں کرتے" کی بجائے یہ الفاظ تھے "جو ہیں پنجاب میں رہتے"۔ ایک قرأت ہے "جو ہیں پنجاب کے ساکن"، لیکن غدر کی دست برد میں کسی وطن پرست حاسد دہلوی نے اصلی الفاظ کاٹ کر وہ الفاظ لکھ دیئے ہیں جواب زبان زدِ خلائق ہیں + خیر ہم پنجابیوں کو اعتراض نہیں اور وہ اس لئے بھی کہ اپنی تاریخ میں پہلی بار پنجابی بعض "ہندوستانیوں" سے جو لاہور میں اپنی روزی کما رہے ہیں تکلف کرنا سیکھ رہے ہیں گو شکر ہے کہ اُن کے "بےزبانی" استاد انگریزی تہذیب کے "امروزقع"

والے عہد میں یہاں وارد ہوئے جب ہر شخص تصنع اور "ترشح" کو چھوڑ کر "صاف گو" اور "بزرگو" اور "فطری" اور "اصلی" ہو رہا ہے سو پنجاب اب اس خطرے سے محفوظ ہے کہ "وہ مکلف" یا خدانخواستہ "مہذب" ہو جائے گا!

ہاں وہ ذاتی جملۂ معترضہ متعلق بہ محلِ استعمالِ الفاظ گوئی ہوتی یہ تھا کہ راقم الحروف نے پہلے مسجد میں پھر پرائمری اور پھر مڈل کی جماعتوں میں اردو پڑھی، چھپ چھپ کر کچھ تک بندی بھی کی چنانچہ اُس کی اوّلیں مساعی سے اُس کے آخری کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دس سال کی عمر ہی میں کہہ دیا کہ ؎

برا ہے پرس آج کل کا زمانہ — نہیں کوئی دیتا کسی کو ہے کھانا

اور مقطع میں تو بس قلم دوات سب توڑ دیئے کہ ؎

رہے گا تاثیر اب تو گر بے نمازی — تو مشکل ہے تیرا جہاں میں سمانا

افسوس ہے اس وقت تشریح کی فرصت نہیں ورنہ ان پنجابی بلند پروازیوں پر محض افادۂ عام کی غرض سے کچھ روشنی ڈالی جاتی۔ ہاں تو راقم الحروف نے پہلے سکول میں اردو پڑھی اس کے بعد پہلے اُردوئے مذکورہ کے ساتھ ساتھ اور پھر اُس سے روگردانی کرتے ہوئے اُس کی بڑی نانی عربی کی طرف توجہ کی، ولایت میں رہ کر کبھی کبھی وہی ذرا سی تک بندی کی، واپس آ کر دو تین ماہ میں قرآن مجید اور گلستان کی مدد سے ساری عربی فارسی کو عبور کر لینا چاہا، اس کے بعد ایک رسالہ اردو میں نکال مارا اور صحیح غلط زبان لکھ کر اور یوں خریداروں پر ستم توڑ کر تھوڑی بہت زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ اور اس ضمن میں بعض عزیزوں بعض دوستوں اور بعض لوگوں کی باتوں سے زبان سیکھنے کی غرض سے کبھی علانیہ اور کبھی خفیہ طور پر استفادہ ہوتا رہا۔ محاورے میں شبہ ہوا تو کبھی اپنے چچیرے بھائی کی نئی دہلوی دلہن سے مشورہ کیا بلکہ کبھی اُن کے ذریعے سے اُن کے لال کنوئیں والی بڑی بوڑھیوں تک سے بھی اور کبھی اپنے ایک عزیز دوست کی "علیگ" بیوی سے پوچھا، اور کبھی اپنے اک مولانا فاضل دوست سے اور کبھی تو اپنے فیض آباد کے رہنے والے ملازم ہی سے غرض ہزار نوع کی ترکیبیں کیں، ذلتیں اُٹھائیں، مصیبتیں جھیلیں اس دہلی لکھنؤ کی جیتی لاڈلی نازک مزاج نازک اندام اردو کے لئے اور اس پر بھی اس سے کچھ ربط پیدا ہو جاتا کچھ بے تکلفی کی باتیں ہو سکتیں تو اک بات بھی تھی، جانتے کہ بہت ناک گھسنی کی ہے لیکن یہ تو سمجھتے کہ خیر یوں دو گھڑی جی تو لٹے اور کچھ جی کی بھڑاس کبھی نکال لی مگر واسطے رے قانونِ فطرت کہ اک تیرے دم سے آخر غیر غیر ہے اور اپنا اپنا اور غیر سے کچھ ملاقات ہو سکتی ہے تو وہ محض اپنے اور اپنوں اور اپنی اور اپنیوں ہی کے ذریعے سے لاریب فیہ۔ القصہ کوتاہ بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت مضمون بہت رسالے بہت اناپ شناپ لکھ مارا مگر روزمرہ کے استعمال کے لئے، عزیزوں سے بے تکلف دوستوں سے، بات چیت کے لئے اردو نہ آنی تھی نہ آئی!

میں عموماً روز و شب اسی قسم کے خیالوں میں غرق رہتا تھا کہ ایک روز صبح کے سات بجے خیال آیا کہ چھوڑو خیالات کے اس مخمصے کو اُردو کے اس گورکھ دھندے کو اور کچھ دنوں زندگی کا لطف تو اٹھالو اور وہ اس طرح کہ میرے بچوں میں ایک ننھی بچّی ہے صرف تین برس کی یکئی سالوں کے بعد میں نے کتابوں سے ذرا منہ پھیر کر اُس صبح کے سات بجے والے روز جو اُس کا چاند سا چہرہ دیکھا اور اُس کی پھول سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی پیاری پیاری باتیں سنیں اور پھر اُسے اپنے پاؤں کے جھولے میں جھلایا اور کچھ گدگدی کی اور پھر ہم دونوں ہنسے کھیلے ناچے کودے تو میری آنکھیں کھل گئیں کہ میں کہاں کتابوں اور مضمونوں میں مارا مارا پھر رہا تھا اور زندگی کہاں میری تلاش میں اپنا سر ٹپک رہی تھی۔ نیم علمیت سے میں نے منہ موڑا تو "کامل" زندگی گویا میرے سامنے کھڑی تھی!

اپنے بچّوں کو اپنی اردو پسندی اور اردو آموزی" کے جوش میں ہم نے اردو سکھائی ہے۔ شروع سے اُن سے اردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہ بات چیت سننے کے قابل ہوتی ہے۔ تین چوتھائی اردو ایک چوتھائی پنجابی یا خدا جانے کون سی نئی زبان ہمارے گھر میں زبانوں کی خوب کھچڑی پکتی ہے۔ وہ تو خیر انگریزی الفاظ اور فقرات کی بھرمار سے جو اپنی ملکی زبانوں کے گلے پر کند چھری پھیری جاتی ہے اُس کا یہاں ذکر نہیں، قابلِ غور امر یہ ہے کہ ابھی آپس میں پنجابی میں ایک بات ہو رہی ہے کہ بچے نے بیچ میں کچھ اردو میں کہہ دیا تو اُس سے اردو میں بات ہونے لگی اور اس میں تصنع تکلّف کچھ نہیں بلکہ اب ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ "یہ ایک بات اُردو میں" "ایک بات پنجابی میں" کا چکّر بغیر کوشش کے چلتا رہتا ہے۔ ننھی منھی گڑیا نے بھی اس سلسلے میں ایک اردو سی سیکھی ہے جو اُس کی مادری پدری زبان ہے۔ پدر بزرگوار بھی اسی فصیح و بلیغ پنجابی سی اردو میں اپنی برخوردار سے مصروف مکالمت و محوِ موانست ہوتے ہیں۔

جو کچھ بھی اوپر لمبی چوڑی تمہید کے طور پر لکھا گیا ہے اُس سب کا مقصد اور لب لباب صرف یہ ہے کہ اپنی پیاری ننھی کو پیار کرتے وقت باوجود اپنی کتابی و اکتسابی اُردو کی نام نہاد "علمیت" کے "اردو" بولتے میں بھی میرے پیار کا اظہار بعض پنجابی لفظوں ہی سے ہوتا اور ہو سکتا ہے "گوتّی مولّی"، "لاڈو باڈو"، "چنی منھی" "میرے پاچھ (پاس) آئے گی؟ آؤں گی آؤں گی! آ میری بانو!

(اور پھر)

"...ے سنٹے ماتیاں   گڈیاں کھڈایاں"

"گڈی گئی پیکے   چھوّو پئی لیئے"

یہ ہے میری "ننھی منھی" کی اور میری "گوتّی مولّی" اردو اور اسی میں ہم دونوں کے لئے زندگی کا لطف اور اسی سے ہمارے لئے دنیا کی ساری شان قائم ہے اور کسی قسم کی علم نوازی اور "صحت پسندی اور عزت طلبی اور "رعب اندازی" اس سے اور مجھ سے اُس پیاری "گوتّی مولّی" اردو کو چھڑا نہیں سکتی! یوں نہ سمجھئے کہ ہماری ننھی بیگم فصیح اردو نہیں بول سکتیں۔ ابھی پچھلے دنوں وہ یہاں (مسوری پہاڑ پر) اپنی طراری سے اپنی بڑی بہن سے فرما رہی تھیں میں تجھے کھڈ میں گا دگرا، دون کی پھر تو تُو مجائے (مر جاتے) گی

پھر میں کا (کیا)، کلوں (کروں) گی؟"

لیکن یہاں تک بات رہتی تو خیر تھی ذاتی بات تھی کسی کو اس پر اعتراض کا کیا حق مگر خواہ وجہ خود پسندی ہو یا حقیقت پسندی اب میں اس گولی مولی اردو کو جس میں بے تکلفی سے پنجابی کا کوئی جملہ اکثر نہیں لیکن کبھی نہ کبھی ضرور گھس آئے تحریر میں نہیں تو تقریر میں اور تقریر میں نہیں تو گفتگو میں اور کم از کم بے تکلفی کی باتوں میں ضرور رائج کرنا اپنا صوبجاتی اور اس لئے اپنا قومی اور اس لئے اپنا انسانی فرض سمجھتا ہوں۔

دنیا میں ہر شے کا ایک موقع ہے اور محل، ہر شے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہر شے سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے ہر شے سے دوسری اشیا کے "ٹیڑھے پن" کو کچھ سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ بس یہی حال ہماری "گولی مولی اردو" کا ہے اور انشا اللہ یہی کام اُس سے لیا جا سکتا ہے اور لیا جائے گا اور یہ کام وہ کرے گی اور ضرور کرے گی یعنی پہلے پنجابیوں کی اردو کو تھوڑا سا صحیح لیکن زیادہ تر مضبوط اور بے دھڑک بنانا اور یوں اس کی بنیاد کو استوار کرنا اور یوں اُس کو زیادہ فطری اور حیات بخش بنانا اور پھر اہلِ زبان کو بعض پنجابی لفظوں کی دہقانی قوت اور دیہاتی عظمت اور فطری سادگی اور عملی سودمندی سے روشناس کرانا اور آخر میں اہلِ پنجاب کی طرف سے اُن کا بے ساختہ شکریہ قبول فرمانا۔

یہ ہوگی "مغنجب" اردو ہمارے ایک عربی کے مولوی صاحب تھے اُن کا قول تھا کہ جس طرح معرّب مفرّس وہند الفاظ ہیں اسی طرح "موّرد" اور "مغنجب" بھی ہونے چاہئیں۔ موّرد بمعنی اردو بنایا گیا مغنجب بمعنی پنجابی بنایا گیا۔

پنجابی بنائی گئی اردو! اس سے اہلِ اردو گھبرائیں مت۔ یہ تو ادلے کا بدلہ ہے۔ کیا انہوں نے ہماری پنجابی کو "اردوا دیروزنِ مردُوا" نہیں دیا؟ کیا ہماری ٹھیٹ پنجابی موّرد نہیں ہوگئی؟ ہمارے شہروں میں جہاں جا کر سنو اگر اُدھر اُردو کی ٹانگ توڑی جا رہی ہے تو اِدھر پنجابی کی ٹانگ ٹوٹ رہی ہے۔ پھر کیا حرج ہے کہ دونوں کی ٹانگ بیک وقت توڑی جائے بلکہ اس سے مصیبت میں شراکت ہو کر محبت کا جذبہ پیدا ہوگا اور شہریت کی وہ زبردست روح جس سے سارے ہندوستان کے جسم میں صحیح قومیت کا خون دوڑے گا۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ اہلِ اردو تہذیب و تمدّن سے کمزور عمل اور اُن کی زبان تکلّف و شائستگی سے اظہارِ خیال کے لئے پھسپھسی سی ہوگئی ہے۔

اُردو سے اس جانب کو پرلے درجے کا عشق ہے لیکن معشوق سے بے وفائی ہوگی اگر عاشق اُس کی خرابیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرنے کی ہدایت نہ کرے چنانچہ عاشقِ زار کا مشورہ ہے کہ ہماری محبوب اردو کو اپنا دامن اتنا نہ پھیلانا چاہئے۔ اردو والے ہر لفظ کو پھیلا دیتے ہیں مثلاً اُردو کا کام پنجابی کم وہاں مم پرزور ہے اردو مفصل و منتشر ہے پنجابی پرزور و مختصر۔ اردو

چام پنجابی جم۔ اُردو نام پنجابی ناں (انگریزی نیم فرانسیسی نوں۔ غلط نہ ہوگا اگر ہم اردو کو ہندوستان کی انگریزی اور پنجابی کو ہندوستان کی فرانسیسی کہیں۔ اردو زیادہ شاہانہ اور درباری اور مفید ہے پنجابی زیادہ مردانہ اور جمہوری اور آزاد + پنجابی کے کئی لفظ فرانسیسی سے ملتے جلتے ہیں + اُردو ہے پنجابی اَے فرانسیسی اتے۔ اردو تین پنجابی تن یا ترے۔ فرانسیسی تروا۔ اُردو سات پنجابی سَت فرانسیسی سَت اُردو میں پنجابی وِچ فرانسیسی وین اصلی پنجابی اسی کو کہتے ہیں چار و باں یعنی چار بیس۔ فرانسیسی اسی کو کہتے ہیں "کیتروین" یعنی چار بیس۔ بلکہ پنجابی فرانسیسی سے بہتر ہے اُس میں نہ صرف فرانسیسی کی سادگی ہے بلکہ جرمن کا "اٹ البحرین" بھی ہے۔ اگر راقم جرمن زبان سے واقف ہوتا تو اس بات کو بھی ثابت کر دیتا + نیز پنجابی میں یونانی کی پہلوانیت بھی ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ وہاں کے اولمپک کھیلوں سے ہمارے پنجاب کی کشتی بازی اور پہلوانی کسی طرح کم نہیں۔ اگر راقم یونانی زبان سے واقف ہوتا اور اس نوٹ کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو وہ اس بات کو بھی ثابت کر دیتا۔ واللہ اعلم بالصواب +) + غرض جتنا غور کرو اتنا ظاہر ہوگا کہ اردو مفصل ہے پنجابی مختصر، اردو دریا ہے پنجابی کوزہ جس میں دریا بند ہے + لہذا اکثر نیک نیت پنجابی اس قاعدے کلیے سے فائدہ اٹھا کر اپنے سکڑے ہوئے پنجابی لفظوں کو پھیلا کر با آسانی اردو بنا لیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک بزرگ کا ذکر ہے کہ جب وہ لڑکپن میں سکول میں پڑھتے تھے تو ایک دن اُن کے ایک عزیز عرصے کے بعد وطن میں آئے۔ اس لڑکے نے اِن عزیز پر اپنا شوق دید اور اپنی قابلیت کا یوں اظہار کیا کہ ہم نے جب یہ گال (گل یہ بات) سُنی کہ آپ آ گئے تو ہم سکول سے ناسے ناسے (نسنا = بھاگنا) آئے کہ آپ سے ملیں"+

اگر پنجابی اردو پر للہ بول دے یا اگر اردو کی شہزادی خود ہی اس پہلوان زادی کو اپنے گھر میں بلائے تو دونوں کے میل جول سے ایک ایسا صالح مرکب پیدا ہو جسے دیکھنے والے دیکھیں اور دیکھتے رہیں جسے سننے والے سنیں اور سنتے ہی رہیں۔ اس نئی مرکب زبان کے بعض الفاظ ملاحظہ ہوں۔

دیکھئے کیونکر پنجابی اور اردو کے مشترک المعنی الفاظ سے نئے اور صریح مفہوم پیدا کئے گئے ہیں اور دونوں زبانوں میں ایک انوکھی وسعت رونما ہو گئی ہے۔

توند (اردو) بڑھے ہوئے اور نرم اور پلپلے پیٹ کے لئے استعمال ہو جس سے پھسپھسا پن پایا جائے

گوگڑ (پنجابی) بڑھے ہوئے اور قدرے سخت پیٹ کے لئے جس سے رعب ٹپکتا ہو۔

درد (اردو) صرف دردِ دل کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

پیڑ (پنجابی) صرف پیٹ کے درد کے لئے " " (ڈھڈ پیڑ کہنے کی ضرورت نہیں ہے)

علم (اردو) مفید اور مشکل اور باقاعدہ علوم کے لئے جیسے علم خرافات، علم طبیعیات استعمال ہو۔

عِلَم (پنجابی) غلط یا دور از کار یا بے قاعدہ علوم کے لئے جیسے غیب کا عِلَم

بیوی (اردو) زوجہ کے معنی میں استعمال نہ کیا جائے بلکہ صرف خانگی انتظامات کے ضمن میں مثلاً میاں باہر سڑک پر گھوم رہے ہیں، بیوی گھر میں گھسی بیٹھی ہے +

وُہٹی (پنجابی) جسے اردو میں دلہن کہتے ہیں لیکن دلہن تو تھوڑے دنوں یا تھوڑے مہینوں دلہن رہتی ہے اس کے برعکس وُہٹی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وُہٹی ہے لہذا بیوی کے لئے لفظ وُہٹی استعمال ہونا چاہئے + بھاری بھرکم یا بدمزاج یا اکھڑ بیوی کو وُہٹ کہا جائے +

پنجابی لفظوں میں عموماً کسی نہ کسی حرف پر زور دیا جاتا ہے چنانچہ وُہٹی میں دوسری واو پر زور ہے + پنجاب کی بیویاں مضبوط ہوتی ہیں "ہندوستان کی کمزور اسی لئے لفظ وُہٹی میں واو ثانی پر زور ہے اور سارے کے سارے لفظ میں اک مضبوطی پائی جاتی ہے لیکن لفظ بیوی میں کمزوری اور ضعف کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر اہل زبان اپنی بیویوں کو بیبیاں ہی پکارنا چاہیں تو ان کا اختیار ہے مگر ہمارا مشورہ یہی ہوگا کہ وُہٹی کہیں کیونکہ وُہٹی پکارے جانے سے بیوی میں دہقانیت کی تمام صفات اور اس لئے طاقت اور مضبوطی آسانی سے پیدا ہو جائے گی +

خوبصورت، حسین (اردو) جو خاتونیں پوڈر اور غازہ لگائیں اُن کے لئے استعمال ہوں۔

سوہنی (پنجابی) (واو پر زور، نیم ساقط ہے) جس لڑکی کا حسن فطری ہو اور "حسن پرور" مصنوعات کا ممنون احسان نہ ہو وہ سوہنی کہلائے۔

بدشکل، بدصورت (اردو) محض بدصورت عورت جسے کوئی پسند نہ کرے۔

کوہجی (پنجابی) (واو پر زور نیم ساقط) ایسی بدصورت عورت جسے دیکھ کر جی متلائے۔

بہت، نہایت (اردو) موجودہ استعمال قائم رہے +

ڈاہڈا (پنجابی) (پہلے الف پر زور بدستور سابق نیم ساقط) غایت درجہ پُر زور لفظ ہے بہت کی بہتات اور نہایت کی نہایت اسی سے ظاہر ہوتی ہے اور صرف پنجاب میں رہ کر اس کے زور کا اندازہ ہو سکتا ہے + جو شخص اپنی زندگی میں زور و قوت پیدا کرنا چاہے وہ اگر صرف اک اسی لفظ سے متمتع ہونے کے لئے وطن چھوڑ کر پنجاب میں سکونت اختیار کرے تو اُس کے حق میں یہ "ڈاہڈا" مفید امر ہوگا +

ہاں ہم پنجابی اپنی ایثار پسندی کے بل پر اس پر بخوشی آمادہ ہیں کہ اس نئی گوتی موتی اردو میں ½ حصہ اُردو والوں کا ہو اور صرف ½ ہمارا۔ پھر دیکھئے کیسی بے تکلف، پر صحت، تنومند اور زوردار ہیکل زبان معرض وجود میں آتی ہے جس کے آگے نہ

ہندی کی چندی نہ بنگالی کی "جگالی" اور نہ گجراتی کی "چپاتی" کچھ کام آئے - پھر یقین ہے کہ یہ اصلاح شدہ و تقویت یافتہ اردو ہندوستان کی ملکی زبان بن جائے اور جب ملک میں ایک ملکی زبان رائج ہو جائے تو یقینی طور پر حُب الوطنی کا زور ہو اور جب حب الوطنی کا زور ہو تو یقینی طور پر اجنبی اپنے ہتھیار ڈال دیں اور جب اجنبی اپنے ہتھیار ڈال دیں تو ہمیں خودبخود سوراج مل جائے +

یہ ہے "گوتی موتی" اردو، یہ اس کی ضرورت، یہ اس کی اہمیت اور یہ اس کی شاندار ممکنات! اگر کسی نے اس "تجویز" کی تائید کی تو آئندہ انشاءاللہ اس کے اثبات اور اس کے ادب پر مزید روشنی ڈالی جائیگی لیکن مضمون نگار یا مصنف کا جب تک دل نہ بڑھایا جائے اُس وقت تک اُس کی طبیعت کا اصلی جوہر چمکنے نہیں پاتا اور نہ اُس وقت تک دنیا اُس کی شخصیت سے خود پورا فائدہ اٹھا سکتی ہے سو باقی دارد یا ایہا المتکلمین!

ل ب

غزل

لا ساقیا کہ آمدِ فصلِ بہار ہے
کس روسیہ کو آج غمِ روزگار ہے

لا ساقیا کہ آج موافق ہے آسماں
پھر اس کی گردشوں پہ کسے اعتبار ہے

میخواریاں لکھی ہیں مری سرنوشت میں
تقدیر کے لکھے پہ کسے اختیار ہے

کافر ہوں میں جو آج بھی جنت طلب کروں
ساقی ہے، نم ہوا ور لبِ جوئبار ہے

کیفی یہ بادہ نوشیٔ پیہم کا فیض ہے
عقبیٰ کی فکر ہے نہ غمِ روزگار ہے

محمد علی کیفی

قطعات

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو چھلکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں یہ مری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

نغمۂ محبت

الٰہی اس کو محبت کا گیت کہتے ہیں
جو اس طرح سے سناتا ہے نغمۂ رنگیں
جہاں رباب کی آواز کان میں آئی
کسی کی یاد نے سینے میں چٹکیاں لیں

برسات

چڑھا ہوا ہے فضاؤں کو ایک نشہ سا
شرابِ ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر اک شے آج
اٹھی ہے درد کے مانند کالی کالی گھٹا
خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

موسمِ بہار

رموزِ قلب رقم ہیں بہار کے رخ پر
نقش ہے اثرِ خامۂ محبت ہے
جو ہے اے موسمِ بہار کہو
نسیم بھی علم ہے
کسی کے نام اک نامۂ محبت ہے

اختر
انصاری دہلوی

"کوئی اخبار وخبار نہیں ہے .... ہم۔ ن۔ ن ......" لپک کر انہوں نے میز پر اپنی انگریزی ٹوپی پٹک دی۔ اور اس زور سے کرسی کھینچی کہ دوسری کرسی کو لوٹ دیا۔ "لاحول ولاقوۃ ...... یہ کرسیاں" یہ کہہ کر انہوں نے کرسی کو سیدھا کیا اور پھر عجیب کھڑ بڑ شروع کی۔ لمبی چوڑی میز پر نظر دوڑا کر ایکدم سے اخباروں کو اٹھا اٹھا کر پٹکنا اور پھینکنا شروع کیا۔ اس قدر تیزی سے ورق لوٹنے شروع کئے کہ ایک شور بے ہنگام بپا ہوگیا۔ "کھڑ بڑ۔ کھڑ بڑ" معلوم ہو رہی تھی۔ ہزاروں ورق چار چار کر کے لوٹ دیئے تھے اور اخبار اور رسالے گھسیٹ گھسیٹ کر پٹخ رہے تھے۔ کوئی دس منٹ تک ان کی یہ اخبار بینی جاری رہی۔ اتنے میں لائبریرین صاحب آگئے تو یہ بولے :-

"کوئی نیا اخبار نہیں آیا؟"

"سب تو تازہ اخبار سامنے آپ کے چنے ہوئے ہیں۔ اور اخبارات کی تازہ فہرست بھی آج کی سامنے آویزاں ہے۔ کہ کون کون سے اخبار موجود ہیں۔ آپ نے دیکھی نہیں۔" وہ "اچھا" کہہ کر فہرست جو دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کو غور سے کھڑے ہو کر پڑھنے لگے۔

"اچھا! تو یہ سب اخبار موجود ہیں۔" یہ کہتے ہوئے پھر میز پر بڑھے اور اب تصدیق کی۔ "کیا واہیات ہے۔" لائبریرین صاحب سے مخاطب کر کے بولے۔ "لائبریری کی یہ بدتمیزی نہ گئی۔ کہ تمام اخبارات چھینٹ کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ دیکھئے کوئی احمق "لیڈر" کے صفحے "پانیر" میں ملا گیا ہے۔ یہ دیکھئے۔ پھر پرانے اخبارات کی موجودگی میز پر کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کے لئے۔"

لائبریرین نے مؤدبانہ کہا۔ "جناب صرف ایک روز تک کے پرانے اخبار لازماً رکھے جاتے ہیں۔ وہ دوسری لائن میں ہوتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں صاحب کہ کوئی ابھی آیا اور تمام میز گڑبڑ کر ڈال گیا۔ ابھی ابھی تو میں قرینہ سے جما کر گیا ہوں۔"

شاید ان حضرت کو اب پتہ چلا کہ وہ احمق خود ہیں۔ اور یہ سمجھا کر انہوں نے میری طرف دیکھا کیونکہ واللہ میں گواہ تھا کہ وہ بدتمیز شخص جو اس بدعت کا ذمہ دار تھا۔ سوائے ان کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

اخباروں پر سرسری نظر ڈال کر ادھر دو ایک کو جو انہوں نے تتر بتر کر دیئے تھے قرینہ سے جما کر لائبریرین سے بولے۔ "کوئی عمدہ کتاب نکلوا دیجئے۔" گویا اخبار بینی کر چکے۔

"بہت بہتر۔" یہ کہہ کر لائبریرین نے پوچھا۔ "فرمائیے۔ کون سی؟"

"کوئی اردو کی ہو۔ نہیں خیر انگریزی کی سہی۔"

"کوئی اخبار وخبار نہیں ہے .... ہم - ن - ن ....." لپک کر انہوں نے میز پر اپنی انگریزی ٹوپی پٹیک دی - اور اس زور سے کرسی کھینچی کہ دوسری کرسی کو لوٹ دیا۔" لاحول ولاقوۃ ..... یہ کرسیاں" یہ کہہ کر انہوں نے کرسی کو سیدھا کیا اور پھر عجیب کھڑ بڑ شروع کی - لمبی چوڑی میز پر نظر دوڑا کر ایکدم سے اخباروں کو اٹھا اٹھا کر ٹپکنا اور پھینکنا شروع کیا - اس قدر تیزی سے ورق لوٹنے شروع کئے کہ ایک شور بے ہنگام بپا ہوگیا۔" کھڑ بڑ کھڑ بڑ" معلوم ہورہی تھی - ہزاروں ورق چار چار کر کے لوٹ دیئے تھے اور اخبار اور رسالے گھسیٹ گھسیٹ کر پٹخ رہے تھے - کوئی دس منٹ تک ان کی یہ اخبار بینی جاری رہی - اتنے میں لائبریرین صاحب آگئے تو یہ بولے :-

"کوئی نیا اخبار نہیں آیا؟"

"سب تو تازہ اخبار سامنے آپ کے چنے ہوئے ہیں - اور اخبارات کی تازہ فہرست بھی آج کی سامنے آویزاں ہے - کہ کون کون سے اخبار موجود ہیں - آپ نے دیکھی نہیں؟" وہ "اچھا" کہہ کر فہرست جو دیوار پہ آویزاں تھی - اس کو غور سے کھڑے ہو کر پڑھنے لگے ؛

"اچھا! تو یہ سب اخبار موجود ہیں" یہ کہتے ہوئے پھر میز پر بڑھے اور اب تصدیق کی ۔ "کیا واہیات ہے" لائبریرین صاحب سے مخاطب کر کے بولے ۔ "لائبریری کی یہ بدتمیزی نہ گئی - کہ تمام اخبارات چھینٹ کر رکھ دیئے جاتے ہیں - یہ دیکھئے کوئی احمق "لیڈر" کے صفحے "پانیر" میں ملا گیا ہے - یہ دیکھئے - پھر پرانے اخبارات کی موجودگی میز پر کچھ سمجھ میں نہیں آتی - خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کے لئے" ؛

لائبریرین نے مؤدبانہ کہا ۔ "جناب صرف ایک روز قبل کے پرانے اخبار لازماً رکھے جاتے ہیں - وہ دوسری لائن میں ہوتے ہیں - مگر میں کیا کروں صاحب کہ کوئی بدتمیز آیا اور تمام میز گڈمڈ کر ڈال گیا - ابھی ابھی تو میں قرینہ سے جما کر گیا ہوں" ؛

شاید ان حضرت کو اب پتہ چلا کہ وہ احمق خود ہیں اور سمجھا کر انہوں نے میری طرف دیکھا کیونکہ واللہ میں گواہ تھا کہ وہ بدتمیز شخص جو اس بدعت کا ذمہ دار تھا - سوائے ان کے کوئی دوسرا نہ تھا ؛

اخباروں پہ سرسری نظر ڈال کر اور دو ایک کو جو انہوں نے بتر بتر کر دیئے تھے قرینہ سے جما کر لائبریرین سے بولے "کوئی عمدہ کتاب نکلوا دیجئے" گویا اخبار بینی کر چکے -

"بہت بہتر" یہ کہہ کر لائبریرین نے پوچھا "فرمایئے - کون سی؟"

"کوئی اردو کی ہو - نہیں خیر انگریزی کی سہی"

لائبریرین نے انگریزی کتابوں کی فہرست سامنے کردی اور یہ حضرت کتاب پسند کرنے میں مشغول ہوگئے۔

(۳)

میرے پراگندہ دماغ کو قدرے سکوت ملا۔ جب یہ حضرت لائبریرین سے کتاب لینے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کتاب دوبارہ اُٹھائی۔ عبارت تلاش کی۔ دماغ میں سلسلۂ مضمون کو دوبارہ قائم کیا۔ اطمینان سے اس طرف دیکھا جدھر یہ حضرت گئے تھے کہ اب آئیں گے تو شکر ہے کہ خود کتاب پڑھنے میں مشغول ہوجائیں گے۔ نہایت ہی اطمینان سے خیالات کو ایک مرکز پر لاکر میں پھر مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔

وہ حضرت آئے اور مجھ سے کوئی پانچ چھ قدم پر ایک صوفے پر تکیہ لگاکر میری طرف پشت کرکے بیٹھ گئے۔ اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ اطمینان سے رکھ کر پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ مگر حضرت یہ نہایت ہی خلیق اور ملنسار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کوئی بیس منٹ تک تو کتاب پڑھتے رہے۔ پھر کھکار کر غور سے میری طرف دیکھا۔ نظر چار ہوتے ہی عجیب حیرت و استعجاب سے بولے۔

"کمال کردیا ہے"!۔

میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگے "تاج محل ...... عجیب و غریب عمارت ہے! اُستاد عیسٰی نے بنایا ہے۔ واللہ اب تک میں یہی جانتا تھا کہ نقشہ اس کا ایک اٹلی کے رہنے والے نے بنایا ہے"۔

"جی ہاں" میں نے کہا اور گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے فوراً ہی اپنی کتاب پر پھر نظر جمالی۔ کیونکہ میں کتاب کے قصہ کی جس نوبت پر پہنچا تھا وہ حد سے زیادہ دلچسپ تھی۔ اور کسی کا مخل ہونا مجھے ذرا بھی گوارا نہ تھا۔

مگر وہ کیوں چپ ہوتے۔ بولے "مصنف نے مستند حوالہ جات سے ثابت کردیا ہے کہ ......"

مَیں (جواب پر مجبور ہوکر) "جی ہاں! میں نے پڑھا ہے"۔

وہ پھر بول اُٹھے "یہ اول درجے کے بدمعاش ہیں۔ اول درجے کے بدمعاش! (گھونسا تان کر) یہ یورپین مصنف ..."

میں چپ ہوکر اپنی کتاب میں پھر مشغول ہوگیا۔ شکر ہے کہ وہ بھی مشغول ہوگئے۔ مگر پانچ منٹ بعد ہی وہ اُچک کر بولے "یہ دیکھئے۔ خود دوسرے منصف مزاج مؤرخوں کے اقوال سے مصنف ثابت کرتا ہے اور ......"

میں "جی ہاں! میں نے پڑھا ہے ...... پوری کتاب مَیں نے پڑھی ہے"۔

وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہوگئے، اور مَیں بھی پھر مشغول ہوگیا۔ دس منٹ بعد پھر وہ پڑھتے پڑھتے اُچھل پڑے "کیا کہنا ہے

مصنف کی قابلیت کا" چودہ مستند حوالے! ذرا غور تو فرمائیے ....“

مَیں (تنگ آکر) "مَیں نے پڑھا ہے۔"

"مگر یہ سب ....“

"میں نے پڑھا ہے۔ میں نے کُل کتاب پڑھی ہے" یہ کہہ کر میں اندازِ بے نیازی کے ساتھ پھر مشغول ہوگیا۔ مگر مشکل سے دس منٹ گزرے ہونگے کہ انہوں نے اپنی رانیں پیٹ ڈالیں۔ اور بیتاب ہو کر پھر مجھ سے کہا" یعنی یہ دیکھئے کہ .....“

میں نے کچھ جل کر بات کاٹتے ہوئے جواب دیا" مَیں نے پڑھا ہے۔"

"آپ یہ دیکھئے کہ یہ حضرت ......“

میں نے ذرا زور دے کر کہا" میں نے پڑھا ہے۔ مَیں نے کُل کتاب دو مرتبہ پڑھی ہے اور ......“

وہ بات کاٹ کر بولے۔ تو پھر آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا۔ کہ مصنف نے غضب ہی کر دیا ہے۔ کہاں کہاں سے مواد جمع ......“

"ارے صاحب میں نے پڑھا ہے" اب رو کر میں نے کہا" مَیں نے سب پڑھا ہے"

وہ حضرت یہ سُن کر کچھ گنگنا کر پڑھنے لگے اور انگلی بجا کر زور دے دیکر خود ہی لطف اندوز ہونے لگے۔

میں اب دق ہو گیا تھا۔ کہ الٰہی کیا کروں۔ کہاں بھاگ جاؤں۔ میری کتاب اسوقت میرے لئے اِس قدر دلچسپی کا باعث ہو رہی تھی کہ بیان سے باہر۔ اور یہ موذی پن میرے لئے جہنم تھا۔ جوں توں کر کے مَیں نے اپنے رنج اور غصہ کو فرو کیا۔ اور پراگندہ دماغ کو پھر کتاب کی طرف متوجہ کیا۔ اب میں کتاب کے انتہائی دلچسپی کے حصے پر پہنچ گیا تھا۔ اور خوش قسمتی سے یہ حضرت بھی منہمک تھے۔ مگر بدقسمتی ...... ہاں میری بدقسمتی کہ یہ حضرت پھر ایک دفعہ پھاند پڑے۔" خوب! یہ بھی آپ نے دیکھا ہے" (مجھے مخاطب کر کے)" اجی حضرت یہ بھی آپ نے دیکھا ہے۔ کہ مصنف نے خود .....“

مَیں۔ (قطع کلام کر کے)" میں نے دے ...... کھا ہے اور ......“

وہ۔ (تیزی سے میری بات کاٹ کر)" ..... مصنف نے خود اپنی طرف سے کوئی ....“

"میں نے پڑھا ہے" (اب پھر رو کر میں نے عجیب لہجہ میں کہا)" میں نے سب پڑھا ......" مگر وہ تو گویا میری کوئی سنتے ہی نہ تھے۔ چپ نہ ہوئے بلکہ بولے:۔

"...... کوئی بھی بات نہیں چھوڑی ......“

اب گویا میں اور وہ دونوں ساتھ ساتھ بول رہے تھے۔ میں اپنے ناتمام جملے کی فکر میں اور وہ اپنے ناتمام جملے کی تکمیل کی

فکر میں ۔ چنانچہ میں نے کہا " میں نے پڑھا ہے ۔ سب پڑھا ہے " میں رو رو کر گویا کہہ رہا تھا ۔ مگر وہ اب خون کرنے پر آمادہ تھے ۔ اپنی دھن میں وہ بولے " ذرہ بھر مصنف نے کسی طرف سے ...."

بڑی لجاجت سے میں نے سمجھا کر کہا " میں نے پڑھا ہے ۔ حضرت سب پڑھا ہے " اب وہ پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ مگر میرا مشغول ہونا ذرا دشوار تھا ۔ دُبلا پتلا آدمی ۔ مارے غصہ کے خون کھول رہا تھا ۔ مشکل سے غصہ رفع ہونے پایا تھا کہ وہ اب کی مرتبہ مجھے قتل کرنے ہی کی نیت کر بیٹھے ۔

وہ ۔ (میری طرف پشت کئے ہوئے اور نظر کتاب پر ڈالے) " اوہو ... ہوا جنابِ من ....

میں ۔ (سخت برافروختہ ہوکر) " میں نے پڑھا ہے ۔"

وہ ۔ " اوہو ذرا ...."

میں ۔ (اور بھی برافروختہ ہوکر) " میں نے پڑھا ہے ۔"

وہ ۔ " اِس صفحہ پر ...."

میں ۔ (بالکل رو کر اور تنگ آکر گویا زندگی سے ہاتھ دھو کر) " میں نے پڑھا ہے ۔"

وہ ۔ " میں آپ کو عبارت ہی سنائے دیتا ہوں ۔"

موت کی تکلیف اُٹھاتے ہوئے میں نے کہا " میں نے پڑھا ہے " وہ بھلا میری کب سنتے ۔ مست ہو کر اُنگلی ہوا میں مار مار کر بہ آوازِ بلند پڑھ کر انہوں نے مجھے سنانا شروع کر ہی دیا ۔ اُن کی پشت میری طرف تھی ۔ کتاب اُن کے سامنے ۔ اور اُنگلی کا جھنڈا میری طرف ۔ انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا تھا ۔

" .... تمام دنیا کے مؤرخین اس بات پر متفق ...."

بات کو ناتمام یہاں چھوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ حضرت نہ میں پہلے کبھی بدتمیز تھا اور نہ اب ہوں ۔ نہ پہلے کبھی وحشی تھا اور نہ اب ۔ نہ پہلے کبھی درندہ تھا نہ اب ۔ نہ پہلے کبھی بیل تھا اور نہ اب ۔ بہت کم گو ۔ بہت مسکین ۔ صلح کُل ، خاموش طبیعت ۔ کمزور ۔ بزدل سنت ۔ کتابوں کا کیڑا ۔ مگر انسان پھر انسان ہے ۔ ع

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود　　　　برآرد بچنگال چشم پلنگ

کسی نے سچ کہا ہے ۔ تنگ آمد بجنگ آمد ۔ ان حضرت کی ضد ۔ بدتمیزی اور جارحانہ کارروائی نے میرے لئے موت اور زیست کا سوال پیش کر دیا ۔ غصہ ۔ انتہائی جلال ۔ کمزور آدمی ۔ پاگل ہوگیا ۔ دیوانہ ہوگیا ۔ وحشی ہوگیا ۔ نہایت شرم کے ساتھ مجھ کو اقبال ہے ۔ کہ " اَسفَلُ السّافِلین " کی تفسیر ہو کر غیظ و غضب میں عقل و ہوش سب کھو بیٹھا ۔ اب صرف

ایک ہی علاج تھا - میں کر گذرا . . . .

اُن کا جملہ تھا " . . . . تمام دنیا کے مؤرخین اس بات پر متفق . . . . . . " اُن کے آخری لفظ "متفق" کے آخری ٹکڑے "فق" کے ساتھ ہی میں نے مجبوراً گویا حفاظتِ خود اختیاری میں اپنی کُرسی کا بڑا گدا گھسیٹ کر پوری قوت سے "آ...ہم" کر کے بے خبری میں اُن کے سر پر اس زور سے گھما کر مارا ہے کہ "متفق" کے بجائے اس زور سے

برپا ہوا کہ ساری لائبریری میں واللہ اعلم کس طرح "ق" اور "ع" (ملے ہوئے) اُن کے گلے سے چھینٹوں کی طرح اُڑ کر بکھر گئے اور میں کرسی پھاند کر بدحواسی میں سر پہ پیر رکھ کر بھاگا -

چشمِ زدن میں لائبریری کے احاطہ کی دیوار پھاند کر کھیتوں کھیت ڈاک گاڑی کی رفتار سے (بہت تیز دوڑتا ہوں) اُڑا جا رہا تھا - نہ دیکھوں خندق نہ کھائی - ارہر کے جھانکڑوں کی باڑھ پر سے اُڑنے کی کوشش جو کی تو اُلجھ کر گرا - بوکھلا کر اُٹھا - مڑ کر لائبریری کے برآمدہ کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کھڑے دیکھ رہے ہیں - بے اختیاری کے عالم میں کتاب اُن کے ہاتھ میں دیکھتے ہی پکار کر میں نے وہیں سے ہاتھ اُٹھا کر کہا "میں نے پڑھا ہے"

عظیم بیگ چغتائی

نعرۂ مردانہ

نعرۂ مردانہ

ڈراتے ہو کسے تم صبر ہمّت پیما امتحانوں سے — بلا کا سامنا ہے کھیل کرنا سخت جانوں سے

بھڑکتی آگ کے شعلوں کی روحوں کو جسد دیکر — بنایا ہے خدا نے مردِ غیرت مند و غیرت ور

تماشا کر چکا کوہِ غم اپنی ناتوانی کا — کہ تھم سکتا نہیں مواجِ دریا زندگانی کا

سکھایا ہے مجھے فطرت نے جینے کے لئے مرنا — لہو سے اپنے نخلِ زندگی کی پرورش کرنا

مرے سینے میں پس کر رہ گئے پتھر مصائب کے — مری نظروں سے یکدم چھٹ گئے بادل نوائب کے

صعوبت کا سمندر میرے استغنا سے واقف ہے — مری ہمت سی میرے جوشِ بے پروا سے واقف ہے

مروڑی بارہا میں نے کلائی سختِ بازوؤں کی — ہوئیں غیرت سے اکثر مشتعل موجیں جو اس خوں کی

میری قوت کا غلبہ مشکلوں پر چھا گیا اکثر — کڑکتی بجلیوں کا حوصلہ خم کھا گیا اکثر!

مزارِ تیرگی ہے روشنی میری نگاہوں کی — مری آنکھوں نے ظلمت چوس لی تاریک راہوں کی

سناتا ہے مجھے راحت کے نغمے شورِ طوفاں کا — گرج ہے بادلوں کی یا ترانہ روحِ انساں کا

جھلکتی ہے میری تسکین شمشیروں کی تابش میں — ملی ہے انگبیں آلام کے تیروں کی بارش میں

وہ ذی ہمت ہوں، ہر مشکل میں خود مشکل کشا ہوں میں
میرے رتبے سے تم واقف نہیں شیرِ خدا ہوں میں

عدم

ہوابازی

اگر انسان غور کرے تو اُسے معلوم ہوگا۔ کہ قدرت ہی اس کے بہترین کارناموں کی محرک ہوئی ہے۔ دنیا کا پہلا جہاز راں وہ تھا جس نے ایک شاخ کو سطح آب پر تیرتے دیکھا اور قدرت کے اس سادہ سبق سے فائدہ اُٹھایا۔ اسی طرح پہلے ہواباز نے بھی فطرت کی درسگاہ میں بادلوں پر نظر گاڑ کر سوچا کہ اگر میں ابر کا ایک ٹکڑا کسی تھیلے میں بند کر لوں۔ تو کیا وہ آسمان پر نہ جا پہنچیگا؟ ابنِ آدم کو ابتدا ہی سے رفعت کی تمنا رہی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی آسمانی جنت کے حصول کی آرزو سے ہمیشہ تڑپاتی رہی ہے۔ جس طرح ایک شفیق ماں اپنے بچہ کو چلنے کی تعلیم دیتے وقت اسے دور سے خوبصورت کھلونے دکھاتی ہے۔ بالکل اسی طرح قدرت نے بھی انسان کو ستاروں تک پہنچنے کی ترغیب دی۔ اسے نئی اور عجیب و غریب دنیاؤں کے خواب دکھائے اور مریخ کے باشندوں سے نامہ و پیام کی آرزو اسکے دل میں پیدا کی۔ دیکھو! وہ کتنے دلچسپ تصورات کی تخلیق کا باعث ہوئی ہے! ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے اور قرونِ وسطیٰ کا انسان کیسے ہوائی قلعے تعمیر کرتا تھا۔ لیکن وہ ہوائی قلعے اب مسلمہ حقیقت ہیں۔

مشہور انگریز فلسفی راجر بیکن (۱۲۱۴ - ۱۲۹۴) نے صدیوں پہلے یہ تجویز سوچی تھی۔ کہ اُڑنے کے لئے ایک پتلا کرہ کسی ہلکی سی دھات کا بنایا جائے۔ اور اسے بلندی کی لطیف ہوا یا سیال آگ سے بھر دیا جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تجویز اس کے پیشتروں نے سوچی۔ جن کا خیال تھا کہ کسی کرہ کو شبنم سے بھر دیا جائے تو سورج کی کشش خود بخود اسے آسمان پر اُڑا لے جائیگی۔

انسان کا دل زیادہ عرصہ تک تخیل کے کھلونوں سے نہ بہل سکا اور اُس نے عملی تجاویز سوچنی شروع کیں۔ آخر ۱۷۸۲ء میں دو فرانسیسی بھائیوں جوزف اور جیکوئیس مانٹ گالفیئے نے اینونے میں ایک غبارے کے نیچے آگ جلا کر اُسے اُڑایا۔ غبارہ صرف دس منٹ ہوا میں رہا۔ اور ایک میل کے فاصلہ پر نیچے اُترا۔ یہ گویا ہوابازی کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد سائنس کے ایک فرانسیسی ماہر چارلس نے ہائیڈروجن گیس کے استعمال سے ایک غبارہ پیرس میں اُڑایا۔ اور یہ پندرہ میل ہوا میں اُڑا۔ اس دن کے بعد سے آج تک ہائیڈروجن کا استعمال ہوائی جہازوں میں ہو رہا ہے۔

ہوابازی کے شائقین غباروں سے مطمئن نہ ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مساعی جاری رکھیں۔ غباروں کی گولائی انہیں مرغوب نہ تھی۔ کیونکہ اس کے باعث انہیں اپنے حسب منشا کسی سمت میں جاتے ہوئے تکلیف پیش آتی تھی۔ اس نقص کو دور کرنے کے لئے ایک فرانسیسی جرنیل نے چپوؤں والا غبارہ بنایا۔ لیکن ایک سو سال بعد تک یہ مشکل کُلّی طور پر رفع نہ ہوئی۔ پھر بھاپ بھی

استعمال ہونے لگی۔ اس اختراع کا سہرا بھی ایک فرانسیسی ہنری گلفرڈ کے سر ہے۔ ایک اور فرانسیسی اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا کپتان رینار پہلے ہوائی جہاز کی ایجاد کا باعث ہوا۔ یہ اہم واقعہ ۱۸۸۴ء کا ہے۔ اس کے بعد برازیلی موجد سانٹس ڈومانٹ نے انیسویں صدی کے آخر میں ہوابازی کی کامیابی سے دنیا کو متعجب کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہوابازی نے کافی ترقی کی۔ جرمنی، انگلستان فرانس اور اٹلی نے عمدہ ہوائی جہاز بنائے۔ اور انگلستان کے ہوائی جہازوں "نزلی سیکنڈس" "بیٹا" اور "گاما" اور جرمنی کے "پرسیول" اور فرانس کے کلیمنٹ بے آرنے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ پٹرول کے استعمال کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد کاؤنٹ زیپلین کے ہوائی جہازوں نے جو کارہائے نمایاں دکھائے وہ عوام سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے علاوہ فرانس کے مائہ ناز ہواباز بلیریا نے رودبار انگلستان کو ۱۹۰۹ء میں عبور کر کے دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے ہوابازوں کی تمام مساعی جنگ کو فتح کرنے میں صرف ہوگئیں اور ۱۹۱۹ء تک ہوابازی کی شاندار تجویزیں معرض التوا میں رہیں۔ جنگ کے خاتمہ کے ایک سال بعد برطانوی ہوائی جہاز آر ۳۴ نے ساڑھے چار دنوں میں بحر اٹلانٹک کو عبور کر کے ہوابازی کی تاریخ میں ایک قابل تقلید مثال قائم کی۔ لیکن فرانسیسی ہوائی جہاز "ڈکس موڈ" (جو پہلے جرمنی کا تھا اور ایل ۲، کہلاتا تھا) ۱۹۲۳ء میں سرعت رفتار کے باعث اس سے بھی سبقت لے گیا۔ اس نے فرانس سے بحیرۂ روم کو عبور کیا۔ اور الجیریا۔ ٹیونس اور صحرائے اعظم کا سفر کیا۔ اس طرح ۴۴۰۰ میل ۱۱۸ گھنٹوں میں طے کر کے برطانیہ کی کامیابی کو دلوں سے محو کر دیا۔ لیکن گذشتہ آٹھ برس میں ہوابازی نے اس سرعت سے ترقی کی ہے کہ پہلے تمام کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔ لنڈبرگ۔ سکاٹ۔ ایمی جانسن وغیرہ کی حیرت انگیز مساعی نے تاریخ عالم میں ایک اہم باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

ہوابازی کی ابتدائی اور موجودہ صورت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ غباروں میں سوار ہوتے تھے۔ تو پہلے وصیت کر جاتے تھے۔ انہیں قسم قسم کے خطرات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ جب انیسویں صدی میں جیمز گلیشیر غبارو میں اُڑا۔ تو ۲۹۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر پہنچ کر وہ بیہوش ہوگیا۔ لیکن اس کے سینکڑوں ہمعصر ہوابازوں کی قسمت اس سے بہت بُری تھی۔ برخلاف اس کے آجکل حالات اتنے خوشگوار ہیں۔ کہ پرواز سینکڑوں انسانوں کے لائحہ عمل کا معمولی جزو ہے۔ اور ہوائی جہاز اتنے آرام دہ ہیں جتنے کہ اول درجہ کے ہوٹل۔ اُن میں کھانے پینے اور سونے کا انتظام قابل تحسین ہے۔ سرعت رفتار کا یہ عالم ہے۔ کہ زمین یا سمندر کے بہترین ذرائع سفر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لندن سے دہلی تک بحری جہاز اور ریل کے ذریعہ سے سفر کرنے میں ستر۱۷ دن صرف ہوتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے یہی فاصلہ صرف چھ دن میں طے کیا جا سکتا ہے۔

وہ وقت بہت دور نہیں جب ہوائی جہاز موٹروں کی طرح گھر گھر نظر آئیں گے۔ (لیکن ہم موٹر والوں کو مشورہ نہیں

دینے کہ وہ انھیں بیچ کر ہوائی جہاز خریدنے کا انتظام کریں۔ نہ موٹر بنانے والی کمپنیوں ہی سے کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنا کام بند کر دیں۔ جرمنی میں ہوا بازی کو مقبولِ عام بنانے کی تحریک زوروں پر ہے۔ حکومت نوجوانوں کو اچھا ہوا باز بننے میں مدد دے رہی ہے۔ جمہوریہ جرمنی اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے خود خسارہ اٹھانے پر بھی آمادہ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اُس نے اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود نوجوانوں کی مجالس ہوا بازی کو اچھے جہاز بہت کم قیمت پر پیش کئے تھے۔ ان جہازوں میں بیس گھوڑوں کی طاقت والے انجن ہیں۔ انگلستان میں ایسا ہوائی جہاز ۴۰۰ پونڈ سے کم قیمت پر ملنا ناممکن ہے۔ لیکن جمہوریہ جرمنی نے صرف ۷۲ پونڈ فی جہاز طلب کئے۔ حالانکہ لاگت اس قیمت سے زیادہ اُٹھتی ہے۔

ہوا بازی کی ترقی نے بین الاقوامی اختلافات کی خلیج کو تنگ تر کر دیا ہے۔ مختلف اقوام کے نوجوان باہمی ربط سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے رُسل و رسائل کے ذرائع میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے۔ اور حکومتِ برطانیہ کے استحکام کی ایک اور سبیل پیدا ہو گئی ہے۔ اس عالمگیر حکومت کے دُور افتادہ حصص میں ایک نیا رشتہ استوار ہو رہا ہے۔ لیکن ہوا بازی کی ترقی سے اہلِ عالم کے دلوں میں بہت سی غلط توقعات قائم ہو گئی ہیں۔ اکثر لوگ اسے امن کی دیوی کہنے لگے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ یہ نسلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر تہذیب کو گرانقدر فائدہ پہنچائے گی۔ دنیا کی مختلف قوموں کے میل جول سے تمام انسانوں کو اخوت کے رشتہ میں جکڑ دے گی۔ بلکہ مریخ اور چاند والوں کو ہمارا حلیف یا محکوم بنا دے گی۔ ان غلط تصریحات کا جواب لارڈ برکن ہیڈ آنجہانی کے حسب ذیل الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہوا بازی کا اثر انسانی سیاسیات اور تعلقات پر کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ نہیں۔ بارہا تاریخ اِس بات کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ کہ جب کوئی ایجاد لوگوں کے سامنے آئی۔ انھوں نے یہ خیال کیا۔ کہ یہ رنگ و نسل کے اختلافات کو مٹا دے گی۔ اور ایک خوشحال اور پُر امن دور کے آغاز کا موجب ہو گی۔ تلغراف۔ ریل گاڑیوں۔ دخانی جہازوں۔ لاسلکی اور تعجب تو یہ ہے کہ ٹیلیفون کو بھی امن کا پیامبر سمجھا گیا۔ لیکن انھوں نے موعودہ توقعات کے پورا ہونے کا کوئی نمایاں ثبوت نہیں دیا۔

"ایسی توقعات رکھنے والوں کو یہ یاد نہیں۔ کہ یورپی تہذیب چھ سو سال تک ایک ہی مذہب اور فلسفۂ زندگی کے زیر اثر رہی۔ لیکن یہ فلسفہ اور مذہب جنگوں کے انسداد میں بُری طرح ناکام رہے۔ اور جب لڑائیاں چھڑیں تو بربریت اور ظلم کے مظاہروں کی کوئی روک تھام نہ کر سکے۔

"جب مذہب اور فلسفہ کی یک رنگی جس کا اثر دل و دماغ اور اخلاق پر ہوتا ہے۔ قوموں کی بربریت اور ہلاکت آفرینی کا خاتمہ نہ کر سکی۔ تو خشکی اور سمندر کے بجائے ہوا کے ذریعہ سے سفر کرنا کس طرح جنگوں کا خاتمہ کر سکے گا؟

"ہوا میں انسان کی فاتحانہ جد و جہد امن کا پیام بننے کے بجائے ایک ہیبت ناک ہتھیار جنگ کے جنونی شیدائیوں

کو نذر کرے گی۔

"یہ جنگ جو سپاہی اور امن پسند شہری دونوں کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ عزت اور تہذیب کے اُصولوں کا خاتمہ کردے گی۔ اور دنیا کے ضمیر پہ کاری ضرب لگائے گی۔"

جس مقالہ سے مذکورہ بالا اقتباسات لئے گئے ہیں۔ اسی میں مذکور ہے کہ قومیں خشکی یا سمندر پر شکست کھاکر دیوانی ہوجائینگی۔ شرافت کا احساس ان کے دلوں سے جاتا رہے گا اور وہ دشمن کی سوتی ہوئی رعایا پر فضائے آسمانی سے ہلاکت آفرین گیس یا دیمول کی بارش کریں گی۔ بیگناہوں کو خاک وخون میں تڑپائیں گی۔ اور تہذیب انسانی کو اپنے ظالمانہ ہاتھوں سے سپردِ خاک کریں گی۔

مادہ پرست یورپ نے یہ حقیقت فراموش کردی ہے کہ محبت اور صلح کا محرک دل ہوتا ہے۔ بیرونی ساز وسامان اس مقصد کے لئے بیکار ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے ایک نفسِ پاکیزہ کی اور بے غرض دل کی۔ اگر وہ چاہتا ہے۔ کہ نوعِ انسان محبت کے زرّیں رشتہ میں منسلک ہوجائے تو اسے پہلو میں ایک قلبِ حسّاس لے کر مشرق سے ملنا چاہیئے۔ مادہ پرستی دنیا کو جنگ کے مرض سے نہیں بچاسکے گی۔ اب محبت بھری رُوح کو آزماکر دیکھے۔

مغرب کو اپنی مادی قوتوں پر بہت ناز ہے۔ یورپ اور امریکہ کے فلسفی رات دن یہی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ کہ عنقریب چاند اور مریخ اُن کے زیرنگیں ہوں گے۔ امریکن لڑکیاں بے تابی سے اُس دن کی منتظر ہیں۔ جب کوئی مریخ کا رہنے والا اُن سے شادی کی درخواست کرے گا۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اِس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا۔ کہ ابھی وہ دن بہت دُور ہے۔ مریخ کے سفر کے لئے بہت پائدار اور تیز رفتار ہوائی جہازوں کی ضرورت ہے۔ آجکل کے طیاروں میں یہ نقص ہے۔ کہ وہ زیادہ بلندی پر تو بے خوف وخطر پرواز کرسکتے ہیں۔ لیکن اُن کے لئے کم بلندی پر آہستہ پرواز کرنا خطرناک ہے۔ کئی طیارے صرف اسی نقص کی وجہ سے پاش پاش ہوچکے ہیں۔ مشہور عالم موجد ڈی لے سیروا کا طیارہ بھی اسی غلطی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ ہوائی جہازوں کو دوسرا خطرہ ہائیڈروجن سے ہے۔ اس گیس کو بہت جلد آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے ہروقت تباہی ہوابازوں کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ آر ۱۰۱ کے جلنے کا باعث بھی ایک حد تک یہی تھی اسکی جگہ ہیلیم گیس (Helium) کے استعمال کی تجاویز کی جارہی ہیں ہیلیم کو آگ لگ جانیکا کم خطرہ ہے لیکن یہ گیس بہت نایاب ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مریخ کے سفر کی امید بیس سال تک قطعاً بے بنیاد ہے خود امریکہ کی انجمن بین السیارات کے صدر کی تقریر سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے موصوف نے حال ہی میں ایک جلسے میں کہا "پانچ سال تک ہم ۵۰۰۰ ڈالر کے خرچ سے دو سو میل کی بلندی پر پرواز کرسکیں گے۔ دس سال بعد پانچ لاکھ ڈالر کے صرف سے ہماری ہوائی ڈاک بیس منٹ میں سمندر پار پہنچے گی اور بیس سال کے بعد ہم اپنا جہاز پہلی دفعہ چاند کی سطح پر اُتار سکیں گے۔

لیکن کیا مغرب کے علمدارانِ تہذیب سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ چاند اور مریخ کے باشندوں سے (اگر واقعی اُنکی کوئی ہستی ہے) محبت کی پینگیں بڑھانے سے پہلے زمین کی خبر لیں۔ ہر عازمِ مریخ کو سعدی کا یہ شعر سنادینا چاہیئے:- تو کار زمیں را نکو ساختی + کہ با آسمان نیز پرداختی؟

عطاءاللہ کلیم

راگ

"لو یہ ریکارڈ سنو" یہ کہہ کر اُس کے دوست نے گراموفون کی سُوئی کو گھومتی ہوئی پلیٹ پر رکھ دیا۔ راگ شروع ہُوا ......
میٹھے سُروں کو سُن کر ایک عجیب خوشی سی اُس کے کانوں سے شروع ہو کر اُس کے دل تک پہنچی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ جھومنے لگا۔ اور ایک پاؤں نے بے ساختہ تال دینی شروع کر دی۔

اُس کے دل میں ایک جلن سی محسوس ہوئی۔ خدا جانے کن مدتوں کے سوئے ہوئے جذبات جاگ رہے تھے۔ کن جنموں سے بجھائی ہوئی آگ سُلگنے لگ گئی تھی؟ ......

وہ ایک دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ پانی پر چاند کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ دریا بل کھاتا ہُوا بہہ رہا تھا دُور اُفق کی طرف، میدان وسیع، دھندلا، نیلا ہر طرف پھیلا ہُوا۔ رات غیر محدود، ستاروں میں اک جھلملاہٹ، ہر شے میں مستی، موسیقی ......

اب وہ پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ خاموش اُونچے اُونچے پہاڑوں کو۔ جن پر کالے کالے بادل چھا رہے تھے۔ اُن کا رنگ نیلا تھا۔ گہرا نیلا۔ اور اُودا۔ دُور کسی گھاٹی پر ایک بھُولی بھٹکی سی دھوپ کھیل رہی تھی۔ خاموشی میں ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ راگ ......

وہ چٹانوں میں کھڑا تھا، نیچے دریا پتھروں سے ٹکراتا ہُوا، کف اُڑاتا ہُوا بہہ رہا تھا۔ پانی میں تلاطم۔ موجوں کا شور، چاروں طرف پہاڑ، دامن میں تاریکیاں لئے ہوئے، اُونچے اُونچے پہاڑ۔ شام، پانی میں راگ کی گہرائیاں۔ راگ کا جوش۔ راگ کا درد ...... وہ جوان تھا۔ اُس کے سینے میں بھی ایک پُرجوش سمندر لہریں لے رہا تھا۔ دل میں ہزاروں خواہشات، امیدیں، جسم میں زور، رگوں میں گرم گرم خون تڑپتا ہُوا، رُوح میں بے تابیاں —— عشق!

آہستہ آہستہ اندھیرا چھا گیا۔ اب نہ دریا تھا۔ نہ پہاڑ۔ وہ ایک سنسان میدان میں تھا۔ چاروں طرف کھنڈر، مسمار شدہ عمارات، خاموشی، حسرت ...... ستارے ایک ایک کر کے نکلنے شروع ہوئے۔

زندگی کی نا امیدیوں، نا انصافیوں، سختیوں، بدصورتیوں نے اُس کے دل میں درد، بیزاری اور غصہ پیدا کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے اِس دُنیا کو ......

راگ نرم اور ہلکا ہُوا، آہستہ آہستہ۔ درد، ہلکا درد، پیدا کرتے ہوئے پھر جاگی وہی محبت اُس کے دل میں۔ اب اس جذبے

میں وہ پہلا سا جوش نہ تھا۔ وہ جوانی کی ایک حسرت لئے ہوئے تھا۔ لیکن اس میں ایک گہرائی تھی۔ وہ گہرائی جو غم کو سہ لینے اور سمجھ لینے سے آتی ہے۔ زندگی کی بیزاری دُور ہوئی۔ وہ اکیلا کھڑا تھا۔ اُس کی رُوح ایک پُر امن مسرت میں غرق ہو رہی تھی۔ چاروں طرف گہرائیاں محبت کی ۔۔۔۔ راگ ۔ راگ ۔ راگ ....

سرسر .... اُف اِک جادُو تھا جو ٹوٹ گیا۔ وہ بیٹھا تھا اپنے دوست کے کمرے میں۔ جس نے ایک لکڑی کے بکس کے پاس کھڑے ہو کر سوئی کو پلیٹ سے اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا پسند آیا میرا ریکاڈ؟"

وہ خاموش تھا۔ سر کو ہاتھوں میں لئے ہوئے۔ کمرہ بدصورت تھا۔ کرسیوں کا رنگ آنکھوں کو بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ باہر شور تھا۔ اُف کتنا شور۔ زندگی خالی تھی۔ آہ۔ کس قدر خالی!

م۔ ز

قطعات

(۱)

سحر میں پہلی سی دِل چسپیاں نہیں ہیں اب
تمہارے وقت کی اب رونق بہار نہیں
یہ چاند اور ستارے وُہی ہیں لیکن اب
جو تُو نہیں تو میرا کوئی غمگسار نہیں

(۲)

میرے خیال کی دُنیا یہی ہے، اور نہیں
مَیں اور تُو یہی منزل یہی مقام یہی
جو فرق ہے۔ تو بس اِتنا کہ ہم اکیلے ہیں
خدا کرے۔ میری دُنیا رہے مُدام یہی!!!

(۳)

پھسل رہی ہیں نگاہیں کسی کے مکھڑے سے
خیال "غیرِ خدا" سے اُلجھ رہے ہیں کیوں؟
میں کیوں کسی سے جُدا ہو رہا ہوں اب ناصر
رقیب مجھ کو اب اپنا سمجھ رہے ہیں کیوں؟

ناصر عسکری

شاہین

سر ہیوبرٹ کی قسمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور اس کے غیر معمولی حُسن، اُس کے خاندانی اعزاز، اس کے وسیع مرغزاروں اور زرخیز وادیوں پر ہر کسی کو رشک آتا تھا۔ لوگ اُس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک حقیقی انسان میں ہونی چاہئیں۔ باوجود بے حد دولت مند ہونے کے وہ انتہا درجے کا نیک دل اور منکسر المزاج تھا۔

تمام عورتیں (بجز ایک کے) دوسرے مردوں کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کے لئے اُسی کو معیار سمجھتی تھیں۔ چنانچہ اکثر لڑکیوں کو جب اس جیسا شوہر نہ ملا، تو نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ محبت اور اس کی مسرتوں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہوگئیں۔

جب کبھی سراپا تبختر میبل اس کی مہمان ہوتی وہ ایسی شاندار دعوتیں دیا کرتا۔ جن کا مقابلہ بادشاہ بھی بمشکل کر سکتے تھے۔ اور اِن شاہانہ تقریبوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اسے اپنی کامیابی کی بہت کچھ امید تھی۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس کی امید یاس میں تبدیل ہوتی گئی، اور اُسے اپنا مال و متاع ایک بے مصرف چیز معلوم ہونے لگا۔ چنانچہ اُس نے اپنی سب دولت بے پروائی سے لٹا دی، اور آخر ایک دن ایسا آیا کہ ہیوبرٹ بے خانماں ہوچکا تھا۔ اور میبل کی شادی ایک دولت مند سردار سے ہوگئی۔ اب سر ہیوبرٹ نے وہ شہر چھوڑ دیا جہاں میبل رہتی تھی۔ اور اپنے ایک کھیت میں چلا آیا۔ اس کی تمام زرخیز وادیوں میں سے اس کے پاس یہی ایک زمین کا ٹکڑا باقی رہ گیا تھا۔ یہاں وہ اپنے ہاتھ سے کاشت کیا کرتا تھا۔ محنت و مشقت کی وجہ سے محبت کا جگر خراش غم آہستہ آہستہ سکون پانے لگا، اور اُس کے سینے کا درد انگیز بوجھ کسی قدر کم ہوگیا۔ بلکہ وہ اپنی اس قربانی پر نازاں تھا جو اُس نے محبت کی قربانگاہ پر نتائج سے بے نیاز ہوکر کی تھی، اور جس نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔

اب اس کا رفیق صرف ایک شاہین تھا۔ جو اپنی خوبصورتی، جسامت اور ہنرمندی کی وجہ سے بہت مشہور تھا، اور جسے اس نے اپنی تباہی کے دوران میں اس لئے بچا لیا تھا۔ کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں میبل کی آنکھوں کے مشابہ تھیں۔ عموماً شام کے وقت وہ شاہین کو اپنے پاس بٹھاتا۔ شاہین اس کی طرف دیکھتا اور پر پھڑپھڑاتا، ہیوبرٹ اس سے قسم قسم کے سوال کرتا۔ اور شاہین کی آنکھوں میں ہمدردی کے آثار پاکر اُس کی زندگی کا وہ خوفناک تسلسل چند گھڑیوں کے لئے ٹوٹ جاتا جس میں شہروں اور آبادیوں کے ہنگاموں سے دُور رہنے والے انسان کا واہمہ اپنے اردگرد جنگل کی بھیانک اور خاموش فضا میں ہزاروں مہیب خیالی صورتیں رقصاں دیکھتا ہے۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ترکِ دنیا اور تسلیم و رضا کی وجہ سے اس کا دل مطمئن ہوتا گیا - اور اگرچہ شریف سینوں میں محبت کی چنگاری ایک مرتبہ سلگنے کے بعد کبھی نہیں بجھ سکتی، لیکن پھر بھی اب وہ نہایت ٹھنڈے دل سے میبل کو یاد کر سکتا تھا۔ اور اس کے دل کا وہ پہلا اضطراب ایک یاس انگیز سکون میں تبدیل ہو چکا تھا -

جو لوگ کچھ عرصہ جدا رہنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ محبت کی آگ اب ہمیں نہیں جلاتی اور اس کی چنگاریاں ہمیشہ کے لئے ہمارے سینے میں راکھ ہو چکی ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں - کیونکہ ان کا قلب ہمیشہ کے لئے اس کے نور سے منور ہو چکا ہوتا ہے - اور اس سے پہلے کہ محبت کا بھڑکا یا ہوا ایک چھوٹے سے چھوٹا شعلہ بھی سرد ہو، مصر کے اہرام روئے زمین پر نظر نہ آئیں - بلکہ اُن کی بجائے ریت کے گمنام و بے نشان تودے ہوا میں اِدھر اُدھر بھٹکتے دکھائی دیں -

آخر ایک دن سر ہیوبرٹ نے سنا کہ میبل بیوہ ہوگئی ہے - اور اُس کے متوفی شوہر کی تمام جائداد کا وارث اس کا اور میبل کا خردسال اکلوتا بچہ ہے -

موجودہ صورت میں سر ہیوبرٹ نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کو میبل سے کوئی سروکار نہ ہو - خواہ اب وہ اس پر مہربان ہی کیوں نہ ہو جائے - کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خواہ میبل محبت کی خاطر غریبانہ زندگی اختیار بھی کر لے - لیکن اُسے ہیوبرٹ کی طرح اس بات کا سچا احساس کبھی نہ ہوگا - کہ غریبی بھی ایک دولت ہے - اور اس سے انسان کو سچی تسکین، امن، اور روحانی آزادی حاصل ہو جاتی ہے +

ایک صبح جب وہ زمین کھودنے کے بعد بیلچہ ہاتھ میں لئے ہوئے ذرا سستا رہا تھا - اُسے میبل کا خیال آیا - اور اُس نے میبل کے لئے خدا سے برکت مانگی اور دُعا کی - اس کے بعد اُس نے میدان پر نظر ڈالی - یکایک اُسے اپنا آپ اور اپنے اردگرد کی سب چیزیں بشاش، روشن اور خوبصورت نظر آنے لگیں - یہاں تک کہ اسے اپنا دل بھی وسیع اور منور معلوم ہونے لگا -

خوشگوار ہوا چل رہی تھی - آسمان پر اِدھر اُدھر بدلیاں تیر رہی تھیں - اور درختوں کی ٹہنیاں مستانہ وار جھوم رہی تھیں - قسم قسم کے جانور درختوں پر اپنے شیریں راگ الاپ رہے تھے - اور ایک بلند درخت پر کوئل اپنی سُریلی آواز میں "کو کو" کر رہی تھی، لیکن ہیوبرٹ اِن سب مناظر سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا، اُس کے دل میں نورانی جذبات کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا، اور وہ دل میں بے حد سرور اور طمانیت محسوس کر رہا تھا -

ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنی نظریں آس پاس کی چیزوں پر ڈالیں - اب نقشہ بدل چکا تھا، خاموش آسمان پر اب بادل نہ تھے - بلکہ دور پہاڑیوں کے پیچھے چلے گئے تھے - اور سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے بادلوں کے یہ ٹکڑے یوں معلوم ہوتے تھے، جیسے پہاڑیوں کے پیچھے نورانی پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ ہے - درخت ساکن اور پرند خاموش ہو چکے تھے - اور ہوا تھم گئی تھی -

آخر اس خاموشی نے بلبل کو بیدار کیا، اس نے چمکیلی اور خوشگوار دھوپ میں نغموں کا ایک طوفان اٹھا دیا۔ پہلے اس نے آہستہ آہستہ گانا شروع کیا۔ اور پھر بتدریج اُس کی آواز تیز ہوگئی۔ آخر وہ دیوانہ وار گانے میں محو ہوگئی۔ یہاں تک کہ فضا میں اس کے نغموں سے ایک تلاطم برپا ہوگیا۔ پھر یکایک اس نے بھی یہ پُرکیف نغمے بند کر دیئے۔

اب حنا کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی، اور ہیوبرٹ نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ یہ اس کی نظر کا فریب ہے، لیکن ایک لمحے کے بعد اس کے گھٹنے اور ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی میبل کے سامنے جھک گئیں۔ وہ ایک درخت کی شاخوں کے پیچھے سے ایک خوبصورت پھول کی طرح نمودار ہوئی۔ جب وہ ہیوبرٹ سے مخاطب ہوئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں کے خوبصورت نیم وا پردے نرگس کی نادمیدہ کلیوں سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے کہا "سر ہیوبرٹ آج میں پرانی دوستی کے بھروسے پر تم سے ایک سوال کرنے آئی ہوں، اور ہمیشہ تمہاری احسان مند رہوں گی . . . ." آہ اُس کی آواز تازہ شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی، پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی جنوبی ہوا سے بھی زیادہ شیریں، ایسی شیریں اور خوشگوار جیسے ٹھنڈا اور میٹھا انار، ایک تشنہ لب مسافر کے لئے، جس کے حلق میں پیاس کے مارے کانٹے پڑ گئے ہوں۔

پھر خاتون نے سر ہیوبرٹ کے غریبانہ جھونپڑے پر ایک نظر ڈالی اور اُس کے بعد بلیچہ پر جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس پر میبل کے دل نے اسے ملامت کی کہ وہ اس سے کتنی نامناسب درخواست کرنے آئی ہے، چنانچہ اس نے نہایت نرم آواز میں کہا۔ "میں اور میرا نوکر تھکے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں اپنی درخواست ملتوی کر سکتی ہوں اور اگر تمہیں تکلیف نہ ہو، تو آج دوپہر کا کھانا میں تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔"

ہیوبرٹ نے بہت جلد کھانا پکانے کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اسے معلوم ہوا کہ اس کے جھونپڑے میں کوئی کھانے کی چیز موجود نہیں، اور اس کا غریبانہ نعمت خانہ خالی ہے۔ اس کے قریب کوئی ہمسایہ بھی نہ تھا۔ جس سے وہ کچھ مانگ سکتا، اور اتنا وقت بھی نہ تھا۔ کہ وہ جلد جلد کوئی شکار لا سکتا یا اپنے شاہین ہی کو شکار کی تلاش میں چھوڑتا، جو اس کی کلائی پر آگے پیچھے چل رہا تھا۔ اور نہایت محبت سے اس طرح اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے مالک کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے۔ آخر نیک دل سردار کا چہرہ ایک لمحے کے لئے اطمینان کی روشنی سے چمک اٹھا۔ لیکن ساتھ ہی اس پر غم کی تاریکی بھی چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شاہین کی قربانی کا اندازہ کر رہا ہے، جو پر پھیلائے ہوئے اس کے ساتھ کھیل رہا تھا، اس نے شاہین کو اپنے ہاتھ پر سے اس ہاتھ پر سے، جس پر وہ نہایت محبت سے کھیل رہا تھا، اور جس پر اسے بے حد اعتماد تھا اُٹھا لیا، اور وفادار پرندے کے نرم و نازک جسم کو اپنے بے رحم ہاتھوں سے پکڑ کر ہیوبرٹ نے اس کی جان لے لی! اور اسے صاف کر کے پکانا شروع کر دیا ::

کھانے کے دوران میں میبل نے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہ" میرے ضدی بچے کو تمہارے مشہور پرندے کا جنون ہوگیا ہے۔ ایک مدت تک میں اُس کی خواہش کو دباتی رہی ہوں۔ یہاں تک کہ اسی خواہش نے اسے بیمار کر دیا ہے۔ اور اب وہ بخار میں بھی روتا ہے۔ اور ضد کرتا ہے۔ کہ مجھے سر ہیوبرٹ کا شاہین لا دو"۔

سر ہیوبرٹ کا ہاتھ وہیں رک گیا اور اُس نے کہا" آہ دیکھو"۔

اس کے بعد خاتون نے نہایت شریفانہ انداز میں کہا" سر ہیوبرٹ! مجھے بے حد رنج ہوتا ہے۔ کہ میں تمہاری اِس مہربانی کا بدلہ اتارنے سے قاصر ہوں۔ تمہاری اس شاہانہ ضیافت کے احسان کے بارے میں کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، لیکن اگر آج سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ طور پر پیش آسکتے ہیں۔ تو میرے غریبانہ دسترخوان پر تم اتنا ہی حق رکھو گے۔ جتنا کہ خود تمہیں اپنے دسترخوان پر حاصل ہے"۔

اس کے بعد وہ جھک کر آداب بجا لائی اور وہاں سے رخصت ہوگئی۔ ہیوبرٹ کے مایوس اور مغموم دل سے اُسے بجز پریشانی کے کچھ حاصل نہ ہوُا۔

کئی ماہ گذر گئے لیکن ہیوبرٹ کبھی میبل کے پاس نہ گیا۔ وہ زندگی کے دن اسی خاموشی سے بسر کرتا رہا، آخر ایک روز میبل نے اپنا آدمی اس کی طرف بھیجا کہ" اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو یہاں آؤ مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں"۔ چنانچہ وہ میبل کے پاس گیا، اُس نے نہایت تپاک اور گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا اور بڑی تواضع کے ساتھ پیش آئی۔ اُس نے کہا۔" مجھے پوری امید تھی۔ کہ تم کسی روز میرے مہمان ہوگے اور میں مدت تک تمہارا انتظار کرتی رہی لیکن اب مجھے معلوم ہوُا ہے کہ میں غلطی پر تھی، اور تم اُس سے بھی کہیں زیادہ مغرور ہو جتنا لوگ تمہیں خیال کرتے ہیں"۔

ہیوبرٹ پر میبل کے غیر معمولی حسن کا رعب طاری ہوگیا، لیکن پھر بھی اس نے بغیر گھبرانے کے نہایت ادب اور اخلاق سے اُسے جواب دیا، اور کچھ اس انداز سے گفتگو کرتا رہا، جس طرح دو معمولی دوست آپس میں کرتے ہیں۔ اس کا باعث ہیوبرٹ کا غرور نہ تھا اور نہ اس کی یہ وجہ تھی کہ اُسے میبل کے یہ الفاظ یاد تھے۔ کہ" ہم دوستوں کی طرح آپس میں مل سکتے ہیں"۔ بلکہ اس بات کا سبب وُہی تھا جو ہمیشہ رہا، یعنی اس کا شیوۂ تسلیم و رضا، دوسرے اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ننھا وارث مر چکا ہے، جس کی زندگی نے ہیوبرٹ کے اظہار محبت سے احتراز کو اور بھی زیادہ موجب تسکین بنا رکھا تھا۔ اس وقت وہ نہایت اطمینان سے اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ اسے میبل کے بلانے کا مقصد معلوم ہو۔

میبل سر ہیوبرٹ کی یہ عجیب حالت دیکھ کر جو اُس کے کردار سے بالکل مختلف تھی، سخت حیران تھی، آخر اُس نے کہا۔ " سر ہیوبرٹ! میں ایک زمانے میں غیر مآل اندیش اور اس لئے مغرور بھی تھی، تمہاری محبت میرے دل پر سورج کے مانند

چمکی تھی، لیکن افسوس کہ میں تمہارے لئے ایک تاریک بادل بن گئی، اور اُس روشنی کو میں نے چھپا دیا، جس نے مجھے منوّر کر رکھا تھا، کاش میں تمہارا قرض اُتار سکوں، یعنی اگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ مجھے کچھ معلوم نہیں کیونکہ حالات بدل چکے ہیں، اور تم دوسرے لوگوں کی طرح بھی نہیں ہو۔"

میبل نے اپنے مطلب کے اظہار کی بہت کوشش کی۔ لیکن ساتھ ہی اس کا چہرہ اس خیال سے سرخ ہو گیا۔ کہ مبادا ہیوبرٹ اس کے مافی الضمیر کو سمجھ جائے۔

ادھر ہیوبرٹ کو یہ خطرہ ہوا کہ میبل شائد اسکی محبت کا بدلہ محبت سے کسی کم درجہ کی چیز سے اتارنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ شاہین کی جان لے کر میں نے گناہ کیا۔ اُس کی آنکھیں میبل کے چہرے پر سے ہٹ کر غم سے جھک گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُٹھیں اور میبل کے سیاہ لباس پر پڑیں، یاس کے تیرہ و تار بادلوں کے پیچھے اُسے امید کی ایک شعاع چمکتی ہوئی نظر آئی، اور اس کا پُرحسرت چہرہ ایک ایسی روشنی سے چمک اُٹھا، جو اس وقت نمودار ہوتی ہے جب چاند بڑی کوشش سے کسی بادل کے کنارے سے نکلتا ہے۔ اور آخرکار پورے کا پورا اس طرح نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے مہرِ نیمروز۔

آخر اُس نے کہا "اے خاتون! میں نے محبت کی ہے لیکن ہمیشہ خاموش رہا ہوں، اور مدت تک اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن اب میں دیکھتا ہوں۔ کہ اس کے اظہار کا وقت آگیا ہے۔ اور آہ اے ملکۂ حسن! میں سچی دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب سردار ہوں گا۔ اگر تو نے مجھے اپنی محبت کے قابل سمجھا"

میبل کا ایک سفید اور نازک ہاتھ اپنے مضطرب دل پر تھا۔ اور دوسرا سر ہیوبرٹ کے پرستار ہاتھوں میں، آخر میبل کی سُریلی آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی سسکیوں اور آنسوؤں کا ایک طوفان اپنے ہمراہ لئے ہوئے نکلی:۔

"مجھے تمہاری محبت قبول ہے۔"

اب سر ہیوبرٹ کی قسمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور اس کی سیاہ آنکھوں والی حورِ مجسّم دلہن، اُس کے وسیع مرغزاروں اور زرخیز وادیوں پر ہر کسی کو رشک آتا تھا +

"ع" ہیٹمور

نواہائے راز

انجام دیکھنا ہو ہوسِ عزّ و جاہ کا ۔۔۔ یا شور واہ واہ کا، یا آہ آہ کا

شہرت ہے چار سُو مرے بختِ سیاہ کی ۔۔۔ چرچا ہے ہر طرف مرے حالِ تباہ کا

ہر وقت، ہر گھڑی ہیں یہی آزمائشیں ۔۔۔ اے بے وفا یہ ڈھنگ نہیں ہے نباہ کا

ظلمت میں نور، نور میں ظلمت کشودہ رُخ ۔۔۔ پھیلا ہُوا ہے دام فریبِ نگاہ کا

حسنِ خیال و حسنِ نظر چاہیئے یہاں ۔۔۔ ہر ذرّہ اک نقاب ہے خورشید و ماہ کا

اے دل تقدرِ شوق کہاں ہے بہارِ خُلد ۔۔۔ شاید سراغ ہو یہ کسی جلوہ گاہ کا

دیتا ہے حسبِ حوصلہ مے ساقیٔ سخن
اس میں اجارہ ہے نہ گدا کا نہ شاہ کا

حامد علی خاں

جنگ کیا ہے؟

اے جنگ تو کیا ہے؟

شاندار فتح کے بعد تیری عظمت کا باقی کیا رہ جاتا ہے؟

مفتوح کے لئے زنجیریں ـــــ مگر مغرور فاتح کے لئے کیا؟

آہ حکومت، تباہ حال قوموں پر حکومت!

ایک خرابہ جس کی آبادی ایک شخص کے جرم، ایک شخص کی حرص کی نذر ہوگئی!

لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور مسکراتے ہوئے چمن اب کیا ہیں؟

لق و دق میدان!

یہاں پُر شوکت معبد وحشی درندوں کے بھٹ اور منحوس پرندوں کا مسکن ہیں۔

وہاں پُر رونق شہر سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں۔

اور اس عالمگیر تباہی میں سر بلند محلات کا نشان تک نظر نہیں آتا!

ہاں ہاں، وہاں ایک عظیم الشان محل ہی تو تھا جہاں اب دھواں اُٹھ رہا ہے!

جب فتح کی مسرت کا ترانہ فاتح کے کانوں تک پہنچتا ہے۔

اور اس کے غرور کو تسکین دیتا ہے۔

تو فطرت کا ساز بے آہنگ ہوجاتا ہے۔

فطرت کا ساز جو ہم آہنگ تھا معصوم لڑکیوں کی چیخوں کا

جو اپنے بھائیوں کا ماتم کرتی ہیں!

ماؤں کے نالہ و بکا کا جو کرب و اضطراب میں ہاتھ ملتی ہیں

اور اپنے بیٹوں کو پکارتی ہیں!

آہ، فتح کا دامن خون کے دھبوں اور بیوہ کے آنسوؤں سے کتنا آلودہ ہے!

منصور احمد

(ہشا مور)

ابنِ رُشد

یہ حقیقت کسی دلیل و بُرہان کی محتاج نہیں ہے کہ روحانی برکات اور تزکیہ نفس کے ساتھ اسلام نے علم و ادب کی بھی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں۔ کہ جس شعبۂ علم وحیات کی طرف مسلمانوں نے توجہ کی اُسے بیش بہا ترقی حاصل ہوئی۔ اسلام کے گرانمایہ ادبی خزانوں کا ایک تابناک گوہر علامہ ابنِ رُشد ہے جس کے علمی کارناموں کا دنیائے علم و ادب پر غیر فانی احسان ہے۔

ابنِ رُشد اوائل سنہ ۵۲۰ھ ہجری میں ہسپانیہ کے ایک شریف اور مشہور علم نواز گھرانے میں پیدا ہوا۔ جو علاوہ عزتِ خاندانی کے علم وفضل میں بھی ممتاز تھا۔ چنانچہ اس کے دادا اشبیلیہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ ایک فطرتاً ذہین بچہ جس نے منزلِ حیات میں آکر پہلی سانس علمی فضا میں لی ہو۔ ظاہر ہے۔ کہ اعصاب جسمانی کی تدریجی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کے قوائے ذہنیہ اور جذبات عالیہ کی کیا کیفیت ہوگی۔ اس کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے کہ آغاز شباب ہی میں ابنِ رُشد اشبیلیہ کا قاضی ہوگیا۔ اور ابومحمد بن مغیث قاضئ قرطبہ کی وفات پر قرطبہ کی خدمتِ قضا اس کو تفویض کی گئی۔ جن حضرات نے اسلامی سلطنتوں کے نظم ونسق اور جاہ وجلال کے حالات کا کتب تاریخ میں مطالعہ کیا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اُس زمانہ میں خدمتِ قضا کس قدر اہم اور مہتم بالشان خدمت تھی۔ شباب کی پہلی منزل میں پہنچکر ایسے عظیم المرتبت ذمہ دارانہ عہدہ پر ماموری اس امر کا واضح ثبوت ہے۔ کہ باوجود قلتِ تجربہ کے ابنِ رُشد نے اپنی علمی وادبی قابلیت سے اربابِ حکومت کو غیر معمولی طور پر متاثر کر دیا تھا۔ یہ اس علم پرور اور معارف نواز عہد کا ذکر ہے۔ جبکہ مسلمانوں میں سینکڑوں ابنِ سینا اور افلاطون موجود تھے۔ خدمتِ قضا کو اُس نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ سلطنت موحدین کے پہلے فرمانروا عبدالمومن نے جو خود بھی ایک بہترین ادیب اور فاضل تھا ابنِ رُشد کو بلاکر دربار شاہی کے اراکین میں داخل کر لیا۔ ۵۴۷ھ میں جب اس کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی۔ وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا اُندلس سے لے کر مراکش تک تمام علاقے ابنِ رُشد کی حدود قضا میں آگئے۔ ۵۵۶ھ میں عبدالمومن نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یوسف تخت نشین ہوا۔ یوسف ایک غیر معمولی دماغ کا شخص تھا۔ جو علاوہ فضل وکمال کے بلند حوصلہ اور صاحب عزم تھا۔ عبدالمومن نے اُس کی تربیت کے لئے علاوہ علماء کے اہلِ شمشیر بھی مقرر کئے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ اگر ایک طرف دریائے علم میں وہ گھوڑے دوڑاتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری جانب میدانِ کارزار میں اس کی شمشیر خارا شگاف کو شجاعت سجدہ کرتی ہوئی

دکھائی دیتی ہے۔ اُس زمانہ میں عیسائیوں نے ٹالیڈو (طلیطلہ) کو دارالسلطنت بناکر ہسپانیہ کے اکثر اضلاع مسلمانوں سے لے لئے تھے ۔ پرستارانِ صلیب طوفان کی طرح دنیائے اسلام پر چھائے جاتے تھے۔ لیکن یوسف کے عزم و ہمت اور مردانگی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں سے غصب کیا ہوُا زمین کا ایک ایک چپہ واپس لے کر چھوڑا +

کہا جاتا ہے۔ کہ علم و شجاعت کا ایک ہستی میں اجتماع محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن یوسف واقعی شجیع بھی تھا۔ اور عالم بھی۔ فلسفہ کے سلسلہ میں ابنِ رُشد کا سب سے بڑا کارنامہ تصنیفاتِ ارسطو کی شروح ہیں۔ لیکن اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے والا حقیقت میں یوسف ہے۔ جس کی ترغیب سے اُس نے ایسی اہم ذمہ داری کو اپنے سر لیا۔ ارسطو کے فلسفیانہ مقالات کی بلند پائگی اور دقّت معنوی مسلّم ہے۔ معمولی سے معمولی موضوع پر اُس کی عجیب و غریب توضیحات دیدنی ہیں۔ ایسے مشکل مضامین کی شرح کرنا ابن رُشد ہی کا حصہ تھا۔ یوسف نے ابن رُشد کی بہت قدر دانی کی اور اس کو بڑی حد تک فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا۔ اس کی وفات کے بعد ۵۸۰ھ میں اس کا بیٹا یعقوب منصور تخت نشین ہوُا، منصور نے اپنے باپ سے زیادہ ابن رشد کو نوازا، لیکن افسوس ایک خفیف سی بات پر منصور کی نوازشوں کا دریا ابن رشد کے لئے خشک ہو گیا۔ اور وہ پیکرِ علم و کمال تباہی و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ منصور باوجود اپنی فیاضیوں اور اولوالعزمیوں کے انتہائی تنگ مزاج اور نخوت پسند تھا، صرف اس بات پر کہ سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس نے اس کو امیرالمومنین کے لقب سے مخاطب نہیں کیا تھا وہ سخت برہم ہو گیا۔ اور مدد دینے سے انکار کر دیا۔ منصور کی یہی تنگ ظرفی ابنِ رُشد کی تباہی کا باعث ہوئی۔ ابن رُشد نے جو ارسطو کی کتاب الحیوانات کی شرح لکھی اُس میں زراقہ کے ذکر میں لکھا کہ میں نے اُس جانور کو بربر (یعنی منصور) کے یہاں دیکھا ہے۔ اس معمولی طرزِ خطابت کو منصور نے اپنی صریح توہین سمجھا۔ دوسری وجہ اس کی تباہی کی اُس کے مذہبی خیالات ہیں۔ ابنِ رشد فلسفی تھا۔ اس کا علم محض اوراقِ کتب تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اُس نے ایک مدت کے عمیق غور و خوض کے بعد فلسفہ میں اہم تصنیفات کیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اعتقادِ مذہبی کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ اسی سبب سے بعض مذہبی روایات سے متناقض خیالات کا اظہار عام برہمی اور انتشار کا باعث ہو جاتا ہے۔ مسائل فلسفہ اور مذہبی اعتقادات کا تصادم ناگزیر ہے۔ اس بناء پر ابن رُشد جیسے بلند مرتبہ فلسفی کا بعض فروعی حیثیت کے مذہبی دعاوی کے خلاف اظہار خیال کرنا توقع کے خلاف نہ تھا۔ اُس کے دامنِ فضل پر اقعی یہ بدنما دھبے بہت کچھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ دریائے رحمت ان کی شست و شو خود فرمائے۔ عام مسلمان اس کی طرف سے اس قدر بدظن ہو گئے تھے۔ کہ اگر منصور اُس سے باز پُرس نہ کرتا تو ملک میں مذہبی جوش کی نہ دبنے والی آگ بھڑک اُٹھتی۔ لہٰذا قرطبہ کی جامع مسجد میں ابنِ رشد ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا۔ اور ابو علی بن حجاج خطیب نے کھڑے ہو کر اعلان

کیا کہ ابنِ رشد ملحد اور بے دین ہوگیا ہے۔ اس اعلانِ الحاد کے باوجود رعایا کے مزید اطمینان کے لئے منصور نے ایک فرمان تمام ملک میں شائع کرایا۔ جس میں ملاحدہ کے مذہبی خیالات کی پُرزور الفاظ میں تردید کی۔ اور ان کی تصنیفات کو جلا دینے کا حکم دیا۔"
چنانچہ اس فرمان کی تعمیل شد ومد کے ساتھ کی گئی۔ اور فلسفہ اور منطق کی سینکڑوں تصنیفات نذرِ آتش کردی گئیں۔ یہ سب کچھ ہُوا لیکن چونکہ منصور خود فلسفہ سے غیر معمولی ذوق رکھتا تھا لہٰذا اس بربادی سے بے حد متاثر تھا۔ اُس نے پھر حکم دیا کہ ابوبکر بن زہر کے پاس ان فنون کی کتابیں بھیجدی جائیں۔ ابنِ زہر خود فلسفہ دان اور منطقی تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایک فلسفی نے یہ کب گوارا کیا ہوگا، کہ ان خزانوں کو آگ میں جھونک دے۔ ان تمام غیر خوشگوار واقعات کے باوجود ابنِ رشد کے مصائب کم نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ وہ شہر بدر کیا گیا۔ ایک تو بادشاہ کا معتوب دوسرے عام مسلمانوں کی نگاہوں میں داعیٔ الحاد۔ ظاہر ہے کہ ابنِ رُشد کی کس مپرسی کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ ملک کے جس گوشہ میں بھی گیا ذلیل ورسوا ہُوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اطمینان کے سامان اور امن کے اسباب دنیا سے اُس کے لئے مفقود ہوگئے ہیں۔

منصور نے جو کچھ کیا وہ بادلِ نخواستہ کیا۔ مذہبی جوش کی آگ کو بجھانے کے لئے ایسے ہی چھینٹوں کی ضرورت تھی، جب شعلے ٹھنڈے پڑے تو اُس نے ۵۹۵ھ میں پھر ابنِ رُشد کو مراقش میں طلب کیا۔ منصور کی قدردانی اور اظہارِ فضل وکمال کا اب وقت آیا تھا۔ لیکن موت نے سب اُمیدوں کا خون کردیا۔ اور صفر ۵۹۵ھ مطابق ۱۱۹۸ء میں ابنِ رُشد اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ وفات سے قبل اُس نے بالاعلان اپنے رکیک فلسفیانہ عقائد سے توبہ کی۔ بیرونِ شہر مقام جبانیہ میں دفن کیا گیا لیکن ایک ماہ بعد لوگوں نے اُس کی قبر کھود کر ہڈیاں نکال لیں۔ اور اُن کو قرطبہ لے جا کر اُس کے خاندانی قبرستان مقبرۂ ابنِ عباس میں دفن کیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۷۵ برس کی تھی۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد منصور نے بھی انتقال کیا۔

ابنِ رشد باوجود علمی فضیلت کے بے انتہا منکسر المزاج اور متواضع تھا۔ اگرچہ وہ ایک مدت تک عہدۂ قاضی القضاۃ پر فائز رہا۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ اس کو ملتا وہ غربا اور اہلِ حاجت پر صرف کرتا۔ اپنے وطن کے ساتھ اُس کو غیر معمولی محبت تھی۔ کتب بینی اور مطالعہ سے اُس کو عشق تھا۔ ابن آلابار راوی ہے۔ کہ اس کی کل تصنیفات کے صفحے مجموعی طور پر بیس ہزار ہیں۔ فقہ میں بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، منہاج الادلہ۔ خلاصۃ المستصفیٰ۔ طب میں کتاب الکلیات۔ مقالۃ فی المزاج وغیرہ وغیرہ مشہور کتابیں ہیں، ان کے علاوہ یونانی تصانیف کے متعدد خلاصے اور شرح ہیں۔ آخر وقت میں وہ الٰہیات کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ زندگی میں ابنِ رُشد کی شایانِ شان قدر نہ ہوئی۔ لیکن اُس کے عظیم الشان علمی کارنامے اُس کی موت کے بعد بھی ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے +

منظور حسین ماہر القادری

نقّال کی بیٹی

ذیل میں جاپان کے ایک مشہور ترین گیت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے ۔ یہ گیت اس ملک کے طول و عرض میں اس قدر ہر دلعزیز ہے ۔کہ یہاں کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے ۔جب جاپانی ستار کے ساتھ یہ گایا جاتا ہے ۔تو لوگ اس دردناک راگ سے متاثر ہوکر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں ۔ یہ گیت جو سینکڑوں برس سے اس قوم کے جذبات کو متاثر کرتا رہا ہے ۔جاپانی ادبیات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔اور یہ امر کچھ حیرت انگیز نہیں ۔ خود ہمارے ملکی ادبیات میں عوام کے گیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے ۔کہ اس قسم کے گیت جذبات کی عریاں تصویر پیش کرتے ہیں برخلاف اس کے جو لوگ ایک لٹریچر کو معرضِ وجود میں لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے جذبات کو مشکل الفاظ ۔ادبی تلمیحات ،چست ترکیبوں ۔ استعاروں اور تشبیہوں اور عمیق فلسفیانہ خیالات کے لفافوں میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں ۔ خیر وجہ کچھ بھی ہو ۔ اور خواہ ایسے گیتوں کو ادبیات میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے ۔اِن میں ایک ایسا درد پوشیدہ ہوتا ہے جو خواص و عوام دونوں کے دلوں میں یکساں جذبات کو مرتعش کر دینے کے لئے کافی ہے ۔

موسم خزاں میں بانسری کی آواز پہ ہرن خود تنفر مرنے کے لئے شکاری کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں ۔کیونکہ اس نغمہ میں اُن کو عشق و محبت کا راگ سنائی دیتا ہے ۔

بالکل اسی طرح یِدُو[1] کی حسین ترین دوشیزہ نے جس کے حُسن و کمال کا تمام دارالسلطنۃ والہ و شیدا تھا محض محبت کی وجہ سے آنکھ بند کر کے اپنی جان قربان کر دی ۔

ایک جُرم میں ماخوذ ہوکر وہ حاکمِ شہر کی عدالت میں حاضر کی گئی ۔حاکم نے اِس نوخیز مجرم سے چند سوال کئے ۔
"کیا تیرا ہی نام اُوشِچی ہے ؟ کیا تو ہی نقال کی بیٹی ہے ۔اس قدر کمسن ہونے کے باوجود تجھ کو اپنے باپ کے گھر میں آگ لگانے کی کیونکر جرأت ہوئی ؟"

اُوشِچی روئی اور کفِ افسوس مل کر بولی "جی ہاں ۔ مگر میں نے عمر بھر میں صرف یہی ایک جرم کیا ہے ۔ اور اُس کی وجہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھی غیر معمولی ہے ۔

"کئی برس ہوئے جب اس شہر میں آگ لگی تھی ۔ اور آگ بھی ایسی کہ تمام شہر جل کر خاک ہو گیا تھا ۔ ہمارا مکان

---

[1] ٹوکیو کا پرانا نام ۔

بھی اس وقت جل گیا۔ اور میرے ماں باپ مجھ کو لے کر گھر سے نکلے۔ تو ہم نے ایک مندر میں پناہ لی۔ اور دوبارہ گھر تیار ہونے تک وہیں قیام کا ارادہ کیا۔

"جب دو دل جن کے درمیان محبت کا رشتہ ازل سے مضبوط ہو چکا ہو ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ تو خود بخود کوئی بہانہ نکل آتا ہے۔ اس مندر میں ایک نوجوان پجاری رہتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

"دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر ہم اکثر ملتے۔ اور وفا کے وعدے دُہراتے۔ ہم نے اپنی چھوٹی انگلی کو کاٹ کر ایک دوسرے کا خون چُوس لیا۔ اور اس طرح ہماری قسم پختہ ہوگئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو لکھ کر بھی دے دیا۔ کہ ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔

"ہم رات کی تاریکی میں اکثر اپنے تکیئے بدل لیا کرتے تھے[1]۔ ہمارا گھر تعمیر ہو چکا اور میں بادلِ ناشاد اپنے عاشق سے رخصت ہوئی۔ وہ عاشق جس سے میں وعدہ کر چکی تھی کہ عمر بھر جدا نہ ہونگی۔ آہ اُس رات کے بعد کتنی راتیں گزر گئیں۔ مگر میرے عاشق نے ایک خط سے بھی مجھ نامراد کے غمگین دل کو تسکین نہ دی۔

رات کی تنہائی میں جب میں اپنے بستر پر لیٹتی تو اُس کے خیال میں کھو جاتی۔ مگر ایک رات میری آنکھ جھپک گئی تو خواب میں مجھ کو اپنے دلبر سے ملنے کی یہ تدبیر معلوم ہوئی کہ میں اپنے گھر کو آگ لگا دُوں تاکہ ہم پھر اُسی مندر میں پناہ لیں۔

"میں نے پھُوس جمع کیا۔ اور شام ہوتے ہی گھر کے پیچھے ایک گوشے میں چپکے سے ڈھیر لگا کر اُس کے نیچے سُلگتے ہوئے انگارے رکھ دیئے۔

"گھر میں آگ لگ گئی۔ غل شور مچا۔ اور میں گرفتار کر لی گئی۔ اُف کس قدر خوفناک منظر تھا۔ اب میں کبھی ایسی غلطی نہ کروں گی۔ میرے حاکم مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ غریب پر رحم کیجئے۔"

آہ یہ عذرِ سادہ! .... مگر اُس کی عمر کیا ہے۔ بارہ سال؟ نہیں! تیرہ سال؟ نہیں! چودہ سال؟ نہیں تو پھر کیا پندرہ سال؟ ہاں ہاں ہائے افسوس اُس کی عمر پندرہ سال ہے۔ اِسی لئے اُس کا جرم ناقابلِ معافی ہے۔

اُوشی چی کو قانون کے مطابق سزا کا حکم سُنا دیا گیا۔ شارع عام پر برہنہ کر کے ایک درخت سے اُس کو باندھ دیا گیا۔ اور سات روز بے آب و دانہ اِسی طرح بندھے رکھا۔ اُف کس قدر دردناک اور عبرت انگیز نظارہ تھا۔

یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ اِس لئے ساتویں روز چار ستونوں سے لڑکی کو باندھ کر اُس کے گرد آگ جلا دی گئی ...... شعلے بلند ہوئے۔ آہ اُوشی چی اِن شعلوں کے بیچ میں تھی۔

مگر پروانہ بھی تو اسی طرح شمع پر جلنے کے لئے خود دوڑ کر آتا ہے۔

محمد بدر الاسلام فضلی
از جاپان

---

[1] جب عشاق ملتے ہیں تو رات کی تاریکی میں چھوٹے چھوٹے جاپانی تکیئے اکثر بدل جاتے ہیں۔

کھڑکی سے آنے والا

میری بارٹن گہری نیند سو رہی تھی۔ دفعتہً اس کی آنکھ کھلی۔ کسی کے پاؤں کی چاپ نے اُسے جگا دیا!

وہ خوف زدہ نہ تھی۔ بستر پر ہمہ تن گوش لیٹی اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ تاریکی بہت زیادہ تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر قبل گرمی کی شدت سے بےچین ہو کر وہ کروٹیں بدلتے بدلتے آخر سو گئی تھی۔ اُس وقت کمرے میں اتنی تاریکی نہ تھی۔

غالباً پانچ منٹ تک وہ ایک سکتے کی سی حالت میں لیٹی رہی۔ اس کے بعد۔ شائد کچھ آہٹ ہوئی۔ یا محض اس کے وہم کی تخلیق تھی۔ جس سے اسے یہ محسوس ہُوا کہ وہ کمرے میں تنہا نہ تھی۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگی۔ پھر بہت اطمینان آمیز لہجے میں دھیمی آواز سے بولی۔

"کیا کمرے میں کوئی ہے؟ کون ہے؟"

تھوڑی دیر تک ایک عمیق سکوت طاری رہا۔ پھر کسی نے جواب دیا۔ ایک مرد کی آواز تھی۔ بہت ہلکی غمگین آواز "میں ہوں! ابھی کھڑکی کے راستے سے آیا تھا۔ تم پریشان مت ہو۔ میں کوئی تکلیف دینے یا نقصان پہنچانے نہیں آیا۔"

"میں گھبراتی نہیں ہوں" اس کی نرم اور دھیمی آواز سے اب بھی استقلال ٹپک رہا تھا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"روپیہ! بہت سخت دقت ہے۔ ایک ماہ سے مجھے بستر پر لیٹنا حرام ہو گیا ہے تقریباً ایک ہفتہ سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہیں ہُوا!" اندھیرے میں سے بلند ہونے والی آواز ...... دھیمی اور شکستہ آواز انتہائی غم میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہی۔ میری کا دل بھر آیا۔ ہمدردی اور رحم کے جذبہ کو حرکت ہوئی۔

"آہ۔ ستم زدہ۔ غریب!" اس نے گلوگیر آواز سے کہا۔ "میرے پاس خود بہت ہی قلیل رقم ہے۔ صرف چند شلنگ۔ اگر تم چاہو تو بخوشی حاضر کرنے کو تیار ہوں۔"

"میرے لئے بہت کافی ہیں۔ کہاں رکھے ہیں؟"

"کھڑکی کے قریب والی بڑی میز پر ایک بٹوا رکھا ہے۔ اُسی میں ہیں۔ روشنی جلا کر دیکھ لو اور جو کچھ ہو وہ سب کچھ مع بٹوے کے لے لو۔"

"روشنی کی ضرورت نہیں میں اندھیرے ہی میں تلاش کر لونگا!"

میری کو کسی کے آہستہ آہستہ حرکت کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد آواز آئی "بٹوا مل گیا" آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ اُس نے پھر سسکیاں لیتے ہوئے کہا "کاش! تم مجھے معاف کر دو"

"معافی کی کیا بات ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا میں نے دے دیا۔ گو وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ لیکن شائد تمہیں کچھ مدد مل سکے" پھر کسی کے دھیمے قدموں کی آواز آئی۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اُسی سے واپس چلا گیا۔

صبح کو جب میری بیدار ہوئی تو اُسے اِس واقعے کا خیال آیا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اُس نے رات کیسا عجیب و غریب خواب دیکھا۔ لیکن میز پر ایک ہی نگاہ ڈالنے سے اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔

ایک فوری خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ اس چھوٹے سے پُرانے بٹوے میں چند شلنگ کے علاوہ ایک ایسی چیز بھی تھی جسے وہ اب کسی قیمت پر بھی حاصل نہ کر سکتی تھی۔

یہ دل کی شکل کا ایک چھوٹا سا سونے کا تعویذ تھا۔ جس میں ایک طلائی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ یہ تعویذ اس کی والدۂ مرحومہ کی نشانی تھی۔ اس میں اس کے سر کے کچھ بال تھے۔ اس کے کھو جانے کا میری کو بڑا صدمہ ہوا۔ لیکن اس نامعلوم شخص کی طرف سے اس کے دل میں کوئی بُرائی یا شکایت پیدا نہ ہوئی۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ وہ اس تعویذ کو فروخت کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اس کا خیال ہی دل سے مٹا دیا۔

زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ ابھی پورے پانچ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ میری کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو گیا۔ جن لوگوں کے ساتھ وہ اطمینان اور خوشی سے دن بسر کر رہی تھی۔ وہ اُسے دو تین ہفتوں کے اندر اندر داغِ مفارقت دے گئے۔

میری کو سخت تعجب ہوا اور کچھ خوشی بھی ہوئی۔ جب اُس نے یہ سُنا کہ وہ لوگ جن کے ہاں وہ رہتی تھی۔ اُس کیلئے ایک سو پونڈ سالانہ کی جائداد چھوڑ گئے ہیں۔ میری نے اپنی حالت پر بہت کچھ غور کیا اور آخر اپنی بہن کے پاس رہنے کا ارادہ کر لیا۔ جو ہمیشہ سے اِس بات کی خواہشمند تھی۔ کیونکہ اُس نے ایک تاجر کے ساتھ شادی کی تھی جس کا زیادہ وقت سفر میں گزرتا تھا۔ اور یہ مکان پر تنہا رہا کرتی تھی۔ میری کو اپنی بہن کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔ کہ اس کی بہن کا شوہر ایک مرتبہ ایک خوش خبری لے کر آیا۔ اُس نے اپنی بیوی کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا "جیک کا خط آیا ہے دیکھو تو کیا لکھا ہے۔ ہمارے ہاں عنقریب ایک مہمان آنے والا ہے۔ اگر وہ میری غیر حاضری میں آئے۔ تو تم دونو اُس کی میزبانی اچھی طرح کرنا۔

تھوڑے عرصے کے بعد وہ مہمان آ پہنچا۔ کچھ ہی دن کے بعد میری اور اس کی بہن حسب معمول شام کو ٹہلنے جانے کے

لئے تیار ہو رہی تھیں۔ کہ ایک شاندار موٹر اُن کے دروازے پر آ کر رکی۔ ایک بلند قامت قوی اور حسین اجنبی نوجوان اُتر کر آیا۔ اور اُس نے گھنٹی بجائی۔ کچھ منٹ کے بعد میری کی بہن میری سے اُس کا تعارف کرا رہی تھی۔

اُس نے کچھ اٹھلاتے ہوئے کہا "مسٹر ایلنگھم یہ میری بہن میری ہے۔ افسوس تم آجکل باہر گیا ہُوا ہے"

پانچ ہی منٹ کے اندر بروس ایلنگھم بالکل کھل گیا۔ وہ اجنبیانہ غیریت نام کو نہ رہی۔ میری اور اُس کی بہن بھی مطمئن اور خوش تھیں۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ کہ یہ نوجوان نہایت با اخلاق ہے۔

اس میں ایک عجیب مردانہ کشش تھی۔ جس نے میری کے دل پر ایک خاص اثر کیا۔ اس کے متین اور بُردبار چہرے کی لکیریں اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں جن سے استقلال برس رہا تھا۔ زبانِ حال سے میری کو اس سخت جدوجہد کا قصہ سُنا رہی تھیں جو اسے اپنی موجودہ کامیابی کے لئے کرنی پڑی تھی۔

ایلنگھم خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی پُرشوق نگاہیں ایک عجیب انداز سے میری کے چہرے پر جم جاتی تھیں۔ جب وہ جانے کے لئے اُٹھا تو اُس نے بڑی گرمجوشی سے میری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک دلکش لہجے میں کہنے لگا۔

"جب سے مَیں انگلینڈ میں آیا ہوں۔ آج پہلی مرتبہ آپ کی صحبت میں مجھے سچی مسرت نصیب ہوئی ہے۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔ کسی کو بھی نہیں جانتا۔ شائد آپ سے ملنے پھر آؤں . . . . . . اور بہت جلد"

میری نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ اور دونوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ضرور! جب آپ کا دل چاہے۔ ضرور آئیے۔ ہمیں انتظار رہے گا"

وہ دوبارہ آیا۔ بہت جلد۔ اُس کے بعد پھر آیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں روزانہ آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ میری کی بہن پر بھی یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ صرف میری کی وجہ سے اپنا زیادہ وقت یہاں گزارتا ہے۔

میری کو بھی اُس کے دل کا حال معلوم ہو گیا ہو گا۔ لیکن وہ ابھی اِس کے لئے کلیتہً تیار نہ تھی۔ اور نہ یہ خیال تھا کہ وہ ایکدم ایسی گفتگو چھیڑ دے گا۔ دونوں ملاقات کے کمرے میں تنہا بیٹھے تھے۔ ایلنگھم اپنے سفر کے کچھ قصے سُنا رہا تھا۔

بہت دیر کے سکوت کے بعد میری نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کی پُرشوق نگاہیں میری پر جمی ہوئی تھیں۔ اور آنکھوں میں ایک خاص چمک اور کشش تھی جو میری نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھی تھی۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں" اُس نے آہستہ سے کہا "میں نے کبھی کسی عورت کے منہ سے محبت کا ایک لفظ بھی نہیں سُنا . . . . . . حتیٰ کہ اپنی ماں . . . . . . کیونکہ میری عمر کچھ مہینے کی تھی۔ جب اُس کا انتقال ہو گیا تھا۔ صرف اِن تین الفاظ کا سننا "تم سے محبت ہے"! تمہیں کیا معلوم میرے لئے کیا کچھ معنی رکھتا ہے"

بے خیالی میں اُس نے میرؔی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور اُس کو مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔

"کہو" اُس نے کان میں کہا۔

میرؔی نے صرف اتنا کہا "تم سے محبت ہے"

آیندہ زمانہ دونوں کے لئے غیر محدود مسرت کا گہوارہ تھا۔ اُسی بڑی موٹر میں دونوں شہر کا گشت کیا کرتے تھے۔ آخر خاطر خواہ مکان مل گیا۔ اُس وقت میرؔی کو محسوس ہوا۔ کہ اُس نے اپنے آپ کو کیسے رئیس کے حوالے کیا ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو روپیہ سے حاصل ہوسکتی تھی میرؔی کے لئے حاضر تھی۔

مکان جب منشا آراستہ ہوجانے کے بعد انہوں نے خاموشی سے اپنا نکاح پڑھا لیا۔ شائد ان سے زیادہ خوشی اور عیش و آرام کی زندگی کسی کو بسر کرنی نصیب نہ ہوئی ہو۔

ایک دن وہ سڑک پر ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ ایک آدمی ملا۔ جس کی حالت معمولی فقیروں کی سی نہ تھی۔ پریشان معلوم ہوتا تھا وہ بہت ہی حجاب اور شرمندگی کے ساتھ امداد کا طالب ہوا۔ ایلنگھم نے بلا توقف اپنی جیب سے ایک مٹھی بھر کر روپے نکالے اور اُس کو دے دیئے۔

اسی دن رات کو ایلنگھم اور میرؔی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ بڑس ایلنگھم ایک دم میرؔی کی طرف پلٹا اور اپنے جذبات محبت کو دباتے ہوئے بہت آہستہ سے بولا۔

"پیاری۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جس سے تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ کہ میں نے اس غریب آدمی کو فوراً اتنے روپے کیوں دے دیئے۔ میں تمہیں خود اپنی زندگی کا وہ واقعہ سناتا ہوں۔ جب کہ میری موت و حیات صرف ایک سکے کی جھنکار پر منحصر تھی"

میرؔی کے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب اُس نے وہ قصہ سنایا۔ ایک قصہ جس کا ایک ایک لفظ میرؔی کے پردۂ دماغ پر فراموش شدہ باتوں کی زندہ تصویر کھینچ رہا تھا۔

ماضی حال بن گیا۔ میرؔی ایک مرتبہ پھر اُسی تاریک کمرے میں کھڑکی سے آنے والے کی آہٹ سُن کر بیدار ہوئی اور اپنے بستر پر خاموش لیٹی اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اُس نے مجھے اپنا بٹوا دے دیا۔ یہی بٹوا اُس کی کُل ملکیت تھا۔ لیکن روپیہ کے علاوہ اُس میں ایک اور چیز بھی تھی۔ دل کی شکل کا ایک چھوٹا سا تعویذ۔ جس میں طلائی زنجیر پڑی تھی۔ میں اُس کو واپس نہ کرسکا۔ کیونکہ جب میں نے اُسے دیکھا تو میں اُس جگہ سے میلوں دُور نکل آیا تھا۔ دوسرے مجھے یقین تھا کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اب میں اس مکان کو نہ پاسکونگا۔

لیکن میں نے اُس کو بٹوے ہی میں رکھ دیا۔ اور ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھا۔ کئی کئی وقت مجھ پر فاقے بھی گزرے۔ لیکن اس کو فروخت کرنے کا کبھی خیال تک بھی دل میں نہ لایا۔ میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ اگر کبھی میں کسی کو اپنا شریک زندگی بنا سکا۔ تو یہ تعویذ اُس کے گلے میں پہناؤں گا ......

وہ تعویذ یہ اب میرے ہاتھ میں ہے... میری! ...... کیا میں ...... کیا یہ تمہارے گلے میں پہنا سکتا ہوں؟"

یہ کہہ کر اُس نے تعویذ میری کے گلے میں ڈال دیا۔

کیا میری نے اُس سے تعویذ کا واقعہ بیان کر دیا؟ نہیں راز کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ایک عورت جسے کسی سے محبت ہو۔ اپنے ہی ساتھ خاک میں لے جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اُن کا انکشاف اُس کے محبوب کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

اُس نے کبھی یہ راز اُس پر ظاہر نہ ہونے دیا +

ناظم میرٹھی

(ترجمہ)

———

دنیا کو وضع کرنے اور تعلیم دینے والا مرد ہے۔ لیکن مرد کو تعلیم دینے والی عورت!

———

عقلمند سے عقلمند آدمی بھی جاہل سے جاہل کسان سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

———

انسان مطالعہ سے مکمل، مشورہ سے مستعد اور تصنیف سے درست بنتا ہے۔

———

گلچیں

محفل ادب

ادب الکاتب و الشاعر

(ہائے مختفی)

الف بے میں ہائے مختفی کا سمجھنا شاعر کے لئے ضرور ہے، فارسی والے قافیہ میں اسے حرف ردی نہیں کرتے ۔ وہ اسے حرف ہی نہیں سمجھتے ۔ مختفی کا لفظ دھوکا دیتا ہے ۔ کہ یہ چھپا ہوا حرف ہے ۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ہائے مختفی محض کتابت میں حرف ہے ۔ اور تلفظ میں اس کی کچھ آواز نہیں ۔ حرف بے صوت ہے ۔ ہاں جمع بنانے یا نسبت دینے کی صورت میں ہائے مختفی کاف سے بدل جاتا ہے ۔ جیسے رفتگاں ۔ مژگاں ۔ زندگی ہمیشگی ۔ ہائے مختفی فارسی و اُردو کا حرف ہے ۔ عربی کی الف بے میں ہائے مختفی کوئی حرف نہیں ۔ مثلاً کعبہ و سجدہ و قطرہ و ذرہ کی (ہ) ہائے مختفی نہیں ہے ۔ عرب اِس (ہ) کو مظہرہ سمجھتے ہیں ۔ اُن کی اصطلاح میں یہ (ۃ) ہے ۔ کہ حالتِ وقف میں (ہ) کی آواز دیتی ہے ۔ فارس والوں نے تصرف کر کے ہائے مظہرہ کو مختفی بنا لیا ہے ۔

ہائے مختفی لکھی اس لئے جاتی ہے کہ حرف ماقبل کے متحرک ہونے پر دلالت کرے یہی سبب ہے کہ جب "کہ" اور "چہ" کے ساتھ است کو ملاتے ہیں تو ی سے بدل جاتی ہے ۔ مثلاً کیست و چیست کی ی وہی ہائے مختفی ہے ۔ جس کا حرف ردی کرنا فارسی میں جائز نہیں ۔ مگر کیست کا قافیہ چیست درست ہے ۔

اگر کہ اور چہ میں ہائے مختفی نہ لگائی جاتی ۔ تو اس طرح لکھتے ۔ کَ رفت وچ گفت و آن شد ۔ اور اس طرح لکھنے میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن جس طرح کہ اور چہ کے اشباع سے ہائے مختفی ی سے بدل گئی ۔ اور اب اس کا حرف ردی کرنا درست ہو گیا ہے ۔ اسی قیاس پر چاہیئے تھا کہ لفظ گلہ و مژہ کی ہائے مختفی الف سے بدل جاتی اور گلہ کا قافیہ مژہ درست ہو جاتا ۔

اسی قیاس پر اُردو کہنے والے اکثر شعرا ہائے مختفی کو الف سمجھتے ہیں اور بے تامل حرف ردی کر دیتے ہیں ۔ ع

اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

مگر اہل ایران اور ہندوستان کے شعرائے فارسی گو قطعاً ہائے مختفی کو قافیہ میں نہیں لاتے ۔ لیکن ہائے مختفی کو الف بنا کر قافیہ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا ۔ کہ اس (ہ) کو الف کر کے تقطیع میں اُسے شمار بھی نہ کریں ۔

ہاں اس بات کا توہم ہوتا ہے کہ جب لفظ گلہ و مژہ میں ہائے مختفی محض اس بات کی علامت ہے کہ اِس کے

مانبل لام اور زے متحرک ہیں۔ تو پھر اُسے الف بنا کر وزن میں محسوب کرنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ جلال اسیر نے اور اُن کی تقلید میں مرزا بیدل و ناصر علی نے اور اُن کی تقلید میں مرزا غالب نے یہ التزام کیا ہے۔ کہ مصرع کے درمیان ایسا نہیں کرتے۔ اسیر ؎

مژہ وارے قدم از دیدہ بُرن نگزاری　　گر بدانی چہ قدر پاسِ نظر داشتہ ایم

بیدل۔

اگر اندیشہ کند طرزِ نگاہِ او را　　جوشِ حیرت مژہ ساز د نگہ آہو را

اب یہاں تک نوبت پہنچی کہ اگر کوئی چشمہ یا جلوہ یا رفتہ و گذشتہ کی (ہ) کو الف بنا کر وزن میں شمار کرے۔ تو لوگ اُسے غلط سمجھتے ہیں۔

مرزا غالب نے قیامت کی اُردو میں بھی لفظ مژہ کی (ہ) کو بڑی زحمت و کوشش سے گرا دیا۔ ؎

بتاؤ اِس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

شاید فردوسی کا یہ مصرعہ۔ ع

مژہ تیرگی بُردہ از پرِ زاغ

مرزا صاحب کے نزدیک ناموزون ہے۔

اِس مسئلہ میں تقلید سے کام نہ لینا چاہیئے۔ تقلید میں آنکھوں پہ پردہ پڑ جاتا ہے۔ ہم ناصر علی و بیدل کے تتبع سے بَری ہیں۔ ہم نے زبان سعدی سے سیکھی ہے۔ بوستان میں سے چند شعر لکھتا ہوں، جہاں ہائے مختفی کو وزن میں لیا ہے اُن الفاظ پر خط کھینچ دیا ہے ؎

بدرگاہِ لطف و بزرگیش بر　　بزرگاں نہادہ بزرگی ز سر
ہمہ طاعت آرند و مسکیں نیاز　　بیا تا بدرگاہِ مسکیں نواز
چو شاخِ برہنہ برآریم دست　　کہ بے برگ ازیں بیش نتواں نشست
بمایہ تواں اے پسر سود کرد　　چہ سود افتد آں را کہ سرمایہ خورد
بدر می کنند آب گینہ ز سنگ　　کجا ماند آئینہ در زیرِ زنگ
کہ حاصل کند نیک بختی بزور　　بہ سرمہ کہ بینا کند چشمِ کور
ز تدبیرِ پیرِ کہن بر مگرد　　کہ کار آزمودہ بود سال خورد
دو رستہ درم در دہاں داشت جائے　　چو دیوارے از خشتِ سیمیں بپائے
دو صورت کہ گفتی یکے نیست بیش　　نمودہ در آئینہ ہمتائے خویش
نبودے بجز آہ بیوہ زنے　　اگر بر شدے دودے از روزنے
سوارِ نگوں بخت بے راہ رو　　پیادہ برو زود بر فتن گرو

سعدی کے اِن اشعار میں افعال بھی ہیں۔ جیسے نہادہ، نمودہ آزمودہ۔ اسما میں بھی ہیں۔ مایہ۔ آبگینہ۔ سرمہ۔ رستہ۔ صفات بھی ہیں، ہمہ، برہنہ۔ بیوہ۔ پیادہ۔ اِن سب الفاظ میں ہائے مختفی وزنِ شعر میں داخل ہے۔

انوری کہتا ہے ؎

رنجور بادیہ بفضائے ارم گریخت　　مقہور بادیہ بہوائے جناں رسید
توئی کز فتح باب دست تو بہت　　ہمیشہ خشک سال آز را نم
کمینہ پاسبانت بخت بیدار　　فرو تر پائگاہت چرخِ اعظم

ع کجا دیدہ ست بیچارہ چنیں حال

صدف بگوہر و نافہ بمشک نے لشکر

حکیم سنائی کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔ ع

چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا　　گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

پندگیرید اے سیاہی تاں گرفتہ جائے پند
عذر آید اے سپیدی تاں دمیدہ بر عذار
حرص شہوت از تو بیدار و تو خفتہ خوش بخسپ
چوں پلنگے بر سیں داری و موشے بر لیسار

عمر خیام کا یہ مصرعہ مشہور ہے ع

کعبہ چو روی بُرد دلے در یاب

این چرخ کہ با کسے نمیگوید راز کشتہ بستم ہزار محمود و ایاز
از آب و گل آفریدہ صانع مارا گرد بہ غم زمانہ قانع مارا

جب نصیر بن احمد کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ نوح بن نصر تخت نشین ہوا تو اُس زمانہ کے شاعر شیخ ابو العباس نے یہ قطعہ جو تعزیت و تہنیت پر مشتمل ہے پیش کیا تھا ؎

بادشاہے گذشت خواب نژاد بادشاہے نشستہ فرخ زاد
زاں گذشتہ جہانیاں غمگیں زیں نشستہ جہانیاں دل شاد

فرخی کہتا ہے ع

باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں

عبد الواسع جبلی۔ ع

بستہ میاں چو رمح و کشادہ دہاں چو تیر

رشید الدین وطواط ؎

ز بہرِ رزم تو غنچہ بباغ چوں پیکاں
ز بہرِ بزمِ تو لالہ براغ چوں ساغر

عنصری ہاتھیوں کی مدح میں کہتا ہے ؎

چوں زنجیرِ داؤد خرطوم ایشاں کہ آویختہ بد ز چرخِ مدور
بگردون گروندہ مانند ورتشاں جہاں را ہم از خیر بہرہ ہم از شر

مینو چہر شصت کلہ شمع سے خطاب کرتا ہے ؎

گر نہ کوکب چرا زندہ نگردی جز بہ شب
ور نہ عاشق چرا گریی ہمی بر خویشتن
رُوئے تو چو شنبلید بر شگفتہ بامداد
دلِ من چوں شنبلید ناشگفتہ در چمن (؟)

سلطان مسعود کے زمانہ کا شاعر مسعود سعد فتح ہندوستان کی تہنیت میں کہتا ہے ؎

یک شب از دہکاں بجالندر کشیدی لشکرے
چوں زمانہ زور مند و چوں قضا کینہ گزار
کوہہا درہم شکستہ آبہا درہم زدند
تازیاں اندر عناں و بختیاں اندر مہار
پرستارہ آسمانے کردی از دودِ شرار
کنوں ہینی نو از سبزہ ہزاراں فرش میناگوں

کمال اسمٰعیل کشتی کی پہیلی میں کہتا ہے ؎

دار گونہ خانۂ دیوار و در مانند ہم سقف او در زیر پا لیت و ستونش زبر
باد او را تازیانہ خاک او را ناخنہ آتش او را خصم جان و آب او را راہ سپر
در ہمہ بحرے بود جائش مگر اندر دو بحر بحرِ شعر و بحرِ جودِ بادشاہ بحر و بر
اے فتنہ شدہ ز طبع پستت بیدار تو خفتہ و عالمے ز دستت بیدار

خسرو کی مثنوی کا شعر ہے ؎

بنود آگہ کہ شاہاں جامۂ راہ دگر گونہ کنند از خوفِ بدخواہ

نظامی۔ ع

شکستہ چناں گشتہ ام بلکہ خرد ستارہ حقیقی کند بر سپہر

یہ سب لوگ تو اساطین فنِ شعر تھے جن کے کلام سے چند شواہد

جو پیش نظر تھے یہاں لکھ دیئے۔ متقدمین میں بھی اکثر شعرا کے کلام میں ہائے مختفی کا اشباع بکثرت نظر آتا ہے۔

طغرا تعغتاو کے ذکر میں کہتا ہے ؎

شگوفہ ازیں نوسفر چوں شگفت　　کہن شاخ او بارک اللہ گفت

صنم خانہ کے وصف میں کہتا ہے ؎

درو بسکہ ہندو زدہ رام رام　　پریدہ رم از طبع مرغانِ بام

عصمت بخاری گھوڑے کی ہجو میں کہتا ہے ؎

اسپے کہ چوں کمانِ شکستہ وجودِ او　　سر تا قدم بغیر پے و استخوان نہ بود

ظہوری ؎

نہ زدہ سکہ از تو بالاتر　　ہیچ کس بر محلِّ جاہ و جلال

زلالی ۔ ع

شہِ غزنی ازاں نامہ برآشفت

میرزا محتشم ؎

مبتلائے رنج باریک است از دوران چرخ
ہر کہ چوں رشتہ ولے بر جمع گوہر بستہ است

میرزا عبداللہ قبول ۔ ع

ہر کہ در عمر نخوردہ تن نہاناں راہ

مرزا بیدل ؎

گذشت از چرخ و نگرفت آبلہ چشم ثریا را
ہوایت تا کجا از یا نشانہ نالہ ما را

ع بپائے جستجو چوں آبلہ خوں گشت منزلہا

ع ترسم نہ فشاری بہ مژہ دامن تر را

پھر اس بات کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ کہ آخر مصرعہ میں قدماء متاخرین، اساتذہ و مقلدین باتفاق ہائے مختفی کو الف کر دینے میں ذرا احتیاط نہیں کرتے۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ کہ درمیان مصرعہ میں جو بات عیب سمجھی جائے۔ آخر مصرعہ میں وہ جائز ہو جائے۔

بلکہ شعرا کے دیوانوں میں ہائے مختفی کی ردیف موجود ہے۔ انداختہ۔ برداشتہ۔ رفتہ۔ کردہ وغیرہ بکثرت ردیف ہوا ہے۔ ان سب میں ہائے مختفی الف ہو گئی ہے۔

جلال اسیر کی ایک غزل بے ردیف کی ہے ؎

مانند قمری سر برہنہ کردیم
بے حلقہ دام از آشیانہ

بہانہ و ترانہ و فسانہ اس کے قافیے ہیں۔

مرزا بیدل نے انہیں قافیوں میں وزن بدل کر غزل لکھی ہے۔ ع

جنوں دارد از بوئے گل تازیانہ

غرض کہ ہائے مختفی کے اشباع کرنے نہ کرنے کا ایک توہم سا مدت سے چلا آتا ہے۔ اور حقیقت اس کی کچھ بھی نہیں۔ نہ اس کا گرانا منع ہے نہ اشباع ✦

"زمانہ"

مطبُوعات

افاداتِ مہدی ۔ حجم پونے چار سو صفحات، کاغذ، طباعت و کتابت عمدہ قیمت ؏ ۔ معارف پریس اعظم گڈھ سے طلب فرمائیے
یہ کتاب ایم مہدی حسن مرحوم "افادی الاقتصادی" کے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ اکثر مضامین بصیرت افروز ہیں ۔ اندازِ تحریر شستہ اور شگفتہ ہے ۔ بعض مضامین کے عنوان درج کئے جاتے ہیں :۔
"حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر" "تمدنِ عرب اور پروفیسر شبلی" "ترکوں کی معاشرت" "آدھ گھنٹہ شبلی کے ساتھ" "مثنوی العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" "اُردو ادب کے عناصر خمسہ" وغیرہ ۔

چندن ۔ لاہور کا یہ ماہوار ادبی رسالہ تقریباً ایک سال سے جاری ہے ۔ اس کے ایڈیٹر مشہور افسانہ نویس مہاشہ سُدرشن صاحب ہیں ۔ سدرشن صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ادب اُردو کی خدمت میں گزارا ہے ۔ اُن کی کثیر التعداد اُردو تصانیف ادبی حلقوں میں ہمیشہ خاص وقعت کی نظر سے دیکھی گئی ہیں ۔ اور پنجاب یونیورسٹی انہیں غالباً ایک سے زیادہ دفعہ ادبی خدمات کے صلے میں گرانقدر انعامات بھی دے چکی ہے ۔
جیسا کہ سدرشن صاحب سے توقع ہونی چاہیئے ۔ اُن کا رسالہ مذاق سلیم کا آئینہ دار ہے ۔ بے جا تعلّیاں اور بلند بانگ دعوے اگرچہ اس میں نظر نہیں آتے مگر بیشتر مضامین نظم و نثر اُن کے حسنِ انتخاب کے شاہد ہیں، کاغذ لکھائی اور چھپائی بہترین اور لاہور کے اکثر رسالوں سے اچھی ہے ۔ ٹائیٹل رنگین تصویر دار ہے ۔ ہم سدرشن صاحب کو اس نفیس رسالے کے اجرا پر مبارکباد دیتے ہیں ۔ اور ہمیں امید ہے ۔ کہ شائقین ادب اس رسالے کی قدر افزائی کر کے سُدرشن صاحب کو موقع دینگے کہ وہ اسے ہر طرح مزید ترقی دے سکیں ۔ چندہ سالانہ پانچ روپے علاوہ محصولڈاک مینیجر چندن لاہور سے طلب فرمائیے ۔

بچھڑی بیٹی ۔ ایک دلچسپ مختصر افسانہ ۔ حجم ۳۰ صفحے ۔ مصنفہ محترمہ خاتون اکرم صاحبہ ۔ کاغذ نہایت نفیس اور چھپائی رنگین ہے ۔ قیمت ۶ر ۔ مینیجر رسالہ عصمت دہلی سے طلب فرمائیے ۔

عرب کی شاعری ۔ کاغذ، کتابت اور طباعت نفیس حجم ۵۶ صفحات : یہ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم کا وہ بصیرت افروز مضمون ہے ۔ جو اس سے پہلے رسالہ "اُردو" میں شائع ہوا تھا ۔ مولانا کا نام ہی کتاب کی خوبی کا شاہد ہے ۔ اہلِ ذوق معتمد صاحب کتب خانہ مسجد چوک حیدر آباد دکن سے طلب کر کے فائدہ اُٹھائیں ۔ قیمت ۴ر +

جغرافیۂ ریاضی و طبعی (۲) جبر و مقابلہ ۔ یہ دونوں کتابیں سید انوار حسین صاحب بی اے مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ پربھنی نے طلبہ کے فائدے کیلئے تصنیف کی ہیں ۔ سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محنت سے لکھی گئی ہیں ۔ طلبہ کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے جبر و مقابلہ کی قیمت ۱۵ر ہے ۔ دوسری کتاب پر قیمت درج نہیں غالباً چھ سات آنے ہوگی ۔ مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے +